PDFBOOKSFREE.PK

...براعلی

تنج ادائیں فرمائیاں کہ کج ادائی
نامِ ...میں عنایتیں اعصاب اور موڑ

# انگارے
طاہر جاوید مغل

سطر سطر رنگ ...
ایک لہو رنگ اور دل گداز دا...

...وبائی وغ...
تنویر ریاض

...کے ماحول اور مزاج میں بسی
...رنگ اور ... مخنت وبائی وغذائی قباحتیں

67

13

# بدقسمت
بشریٰ امجد

لمحہ لمحہ سنسنی خیزی کی جانب گامزن ایک
اعصاب شکن کہانی کے لرزا خیز موڑ

طاہر...

سر سطر
...جسے حل کرنے کا سہرا جلیل کے سر تھا

72

# آوار...
ڈاکٹر عبدالرب عبدالر...

تحیر... سنسنی اور ایکشن ... ایکشن
ڈوبتا دلچسپ ...

131
# رنگِ وفا
امجد رئیس

ایک دیرینہ ہمدم کی
یکدم اجنبی ہو جانے کی تلخ نوائی

135
# تلاش
سکندر علیم

وقت اور حالات کے تحت جرم کا
شکار ہونے والے ایک شکاری کی بپتا

143
# بے ضمیر
جمال دستی

اس نوجوان کا المیہ جو ایک خاموش
دیوار کی طرح ساکت تھا



جلد 45 • شمارہ 07 • جولائی 2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: ...

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

158 دلدل — عبار تونیر

باریک ... سپرا

195 خمیازہ

دلدل ... پرستوں

9 رقصِ اجل — ظر اسلم

... نے والے شریف کی ... ہولنا ... کے ٹکراؤ کی ہولنا ...

215 دیدہ دلبر

باریک ... سرا

218 قطرہ خور — ایس ملر

زندگی کے لازوال ... میں ... روشنی ... سائی

221 بھوت کی واپسی — محمد عثمان آزاد

زندگی کے لازوال ... بھوت ... روشنی ... ماجرا

218 برزخ — رزاق شاہد کوہلر

عقل باطن کی گہرائیوں سے ہم کلام ہو تو ہر شخص خواہشات سے بالاتر ہو جاتا ہے

215 تراوٗ — مریم کے خان

زندگی کے لازوال اندھیروں میں روشنی کی کرن کے متلاشی

215 ترا ... تری — ادارہ مریم کے خان

اقتباسات گدگدیاں مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کیلئے



پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول، مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

مدیر اعلیٰ

# چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ پر چلتا ٹریفک بالکل تھم گیا۔ پولیس اور امدادی رضا کاروں کی نقل و حرکت نظر آئی پھر ٹریفک رواں ہوگیا۔ پتا چلا کہ ایک پیاسا کبوتر نڈھال ہو کر سڑک پر آگرا تھا۔ اس کے امدادی مرکز روانہ ہونے تک سب سوار سکون اور خاموشی سے کھڑے رہے۔ یہ ایک مہذب ملک کے مہذب شہریوں اور اہل کاروں کا رویہ تھا... رمضان المبارک کے مقدس مہینے کے آغاز میں یہاں کراچی میں بارہ سو سے زائد انسان موسمی سختی کی بنا پر موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اندرونِ سندھ بھی موسم کی ہلاکت خیزی نے رنگ دکھایا لیکن کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ محترم وزیر اعلیٰ چار دن گزر جانے کے بعد اسپتال پہنچے۔ سیاسی حلقوں میں الزام تراشیاں اور پوائنٹ اسکورنگ ہو رہی ہے۔ شہر اور شہریوں کو یوں لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے جیسے یہ برطانوی کبوتر سے بھی گئے گزرے ہوں۔ گرمی کی حدت اور شدت تو بہرحال امرِ الٰہی ہے۔ اس کی ہلاکت خیزی میں اضافہ ہونے کے کچھ اسباب ایسے ہیں جو انسانی کنٹرول میں ہیں۔ بجلی کا نہ ہونا یا پانی کا نہ ہونا کہ یہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ یہ بات بجا کہ ہواؤں کا رخ ربّ العزت کے اختیار میں ہے۔ کسی میں طاقت نہیں کہ سمندر کی طرف چلنے والی ہواؤں کا رخ پھیر سکے مگر گھروں سے اسپتالوں تک میں بجلی کی مسلسل فراہمی، خرابیوں کا پھرتی سے دور کیا جانا، پینے کے پانی کی فراہمی، ایمبولینس سروس، اسپتالوں میں ایمرجنسی کا مقابلہ کرنے کا بندوبست، دواؤں کی وافر فراہمی، میت گاڑیوں کی دستیابی اور آخری مرحلے میں جان سے گزر جانے والوں کے لیے ''مناسب داموں'' پر دو گز قطعہ زمین کی فراہمی ...... یہ سب انسانی اختیار و اقتدار کی بنیادی اور انتہائی اہم ذمے داریاں ہیں جن سے مختلف حیلوں بہانوں سے فرار لوگوں کی سرشت کا حصہ بن چکا ہے۔ اس فراری ذہنیت سے نجات حاصل کیے بغیر ہم کبھی بھی قومی سانحات سے خیر و خوبی سے نمٹنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ آیئے محفل کا رخ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا شگوفے کھل رہے ہیں اور کون سے مرجھا رہے ہیں۔

ہری پور سے محمد قاسم رحمان کی آمد ''جاسوسی میں ایک دو خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اس بات کا پورا یقین ہے کہ تقریباً سب مجھے بھول چکے ہوں گے۔ کیونکہ امتحان اور اس کے بعد بیماری کی وجہ سے میں کافی ماہ غیر حاضر رہا۔ دو دن میں بک اسٹال کے چھ چکر لگانے کے بعد جاسوسی 4 جون کی شام کو مل ہی گیا۔ ٹائٹل گرل شاید یہ سوچ رہی تھی کہ میرے آئیڈیل کا گھوڑا تو آگیا لیکن نجانے خود کب آئے گا۔ سائڈ پر شاید اکبر شاہ جیلس ہو رہے تھے۔ اداریہ پڑھنے کے بعد دوستوں کی محفل میں آیا جہاں اعجاز احمد راحیل بڑے کروفر کے ساتھ براجمان تھے۔ ابن شمشاد کا مختصر مگر اچھا تبصرہ تھا۔ ساگر نلوکر صاحب جاسوسی میں جیسی کہانیاں چھپیں گی ویسا ہی تو ٹائٹل ہوگا نا۔ ادریس احمد خان آپ اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں کیوں جی۔ صفدر معاویہ آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور واقعی اب ہر کہانی تو زبردست نہیں ہو سکتی لیکن نارمل سے نچلے درجے سے بھی تو کم کہانی نہیں ہونی چاہیے نا۔ عرفان راجہ کا تبصرہ بھی بہتر رہا۔ محمد مرتضیٰ ٹائٹل گرل سے کہیں آپ تو نہیں بچھڑ گئے۔ ماضی کے اوراق پلٹیے نا جی۔ نادر سیال آپ پیپروں میں بھی جاسوسی پڑھتے ہو۔ زویا اعجاز، بلقیس خان اینڈ عبدالجبار کے تبصرے بہترین تھے۔ جانِ جاناں اینڈ دیر ویلکم۔ کہانیوں کی ابتدا حسبِ معمول آوارہ گرد سے کی۔ زہرہ بانو کی داستان ختم ہوئی اور کہانی پھر سے اپنی پرانی ڈگر پر آگئی۔ اسپیکٹرم کا اضافہ اچھا ہے۔ احمد اقبال کی تحریر سونا چاندی کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ کہانی پڑھنے کے بعد ایک ڈسپرین کی گولی لینی پڑی۔ خونی تصویر پڑھ کر حیرت سی ہوئی۔ ایک مذہبی امام کے قتل کی وجہ سے ٹیم کا ٹوٹ جانا اور اتنے قتل عجیب سی بات ہے۔ خونِ ناحق میں الفریڈ وا اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ خود کردہ بھی زبردست رہی۔ سراغ رساں کیرول نے بہت چالاکی سے ایلس مینڈوزا کو بے نقاب کیا۔ چہرہ شناس میرے فیورٹ رائٹر کی تھی۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ جولی پولیس انسپکٹر تھی۔ شکار میں فرینک نے خوامخواہ اندیشہ پال لیا جس کی وجہ سے اسے موت کی آغوش میں جانا پڑا۔ لہو رنگ سرورق کی پہلی کہانی زبردست تھی۔ عنبرین اور آمنہ بیگم کے کریکٹر پسند آئے۔ کاشف زبیر کی تحریر کی تعریف کرنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ گل نے رل کا پتا لگا ہی لیا تھا مگر افسوس ...... لیکن زویا اور منصور کا انجام بہت بھیانک ہونا چاہیے تھا۔ کترنیں اس بار کچھ خاص نہ تھیں۔''

اوکاڑہ سے مسز فاروق بلوچ کی محبتیں ''میں جاسوسی کی اس وقت بھی قاری تھی جب 70ء کا زمانہ تھا اور میں ایک نوعمر بچی تھی اور آج بھی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی ہوں جبکہ میں خود جوان بچوں کی ماں ہوں۔ 45-40 سال کے اس عرصے میں تعلیم مکمل ہوئی، شادی ہوئی، کراچی شہر چھوٹا، رخصت ہو کر اوکاڑہ آگئی، پھر شوہر کے ساتھ وکالت مکمل کی۔ اس دوران ایک بیٹے اور پھر بیٹی کی نعمت سے اللہ نے نوازا۔ زندگی گزرتی جا رہی ہے مگر میکے کی لگی ہوئی ''لت'' ایسی لگی کہ آج تک پیچھا نہ چھڑا سکی اور اب بھی اتنی ہی باقاعدگی سے جاسوسی پڑھتی ہوں۔ میرا یہ خط کسی مخصوص شمارے کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی میرے لیے ممکن ہے کہ میں باقاعدگی سے چینی نکتہ چینی کی محفل میں شریک ہو سکوں، لیکن اگر میرے خط کو آپ کی محفل میں جگہ ملی تو کبھی کبھی خط لکھنے کی جسارت کر لیا کروں گی۔ ورنہ جاسوسی سے رشتہ تو مرتے دم تک رہے گا، انشاء اللہ۔ تقریباً آدھی صدی کے اس عرصے میں جاسوسی نے اپنا معیار جس طرح قائم رکھا، اس کے لیے آپ اور آپ کی تمام ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے کیونکہ بہرحال یہ آپ سب کی کاوشوں کا ثمر ہی تو ہے۔ میرے پسندیدہ ترین مصنف علیم الحق کے لیے سلام اور ڈھیروں دعائیں۔ (وہ عالم فانی سے کوچ کر چکے ہیں، دعا کریں) ڈاکٹر صاحب نے جاسوسی کا ''چہرہ''

ہمیشہ اپنے رنگوں سے جوان رکھا ہے۔ ان سے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اپنے برش سے مزید کام لیتے ہوئے سرورق کی یکسانیت کے تاثر کو بدلیں تاکہ سرورق پر لکھی جانے والی کہانیاں بھی شاہکار ثابت ہوں۔ مصری تاریخ وتہذیب کی پُراسراریت اور اہرام کی کشش، دوسری جنگِ عظیم اور اقوامِ اسلام کے خلاف ہنود و یہود کی سازشیں، خاص طور پر اسرائیل کی نفرت، ظلم اور مکاریاں اور نہتے مظلوم فلسطینی مسلمانوں کی اپنی بقا کی کوششیں۔ اور سب سے بڑھ کر اپنے پیارے وطن پاکستان کے سر سے کفن باندھ کر دشمن بھارت ایجنسیوں کی ناپاک اور مذموم سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے افواج کے جوان، یہ ہیں وہ موضوعات جن پر وقتاً فوقتاً جاسوسی کے صفحات پر دل کو چھوتی ہوئی تحریروں کی اشد ضرورت ہے، اگرچہ یہ موضوعات پہلے بھی شامل ہوتے رہے ہیں مگر یہ میرے انتہائی پسندیدہ موضوعات ہونے کے ساتھ ساتھ آج کے وقت اور حالات کی ضرورت بھی ہیں تو آپ اس طرف خصوصی توجہ دیں بلکہ میری آپ سے شدید خواہش کا اظہار ہے کہ مصری تہذیب پر ایک طویل کہانی جلد از جلد جاسوسی کے ابتدائی صفحات میں ضرور شامل کریں تو دل سے دعا نکلے گی آپ کے لیے۔ طاہر جاوید مغل نے جس طرح محبت کے جذبے کو اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے اس نے حساس دلوں کی گہرائیوں کو چھولیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ محترم محمود احمد مودی صاحب، سرکش، کے بعد مزید کوئی سرکشی نہ دکھا سکے اب تک۔ منتظر ہیں ہم۔ باقی تمام لکھنے والے اپنی اپنی کاوشوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان سب کی درازیٔ عمر اور درازیٔ قلم کے لیے دعائیں۔ آپ نے کچھ عرصہ پہلے نئے لکھنے والوں کے لیے فرمایا تھا کہ وہ اپنی کہانیاں جاسوسی ڈائجسٹ کے پتے پر روانہ کریں۔ مناسب اصلاح کر کے شائع کر دیا جائے گا، کیا میں یہ جرأت کر سکتی ہوں؟" (خوش آمدید)

کراچی سے حسن افضال کی شکایت "طویل عرصے سے جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ چند ماہ پیشتر بھی ایک خط ارسال کیا تھا جس میں "انگارے" کے مصنف/خالق کا نام طاہر جاوید مغل میں نے بھی پوچھا تھا لیکن جون کے شمارے میں میرا نام موجود نہیں ہے۔ (معذرت... بڑی تعداد میں آئے ہوئے خطوط کی چھانٹی میں سہواً غلطی ہوگئی ہوگی) بہرحال جاسوسی ایک معیاری رسالہ ہے اور اس کا مطالعہ میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے کرتا ہوں۔ آوارہ گرد بہت اچھی جا رہی ہے۔ میری طرف سے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کو مبارک باد پہنچا دیں۔ دوسری کہانیاں بھی معیاری اور دلچسپ ہیں۔ ٹائٹل ہر ماہ کی طرح اس مرتبہ بھی دیدہ زیب ہے۔ میری تجویز ہے کہ ایک طویل اور سسپنس سے بھرپور کہانی کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ سری ادب کے شائقین بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح جاسوسی ڈائجسٹ میں انمول کہانیاں پیش کرتے رہیں اور قارئین ان سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔"

غلام یلیسین نوناری، چوک سرور شہید سے لکھتے ہیں "جون کا شمارہ 3 تاریخ کو ملا۔ سرورق میں دورِ ماضی کا ہلکا سا عکس نظر آیا۔ مسندِ صدارت پر اعجاز احمد راحیل جلوہ افروز تھے۔ تبصرہ پڑھ کر ان کی قابلیت کے معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ الفاظ کا چناؤ، جملوں کا استعمال اور ان میں ترتیب کسی منجھے ہوئے تبصرہ نگار کی خاصیت ظاہر کر رہی تھی۔ چشمہ بیراج سے ساگر لکوکر کا دھیما دھیما انداز گہری کاٹ لیے ہوئے تھا۔ مظہر سلیم ہاشمی کی دوبارہ آمد خوش آئند رہی۔ طاہرہ گلزار، زویا اعجاز اور بلقیس خان نے عمدہ تبصرے تحریر کیے۔ اپنے دوست محمد زبیر حسنین کو پہلا تبصرہ شائع ہونے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں پر۔ سونا چاندی، احمد اقبال کی پڑھ کر عرصے بعد چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ کہانی میں صائمہ کا کردار بہت پسند آیا۔ سیجا کا آخری حصہ بہت سے راز افشاں کر گیا۔ اس قسط نے سابقہ دو قسطوں کی تلافی کر دی۔ کہانی کے اینڈ نے رلا دیا۔ آوارہ گرد میں لئیق شاہ اور زہر بانو کا ماضی اختتام کو پہنچا اور شہزی فل ایکشن میں نظر آیا۔ اول خیر کو بیگم صاحب کی طرف سے کڑی سزا ملی اور شاید اب شہزاد بھی بیگم ولا سے دور رہے۔ آخر میں لگتا ہے شوکی کو گولی لگی ہے۔ صحیح صورتِ حال اگلے ماہ معلوم ہوگی۔ رنگوں میں انوار صدیقی چھا گئے۔ کاشف زبیر بھی لازوال تحریر لائے۔ مختصر کہانیوں میں چہرہ شناس مریم کے خان، شکار، سلیم انور اور خونِ ناحق، بابر نعیم بے حد پسند آئیں۔ اگلے مہینے کے شمارے کا شدت سے انتظار رہے گا۔"

ساہیوال سے محسن علی طاب کی حاضری "جاسوسی ساہیوال میں 10 جون کو ملا۔ تبصرہ حاضرِ خدمت۔ ٹائٹل شمارے کے حساب و کتاب سے موزوں تھا کیونکہ جب شمارہ پڑھا تو ٹائٹل معقول لگا۔ پہلے شربت فولاد سے جان بنائی۔ پھر جلدی سے نکتہ چینی پر آ پہنچے۔ ساہیوال سے اعجاز احمد کی دستک پڑھ کر واقعی گیلی گیلی محسوس ہوئی۔ طاہرہ جی نے بال کی کھال اتاری سب کو اچھی اچھی سنائی۔ جانِ جاناں جی ویلکم۔ انعام حاصل کرنے والوں کو مبارکاں۔ مسیحا محی الدین نواب نے کہانی کا اینڈ ایسا کیا کہ ہم رنجیدہ ہو گئے۔ آوارہ گرد اگر شمارے کی مسحور کر دینے والی تحریر نہ کہیں تو ناانصافی ہوگی۔ بے شک اس کہانی کو انعام ملنا چاہیے۔ اس نے عوام کی آنکھوں پر بندھی پٹی اتارنے کی اپنی سی کوشش کی۔ لہو رنگ کی کچھ سمجھ نہیں آئی کہانی کہیں جا رہی ہے لکھا کچھ اور ہے۔ خواب سراب فرہاد کا کردار پسند آیا۔ اس نے اینڈ پر سرپرائز دیا۔"

میانوالی سے احسان سحر کی سحر انگیزی "ٹائٹل کا جائزہ لیا۔ پھول کی پتیوں سا نرم و نازک خوشبودار وجود لیے صنفِ نازک نے ساری سستی پل میں دور کر دی۔ بھاگتا گھوڑا اور کانٹوں کی یاد ہمیں انتباہ کرتے نظر آئے کہ آگے آنا خطرناک ہے، اپنی حدود میں رہو۔ ہم جیسے بے چارے لوگ دور ہی سے نظارہ کر کے دل کو اطمینان دلاتے رہے کہ آئے گا ایک دن اچھا وقت بھی..... گھبرانا نہ اے دلِ ناداں۔ خطوط کی محفل میں دل کا کھویا ہوا قرار بحال کرنے آ پہنچے۔ پیارے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ کچھ حسد رکھنے والے بھی موجود تھے۔ خیر چھوڑیں۔ طاہرہ گلزار کی آمد گویا بہار کی آمد کے مصداق اچھی لگی۔ بلقیس خان آپ کے بھائیوں کا سن کر جو دکھ ہمیں ہوا اس کا اظہار الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہر دم دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومین کے درجات بلند فرمائے اور آپ اور آپ کی فیملی ممبرز کو ذہنی سکون عطا فرمائے، آمین۔ زویا اعجاز کا بھی اچھا تبصرہ رہا۔ میں جاسوسی کے توسط سے رضوان تنولی کو جاسوسی میں خوش آمدید کہوں گا۔ کہانیوں پر تبصرہ ہو جائے تو سب سے پہلے احمد اقبال کی بزدل سیریز سے اسٹارٹ لیا۔ ابتدا سے ہی قہقہوں کی برسات نے ذہن و دل کو جکڑ کر ساری کوفت پل میں دور کر دی۔ خوشی کی جتنی پُراسرار انداز سے گمشدگی ہوئی اتنی ہی آسانی سے بازیابی بھی ہوگئی۔ کوئی پاپڑ نہیں بیلنے پڑے۔ ہلکے پھلکے اور مسکراتے انداز کی اچھی کاوش رہی۔ ہم تو خوشبو میں خود کو بھگونے کے عادی ہیں اور خوشبو آج کے دور میں مشکل سے ملتی ہے۔ خوشبو (محبت) جو

من میں اتر جائے۔ پہلا رنگ، بہت ہی خوب صورت کہانی رہی۔ حساس رشتوں کی حامل۔ اور یہ رشتے غلط فہمیوں، حرص وہوس اور لالچ کی نذر ہو کر بہت دور چلے گئے ایک دوسرے سے۔ بیٹا ماں کا نہ رہا۔ باپ بیٹے کا نہ رہا۔ بڑوں کی کرنی بچوں کو بھگتنی پڑی۔ خوب صورت الفاظ اور تلخ سچائی کا حامل رنگ ابھار رہا، ویلڈن۔ خوابوں کے پیچھے بھاگنے والے سرابوں کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہمیں دوسرے رنگ میں پڑھنے کو ملا۔ ایسے اونچے خواب جب ذہن میں پیدا ہو جائیں تو انسان انہی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے تو ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ منصور اور زویا کی لالچی فطرت نے ایک کی جان لی۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی۔ بچتا کوئی بھی نہیں برے کام کر کے۔ آوارہ گرد، ماضی سے نکل کر حال کی طرف بڑھتی ہوئی یہ قسط پھر سے اپنے ڈگر پر گامزن ہے۔ اسپیکٹرم کے ناپاک منصوبے اور بہت کچھ ظاہر ہونا ابھی باقی ہے جس سے کافی دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ خونِ ناحق، کر برا ہو گا برا۔ الفریڈ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ خونِ ناحق کبھی چھپتا نہیں۔ نہ بہانے والا بھی چھپا ہے اور نہ سزا سے بچا ہے۔ مسیحا بھی آخر اختتام کو پہنچی۔ آخری حصہ کافی طویل اور دلچسپی سے بھرپور رہا۔ اچھائی زندہ رہی اور لالچ و بدی اختتام کو پہنچی۔ خونی تصویر، تجسس سے بھرپور شاہکار کوشش تھی۔ جیلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انسان ہمیشہ برے ہی کام کرتا آیا ہے۔ جن میں قتل کرنا بھی شامل ہے۔ بعض سچ ہمیشہ تاخیر سے ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ اس وقت کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا ہے، دوسری وصیت میں بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ عورت کی عورت سے جیلسی ازل سے ابد تک رہے گی، چاہے بہن کے روپ میں یا..... اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی ہمیشہ ضرورت نہیں رہتی انسان کا کردار بھی اسے بلند کرتا ہے اور ہم پاکستانی لوگ کتنے بلند اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں یہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔''

مظفر آباد، آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی باتیں ''ٹائٹل خوب صورت اور جاسوسی کے عین مطابق تھا۔ چیں نکتہ چینی میں اداریے سے مستفید ہوتے ہوئے خطوط پر نظر دوڑائی۔ اعجاز احمد راحیل کو براجمان پایا۔ ان کی گیلی گیلی تحریر بہترین ثابت ہوئی۔ اعجاز بھائی نیک خواہشات اور دعا دینے پر شکر گزار ہوں۔ مرتضیٰ احتشام، زویا اعجاز، بلقیس خان، عبدالجبار رومی کے تبصرے بہت پسند آئے۔ مظہر سلیم ہاشمی کی واپسی بھی بہت اچھی رہی۔ میں تمام احباب کا جنہوں نے میری امی جان کی مغفرت کی دعا کی اور مجھے یاد رکھا، تہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔ جنہوں نے مجھ ناچیز کو اپنے الفاظ میں جگہ دی۔ سب سے پہلے آوارہ گرد کا مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے مشکور ہیں جنہوں نے اتنی اچھی تحریر کو ہمارے لیے سجایا۔ بیگم صاحبہ اور لئیق شاہ کی داستان کا اختتام ہوا۔ اب اول خیر کی داستان کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ یہ قسط ایکشن سے بھرپور رہی جو کہ حقیقتاً پسند آئی۔ لہو رنگ، انوار صدیقی کی تحریر بھی بہترین ثابت ہوئی۔ برجیس ناز کے حالات پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ بے چاری ساری زندگی دکھ اٹھاتی رہی اور آخر کار موت کو گلے لگا لیا۔ یتنی اور ساجد کا رشتہ چونکا دینے والا ثابت ہوا۔ البتہ اس کہانی میں احتشام احمد کی موت کا کوئی واضح ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ کہانی کی منظر نگاری اور کرداروں سے پورا پورا انصاف اور بہترین اتار چڑھاؤ، مزہ آ گیا پڑھ کے۔ خواب سراب، میں کاشف زبیر صاحب نے قلم کا حق ادا کر دیا۔ جاگتی آنکھوں کے خواب واقعی سچ ثابت نہیں ہوتے۔ نگل کا کردار بہت جاندار تھا۔ اتنی نڈر اور دلیر لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہیں ملتی۔ فرہاد گو کہ جاہل اور اجڈ آدمی تھا پر دل کا بہت اچھا ثابت ہوا۔ مجموعی طور پر دونوں سرورق بہترین رہے۔ سونا چاندی میں، احمد اقبال صاب نے بزدل سے ملاقات کرائی۔ کافی عرصے بعد ملے، سو یہ ملاقات یادگار ثابت ہوئی۔ پُر مزاح جملے اور بزدل، صائمہ کی نوک جھوک لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتی چلی گئی۔ ہنستی مسکراتی یہ تحریر بہت پسند آئی۔ مختصر کہانیوں میں، خونِ ناحق، بیوٹی، دوسری وصیت بہت پسند آئیں۔''

معراج محبوب عباسی کی خبریں ہری پور ہزارہ سے ''بات کرتے ہیں کچھ جاسوسی ماہ جون کے سرورق کی تو وہ کھوپڑی در کھوپڑی بنا ہوا نظر آیا۔ لڑکی نہایت معصوم تھی جبکہ صنفِ مخالف کے دماغ میں شیطانی چال جس کی غمازی کارنر میں موجود گھوڑا کر رہا تھا۔ اس لیے ڈاکر انکل نے درمیان میں کانٹے دار باڑ لگانا ضروری سمجھا۔ اب پیشِ خدمت ہے... نکتہ چینی فیشن' آپ تک پہنچانے کے لیے تعاون کیا ہے جاسوسی ڈائجسٹ نے، فیشن میں آپ کو خبر دیں گے کہ اس مرتبہ جاسوسی میں فہرست کو نئے اور منفرد انداز میں پیش کیا گیا۔ ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل ماضی میں کھوئے نظر آئے۔ راحیل صاحب! میری اور نکتہ چینی کی پوری ٹیم کی طرف سے مبارک باد۔ اس کے علاوہ ہماری بلیٹن ٹیم، کراچی سے ابن شمشاد، خانیوال سے صفدر معاویہ، راولپنڈی سے عرفان راجہ۔ جھنگ سے مرتضیٰ احتشام، پشاور سے طاہرہ گلزار، عبدالجبار رومی انصاری لاہوری بھی بے حد مشکور ہے کہ انہوں نے خبر نامہ پسند کر کے نکتہ چینی نیوز کی ریٹنگ میں زبردست قسم کا اضافہ کیا۔ پشاور سے طاہرہ گلزار صاحبہ! سرکاری چینل کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ مرتضیٰ احتشام صاحب جوائن نہیں کیا اللہ نے دے دیا ہے وہ بھی چھپر پھاڑ کر۔ میرا مطلب ہے چھپر پھاڑ آفر۔ خبروں کو بلیٹن کا حصہ بناتے رہیں گے یہاں پیش ہے نکتہ چینی خوش خبر جس کے لیے تعاون کیا ہے طاہر جاوید مغل نے جبکہ شریک اسپانسر ہیں محی الدین نواب۔ جاسوسی کے اولین صفحات پر طنز و مزاح کے طوفانِ بادو باراں کے ساتھ رومانس کی ہلکی پھلکی ژالہ باری بھی دیکھنے کو ملی۔ دوسری جانب مسیحا کے صفحات پر بوریت کی گرم لو چلتی رہی۔ اس کے علاوہ آوارہ گرد کے ایکشن چمن میں ہر سو بہار دیکھنے کو ملی اور سنسنی خیزی کی موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ اسی موسم نے ہی بابر نعیم کو نیا آئیڈیا دیا اور انہوں نے خونِ ناحق نامی شاہکار اختصاریہ جاسوسی قارئین کے لیے پیش کیا اور اس میں بھی الفریڈ کی گرفتاری کا موجب یہی بے ایمان موسم بنا۔ اگر بارش نہ ہوتی تو الفریڈ کا منزل سے فاصلہ دو گام بھی نہیں تھا مگر آہ ٹوٹی کہاں اس بے چارے کی کمند۔ سلیم انور کی شکار میں شکار کون تھا اور شکاری کون اور شکار کس نے کیا اور کس کو کرنا تھا اس ''کون'' اور ''کس'' میں دماغ اس بری طرح الجھا کہ ہمارے نیوز ڈیسک کو بھی اس خبر کی سمجھ نہیں آ سکی۔ ہاں اس میں جو بات ہے وہ یہ کہ کہانی شروع ہوتے ہی ایک لاش دریافت ہوئی اور کہانی کے آخر میں لاش دریافت کرنے والے کو بھی لاش میں بدل دیا گیا۔ تاکہ اگر اس کہانی کا سیکوئل یعنی شکار ٹو بنے تو اسٹارٹ میں لاش موجود ہو۔ سرورق کے دونوں رنگ اس مرتبہ معروف قلم کاروں کے قلم سے تحریر کردہ تھے مگر کچھ نجی معروفیات کے باعث ہمارا نیوز ڈیسک ان کے متعلق مستند خبر تیار نہیں کر رہا اس لیے مصنفین سے دلی معذرت۔ خبروں کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے اگلے نیوز بلیٹن تک اجازت۔''

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی سرخوشی ''پورا سال توجہ، لگن اور ایمانداری سے کی گئی محنت کا صلہ ملا ہے کہ یکم جولائی کو میں اٹھائیس سال کا

قرار دے دیا گیا ہوں۔ حالانکہ پچھلے سال ہی میں ستائیس کا تھا۔ (واقعی میں یہ تو کمال ہے) تمام تر معروفیات کے باوجود جاسوسی ڈائجسٹ اس دفعہ جون کی سات تاریخ کو خریدنے کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ سرورق پر تبصرہ عموماً نہیں کرتا مگر اس دفعہ خزاں رسیدہ مرد کی سوچ کا گھوڑا دوڑتا ہوا دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے فن کا معترف ہونا پڑا۔ یہ موجود کانٹے یقیناً دوشیزۂ سرورق کی زباں سے جھڑے ہوں گے، ماشاء اللہ۔ کیا حقیقت کے قریب سرورق سجایا گیا ہے اس دفعہ۔ اس کے بعد بلاتوقف چٹنی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ اپنے ساہیوال والے بھائی وال جناب اعجاز احمد راحیل کا ابتدائی تبصرہ دیکھ کر خوشی سے آنسو میں آنکھوں آ گئے (ضرورتِ ہیچ مدارد)۔ بہت جامع اور مکمل تبصرہ تھا۔ خانیوال سے برادر محمد صفدر کے تبصرے میں ادارے نے بہت اچھی وضاحت کر دی کہ مصنف کی ہر کہانی شاہکار نہیں ہوتی اور ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں مگر آپ بھی اس حقیقت کو دیکھیں کہ مصنف کی ہر کہانی ''دیوتا'' بھی نہیں ہونی چاہیے۔ محبِ وطن پاکستانی کا تبصرہ بہت خوب اور حب الوطنی سے لبریز تھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ نے میرے متعلق عجیب بات کی ہے ورنہ لوگ تو سمجھتے ہیں میں نے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ جمایا ہوا ہے اللہ بخشے فرہاد علی تیمور کی طرح۔ ڈیرہ مراد جمالی سے زبیر حسین شیخ اور ضلع دیر سے اعظم خان کی پہلی دفعہ شرکت پر خوش آمدید۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان صاحبہ کا سوگوار تبصرہ ملاحظہ کیا۔ آپ کے گزشتہ تبصرے میں آپ کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات نے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ الفاظ اور تسلیاں حق ادا نہیں کر سکتیں نہ کوئی تعزیت جو قیامت آپ پر گزری ہے۔ مگر صبر و رضا ہی انسان کا اختیار ہے اور تاخیر کے لیے انتہائی معذرت۔ اس کے علاوہ عبدالجبار رومی، عرفان راجا اور زویا اعجاز کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو پہلی دفعہ قسط وار ناول چھوڑ کر کاشف زبیر صاحب کے دوسرے رنگ کا مطالعہ کیا۔ کہانی اچھی تھی اور کاشف زبیر صاحب کا روایتی انداز... لیکن اتنی اچھی نہیں تھی جیسی ہم توقع کر رہے تھے۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کی سونا چاندی بہت جاندار کہانی رہی۔ انجام گو کہ بہت ہی غیر متعلقہ سا محسوس ہوا کیونکہ سونا چاندی اچانک ٹپک پڑے تھے کہانی میں مگر ساری کہانی میں ظرافت بدرجہ اتم موجود تھی۔ سکندر علیم کی مختصر کہانی خود کردہ مزہ دے گئی۔ سراغ رسی کی چھوٹی سی داستان۔ کہانی کا نام اور پھر ایلس کا کیرول سے اتنا آسانی سے تعاون اور تمام جزئیات کا تفصیل سے بیان کرنا ہی اسے مشکوک کر گیا تھا کہ یہ خود ساختہ ڈکیتی ہے اور ایلس ہی اس میں ملوث ہے۔ عمدہ کاوش تھی۔ سب سے آخر میں عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد کا مطالعہ کیا۔ صد شکر کہ کہانی در کہانی سے بات نکل کر اصل کہانی تک پہنچی۔ اسپیکٹرم اور پاور کی رسا کشی میں بلیو تکسی بھی شامل حال ہو گئی۔ اب یہ جنگ کافی اوپر کی سطح پر لڑی جانے والی ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ امید ہے بھٹی صاحب اس کا ٹیمپو اور معیار برقرار رکھیں گے۔ مسیحا کی آخری قسط نے بھی خوب لطف دیا۔ جی میں نے کہانی پڑھنے کا نہیں کہا صرف ''آخری قسط'' لکھا پڑھ کے ہی لطف آ گیا کیونکہ اب اس کی جگہ اگلے ماہ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے جاسوسی کی زینت بن رہی ہے۔''

چارسدہ سے مسٹر جانِ جاناں کا اظہار ''اس چلچلاتی دھوپ میں جاسوسی کا ملنا کسی نرم چھاؤں اور ٹھنڈے شربت سے کم نہیں۔ سو ہم بھی جاسوسی کو ہاتھ میں لینے کے بعد ایسے پُرسکون ہو گئے جیسے کہ...... باقی کی تشبیہات آپ خود ڈھونڈ لیں۔ سرورق پر ایک البیلی حسینہ اپنے گلابی ہونٹوں، ستواں ناک اور نشیلی آنکھوں سے کسی جانب محوِ تماشا تھی جبکہ اس کے گرد خاردار تار کی موجودگی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ شجرِ ممنوعہ ہے لیکن دلِ ناداں بھلا کب ان زنجیروں سے گھبرانے والا ہے کہ میں آدم زادہ ہوں مجھ کو بہک جانے کی عادت ہے۔ سو ان دیدہ و نادیدہ زنجیروں کی پروا نہ کرتے ہوئے ہم نے اپنا چہرہ، مذکورہ خاتون کے عین کان کے درمیان گھسیڑ دیا۔ بہرحال کچھ سن گن لینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دماغ کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے کے باوجود محترمہ کی سنجیدگی کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ سکی سو آسان کام کرتے ہوئے صفحات پلٹ دیے۔ چٹنی نکتہ چینی میں اعجاز احمد کی کیلی کیلی تحریر مزہ دے گئی۔ تبصرہ واقعی جاندار تھا۔ ابن شمشاد! ہمارے لیڈروں کو ہمارے خون کا چسکا لگ چکا ہے۔ ساگر لوکرا! ہمیں آپ سے اتفاق ہے۔ یہ منطق ہماری بھی سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔ عرفان راجہ بھی بجلی اور مہنگائی کا رونا روتے رہے۔ مظہر سلیم ہاشمی کو دوبارہ خوش آمدید! محبِ وطن پاکستانی کی رائے ہمارے بھی دل کی آواز ہے اگر انگریزی کہانیوں کے بجائے دیسی کہانیاں شامل کی جائیں تو بہت ہی اچھا ہوگا، ایسی کہانیاں پڑھتے ہوئے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ البتہ ابتدائی صفحات پر کسی مشہور مصنف کی ترجمہ شدہ کہانی ہو تو مزہ دوبالا ہو جائے گا لیکن ساتھ ہی مصنف کا نام اور کہانی کا اصل نام بھی ہونا چاہیے۔ تبصروں میں اپنا تبصرہ دیکھ کر حوصلہ بڑھ گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے احمد اقبال کی سونا چاندی پڑھی، اقبال صاحب کی کہانیوں کو تبصروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ کہانی زبردست تھی۔ لگتا ہے اب عنقریب بزدل صاحب! مزید بزدل ہونے والے ہیں یعنی کہ شادی کے بندھن میں بندھنے والے ہیں۔ سونا چاندی کے بعد بھٹی صاحب کی آوارہ گرد پڑھی، انتہائی شاندار کہانی لکھی ہے بھٹی صاحب نے۔ شہزاد احمد خان کے جوہر روز بروز کھلتے جا رہے ہیں لیکن ساتھ ہی دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی خواب سراب، بھی زبردست تھی۔ رل اپنی بے وقوفی کی بدولت جان سے ہاتھ دھو بیٹھی جبکہ گل اپنی قسمت سے موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی۔ باقی کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ پورے شمارے میں بس دو تین کہانیاں ہی اچھی تھیں اور آخر میں ایک گزارش۔ براہ کرم اقلیم علیم سے کوئی کہانی لکھوائیں۔''

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی وضاحت ''رسالہ تو 4 تاریخ ہی کو مل گیا تھا۔ خطوط کی محفل میں اپنا نام دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی ورنہ میرے 3 خطوط شائع نہ ہونے پر میں بددل ہو کر بیٹھ گیا تھا کہ شاید نواب صاحب کی بے سروپا کہانی مسیحا پر میری شدید تنقید آپ کے ادارے کو بری لگی اور میرے خطوط کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ میں آپ کے رسائل کا کئی دہائیوں سے قاری ہوں اور برسوں ممالک غیر میں بھی طویل مسافت طے کر کے انتہائی مہنگے داموں خریدتا رہا۔ بہرحال آپ کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا ہوں کہ قصور ڈاک خانے والوں کا تھا۔ اس ماہ میرے ہم شہری شاہ جی اور بھائی ہمایوں سعید بھی غائب تھے اور میرے ہی شہر کی ایک نئی لکھن والی (شاید روشی خان) بھی ایک جھلک دکھلا کر غائب ہیں۔ ماہا ایمان تو ایک قصہ پارینہ بن چکیں۔ البتہ بی بی طاہرہ گلزار، زویا اعجاز، بلقیس خان، صفدر معاویہ، اعجاز راحیل، ساگر لوکرا ابھی تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس ماہ کی بہترین کہانی سونا چاندی رہی

کہ کافی عرصے بعد بزدل اور صائمہ کی پُر لطف کہانی پڑھنے کو ملی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں فلمی انداز لیے ہوئے تھیں۔ بدیسی ادب میں مریم خان کی چہرہ شناس رہی۔ نواب صاحب کی مسیحا کے اختتام پر سکھ کا سانس لیا کہ اب تو ہر قاری ہی اس کی مخالفت کر رہا تھا۔ طاہر مغل صاحب کی انگارے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ بھٹی صاحب کی آوارہ گرد ابھی پڑھ نہیں سکا۔''

پشاور سے طاہرہ گلزار کی آمد'' آج صبح صبح یعنی 5 جون کو بجٹ کے دن یہ خوش خبری ایک جاسوسی پڑھنے والے دوست غلام یٰسین نے کہا کہ جاسوسی کے 10 انعام پانے والوں میں آپ شامل ہو۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انعام چاہے 10 روپے کا ہو یا 1000 روپے کا ہو خوشی صرف ملنے کی ہوتی ہے قیمت کی نہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ جاسوسی کا وہی معیار بنا رہے جو 20 سال پہلے تھا۔ جاسوسی کا سرورق ایک زبردست سبق دینے والا ہے۔ اگر کوئی گہرائی سے سوچے کہ کوئی کتنے عقل کے گھوڑے دوڑائے مگر مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں لیکن صرف ایک آدم اور ایک حوا کی صورت میں۔ یہ دو دو یا تین، چار شادیاں صرف مردوں کی عیاشی اور کمزوری ہے۔ اس لیے تو مجھے مردوں سے نفرت ہے۔ ہاں ان مردوں کی عزت کرتی ہوں جو صرف اور صرف اپنی ایک بیوی کے ساتھ خوش و خرم اور عزت و احترام کے ساتھ رہتے ہوں۔ آخر منتیں کر کر کے انکل کو بھی اعجاز احمد راحیل پر رحم آہی گیا اور اس کو پہلے نمبر پر لے ہی آئے، مبارکاں۔ آخر کیا کریں رسم دنیا ہے۔ کراچی کے بھائی ادریس احمد خان کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ محمد یوسف سانول کی پہلی کاوش اور اتنی زبردست، ارے بھائی نواب انکل کو تو ہم بھی سمجھا سمجھا کے تھک گئے کہ فرشتے انسان نہیں بن سکتے مگر کیا کریں بڑے ہیں نا۔ بھائی صفدر معاویہ بھی تنقیدی تنقیدی سے نظر آئے۔ راولپنڈی سے بھائی عرفان راجہ عوام کی تکلیفوں میں گوڈے گوڈے غرق نظر آئے، نادر سیال جی ٹائٹل گرل نے بھی آپ کو گھاس نہیں ڈالی ہاہاہا۔ تبصرہ گزرے حال تھا، لگتا ہے کہ امتحان کی وجہ سے عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ تمام پرانے تبصرہ نگاروں سے درخواست ہے کہ پلیز واپس آئیں اور وہی رونقِ جاسوسی بڑھائیں۔ بابر عباس، تنفیر عباس بابر، آغا فرید احمد خان آف سکھر، جاوید بلوچ آف علی پور، قدرت اللہ نیازی، قیصر اقبال، ماہا ایمان، ہمایوں سعید، سعدیہ بخاری، شیر علی خان، قمر حق، این ایس آر مدثر اینڈ میر اسویٹ سا دوست رضوان تنولی...... اب کہانیوں میں تھوڑا سا ہم بھی کھو جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون کیا گدڑی لعل چھپا کے لایا ہے۔ شروع کے صفحات سے ہی احمد اقبال صاحب کی تحریر سونا چاندی پڑھ کے ہنس ہنس کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ دل خوش کر دیا احمد اقبال صاحب ویلڈن۔ بابر نعیم کی مختصر تحریر خونِ ناحق واقعی مجرم کبھی بھی قانون اور قانونِ قدرت سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ چلو جی آخر مسیحا بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ سلیم انور کی مختصر مغربی تحریر شکار اچھی رہی۔ آوارہ گرد بھٹی صاحب کی زبردست تحریر۔ آخر کار میڈم کی دردناک داستان ختم ہوئی۔ اور شہزی کا ایکشن شروع، آخر میں شوکت ظالم ڈپٹی روشن خان کے ظلم کا نشانہ بنا۔ زورِ قلم اور تیز ہو بھٹی صاحب۔ سرورق کی دوسری کہانی خواب سراب میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی تحریر، کیا جادو ہے ان کے قلم میں، صفیہ اور فرہاد کی بے جا نفرت نے رمل کی جان لی اور گل مرتے مرتے بچی۔ صفیہ کو عقل تب آئی جب خود اللہ کے عذاب کینسر میں مبتلا ہوئی۔ ویلڈن کاشی بھائی زورِ قلم اور تیز ہو۔ انوار صدیقی کی تحریر لہو رنگ بہت زبردست موضوع والی کہانی لیکن مصنف نے بہت جلدی میں دی اینڈ کر کے کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔''

ناظم آباد کراچی سے محمد ادریس خان کی شمولیت'' مورخہ 6 جون کو ماہ نامہ جاسوسی کا دیدار ہوا۔ جون کی گرمی میں فرحت کا احساس ہوا۔ سرورق بھی خوب سے خوب تر تھا۔ نازنین وبال پہنے ہوئے مرد اور ایک گھوڑے کو دکھایا گیا اور خاردار تار نظر آ رہا تھا۔ رنگ بھی دیدہ زیب تھے۔ اداریہ بھی حسبِ حال تھا اور خطوط کی محفل میں اعجاز احمد راحیل سرفہرست نظر آ رہے تھے، مبارکباد قبول کریں۔ بہت شکریہ کہ تبصرہ پسند آیا۔ برادر عبدالجبار رومی کا بھی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ کچھ لوگ بہار کے مانند آتے ہیں اور اپنا جلوہ دکھا کر چلے جاتے ہیں اور یادوں کے دیے روشن کر جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ابتدائی کہانی پر تبصرہ احمد اقبال کی سونا چاندی دلچسپ تحریر تھی۔ خونی تصویر نے بھی اچھا تاثر پیش کیا۔ خونِ ناحق میں خون خود ہی گواہ بن گیا۔ دوسری وصیت بھی اچھی تحریر تھی۔ رہی مسیحا تو تکلف برطرف کہ صرف پہلی قسط ہی پڑھ سکے، اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بصد شکر کہ اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ امید ہے انگارے بہترین ثابت ہوگی۔ بے چینی سے انتظار رہے گا۔ خود کردہ بھی اچھی کہانی تھی کہ ایلس نے اپنے ہی اسٹور میں چوری کی مگر ایک چھوٹی سی بات نظر انداز کر دی نتیجتاً پکڑی گئی۔ آوارہ گرد تسلسل کے ساتھ بے حد دلچسپی لیے جاری و ساری ہے اور ایک ہی نشست میں پڑھی جانے والی کہانی ہے اور قسط کے آخری حصے میں تجسس کا زیادہ احساس دلا دیتی ہے۔ بیوٹی میں برناڈیٹ کی چالاکی اور فریب کے باوجود اس کو اس کے جرم کی سزا ملی۔ سرورق کی کہانی لہو رنگ حسبِ سابق بہترین تھی اور دوسری کہانی خواب سراب بھی بہترین سے بہترین تھی، کترنوں نے بھی مزہ دیا۔''

علی پور سے ہارٹ کیچر کے نادر خیالات'' نامعلوم مہینے میں اپنا دھڑکتا تبصرہ دیکھ کر باوجود لوڈشیڈنگ کے 6 کم 20 طبق روشن ہو گئے پھر دوبارہ بہ زبانِ قلم ہم کلام ہونے کا حوصلہ نہ ہوا۔ انکل جان کے بقول ہمارے پاس وقت بہت ہے مگر بقول ہمارے، ہمارے پاس وقت نہیں۔ سرمایہ محبت ہے، انکل جان فرماتے ہیں ہمارے خیالات مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں جبکہ ہم سمجھ میں نہیں دل میں آتے ہیں چاہے دردِ دل دستک سے نہ کھلے تو ہم دلدار کے دل کا در توڑ کر تختِ دل پر فروکش ہو جاتے ہیں۔ بالآخر ڈے بہ ڈے (دن بہ دن) کا انتظار جاسوسی ختم ہوا۔ آسمان سے آبی موتیوں کی ٹپ ٹپ تھی اور حالتِ صوم میں 15 شعبان المعظم کو پچ کم فقفی پانچ میں ہمارے نام ہوا۔ ماہ جون کی مس جاسوسی کی آنکھوں کے جام میں آنسوؤں کی مے...... یعنی

## سانحۂ ارتحال

6 رمضان المبارک کو ادارے کے دیرینہ کارکن محمد اختر بیگ کے چھوٹے بھائی محمد حیات بیگ علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جاملے۔ ادارہ مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

موسم خوشگوار حسن جنت سوگوار فہرست میں انوار صدیقی کو دیکھ کر دیرینہ تمنا پوری ہوئی اس کے بعد بزم محبتاں پر چشم چاہ ڈالی تو سرفہرست، ساہیوال کے ہوائی اعجاز کو بیٹھے پایا۔ موصوف کے خطوں میں کچھ اور ہو نہ ہو البتہ آہ آہ ضرور ہوتی ہے۔ رمشا عرفان لیجیے محی الدین نواب کا مسیحا تمام ہوا۔ اب تو آپ کی مُنڈ میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔ میڈم ماہرین ناز آپ کی زبان ہمیشہ کی طرح نامبارک ٹھہری اور ایک بار پھر ہم سرمٹے سے ہو کے آ گئے۔ جویریہ علی آوارہ گرد بہت ڈبل زبردست کہانی ہے خوامخواہ کسی کی محنت پر واٹر پھیر کر دل شکن خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔ طاہرہ گلزار تو معلوم کریں نا...... شکیل کاظمی کو اتنی لمبی پٹی آخر کس نے پڑھائی ہے۔ واؤ اینڈ ویلڈن شہنشاہ ذہانت سر محی الدین نواب ٹاپک چاہے کتنا ہی ناقابلِ یقین والو کھا کیوں نہ ہو آپ دلائل کے چابک سے ناقدین ادب سے منوا کر ہی دم لیتے ہیں کہ بالآخر وہ اپنا گو گلو سامنہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ ہمیں گوہر جوہر شناس معراج رسول کی دریافت پر فخر ہے آپ صرف جے ڈی پی کا ہی نہیں بلکہ سرزمین پاکستان کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ مسیحا کی آخری قسط پڑھ کر ذہن میں تمام انگڑائیاں بھرتے سوالوں کا مدلل جواب مل گیا۔ احمد اقبال جی اف کیا پیچیدہ طرزِ تحریر ہے آپ کی قسم سے دل، دماغ کی وال ہی بنا ڈالتے ہیں۔ عقلِ اقبال کے کیا ہی کہنے سونا چاندی ماہ جون شمارے کی زینت رہی۔ خونی تصویر اور ہیوٹی قدرے عام کہانی ثابت ہوئیں اور خاص کہانیوں کو عام کہانیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے اگر عام کہانیاں نہ ہوتیں تو خاص کہانیاں بھی عام ہو کر رہ جاتیں۔ سرورق کے دونوں رنگ اپنا اپنا رنگ جمانے میں کامیاب رہے۔''

محمد مرتضیٰ احتشام جھنگ سٹی سے لکھتے ہیں ''3 جون 2015ء کی شام بک شاپ سے جاسوسی ڈائجسٹ خریدا اور گھر لے آئے۔ ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ آدمی کے دماغ والی جگہ پر گھوڑے کو دوڑتے ہوئے موجود پایا اور حسینہ اپنی پلکوں پہ رت جگوں کے نشان لیے باڑ کے اس پار کسی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی۔ اداریہ پڑھا زمبابوے کرکٹ ٹیم کا تہ دل سے شکریہ کہ انہوں نے ہمارے بے رونق اور ویران میدانوں کو رونق بخشی۔ اعجاز احمد راحیل فرام ساہیوال کا تبصرہ شاندار تھا۔ ابن شمشاد فرام کراچی جس دن ہمارے لیڈر اس بات کو سمجھ گئے حالات بہتری کی طرف آ جائیں گے۔ محمد یوسف ساتول بھائی چینی نکتہ چینی میں آپ کو خوش آمدید۔ محمد صفدر معاویہ بھائی آپ کی بات سو فیصد درست ہے مگر تنقید کرنا ہمارا حق ہے۔ زبیر حسین شیخ پہلا خط شائع ہونے پر مبارک ہو۔ رمشا عرفان آپ بھی عقل مند ہیں۔ عرفان راجہ لوڈشیڈنگ کے تو ہم بھی ستائے ہوئے ہیں۔ اپنا خط دیکھا تو حیرانی ہوئی کہ اتنی زیادہ قینچی چلائی گئی (چلانی پڑتی ہے ورنہ آپ لوگوں کے خطوط کی طوالت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ صرف تین چار خط چھاپے جا سکیں) مظہر سلیم آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کی کہانیاں ادارے کے معیار پر پوری اتریں گی۔ طاہرہ گلزار جی آپ کا تبصرہ بڑا شوخ مگر جاندار ہوتا ہے۔ نادر سیال بھائی اللہ تعالیٰ آپ کو جلد سے جلد رہائی دے، آمین۔ مرحا گل کبھی خط شائع نہ ہو تو نو پرابلم آپ باقاعدگی سے خط لکھا کریں۔ اعظم خان فرام دیر آپ کی سوئی بالکل ٹھیک جگہ پر اٹکی ہے۔ بلقیس خان آپ امید رکھیں انشاء اللہ ماہا ایمان آپ کے دکھ بانٹنے ضرور آئیں گی۔ عبدالجبار رومی انصاری ہمارے اندر تو دوستی اور محبت کی پوری قوسِ قزح بھری پڑی ہے۔ آپ کو صرف گلابی رنگ نظر آیا۔ اس کے بعد کہانیوں کی جانب بڑھے۔ سونا چاندی احمد اقبال ابتدائی صفحات پر بہت اچھی کہانی لے کر آئے اور اینڈ پر تو سونا جیسے ڈاکو کا کردار درویشہ اور اس کی بیوی چاندی کا حسن سلوک دل کو بھا گیا۔ خونی تصویر میں تحریر ریاض صاحب نے بڑی عمدگی سے آرلین کی اداکاری اور فنکاری کو پیش کیا۔ اچھی کہانی تھی۔ خونِ ناحق بابر نعیم صاحب کی مختصر مگر عبرت اثر داستان تھی۔ آخر کار مسیحا اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ محی الدین معاشرتی رویوں اور برائیوں پر مبنی کوئی کاٹ دار کہانی ضرور لے کے آئیں گے۔ سکندر علیم کی خود کردہ کہانی میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ لالچ کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ مریم کے خان صاحب کی چہرہ شناس پڑھ کے کسی کی چہرہ شناسی یاد آ گئی۔ بہرحال آخر کار جان جیسا سفاک اور بے رحم مجرم اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ شکار کہانی بے مقصدی لگی۔ اس کے بعد آوارہ گرد کی جانب اپنے قدم بڑھائے۔ لئیق شاہ کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ یہ کہانی آہستہ آہستہ بین الاقوامی رخ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ہیوٹی کہانی میں ایس انوار نے 20 سال پرانے قتل کا بڑی کامیابی سے سراغ لگا لیا۔ سرورق کا پہلا رنگ لہو رنگ شروعات تو بہت اچھی تھیں لیکن اینڈ متاثر کرنے میں بالکل ناکام رہا۔''

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی دل سوزی ''5 جون کی پُر بہار شام جب مارگلہ سے آتی بھیگی ہواؤں نے جون کی گرمی کو مارچ اور اپریل کے موسم میں بدل ڈالا پھر بوندا باندی شروع ہوگئی تو ایسے سہانے موسم میں اپنا پیارا جاسوسی ملا۔ محفل میں حاضر ہوئے تو اعجاز احمد راحیل کا نام جگمگا رہا تھا۔ اب تک ان کے تین عدد خط سسپنس والے کو ملا کر پڑھ چکی ہوں۔ دراصل پہلے خطوط پڑھتی ہی نہیں تھی اور اب شوق پیدا ہوا تو کچھ مخصوص تبصرے ہی پڑھتی تھی۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ اعجاز احمد تو حساس اور وفا شعاروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جو اَب نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ بہت خوب۔ بے حد جاندار تحریر ہے آپ کی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی الجھنیں دور کرے۔ نادر سیال، آپ کی آنکھوں کا نمکین پانی سید حادل پر گرا ہے اور دل داغ دار میں ایک اور داغ کا اضافہ ہوا ہے، کیوں، کب اور کیسے جیل میں ہو۔ بتایا ہی نہیں۔ اچھی سوچ اور اچھے دل کا مالک ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قید و بند میں بھی قلم اور کتاب سے رشتہ رکھا ہے۔ کاش، میرے بھائی، میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی۔ طاہرہ گلزار! ہمایوں سعید تو پہلے ہی خود پسندی کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ آپ نے بانس پر چڑھا دیا۔ اب کون اتارے گا اسے؟ شوکت شہریار! آپ کا ذکر خیر بھول گئی تھی۔ پٹھان ہوں نا، دوسرے منیر نیازی سے بھی کوئی رشتہ بنتا ہے جبھی تو ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں۔ باقی رہی سپرہٹ کے روکھے پھیکے ہونے کی بات تو جب ہم جیسے محفل میں آتے ہیں نا تو سپرہٹ ''سٹ'' ہو جاتے ہیں۔ یہ انگریزی والا Sit نہیں ہے اس کو چک 36 کی پنجابی والا سٹ پڑھا جائے عام پنجابی میں اسے سَٹ کہتے ہیں۔ ابن شمشاد، ساگر نکو کر، محب وطن، صفدر معاویہ، رومی، ساتول اور طاہرہ کے تبصرے خوب تھے، مظہر سلیم ہاشم، نادر سیال، عرفان راجہ، اعظم خان اور مرتضیٰ احتشام کے خط بھی عمدہ تھے۔ مرحا گل، ہمدردی کا شکریہ، طویل انتظار سے پہلے آپ کی سن لی گئی، انعام کی حق دار ہوئیں مبارک ہو۔ حسبِ معمول آوارہ گرد سب سے پہلے پڑھی، لئیق شاہ کی دلدوز داستان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ

رہی، اس دفعہ قسط بے جان تھی۔ محی الدین نواب کی مسیحا لاعلاج مریض ثابت ہوئی۔ ہلالہ اور بنت فاطمہ کے ساتھ بہت برا کیا گیا۔ آخری رنگ پہلے نمبر پر رہا۔ کاشف زبیر کی خواب سراب فکر انگیز تحریر ہے ان لڑکیوں کے لیے جو شوبز کی چکاچوند سے متاثر ہو کر اپنی اور خاندان کی عزت خاک میں ملا دیتی ہیں۔ عادل شریف آدمی تھا مگر بیوی کو اتنی ڈھیل دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ ان مردوں سے باز پرس کی جائے گی جو اپنی عورتوں کو بے لگام چھوڑتے ہیں۔ انوار صدیقی کی لہو رنگ نے آخر تک الجھائے رکھا۔ احتشام رشتوں کو پامال کرنے والا بدکار شخص تھا، برجیس برابر کی ذمے دار ایسی عورت جو ایک گناہ کو چھپانے کے لیے مسلسل گناہ کرتی ہے اور پھر دونوں ہی حرام موت مرتے ہیں۔"

سرگودھا سے اسد عباس کی درخواست "خلافِ توقع جاسوسی اس بار 4 تاریخ کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل والے صاحب حسینہ کو ترچھی نظر سے گھورتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سب سے پہلے خطوط کی محفل پر نظر ڈالی۔ ساہیوال سے اعجاز احمد صاحب اس بار اول تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ لمبے عرصے بعد پرانے تبصرہ نگار مظہر سلیم ہاشمی بھی محفل میں نظر آئے۔ ویلکم جناب! زیادہ تر تبصروں میں نواب صاحب کی مسیحا کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ شاید لوگ بھول گئے ہیں کہ یہ وہی نواب صاحب ہیں جنہوں نے دیوتا جیسا شاہکار ناول لکھا تھا۔ میرے خیال میں دیوتا میں مسیحا سے زیادہ ماورائی چیزیں شامل تھیں لیکن افسوس آج ہم نے یہ وتیرہ بنالیا ہے کہ اگر کوئی سینئر تبصرہ نگار کسی اسٹوری پر تنقید کرتا ہے تو ہم بھی اس اسٹوری پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بہرحال اگر کچھ لوگوں کو مسیحا پسند نہیں آئی تو وہ رائٹر کو ہٹ کرنا بند کردیں۔ تنقید اگر مثبت انداز میں کی جائے تو وہ اصلاح کا سبب بنتی ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، پہلے صفحات پر احمد اقبال بزدل میاں کے ہمراہ موجود تھے۔ کہانی میں بزدل اور توپ صاحب کے مکالمے بہت محظوظ کرتے ہیں۔ کہانی کا انجام توقع کے برعکس تھا۔ خونی تصویر میں ڈیوڈ صاحب نے کس چالاکی سے ہاکس کو اپنی راہ سے ہٹادیا۔ خونِ ناحق، مختصر مگر پُراثر۔ الفریڈ بھائی کو قتل کرنے کے بعد بھی پھانسی کے پھندے سے بچ نہیں سکا۔ دوسری وصیت کو پڑھنے کے لیے دماغ پر بہت زیادہ زور دینا پڑا۔ خودکردہ، مس ایلس نے پلان تو بہت اچھا بنایا تھا تاہم اپنی ہی غلطی سے پھنس گئی۔ بیوٹی اس ماہ انگریزی تراجم میں ٹاپ پر رہی۔ جونز نے چٹکی بجاتے ہی 20 سال پرانا کیس حل کرڈالا۔ خلافِ توقع برناڈیٹ قاتل ثابت ہوئی۔ پتا نہیں انگریز جاسوس اتنے چالاک کیوں ہوتے ہیں۔ (چالاک نہیں ذہین کہیں) سرورق کے رنگوں میں انوار صدیقی صاحب پہلے رنگ کے ساتھ حاضر تھے۔ کہانیاں کا موضوع اچھا تھا، تاہم احتشام احمد کا قتل معما ہی رہا۔ خواب سراب، کاشف زبیر اس بار اپنے قلم کا جادو نہ چلاسکے۔ کہانی کا ٹاپک بہت پرانا تھا۔ اس موضوع پر وہ سیکڑوں کہانیاں لکھ چکے ہیں جناب کچھ تبدیلی لائیے۔ عوام تبدیلی چاہتی ہے۔" (بھیج دیں)

مرحا گل کی حاضری ورابن کلاں سے "اس بار سرورق قیامت خیز تھا۔ نشیلی آنکھوں والی حسینہ کو ایسا کرنٹ لگا کہ گردن دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی اور اس میں نکلتا ہوا شخص جس کے ناپاک عزائم گھوڑے نے عین آنکھ کے اوپر پاؤں رکھ کر مٹی میں ملا دیے جس سے وہ کچھ جتاتی ہوئی نظروں، طنزیہ مسکراہٹ لے کر رہ گیا اور حسینہ کی بالی فاتحانہ عزائم کے ساتھ کھڑی رہی۔ جلد ہی محفل میں پہنچ کر دم لیا۔ ذرا وکھری ٹائپ کے تھے آخر سے اپنا نام دیکھنا شروع کیا تھا خطوط میں کہ اپنا نام قرعہ اندازی کی زینت بنا جگمگا رہا تھا۔ یقین نہ آیا۔ سب سے پہلے آوارہ گرد کو رونق بخشی جس کا انعام اس صورت میں ملا کہ بیگم صاحبہ کی داستان ختم ہوئی شکر خدا کا۔ ہمیں تو جون والی قسط سے پتا چل گیا تھا کہ شہزی لئیق شاہ کا بھائی ہے۔ بچھڑا ہوا بھائی۔ شاید دوسرے قارئین کو پتا نہیں چلا ہے۔ خود شہزی کو بھی نہیں ہے۔ حالانکہ لاکٹ اور تصویر والی بات سے ساری بات پتا چل گئی حالانکہ عبدالرب بھٹی صاحب کو اتنی جلدی لاکٹ والی بات منظرِ عام پر نہیں لانی چاہیے تھی۔ اول خیر کی سزا پر کافی دکھ ہوا۔ کہانی میں میرا فیورٹ کردار اول خیر ہے اس کے دم سے کہانی میں رونق ہے۔ مسیحا کو بالکل نظرانداز کردیا۔ چہرہ شناس میں اس طرح کھوئے کہ گرمی کا احساس نہ ہوا۔ مریم کے خان کی لکھی کہانی ہو اور ہمیں پسند نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا سو بیسٹ رہی۔ انور صدیقی کا رنگ لہو رنگ اف کیا بات تھی اس کہانی میں جیسے کشکول دوبارہ آگئی ہو ساجد تو پورے کا پورا شیخ حامد تھا وہی حقارت، وہی انداز سب کچھ ویسا ہی تھا عنبرین دوسری شبنم تھی برجیس کی طرح روبی انسپکٹر سراج بس کیا بتائیں، نہایت شاندار اسٹوری تھی۔ مزہ دوبالا کرگئی۔ دوسرا رنگ کوئی خاص تاثر نہ دے سکا۔ اس ماہ انور صدیقی نے میلا لوٹ لیا۔ احمد اقبال میرے فیورٹ ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ پہلے صفحہ پر صائمہ بزدل مزہ دے گئے۔"

لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی توصیف "دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں۔ ٹائٹل گرل کی آنکھوں میں کرب نظر آیا مگر ساتھ کھڑے اعجاز احمد راحیل نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ مبارک باد جناب۔ یار آپ کی یادوں والی بات سے میں متفق ہوں۔ اداریے میں انگارے کی خوشی ایسی لگی جیسے حکومت نے سرکاری ملازمین کی تنخواہ میں سو فیصد اضافہ کردیا ہو۔ طاہرہ گلزار بھی اب بہت اچھے تبصرہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہوگئی ہیں۔ سجاد خان اور نادر سیال خدا آپ کو جلد از جلد رہائی دلوائے، آمین۔ زدیا اعجاز وہ سرخی مائل دانت والی خوفناک حسینہ آپ ہی تو تھیں۔ جانِ جاناں ویلکم، بلقیس خان کا تبصرہ جاندار تھا۔ محفل میں پرانے دوست نظر نہیں آئے۔ شاید سب کو گرمی لگ گئی ہے۔ (اللہ نہ کرے) سونا چاندی میں احمد اقبال نے یادگار کرداروں سے یادگار ملاقات کروادی۔ اس کو پہلا نمبر دیتا ہوں۔ آوارہ گرد میں ڈاکٹر بھٹی کا قلم جوبن پر ہے۔ زہرہ بانو کی داستان ختم ہوئی اور آوارہ گرد کی آوارہ گردی دوبارہ شروع ہوگئی ہے۔ بیگم صاحبہ نے اول خیر کو گروپ سے نکال دیا ہے مگر شہزی کی بات مان کر اس کی برتری کمپیل داوا کو دکھا دی۔ اسپیکٹرم اور پی ایس ایس کا مقابلہ دیکھنے کو بے چین ہوں۔ لہو رنگ کی تعریف تو دور کی بات اس پر تبصرہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہا۔ انکل بچ میں ایسی تحاریر ذہن کو بوجھل کردیتی ہیں۔ کاشف زبیر صاحب ہمیشہ کی طرح خواب سراب میں بھی چھائے رہے۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

محمد صفدر معاویہ، خانیوال۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ ابن شمشاد، کراچی۔ سعد عباس، ضلع اٹک۔ رضوان سلطان تنولی کریزوی، کراچی۔

طاہر جاوید مغل

# انگارے

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

ٹھہر
اثرورسو
روک سکیں
قدموں میں
سے نہیں
سطر رنگ

یہ نومبر کی ایک نہایت خوشگوار شام تھی۔ میرے وطن کی شام... میرے بچھڑے دیس کی شام۔ اس شام میں میری جنم بھومی کے سارے کھیتوں کھلیانوں اور پھلواریوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ گلی کوچے، بستیاں، دریا، پہاڑ، میدان اور سبزہ زار سب کی مہک اسی شام میں شامل تھی۔

ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی میں نے اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلائے۔ ایک بھرپور انگڑائی لی اور اس انگڑائی کے بعد ڈھیر ساری تازہ ہوا اپنے سینے میں بھرلی۔ میں ابھی ابھی ڈنمارک سے لاہور آنے والی فلائٹ سے اترا تھا اور مختلف مراحل سے گزر کر ائرپورٹ سے باہر آیا تھا۔ میں غالباً دس بارہ سال کا تھا جب آخری بار امی ابو کے ساتھ پاکستان آیا۔ اب میری عمر 23 سال تھی یعنی اپنے وطن کی زمین پر میرے قدم کم و بیش تیرہ سال بعد پڑے تھے۔

میں چچا کے گھر جا رہا تھا۔ یہ گھر دراصل ہمارا آبائی گھر بھی تھا۔ وہاں قدم قدم پر میرے بچپن کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ گھر لاہور سے پندرہ بیس میل دور ایک قصبے نما گاؤں میں واقع تھا۔ چچا کی بیٹی کی شادی تھی۔ پروگرام کے مطابق مجھے 14 نومبر کو لاہور پہنچنا تھا لیکن میں 12 نومبر کو ہی آگیا تھا۔ میں چچا اور ان کی فیملی کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ آج میری چچازاد فائزہ کی منگنی کی رسم تھی اور میں اس موقعے پر چچا کے گھر کی خوشیوں کو دوبالا کرنا چاہتا تھا۔

ائرپورٹ سے نکل کر میں سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ اردگرد موجود کئی خواتین و حضرات نے مجھے توجہ سے دیکھا۔ اس توجہ میں یقیناً پسندیدگی کی جھلک بھی موجود تھی۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ میں چھ فٹ قد کا ایک جاذب نظر نوجوان تھا۔ اکثر لوگ بالخصوص نوجوان خواتین میری شخصیت سے متاثر ہوتی تھیں۔ میں ایک چیمپئن ہوں۔ آپ مجھے یورپی چیمپئن بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کس چیز کا چیمپئن؟ فی الحال یہ جان لیجیے کہ میری فیلڈ کا تعلق مارشل آرٹ یعنی لڑائی مارکٹائی سے ہے۔ اپنے خالی ہاتھوں سے میں چار پانچ لڑاکو افراد کا بھرتا بہ آسانی بنا سکتا ہوں۔ پڑھنے والے سوچیں گے کہ اگر میں واقعی یورپی چیمپئن تھا تو پھر بہت سے لوگ مجھے شکل و صورت سے جانتے ہوں گے کیونکہ کھیل کسی بھی قسم کا ہو ہر جگہ دیکھا جاتا ہے لیکن ایک مشہور و معروف شخص ہونے کے باوجود مجھے صورت سے بہت کم لوگ پہچان پا رہے تھے۔ ایسا کیوں تھا اس کی وضاحت بھی میں جلد ہی کردوں گا۔

طویل عرصہ یورپ میں رہنے کے باوجود میری اردو بہت اچھی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے گھر میں ہمیشہ اردو ہی بولی اور پڑھی گئی۔ میں نے ٹیکسی والے سے اپنی منزل کا کرایہ طے کیا اور سوار ہوگیا۔ ٹیکسی لاہور کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ملتان روڈ پر آگئی اور پھر میرے آبائی گاؤں مرادپور کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں تیرہ برس بعد پاکستان آیا تھا۔ اس میں صرف ایک استثنا موجود ہے۔ قریباً ساڑھے تین سال پہلے بھی میں والدہ کے ساتھ صرف تین دن کے لیے پاکستان آیا تھا اور ایک شادی میں شرکت کی تھی لیکن وہ سب کچھ تو ایک دھندلے خیال کی طرح جیسے جاگی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہو مگر اب جو کچھ تھا وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ یہ دیسی شام کی دیسی خوشبو ہوا کے ساتھ میرے سینے میں داخل ہو رہی تھی اور رُوئیں رُوئیں میں سرایت کر رہی تھی۔ میں ہر چیز کو بے پناہ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ گاہے بگاہے میں ٹیکسی ڈرائیور سے مختلف سوالات بھی کر رہا تھا۔ جن کے دلچسپ جوابات مجھے مل رہے تھے۔ اس نے اپنا نام نثار بتایا تھا۔ کچھ چیزیں مجھے حیران بھی کر رہی تھیں، مثلاً ٹریفک کی بدنظمی، دھواں، انکروچ مینٹ، شور بہرحال یہ سب کچھ میرے وطن کا حصہ تھا اور یہ جیسا بھی تھا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ اب ہم لاہور سے باہر نکل کر ہائی وے پر محوِ سفر تھے۔ یہ ملتان روڈ سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ دونوں طرف کھیت تھے اور امرود، مالٹے وغیرہ کے باغات تھے۔ کہیں کہیں دکانوں اور گھروں کی روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ٹیکسی کی رفتار اب بڑھ گئی تھی۔ مناظر تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان ہی مناظر میں ایک ایسا منظر بھی میرے سامنے آنے والا ہے جو مجھے سرتاپا دہلا دے گا اور پاکستان میں میری یہ نہایت خوشگوار آمد ایک تکلیف دہ کیفیت میں ڈھل جائے گی۔

اچانک ہی مجھے لگا کہ ٹیکسی کی رفتار قدرے سست ہوگئی ہے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ یہ ایک موڑ تھا اور یہاں سڑک بھی کچھ خراب تھی۔ آگے جانے والی گاڑیاں سست روی سے گزر رہی تھیں مگر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔ یہاں کوئی حادثہ بھی ہوا تھا۔ میں نے ایک کار کی ہیڈ لائٹس میں دیکھا کہ سڑک پر کچھ شیشے بکھرے پڑے تھے۔ تب میری نگاہ سڑک کے نشیب میں واقع کھیتوں اور کچے راستے کی طرف گئی۔ میں ٹھٹک گیا۔ یہاں ایک موٹر سائیکل سوار خون میں لت پت پڑا تھا۔ یقیناً وہ بے ہوش تھا

مگر صاف پتا چلتا تھا کہ یہ حادثہ ابھی دو چار منٹ پہلے ہی ہوا ہے۔ گری ہوئی موٹر بائیک کی ہیڈ لائٹ ابھی تک روشن تھی اور پچھلا پہیہ بھی گھوم رہا تھا۔ سڑک پر چلنے والی گاڑیاں ناہموار سڑک پر اچھلتی کودتی گزرتی چلی جارہی تھیں۔ کوئی رکا نہیں، کسی نے زخمی کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس سب ایک ہراس آمیز جلدی میں نظر آتے تھے۔ ہماری ٹیکسی بھی جائے حادثہ کے پاس سے گزری۔ میں نے ڈرائیور کا کندھا جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کیا ہورہا ہے؟ اسے کوئی اٹھاتا کیوں نہیں؟''

ڈرائیور نے جلدی جلدی گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ ''جو اٹھائے گا مصیبت میں پڑ جائے گا۔ ابھی کوئی پولیس موبائل یا ایمبولینس آجائے گی، خود ہی اٹھالے گی۔''

''یار کیسی بات کررہے ہو، پتا نہیں موبائل یا ایمبولینس کب آئے گی؟ اس بے چارے کو تو فوری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کوئی کردے گا نا مدد باؤ جی۔'' ڈرائیور نے کہا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنے کی فکر میں تھا۔

میں نے کہا۔ ''کوئی اور کیوں؟ ہم کیوں نہیں، تم گاڑی روکو۔ ہم اسے دیکھتے ہیں۔''

ڈرائیور پریشان لہجے میں بولا۔ ''باؤ جی... لگتا ہے آپ پہلی بار پاکستان آئے ہیں۔ یہ یہاں کا رواج نہیں ہے۔ جو زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچاتا ہے عام طور پر وہی پھنستا ہے۔''

''یار! کیا بول رہے ہو، تم گاڑی روکو۔ میں کہتا ہوں گاڑی روکو۔'' میرے تحکمانہ لہجے نے درمیانی عمر کے ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے پر مجبور کردیا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور سڑک سے اتر کر نشیب کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ زخمی نوجوان تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے اس کا ہیلمٹ کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک ٹانگ ابھی تک موٹر بائیک کے نیچے پھنسی ہوئی تھی۔ موٹر بائیک کا پچھلا حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کسی گاڑی نے ٹکر ماری ہے۔ میں نے بائیک کا انجن بند کر کے بائیک کو اٹھایا اور دوسری طرف پھینکا۔ مضروب کی سفید شلوار لہو رنگ ہورہی تھی۔ وہ یکسر بے ہوش تھا۔ میں نے ٹیکسی کی طرف دیکھا وہ سڑک پر تھی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ مجبوراً کھڑا ہے۔ اگر اس نے مجھ سے پندرہ سو روپے کرایہ وصول نہ کرنا ہوتا تو کب کا جاچکا ہوتا۔ مجھے اس کے رویّے پر بے حد تعجب ہوا۔ میں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ پاکستان میں قانون کی عمل داری کا معیار وہ نہیں جو یورپی ممالک میں ہے اور اس حوالے سے لوگوں کے رویّے بھی قدرے مختلف ہیں لیکن جو کچھ میں یہاں جائے حادثہ پر دیکھ رہا تھا وہ ششدر کردینے والا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو آواز دی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ ہم نے کوشش کر کے زخمی کو اٹھایا اور اوپر سڑک تک لے آئے۔ اس دوران میں دو تین راہگیر اردگرد نظر آئے۔ انہوں نے زخمی کو ٹیکسی میں ڈالنے میں ہماری مدد کی۔ یہ دیہاتی ہی تھے۔ درمیانی عمر کے ایک تنومند شخص سے میں نے پوچھا کہ قریب ترین اسپتال کہاں ہے۔ اس نے ایک قریبی جگہ کا نام بتایا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جائیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔''

وہ پہلے تو ہچکچایا پھر حوصلہ کر کے ہمارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ میں نے پچھلی نشست پر بیٹھ کر زخمی کا سر اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ اس کے زخم سے بہنے والا خون میری پینٹ کو تربتر کررہا تھا۔ وہ بہت گہرے سانس لے رہا تھا۔ عمر یہی تیئس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ قبول صورت تھا۔ وہ کسی ماں کا بیٹا تھا، کسی بہن کا بھائی تھا اور ہوسکتا ہے کسی بیوی کا شوہر ہو۔ اس کے پیارے اس پر ٹوٹنے والی آفت سے بے خبر اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔

''جلدی چلو یار۔'' میں نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس نے رفتار کچھ اور تیز کردی۔ اس کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے خفا ہے لیکن وہ اس خفگی کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ موقع ہی ایسا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ گاڑی بھگائے چلا جارہا تھا۔ تقریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ نیم دیہی علاقے کا ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔ طبی سہولتیں بس گزارے لائق ہی تھیں۔ بہرحال عملے نے زخمی کو فوراً ایمرجنسی والے کمرے میں پہنچایا اور طبی امداد دینا شروع کردی۔ میں اور ڈرائیور برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھ آنے والا مددگار دیہاتی بھی پاس ہی موجود تھا۔ ڈرائیور نے مجھ سے ہولے سے کہا۔

''باؤ جی! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ شلوار قمیص والا ایک لیم شحیم ڈاکٹر ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''اس بندے کو آپ لے کر آئے ہیں یہاں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کی گاڑی سے زخمی ہوا ہے یہ؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ڈاکٹر، ہم گزر رہے تھے۔ یہ پہلے سے سڑک پر پڑا تھا۔''

ڈاکٹر نے مجھے سرتاپا گھورا پھر ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ تمہاری ٹیکسی ہے؟''

ٹیکسی ڈرائیور نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکٹر تنومند دیہاتی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں بھی ان کے ساتھ آیا ہوں جی۔'' دیہاتی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر بولا۔ ''آپ تینوں ابھی یہیں رہیں۔ زخمی کی حالت ٹھیک نہیں۔ ہم نے پولیس کو بلایا ہے۔ وہ آپ سے دو چار سوال کرے گی پھر آپ جا سکیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اگر ہمارا پولیس سے ملنا ضروری ہے تو پھر آپ انہیں ذرا جلدی بلالیں۔ مجھے ایمرجنسی میں کہیں پہنچنا ہے۔''

اس کا معنی خیز فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ ''ایمرجنسیاں ہی کام خراب کرتی ہیں۔'' کہیں اس کا یہ فقرہ ڈرائیور اور میری طرف تو اشارہ نہیں کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد پولیس پارٹی بھی پہنچ گئی۔ ان میں ایک فربہ اندام اے ایس آئی تھا۔ ساتھ میں ایک حوالدار ٹائپ شخص اور دو ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ بظاہر وہ میرے اور ڈرائیور نثار کے ساتھ عزت سے پیش آئے لیکن اس عزت کے پیچھے شکوک کے سائے بھی موجود تھے۔ اے ایس آئی نے مجھ سے تیکھے لہجے میں سوالات کیے۔ میں کہاں سے آیا تھا؟ کہاں جا رہا تھا؟ ہم نے زخمی کو کہاں دیکھا؟ اس کی موٹر بائیک کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہمارے ساتھ آنے والے.... راہگیر سے بھی دو چار سوال پوچھے۔

جس دوران میں اے ایس آئی ہم سے یہ سوالات کر رہا تھا، حوالدار اور ایک کانسٹیبل احاطے میں کھڑی ٹیکسی کا آگے پیچھے سے معائنہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور نثار سے کاغذات طلب کیے تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے ان کے حوالے کر دیے۔

اے ایس آئی اپنی ڈائری پر کچھ اندراجات وغیرہ کرنے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی اب آٹھ بجنے والے تھے۔ چچا کے گھر نو بجے کے قریب رسم منگنی تھی۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ''محترم! مجھے کہیں جلدی پہنچنا ہے۔ اگر آپ نے مجھ سے مزید کچھ پوچھنا ہو تو میں فون نمبر دے دیتا ہوں۔ آپ اس پر مجھ سے رابطہ کر لیجیے گا۔''

وہ ایک دم تلخ لہجے میں بولا۔ ''آپ ذرا بریک پر پاؤں رکھو۔ ابھی بڑے تھانیدار صاحب آ رہے ہیں۔ وہی فیصلہ کریں گے کہ تم دونوں کو جانا ہے یا رکنا ہے۔''

مجھے تاؤ آ گیا میں نے کہا۔ ''یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں۔ ہم مجرم نہیں ہیں۔ ہم نے ایک شہری کی مدد کی ہے اور ایسے وقت میں کی ہے جب کوئی دوسرا نہیں کر رہا تھا۔ ہم نے اسے اسپتال پہنچایا ہے۔ آپ نے جو کچھ ہم سے پوچھنا تھا، پوچھ لیا ہے۔ اب براہ مہربانی ہمیں جانے دیں۔''

اے ایس آئی نے ڈائری بند کر کے میز پر رکھی اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''نئے نئے آئے ہو نا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں نیا نیا آیا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ قانون کیا ہے۔''

''اور ہم تو یہاں آلو چھولے بیچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے؟'' اس نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''یہ آپ کس طرح بات کر رہے ہیں؟'' میں نے ذرا تنک کر کہا۔

''اچھا اب بات کرنا بھی مجھے آپ جناب سے سیکھنا پڑے گا؟'' وہ پھنکارا۔

ہمارے درمیان دو تین تلخ جملوں کا تبادلہ مزید ہوا۔ اسی دوران میں حوالدار اور کانسٹیبل ٹیکسی کا معائنہ کر کے اندر آ گئے۔ حوالدار نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''سر! تیسرا بندہ کہاں ہے؟''

تیسرے بندے سے اس کی مراد ہمارے ساتھ آنے والا دیہاتی تھا۔ وہ واقعی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پولیس والوں نے اسے احاطے میں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ موقع دیکھ کر نکل گیا تھا۔ اے ایس آئی کا پارا کچھ اور بھی چڑھا ہوا نظر آنے لگا۔ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے رمضان علی کہیں یہ دونوں بھی رفو چکر نہ ہو جائیں۔ ویسے بھی بڑی چھیتی ہے ان باؤ صاحب کو۔ ان کو ذرا اندر والے کمرے میں لے جاؤ اور آرام سے بٹھاؤ۔''

حوالدار توند مٹکاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کے

پیچھے لمبے تڑنگے کانسٹیبل چلے آرہے تھے۔ ڈرائیور کا رنگ بالکل زرد ہوگیا۔ حوالدار نے مجھے بازو سے تھاما اور بولا۔ ''باؤجی! چھیتی کا کام شیطان کا ہوندا ہے۔ آپ ذرا اندر چل کر تشریف رکھیں۔''

''پر کیوں؟''

اے ایس آئی پھنکارا۔ ''زخمی کا کوئی پتا نہیں کہ کب اللہ بیلی ہوجائے۔ وڈے تھانیدار صاحب کو تم دونوں سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔''

میں نے حوالدار کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم لوگوں کو بتایا ہے کہ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں اپنا فون نمبر، ایڈریس، شناختی کارڈ سب کچھ آپ لوگوں کو دے دیتا ہوں لیکن میں یہاں رک نہیں سکتا۔''

حوالدار نے بدتمیزی کے انداز میں کہا۔ ''رکیں گے تو اب آپ کے بڑے بھی۔ چلو اندر۔''

میں نے غصے سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا۔ ''ڈونٹ ٹچ می۔'' میرے منہ سے بے ساختہ جھلائی ہوئی آواز نکلی۔

وہ بولا۔ ''اس انگریزی کا ڈراوا کسی اور کو دینا باؤ۔ سیدھی طرح اندر چلو۔ نہیں تو بے عزتی ہوجائے گی۔''

''کیا کروگے تم؟'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

اے ایس آئی نے آگے بڑھ کر مجھے زور سے دھکا دیا۔ ''زبان مت چلاؤ، جو کہہ رہے ہیں وہ کرو۔''

اس نے دوسرا دھکا دیا تو میں دیوار سے جالگا۔ دماغ میں چنگاریاں سی بکھر گئیں لیکن میں جانتا تھا یہ میری کیٹیگری کے لوگ نہیں ہیں۔ میں کسی کو ایک ہاتھ بھی ماردیتا تو اس کے لیے اٹھنا محال ہوجاتا۔ میں نے خود پر ضبط کیا اور انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم اچھا نہیں کررہے ہو سب انسپکٹر، تمہیں اس کے لیے جواب دینا پڑے گا۔''

اے ایس آئی کی آنکھوں سے جیسے خون ٹپکنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی۔ ایک شال نے اس کے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا مگر یہ شال اس کے جسم اور دلکشی کو چھپانے میں تقریباً ناکام تھی۔ لڑکی کے گھنے بالوں کی کچھ لٹیں شال سے نکل کر اس کے حسین چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اور ڈرائیور کو دیکھ کر وہ سیدھا ہماری طرف آئی۔ جو کچھ اس نے کہا مجھے اس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑلیا اور مجھے جھنجوڑ کر بولی۔ ''تم نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ تم نے جان بوجھ کر مارا ہے اسے۔ تم کمینے... تم اسی کے آدمی ہو... وہ ہمیں برباد کردینا چاہتا ہے۔ ہمیں ماردینا چاہتا ہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی... اور ہوا تو جان دے دوں گی اپنی۔'' وہ ہیجانی انداز میں بولتی جارہی تھی۔

اے ایس آئی نے اسے بمشکل پیچھے ہٹایا۔ لڑکی نے لال بھبوکے چہرے کے ساتھ میری اور ڈرائیور... کی جانب تھوک دیا۔

پتا نہیں کیسا الاؤ بھڑک رہا تھا اس کے اندر۔ وہ شکل صورت سے تو ایسی نہیں لگتی تھی۔ وہ مسلسل جنونی انداز میں بولتی چلی جارہی تھی۔ دو نرسیں اسے سنبھال کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ وہاں سے اس کی روتی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ ''وہ کہاں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، پلیز مجھے اس کی شکل دکھادیں۔''

ایک نرس بولی۔ ''بی بی، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسے لاہور بھجوا رہے ہیں۔ ابھی ایمبولینس آجاتی ہے پھر اسے دیکھ لینا۔''

ڈرائیور کے ہونٹ بالکل خشک ہورہے تھے۔ وہ بار بار شکوہ کناں نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اب میرا دل بھی گواہی دینے لگا تھا کہ ہم راہ چلتے ایک سنگین چکر میں پھنس گئے ہیں۔ اگر واقعی مضروب کو کچھ ہوجاتا تو ہم شدید مشکل میں پڑسکتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم تھا ایکسیڈنٹ کی صورت میں تو فوراً ضمانت وغیرہ ہوجاتی ہے لیکن اگر یہ بات نکل آئے کہ جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی ہے تو پھر یہ نہایت سنگین کیس بنتا ہے۔

میں نے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ اس کا سانولا چہرہ جیسے اندرونی جوش سے تمتمانے لگا۔ حوالدار سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''یہ تو اور ہی چکر نکل آیا ہے بھئی۔''

حوالدار نے بھی مونچھوں کو تاؤ دے کر اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ''میں ایک... فون کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''ٹیلی فون بھی کروالیتے ہیں۔ ذرا چھری کے نیچے سانس تو لو لاٹ صاحب۔'' اس کے تیور اب ضرورت سے زیادہ خطرناک نظر آنے لگے تھے۔

''یا اللہ یہ کیا ہورہا ہے۔'' میں دل ہی دل میں پکارا۔

ڈرائیور بھی ہکا بکا نظر آرہا تھا۔ وہ زخمی کو جائے حادثے سے اٹھانے سے ڈر تو رہا تھا لیکن یہ توقع یقیناً اسے بھی نہیں تھی کہ صورتِ حال ایسا سنگین رخ اختیار کرلے گی۔

اس سے پہلے کہ اے ایس آئی ہمیں دوبارہ اندرونی کمرے میں بھیجنے کا حکم جاری کرتا، اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف اس کا کوئی افسر تھا۔ ''ہیلو سر! قادر بول رہا ہو... جی جی سر... روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ جی شک ہو رہا ہے کہ یہی لوگ بندے کو ٹکر مار کر یہاں لائے ہیں۔ ٹیکسی کے بمپر پر ڈینٹ بھی نظر آرہا ہے... جی سر... جی سر... ایک لڑکی بھی یہاں آئی ہے جی... وہ بھی کچھ واویلا کر رہی ہے۔ آپ یہاں آئیں تو پھر بات کھلے گی... او کے سر۔'' بات ختم کرنے کے بعد اے ایس آئی نے ایک بار پھر آتشیں نظروں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ''معاملہ کافی لمبا لگ رہا ہے باؤ جی اور اس کڑی کا کیا چکر ہے، اس کی بھی ابھی کچھ سمجھ نہیں آئی؟''

حوالدار نے مونچھوں کو تاؤ دے کر عام سے انداز میں کہا۔ ''دشمنی وغیرہ کا چکر ہے جی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں باؤ صیب اور ڈرائیور کی ساجھے داری ہو۔'' اس نے ساجھے داری پر زور دیا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''میں ابھی ابھی ڈنمارک سے آیا ہوں۔ آتے ساتھ ہی میں نے ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور سے ساجھے داری کر کے اس بندے کو ٹکر ماردی ہے اور پھر خود ہی اسے اٹھا کر یہاں بھی لے آیا ہوں... زبردست۔''

اے ایس آئی بولا۔ ''بندے کو یہاں لے آنا تمہیں بے گناہ ثابت نہیں کرتا ہے۔ موقعے پر اور لوگ بھی تو موجود تھے اور ان میں سے یہ دو تین بندے تمہارے ساتھ بھی آئے ہیں۔''

''کون سے دو تین بندے؟''

''جو اَب غائب ہوگئے ہیں۔'' اے ایس آئی نے اپنی ٹھوڑی کھجا کر کہا۔

''دو تین بندے نہیں تھے، وہ صرف ایک بندہ تھا اور اسے ہم خود اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ہمیں اسپتال کے راستے کا پتا نہیں تھا۔'' میں نے ترخ کر کہا۔

''یہ تو تم کہہ رہے ہو نا، سچ کیا ہے یہ ہمیں پتا ہے اور جو نہیں پتا وہ بھی چل جائے گا۔'' پھر وہ حوالدار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلو بھئی، ان دونوں کو بٹھاؤ گاڑی میں۔''

ڈرائیور نے گھگیا کر کہا۔ ''میں بالکل بے قصور ہوں سر جی۔ میرا اس بندے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میں تو ڈرائیور ہوں۔''

''اوئے چل باہر، گاڑی میں بیٹھ۔ تھانے جا کر تیرا سارا اگا پچھا پتا کر لیتے ہیں۔'' حوالدار نے خطرناک لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کو دھکا دیا۔

اس بے چارے کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑا کر دروازے کی دہلیز سے ٹکرایا اور اوندھے منہ گرا۔ اس کی ناک پر چوٹ لگی اور تیزی سے خون رسنا شروع ہوگیا۔ حوالدار نے اسے اوپر تلے کئی تھپڑ مارے۔ وہ دہشت زدہ انداز میں چلّانے لگا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر حوالدار کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس پر عملہ مشتعل ہوکر مجھ پر پل پڑا۔ مجھے ان سے ایسی لاقانونیت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ شاید میں نے جس طرح اے ایس آئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی تھیں وہ اس کے لیے رنج کا باعث بنی تھیں۔ میری گردن پر دو زوردار جھانپڑ پڑے پھر اے ایس آئی نے میرے پیٹ پر لات رسید کی۔ یکایک مجھ پر مکّوں اور ٹھوکروں کی بارش ہوگئی۔ غالباً وہ لوگ سمجھے ہوں گے کہ میں ابھی ڈرائیور کی طرح فرش پر گر کر رونا چلّانا شروع کر دوں گا۔ ان بے چاروں کو خبر نہیں تھی کہ یہ سب کچھ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں ایک پروفیشنل فائٹر تھا۔ میرا جسم اس سے کہیں زیادہ تکلیف جھیل سکتا تھا۔ دوسری طرف اگر میں ان پر جوابی وار کرتا تو شاید یہ لوگ چند سیکنڈ میں چوٹیں کھا کر تتر بتر ہوجاتے۔ بہرحال میں ایسا کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ شاید کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اپنے ساتھ جو وعدے لے کر یہاں آیا تھا وہ مجھے پابند کرتے تھے کہ میں ان پر جوابی حملہ نہ کروں۔

میری جیکٹ پھٹ گئی۔ نچلے ہونٹ سے بھی خون رسنے لگا۔ انہوں نے اپنے طور پر مجھے اچھی طرح ٹھیک کرلیا تو اے ایس آئی نے میرا پھٹا ہوا گریبان پکڑا اور باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے بولا۔ ''چل بیٹھ گاڑی میں۔ نہیں تو یہیں پر ننگا کر دوں گا۔ کوئی معافی نہیں پولیس پر ہاتھ اٹھانے والے کے لیے۔''

میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر ضبط کرتے ہوئے اے ایس آئی کی ہدایت پر عمل کیا۔ ڈرائیور مجھ سے پہلے ہی باہر نکل کر پولیس موبائل کی طرف جا چکا تھا وہ لوگ اسے مارتے ہوئے وہاں تک لے گئے تھے۔ مجھے بھی دھکے دیتے ہوئے پولیس موبائل کے اندر پہنچا دیا گیا۔ اردگرد کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے چکرا رہے تھے۔ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اتنی تیزی سے خراب ہوجائے گی۔ میں فی الحال اپنے اور اپنے چچا کی فیملی کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے

اپنی خاموشی اور بے عملی کو برقرار رکھا۔

''اوئے، ایسے ڈیلے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتا ہے، نیچی کر آنکھیں، نیچی کر۔'' حوالدار نے میرے بال پکڑ کر میرے سر کو جھٹکا دیا۔

میں نے ہونٹ سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو کچھ ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا۔ اس کے لیے تم لوگوں کو جواب دینا پڑے گا۔''

''اوئے دے لیں گے جواب بھی تجھ وڈے لاٹ صاب کو۔'' حوالدار نے زہر خند لہجے میں کہا اور مجھے ایک اور جھانپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن ایک ہیڈ کانسٹیبل نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

''جانے دو جی، کافی ہوگئی ہے۔'' اس نے اپنے حوالدار سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پولیس اسٹیشن میں تھے۔ یہ جگہ اپنی مثال آپ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہم ایک سرکاری دفتر میں نہیں کسی چودھری کے ڈیرے پر آگئے ہیں۔ احاطے میں بوہڑ کے ایک بڑے درخت کے نیچے ایک بہت بڑی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک جانب تین چار گھوڑے بندھے نظر آ رہے تھے۔ احاطے میں دستی نلکے کے قریب ایک بھوری بھینس بندھی ہوئی تھی اور ایک اہلکار غلط وقت پر بھونڈے طریقے سے اس کا دودھ دوہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً یہ بھینس کسی مقدمے میں ملوث ہو کر یہاں آئی تھی اور اب تھانے کے اہلکار مالک کے خرچے پر اس کا دودھ وغیرہ نوش کر رہے تھے۔ کافی بڑا تھانہ تھا۔ چھ سات کمرے ہوں گے۔ ایک بڑے کمرے میں بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا اور میز پر کاغذات وغیرہ بکھرے ہوئے تھے یقیناً یہی ایس ایچ او صاحب کا کمرا تھا لیکن وہ تھانے میں موجود نہیں تھے۔ مجھے اور ڈرائیور کو ایک غلیظ سے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ یہاں پہلے سے تین حوالاتی موجود تھے۔ ایک بے چارہ پرالی (چاول کی چھال) پر الٹا لیٹا تھا یقیناً اسے خوب مار لگائی گئی تھی اور وہ سیدھا لیٹنے کے قابل نہیں تھا۔

ڈرائیور کی حالت بری تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے جو کچھ ہوا ہے میری وجہ سے ہوا ہے لیکن تم اب تسلی رکھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں غریب بندہ ہوں جی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''رجسٹریشن ہے نا تمہارے پاس؟''

''ہاں جی پر میرا چالان ہوگیا تھا۔ چالان کی پرچی میں نے چھوٹے تھانیدار کو دے دی ہے۔''

''اور لائسنس؟''

''لائسنس بھی دے دیا ہے جی۔''

''پھر کوئی فکر نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اسی دوران میں ہمیں حوالات کی سلاخوں کے اندر سے احاطے میں روشنی دکھائی دی۔ یہ ڈرائیور نثار کی ٹیکسی تھی جواب اندر داخل ہو رہی تھی۔ اسے ایک ہیڈ کانسٹیبل چلا کر لایا تھا۔ ٹیکسی برآمدے کے قریب رک گئی۔ بلب کی روشنی میں، میں نے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ٹیکسی کا اگلا بمپر ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور سامنے والی جالی بھی مڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ سب کچھ پہلے تو نہیں تھا۔ غصے سے میرے جسم میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ خبیث اے ایس آئی نے اپنا کہا سچ ثابت کرنے کے لیے اور ہمیں مزید پھنسانے کے لیے ٹیکسی کو خود نقصان پہنچایا تھا۔ شکر ہے کہ ڈرائیور نے یہ سین نہیں دیکھا ورنہ وہ مزید دہشت زدہ ہو جاتا۔ اسے دیکھ کر تو پہلے ہی ایسا لگتا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ اب مجھے اپنے سامان کی فکر ہونے لگی۔ یہ کافی قیمتی سامان تھا اور ٹیکسی کی ڈکی میں پڑا تھا۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ہماری پولیس اپنے قبضے میں آنے والی اشیا کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ ان میں یقیناً جاندار اشیا بھی شامل تھیں۔ جیسے وہ بھینس، جس کے تھن سے بے ڈھنگے طریقے سے کھینچ کھینچ کر زبردستی اس کا دودھ نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔

ڈرائیور نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے کسی رشتے دار یا واقف کار کو فون کریں جی۔ نہیں تو یہاں ہمارا حال بہت برا ہو جانا ہے۔''

''فون کیسے ہوگا، تمہارا فون تو لے لیا ہے انہوں نے اور میرے پاس ہے ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہر کام روپے دے کر ہو جاتا ہے جی۔ آپ اس سنتری سے بات کرو۔ ابھی کوئی انتظام کر دے گا۔''

''بھئی مجھے تو یہاں کے طور طریقے پتا نہیں۔ نیا نیا آیا ہوں، تم ہی کوشش کر کے دیکھو۔''

ڈرائیور نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پھر بڑی عاجزی سے سنتری کو آوازیں دیں۔ ''سنتری جی... ذرا ایک منٹ بات سنو جی۔''

سنتری نے بالکل کان نہیں دھرے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ایسی داد فریاد ایسی جگہوں پر ہر وقت کا معمول

ہوتی ہے۔ اس لیے تھانے کا عملہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔

ڈرائیور۔۔۔ قریباً دس منٹ تک وقفے وقفے سے سنتری کو بلاتا رہا لیکن اس نے گھورنے اور بڑبڑانے کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ اس دوران میں کسی کمرے سے گاہے بگاہے کسی ملزم کے رونے چلّانے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ بالآخر سنتری نے ڈرائیور پر تھوڑا سا ترس کھایا اور بیزار سے انداز میں ہماری طرف آیا۔

''یہ کیا چاؤں چاؤں لگا رکھی ہے؟'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

ڈرائیور نے سلاخوں کے ساتھ منہ لگایا اور سنتری کے ساتھ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ ڈرائیور کا انداز بے حد التجا کا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور اپنے ہاتھ کی مٹھی میں کچھ لے کر میرے پاس آیا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ ایک بوسیدہ سا موبائل فون تھا۔ وہ مجھے لے کر حوالات کے ایک نسبتاً تاریک گوشے میں چلا گیا۔ لرزتی آواز میں بولا۔ ''لو جی، جلدی سے کر لو فون جس کو کرنا ہے لیکن آواز ذرا نیچی ہی رکھنا۔''

میں یہاں بالکل تووارد تھا۔ چچا کے سوا کس کو فون کر سکتا تھا مگر چچا کے گھر اس وقت منگنی کی رسم چل رہی تھی۔ مجھے بالکل مناسب نہیں لگا کہ میں اس وقت اس مصیبت کی اطلاع انہیں دوں پھر میری نظر برآمدے کے وال کلاک پر پڑی۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ دیہات اور قصبات میں یہ وقت سونے کا ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا چچا کے گھر بھی تقریب ختم ہو چکی ہو۔ میں نے چچا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف چار پانچ دفعہ بیل ہوئی پھر چچا کی بھاری آواز ابھری۔ ''کون؟''

''چچا! میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔''

''ہاں شاہ زیب پتر، کیا حال ہے؟ کب پہنچ رہے ہو پاکستان؟''

میں نے کہا۔ ''چچا! میں پاکستان پہنچ گیا ہوں اور یہاں پہنچتے ہی ایک۔۔۔ چھوٹی سی مشکل ہو گئی ہے میرے ساتھ۔''

''کک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ میں سمجھا نہیں؟''

میں نے مختصر الفاظ میں چچا کو بتایا کہ میرے ساتھ یہاں کیا اور کس طرح ہوا ہے۔ چچا ہکابکا سے سن رہے تھے جب اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ کال ملانے کی کوشش کی۔ نیٹ ورک میں خرابی آرہی تھی۔ کال نہیں مل رہی تھی۔ نثار نے میرے ہاتھ سے فون سیٹ لیا اور خود نمبر ملانے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ کوشش کامیاب رہی لیکن آواز اب بھی صاف نہیں آئی۔

نثار ہیلو ہیلو کر رہا تھا جب اچانک ایک گرج دار آواز نے ہمارے کانوں کے پردے پھاڑ دیے۔ ''اوئے۔۔۔ یہ کیا کر رہا ہے تو؟''

نثار سرتاپا لرز گیا۔ اس نے سہم کر آہنی سلاخوں کی طرف دیکھا بلکہ ہم دونوں کی نظر ایک ساتھ ہی سلاخوں پر پڑی۔ وہاں ہمیں ایک ہٹا کٹا پولیس افسر نظر آیا۔ اس کے جبڑے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ سخت گیر چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہی اس تھانے کا ایس ایچ او ہے اور اسپتال میں اے ایس آئی قادر نے اسی سے بات کی تھی۔ یہ شخص نہ جانے کب خاموشی سے یہاں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے نثار کو فون پر ہیلو ہیلو کرتے دیکھ لیا تھا اور اب سخت طیش میں نظر آتا تھا۔

بہرحال چند سیکنڈ بعد جب وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے میں طیش کے بجائے تحمل نظر آیا۔ اس نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اِدھر لاؤ یہ فون۔''

نثار آگے بڑھا اور لرزتے ہاتھ کے ساتھ فون سیٹ ایس ایچ او کی طرف بڑھا دیا۔ اب حوالدار رمضان اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر قادر بھی ایس ایچ او کے پیچھے آکر مؤدب کھڑے ہو گئے تھے۔

ایس ایچ او نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔ ''جناب کی تلاشی نہیں لی گئی تھی؟''

''لی تھی جناب، کہیں نیفے شیفے میں چھپا رکھا ہوگا۔''

ڈرائیور نے کانپ کر کہا۔ ''نہیں سر جی۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے۔۔۔''

''کیا میں، میں کر رہا ہے؟'' سب انسپکٹر گرجا۔

''وہ جی۔۔۔ میں نے۔۔۔ ذرا سنتری صاحب کی منت کی تھی۔ ضروری بات کرنی تھی۔'' نثار نے ایک طرف کھڑے سنتری کی طرف اشارہ کیا۔

دبلا پتلا سنتری فوراً مکر گیا کہ اس نے کوئی موبائل دیا ہے۔ الٹا وہ غصہ دکھانے لگا کہ اس پر الزام لگایا جا رہا ہے۔

اس دوران میں لمبا تڑنگا ایس ایچ او حوالات کا دروازہ کھلوا کر اندر آ گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے نرم لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی ضروری بات کرنی ہی تھی تو سب انسپکٹر سے کہتے، وہ آپ کو لینڈ لائن پر کال کروا دیتا۔ میرے تھانے میں اس طرح کا گھپلا ہو، میں کبھی برداشت نہیں کرتا۔ آئندہ آپ کو احتیاط کرنا ہوگی۔''

"جی سر... جی سر۔" نثار ہکلایا۔ وہ ایس ایچ او کے شائستہ لہجے پر قدرے متحیر بھی نظر آ رہا تھا۔

"اب آپ ذرا... مرغا بن جایئے۔" ایس ایچ او نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور نثار کا رنگ فق ہوگیا۔ میں بھی ہکا بکا رہ گیا۔

ایس ایچ او دوبارہ بولا۔ "جناب نے سنا نہیں، میں نے عرض کیا ہے کہ مرغا بن جایئے۔"

ڈرائیور نثار ایک دم ایس ایچ او کے پاؤں پر گر پڑا۔ "مجھے معاف کردیجیے جی۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اپنے بچوں کے صدقے مجھے..." اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ایس ایچ او نے وہ کیا جس کی توقع ہمیں ہرگز نہیں تھی۔ کم از کم مجھے اور نثار کو تو بالکل بھی نہیں تھی۔ اس نے نثار کی شلوار کے نیفے پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اس کی شلوار نیچے گرادی۔ اہلکار نثار پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے۔ وہ گر گیا۔ لمبی قمیص کی وجہ سے وہ مکمل برہنہ ہونے سے بچ گیا تھا لیکن اس کی مکمل ستر پوشی بھی نہیں رہی تھی۔ وہ دوہائی دے رہا تھا۔

"خدا کے لیے معاف کردو، خدا کے لیے۔"

میں اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ انسانیت کی یہ تذلیل میری برداشت سے باہر تھی۔ مزید تکلیف کی بات یہ تھی کہ اس تذلیل کی کوئی بڑی وجہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ جھیلنا چاہا لیکن جھیل نہیں سکا۔ میں جھپٹ پڑا۔ میں نے نثار کو اہلکاروں کی بے رحم ضربوں سے بچانے کی کوشش کی۔ میں اس پر گر پڑا۔ میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ اس کے جسم پر آنے والی تمام چوٹیں میں نے اپنے جسم پر لیں۔ چوٹیں ہر طرف سے لگ رہی تھیں۔

"پیچھے ہٹ جاؤ... پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں دہاڑا لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔

میں ان لوگوں پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ اگر میں نے ہاتھ اٹھایا تو ان کو کاری ضربیں آئیں گی اور ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ایک آدھ کا کام ہی تمام ہوجائے۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں۔ وہ اپنے حریف کی طاقت سے ناواقف تھے۔

دھینگا مشتی کے دوران میں نثار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی شلوار پاؤں سے نکل چکی تھی۔ تاہم لمبی قمیص نے اسے گھٹنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اسے اپنے جسم کی آڑ فراہم کرتا ہوا حوالات کے دروازے کی طرف آ گیا۔ مجھے تھانے دار کے ہاتھ میں اس کا سرکاری پستول نظر آ رہا ہے۔ اس نے پستول کا دستہ پورے زور سے نثار کے سر پر مارا۔ دوسرا وار وہ غالباً مجھ پر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ یہ کافی شدید دھکا تھا اور شاید تھانے دار کو اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ وہ اڑتا ہوا سا دیوار سے ٹکرایا اور کھانے کے برتنوں پر جا گرا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوگئی۔ اے ایس آئی نے بھی پستول نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آ جاتا ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے، رک جاؤ۔"

اس آواز نے جادو کا سا کام کیا۔ نہ صرف اے ایس آئی ٹھٹک گیا بلکہ مجھے اندھا دھند مارنے والے بھی بدک گئے اور ہاتھ روک لیے۔ میں نے نثار کو بدستور اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے رکھا تھا۔ وہ بے چارہ سر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے نیم بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کا پورا چہرہ خون سے رنگین نظر آنے لگا تھا۔

حوالات سے باہر چھریرے جسم والا ایک دراز قد پولیس افسر کھڑا تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا وہ ایس پی تھا۔ وہ درمیانی عمر کا نوجوان تھا اور اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔

"یہ کیا تماشا ہے قیصر چودھری؟" اس نے نثار کے پھٹے ہوئے سر کو دیکھ کر بارعب لہجے میں پوچھا۔

"تماشا آپ کے سامنے ہی ہے جی۔" تھانے دار نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ میرا دھکا کھا کر وہ کھانے کے برتنوں پر گرا تھا اور شاید اسٹیل کے جگ کا کنارہ اس کی ٹھوڑی پر لگا تھا۔ یہاں کٹ آنے کی وجہ سے خون رسنے لگا تھا۔

اب عملے کے دو چار مزید افراد لاک اپ کے اندر آگئے تھے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا اور گھسیٹ کر آہنی سلاخوں کے ساتھ لگا دیا۔ ایک بنے کٹے پولیس والے نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی لگائی اور ہتھکڑی کا دوسرا سرا آہنی سلاخوں سے منسلک کردیا۔ میرا پہلے سے زخمی ہونٹ مزید زخمی ہوچکا تھا اور چہرے پر مزید چوٹیں بھی آئی تھیں۔

تھانے دار نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایس پی کو مخاطب کیا۔ "سر! یہ خطرناک شخص ہے۔ اس نے حوالات سے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ مجھ پر حملہ کیا ہے۔ پستول چھیننا چاہ رہا تھا مجھ سے۔"

"یہ غلط ہے جناب! ایسا کچھ نہیں ہوا یہاں۔" میں نے کہا۔ "میں اور یہ ٹیکسی ڈرائیور بے قصور ہیں۔ ہمارا گناہ صرف اتنا ہے کہ ہم ایک بے ہوش زخمی کو اٹھا کر اسپتال لائے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو شاید وہ وہیں پڑا پڑا مر جاتا۔"

"یہ بکواس کر رہا ہے سر۔" تھانے دار نے ہانپتے لہجے میں کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے حاجی نذیر صاحب کی بیٹی اسپتال پہنچی تھی۔ اس نے چلا چلا کر کہا ہے کہ ان لوگوں نے لڑکے کو جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے۔ اسے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔"

ایس پی نے کہا۔ "چلو، اس بات کا فیصلہ تو عدالت میں ہو جائے گا لیکن یہاں لاک اپ میں جو کچھ ہوا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

تھانے دار نے ایک کپڑے سے اپنی خون آلود ٹھوڑی پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس کے ذمے دار بھی یہی لوگ ہیں۔ اگر پسٹل میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو یہاں باقاعدہ پولیس مقابلہ ہو جاتا تھا۔" اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے مجھے دو زوردار تھپڑ مارے اور میرا گریبان پھاڑ دیا۔ اس موقعے پر ایس پی تیزی سے آگے آیا اور اس نے تھانے دار کو مزید کارروائی سے روک دیا۔

"اسٹاپ اٹ، کنٹرول یور سیلف۔" اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

تھانے دار ہانپتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ٹھوڑی سے بہنے والے خون نے اس کی وردی کو داغ دار کر دیا تھا۔ اسی خون جیسی سرخی اس کی آنکھوں میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ایس پی اسے لے کر حوالات سے باہر نکل گیا۔ میں سلاخوں کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ میرا ایک ہاتھ ہتھکڑی میں تھا۔ نثار نیم بے ہوشی کی حالت میں ٹھنڈے فرش پر لیٹا تھا۔ حوالدار کی ہدایت پر دو حوالاتی اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگے۔ دیگر عملہ خونخوار نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔ ایک حوالاتی نے کوشش کر کے نثار کی شلوار اس کی برہنہ ٹانگوں پر چڑھا دی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا میرے لیے بے حد حیرت خیز تھا۔ مجھے صرف دو باتوں سے تھوڑی سی تسلی ہو رہی تھی۔ پہلی یہ کہ ایس پی پڑھا لکھا شخص تھا اور قدرے مختلف لگ رہا تھا۔ دوسری یہ کہ چچا حفیظ کو میری مصیبت کی خبر ہو چکی تھی اور یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ میں کس تھانے میں ہوں۔

قریباً ایک گھنٹے کے بعد تھانے کے احاطے میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر اور گزری اور پھر مجھے حوالات کی سلاخوں کی دوسری جانب چچا حفیظ کی صورت دکھائی دی۔ ان کے ساتھ ایک اور ضخیم شحیم شخص بھی تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا یہ دوسرا شخص ہمارا ایک دور کا رشتے دار اور ہائی کورٹ کا وکیل تھا...... میری حالت دیکھ کر چچا کا رنگ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

"یہ کیا ہو گیا شاہ زیب پتر؟" انہوں نے لرزاں لہجے میں کہا اور سلاخوں کے اندر سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے خون آلود کپڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اسی زخمی کا خون تھا جسے ہم نے اسپتال پہنچانے کا گناہ کیا تھا۔

وکیل کا نام عبداللہ تھا اس نے چچا کی موجودگی میں ہی مجھ سے سارا ماجرا سنا۔ اس کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔ "اگر معاملہ صرف ٹکر والا ہوتا تو میں کل ہر صورت تمہاری ضمانت کروا لیتا لیکن اب لڑکی کے بیان اور انسپکٹر کے زخمی ہونے کی وجہ سے معاملہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے پھر بھی میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟ میرے تو فرشتے بھی اسے نہیں جانتے اور یہ جو لڑکا ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوا ہے، یہ کون ہے؟"

وکیل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھوڑا بہت اس بارے میں پتا ہے۔ جو لڑکی وہاں اسپتال میں آئی تھی اس کا نام عاشرہ نذیر ہے۔ وہ ایک مقامی زمیندار حاجی نذیر کی بیٹی ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے والا لڑکا عارف اس کا ماموں زاد ہے اور شاید منگیتر بھی۔"

"لڑکی نے اسپتال آتے ساتھ ہی یہ کیوں کہہ دیا کہ ہم نے لڑکے کو جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے؟" میں نے پوچھا۔ وکیل کی طرح میں بھی بہت مدھم آواز میں بول رہا تھا۔

"اس کا ٹھیک جواب تو وہی دے سکتی ہے لیکن اس سے یہ خیال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ واقعی ایکسیڈنٹ کا کیس نہ ہو۔ کسی نے دشمنی نکالنے کے لیے جان بوجھ کر عارف کو ٹکر ماری ہو۔ سنا ہے کہ لڑکی جوان اور خوبصورت ہے۔ یہ کوئی رشتے کا تنازعہ بھی ہو سکتا ہے۔"

چچا حفیظ کی آنکھوں میں کروٹ لیتے ہوئے خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے متوحش نظروں سے میرے چہرے کی چوٹوں کو دیکھا اور بولے۔ "شاہ زیب پتر! تجھے کیا ضرورت پڑی تھی یہاں آتے ساتھ ہی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی؟"

میں نے کہا۔ ''چچا! وہ بندہ سڑک کے کنارے مر رہا تھا۔ گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں کوئی اسے اٹھا نہیں رہا تھا۔ وہ چند منٹ اور وہاں پڑا رہتا تو پھر اسپتال بھی نہ پہنچ پاتا۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس پر مجھے شرمندگی ہو۔''

''لیکن شاہ زیب پتر! یہ پولیس والوں کے ساتھ ہاتھا پائی تو غلط ہوئی ہے نا۔ یہ پاکستانی پولیس ہے رائی کا پہاڑ بناتی ہے اور یہاں تو انسپکٹر زخمی بھی ہوا ہے۔ یہ بڑا ڈنگا بندہ ہے یہ ہمیں سخت مصیبت میں ڈال دے گا۔''

میں نے فرش پر کراہتے ہوئے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ''میں نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا چچا۔ بس اس بے گناہ کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ اسے وحشیوں کی طرح مار رہے تھے۔ میں اس کے اوپر گر گیا۔ یہ چوٹیں جو مجھے لگی ہیں آپ کے سامنے ہیں۔''

چچا پریشان لہجے میں بولے۔ ''یہ تو تم کہہ رہے ہو ناں، وہ تو کہہ رہے ہیں کہ تم نے اسلحہ چھیننے اور حوالات سے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ تھانے دار کی وردی پر خون بھی لگا ہوا ہے۔''

''یہ چوٹ میں نے اسے نہیں لگائی ہے چچا۔ میں نے اسے بس پیچھے دھکیلا تھا۔ وہ برتنوں پر گرا اور کسی برتن کا کنارہ اس کی تھوڑی پر لگا اور جو اسلحہ چھیننے والی بات ہے وہ بھی سفید جھوٹ ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''ایسے معاملوں میں صرف قسموں سے کام نہیں چلتا۔ شہادتوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔'' ایڈووکیٹ عبداللہ نے ذرا بجھے لہجے میں کہا پھر تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ''بہرحال کل میں پوری کوشش کروں گا کہ ضمانت ہوجائے۔''

میں نے چچا سے معذرت کی کہ میری وجہ سے انہیں ایک مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے اور وہ بھی خوشی کے موقعے پر۔

چچا بہت فکرمند نظر آتے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے میری معذرت سنی بھی یا نہیں۔ میں نے وکیل کو اپنے اس سامان کے بارے میں بتایا جو ٹیکسی کی ڈکی میں پڑا تھا۔ اس نے اس سامان کی تفصیل مجھ سے پوچھی اور ایک کاغذ پر لکھ لی پھر بولا۔ ''تھانے والوں نے بھی سامان کی لسٹ بنائی ہوگی۔ میں اسے اس لسٹ سے ملا لیتا ہوں۔ اللہ کرے زیادہ فرق نہ ہو۔''

مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر چچا اور وکیل تیزی سے باہر چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد میں ان کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہا تھا۔ لگ رہا تھا وہ کسی سے ملنے گئے ہیں۔ اب رات کے بارہ کا عمل ہوچکا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور اس سردی نے حوالات کی دیواروں اور برہنہ فرش کو کچھ اور ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ تینوں حوالاتی ٹھٹھرے سہمے لاک اپ کی دیواروں سے لگے بیٹھے تھے۔ نثار کروٹ کے بل فرش پر پڑا تھا۔ اس کے زخمی سر پر ایک میلی سی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے میں ڈرائیور کو اس چکر سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر کوئی جھوٹا الزام اپنے سر لینا پڑا تو وہ بھی لے لوں گا۔ میں پیچھے ہٹنے والا بندہ نہیں تھا۔ اگر کسی کے لیے کھڑا ہوجاتا تھا تو پھر آخری حد تک جاتا تھا۔

رات کے قریباً ڈھائی بجے کا عمل ہوگا جب ایک گاڑی تیزی سے تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ آواز سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی گاڑی ہے جس پر چچا حفیظ اور ایڈووکیٹ پولیس اسٹیشن آئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک چودھری نما بارعب شخص کے ساتھ لاک اپ کی طرف آئے۔ چودھری کے ساتھ دوسرے بندے کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو ہمیں جائے حادثے پر ملا تھا اور جس کو ہم نے اسپتال کا راستہ جاننے کے لیے اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا لیا تھا۔ اسپتال میں پولیس کو دیکھنے کے بعد یہ شخص وہاں سے کھسک گیا تھا۔

چچا حفیظ کی پریشانی میں اب تھوڑی سی کمی دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب یہ وہی ہے ناں جس نے تمہیں اسپتال کا رستہ بتایا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چچا حفیظ نے کہا۔ ''یہ گھبرا کر اسپتال سے نکل گیا تھا پر اب پھر آگیا ہے۔ یہ عدالت میں گواہی دے سکتا ہے کہ وہاں موڑ پر اصل معاملہ کیا ہوا تھا۔''

اس شخص نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے چچا سے پوچھا۔ ''آپ اسے لے کر کہاں سے آئے ہیں؟''

چچا کے بجائے ایڈووکیٹ نے جواب دیا۔ ''ہم موقعے پر گئے ہوئے تھے جہاں یہ روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہاں پاس ہی دو تین دکانیں اور ایک چھوٹی بستی ہے۔ تم اسے چھوٹے سائز کا گاؤں بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ اس گاؤں کے چودھری ہیں۔'' اس نے سرخ سفید رنگت والے بارعب

شخص کی طرف اشارہ کیا پھر دیہاتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ کرم داد ہے، اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اسے ڈھونڈنے میں چودھری صاحب نے ہماری مدد کی ہے۔''

چچا حفیظ نے کہا۔ ''ایک اچھی گل اور بھی ہے۔ پتا چلا ہے کہ لاہور کے اسپتال میں زخمی لڑکا ہوش میں آگیا ہے۔ اللہ سوہنے سے امید ہے کہ وہ بچ جائے گا۔ عبداللہ کہہ رہا ہے کہ اگر تھانے دار قیصر سے معاملہ ہوجائے تو کل کچہری سے تمہاری ضمانت ہوسکتی ہے۔''

''تھانے دار سے معاملہ... میں سمجھا نہیں؟''

''پتر، اس کے پاس وردی ہے، اختیار ہے، وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ اس معاملے کو سیدھا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے راضی کرلیا جائے۔''

''کس طرح راضی کرلیا جائے؟'' میں نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

''تم... اس کے سامنے معافی کے دو بول، بول دینا۔ باقی گل بات چودھری صاحب خود ہی کرلیں گے۔'' چچا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میں نے بگڑ کر کہا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا چچا۔ میں کس بات کی معافی مانگوں؟ معافی تو ان پولیس والوں کو مانگنی چاہیے۔ انہوں نے دو شریف شہریوں کو پریشان کیا ہے، بے دردی سے مارا پیٹا ہے اور یہ سب اس لیے کہ ہم نے ایک شدید زخمی شہری کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔ ٹھیک ہے ہمیں شاباش نہ دو، ہماری حوصلہ افزائی نہ کرو لیکن اس طرح معافیاں تو نہ منگواؤ ہم سے۔''

چچا حفیظ نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''پتر! تم جہاں سے آئے ہو وہاں یہ رواج ہوں گے، یہاں نہیں ہیں، خدا کا شکر کرو کہ بندے کی حالت اسپتال میں چنگی ہوگئی ہے اور یہ چودھری بشارت بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ نہیں تو کام بہت بگڑ جانا تھا۔''

میں اندر سے بری طرح تپ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''لیکن میں انسپکٹر سے معافی نہیں مانگوں گا۔ جب میرا قصور ہی کوئی نہیں تو معافی کس بات کی؟ یہ تو اپنے آپ سے جھوٹ بولنا ہے اور میں ایسا نہیں کرسکتا۔''

چچا حفیظ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''شاہ زیب! تم نے پہلے بھی جلد بازی کرکے معاملہ بگاڑا ہے، اب اور من مانی نہ کرو۔ میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا تمہیں کرنا پڑے گا۔ تم صرف معافی مانگ لو باقی بات ہم کرلیں گے۔'' چچا روانی میں کہہ گئے۔

''باقی بات کیا؟'' میں نے پوچھا۔

چودھری نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''تھانے دار اور چھوٹے تھانے دار کو کچھ دینا دلانا بھی پڑے گا۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے۔ دو چار سخت لفظ بھی انہوں نے رپورٹ میں لکھ دیے تو بات مہینوں اور سالوں تک چلی جائے گی۔''

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ ''تو آپ لوگ رشوت کی بات کررہے ہیں؟''

چچا حفیظ نے اپنائیت بھرے غصے سے کہا۔ ''تم ان باتوں میں دخل نہ دو جن کا تمہیں پتا نہیں۔ جب یہاں کچھ دن رہ لوگے پھر اپنی مرضی کرلینا۔ ابھی جو کہتے ہیں وہ کرتے جاؤ۔ صبح سات بجے پیشی کے لیے روانگی ہے۔ اس سے پہلے پہلے معاملہ ٹھیک ہوجانا چاہیے۔''

''میں نے صاف کہہ دیا ہے، میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا اور میں نے کسی کو رشوت کبھی نہیں دینی۔ آپ میری بات ایس پی صاحب سے کروائیں وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات سنیں گے۔ وہ یہاں سے ہوکر گئے ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

ایڈووکیٹ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم ایس پی تبریز کی بات کررہے ہو۔ تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ وہ بہت اچھے افسر ہیں لیکن یہاں بات اچھے برے کی نہیں۔ یہ دیکھنا ہے کہ کس کا اختیار زیادہ ہے اور کوئی بڑا افسر ہوتے ہوئے بھی بے اختیار ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''قیصر چودھری ویسے تو صرف انسپکٹر ہے لیکن اس کی اصل اتھارٹی شاید ایس پی سے بھی زیادہ ہے، اس کا پیچھا بڑا مضبوط ہے۔ وہ ایک بہت بااثر شخص کا خاص آدمی ہے۔''

''کون شخص؟'' میں نے پوچھا۔

ایڈووکیٹ بس لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ چچا حفیظ کے چہرے پر بھی رنگ سا آکر گزر گیا ہے اور صرف چچا حفیظ ہی نہیں ان کے ساتھ آنے والے چودھری کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

''شاہ زیب! میرا مشورہ ہے کہ تم فی الحال سوال جواب میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ ابھی تمہارے لیے اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ انسپکٹر کی بیک بڑی تگڑی ہے۔ اگر ہم نے اس کی ناراضی دور نہ کی تو بڑی سخت مصیبت میں پڑجائیں گے۔ تمہارے چچا جو کہہ رہے ہیں وہ بات سوفی

صد درست ہے۔ تمہیں قیصر صاحب سے معافی مانگ لینی چاہیے۔ باقی ہم سنبھال لیں گے۔'' پھر وکیل مزید دھیمی آواز میں بولا۔ ''وہ کہتے ہیں ناکہ وقت پڑنے پر لوگ گدھے کو بھی باپ بنالیتے ہیں۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں سیدھا سیدھا چلنے والا شخص تھا۔ میری عمر کا زیادہ حصہ ڈنمارک جیسے ملک میں گزرا تھا۔ کئی ایک معاشرتی خامیوں اور اخلاقی برائیوں کے باوجود وہاں عدل وانصاف کا بول بالا تھا۔ شہریوں کو مثالی حقوق حاصل تھے۔ ان لوگوں نے اسلام کے ہی کچھ سنہری اصولوں کو اپنا کر اپنی زندگیوں کو آسان اور خوبصورت بنا رکھا ہے۔ عدل وانصاف کا رویہ بھی ان سنہری اصولوں میں سے ایک ہے۔ میں نے اب تک یہی کچھ دیکھا تھا لیکن اب جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ مجھے ایک ایسے شخص سے معافی مانگنے کا کہا جارہا تھا جسے مجھ سے معافی مانگنی چاہیے تھی بلکہ جسے اپنی نوکری کا خطرہ لاحق ہوجانا چاہیے تھا۔

اگلا آدھ گھنٹا اسی بحث وتکرار میں گزر گیا۔ آخر چچا حفیظ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ پتر شاہ اگر تو مجھے اپنا چاچا سمجھتا ہے اور تیرے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی عزت ہے تو میری بات مان لے۔ معافی مانگنے سے تو چھوٹا نہیں ہوجائے گا لیکن ہم سب ایک بڑی مصیبت سے بچ جائیں گے۔ یہ دیکھ... میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔''

چچا کے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میں تڑپ گیا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے پھر میری نظر ٹھنڈے فرش پر کراہتے ہوئے زخمی شتار پر پڑی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر یہ معاملہ مزید بگڑ گیا تو اس بے چارے کو بھی سخت رگڑے لگیں گے۔ میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے چچا کے سامنے نیم رضامندی ظاہر کردی۔

چچا اور عبداللہ دوسرے کمرے میں تھانے دار کی طرف چلے گئے۔ چودھری بھی ان کے ساتھ گیا۔ چودھری کا پورا نام بشارت گوندل تھا۔

میری ٹانگیں مسلسل کھڑے رہنے سے اور سردی کے سبب اکڑ گئی تھیں کیونکہ ہتھکڑی کی وجہ سے میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک بے دم ہوچکا ہوتا لیکن میرے لیے یہ سب جھیلنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کسی قریبی کمرے سے تین چار افراد کے بولنے کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی کوئی فقرہ میری سمجھ میں آبھی رہا تھا۔ ایسے میں ایک دو فقروں نے میرے سینے میں سلگتے انگاروں کو کچھ اور بھی تکلیف دہ بنادیا تھا۔ چچا بڑے التجائیہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''بچہ ہے جناب، نیا نیا آیا ہے۔ ناسمجھ ہے، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا ہے آپ سے۔''

تھانے دار کی دھیمی مگر نہایت کاٹ دار آواز سنائی دی۔ ''میں نے اس کی معافی کا اچار ڈالنا ہے۔ معافی مانگنی ہے تو عدالت میں جاکر مانگے۔ میں تو قانون کا نوکر ہوں جو قانون کہتا ہے وہ میں نے لکھ دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''ایسا نہ کہیں قیصر صاحب۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بچوں سے غلطی ہوجاتی ہے۔ بڑے معاف کرتے ہیں۔'' چچا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چودھری بشارت مدد کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو جی قیصر صاحب! ہم تو جانتے ہیں ناں آپ کو۔ کبھی چوں چرا کی ہمت نہیں کرتے آپ کے سامنے۔ اب یہ منڈا انجانے میں غلطی کر بیٹھا ہے، آپ وڈا پن دکھائیں، معاف کردیں۔''

گفتگو وضاحت سے ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ چچا وغیرہ تھانے دار کی منت ساجت میں مصروف ہیں۔

کچھ دیر بعد چچا حفیظ اور وکیل میرے پاس آئے۔ چچا کی آنکھوں میں نمی تھی۔ میرے سامنے پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔ ''دیکھ تھانے دار کے سامنے کوئی غلط سلط بات منہ سے نہ نکالنا۔ میرے کہنے کی لاج رکھ لینا۔ اس سے معافی کے دو بول، بول لینا، باقی ہم سنبھال لیں گے۔''

چچا کی بے چارگی اور ڈرائیور کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ میں رضامندی کے انداز میں خاموش رہا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میں چچا اور ایڈووکیٹ کے ساتھ لاک اپ سے نکل کر اس کے دفتر نما کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس تھانے کا حاکم انسپکٹر قیصر براجمان تھا۔ بجلی کے ہیٹر نے کمرے کو نیم گرم کررکھا تھا۔ میز کے سامنے صرف دو کرسیاں تھیں، جن میں سے ایک پر چودھری اور دوسری پر سب انسپکٹر قادر بیٹھا تھا۔ انسپکٹر قیصر کی ٹھوڑی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ پرانی طرز کے ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے سرخ چہرے پر غصے کی تمتماہٹ تھی اور لہجہ نرم ہونے کے باوجود اپنے اندر زہر چھپائے ہوئے تھا۔ وہ ریسیور.. کان سے

لگائے ہوئے بولا۔

"چلو کوئی بات نہیں جناب عالی۔ آپ کے کوٹھے کی لڑکی ہے تو ہمارے سرآنکھوں پر۔ مجھے پتا ہوتا تو کل ہی چھوڑ دیتے اسے لیکن اب بھی کوئی بات نہیں صبح تک محترمہ آجائیں گی واپس آپ کے کنجر خانے پر... نہیں نہیں... آپ بےفکر رہیں۔ نہیں جی نہیں... آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ چھوٹی موٹی شرارت سے کیا بگڑ جاتا ہے ایسی ہونہار کڑیوں کا اور آپ کی یہ بادشاہ زادی تو دیکھنے میں ہی بڑی ہیوی ڈیوٹی لگتی ہے..."

تھانے دار کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی قریبی چوکی میں کسی طوائف زادی اور دو تماش بینوں کو پکڑ کر بند کیا گیا ہے اور یہ واقعہ پرسوں رات پیش آیا ہے۔ شاید طوائف زادی کے ساتھ کسی بہکے ہوئے اہلکار نے دست درازی کی ہے یا پھر اس سے بھی آگے گیا ہے۔ اب ایس ایچ او طوائف زادی کے وارث کوٹھے دار کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی اسے یہ بھی باور کروا رہا تھا کہ لڑکی کی رہائی کے لیے اسے نقد کی صورت میں بھی کچھ نہ کچھ خراج دینا پڑے گا۔

بات لمبی ہوتی جارہی تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر بات لمبی کر رہا ہے۔ شاید ہمیں اس طرح اپنے سامنے کھڑا کر کے اور انتظار کروا کے اسے مزہ آرہا تھا۔ یہ کوٹھے دار یا دلال اس کا پرانا واقف کار لگتا تھا۔ لڑکی والی بات چیت کے بعد اس نے کسی متنازعہ پلاٹ کے بارے میں گفتگو شروع کردی۔ اسے ہماری موجودگی کی جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے اس کی یہ فون کال ختم ہوئی اور اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ چچا حفیظ نے جو الفاظ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اپنے ذہن میں جوڑ رکھے تھے وہ تھانے دار کے سامنے ادا کردیے۔

چچا نے کہا۔ "جناب! یہ اپنی غلطی کو مان رہا ہے۔ آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔"

تھانے دار نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کیا بات کر رہے ہو بزرگو! میں ایک دو ٹکے کا تھانے دار اور یہ سر جی آئے ہیں ڈنمارک سے۔ پتا نہیں کتنا پڑھے ہوئے ہیں اور کن کن پڑھے لکھوں سے رابطے ہیں جناب کے۔ میری موت آئی ہے کہ میں ان سے معافی منگواؤں؟"

"چلو جی غصہ تھوک دو صاحب۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی شرمندہ ہو رہے ہیں۔" چودھری بشارت نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو معافی مانگ لو قیصر صاحب سے۔ یہ چاہیں تو ابھی پولیس مقابلے کا کیس بن سکتا ہے تم پر۔ دفعہ 333 وغیرہ لگ گئی تو دن میں تارے نظر آجائیں گے ہم سب کو۔"

چچا حفیظ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں کسی اور ٹائپ کا بندہ تھا۔ تھانے دار قیصر چودھری جیسے لوگ میرا کچھ بگاڑ سکتے تھے اور نہ مجھے مرعوب کرسکتے تھے لیکن یہاں صورت حال کچھ اور ہوگئی تھی۔ میری وجہ سے کچھ اور لوگ سخت پریشانی میں گرفتار ہو رہے تھے جن میں چچا حفیظ اور ڈرائیور نثار سرفہرست تھے۔ میں نے دل پر جبر کیا اور خود کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا غلط ہوا... آئی ایم سوری انسپکٹر۔"

اس کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں بولا۔ "واہ... زبردست... یہ کیسا لفظ ایجاد کیا ہے انگریزوں نے سوری... کمال کا لفظ ہے۔ بندے کی اکڑ بھی نہ ٹوٹے اور معافی تلافی بھی ہوجائے۔ واہ... سوری۔" اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔

چچا نے ایک بار پھر مجھے ٹہوکا دیا اور غصے بھری سرگوشی میں بولے۔ "سیدھی طرح کہو نا... معاف کردیں۔"

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں لیکن میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں نے انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا میں اس کے لیے معافی مانگتا ہوں۔"

"کس سے؟" انسپکٹر قیصر نے ڈھٹائی سے پوچھا۔ وہ ذلیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

میرا جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پر پل پڑوں۔ اس پر گھونسے برساتا جاؤں اور کہتا جاؤں تم سے... تم سے... تم سے کمینے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میرے سامنے وعدوں کی ایک زنجیر تھی۔ میں نے حتی الامکان برداشت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

وہ ایک دم بھڑک کر میری طرف آیا۔ اس نے اپنے شائستہ لہجے کو خیرباد کہا اور میرا گریبان پکڑ کر پھنکارا۔ "اسی طرح بک بک کرنا جس طرح کر رہا تھا۔ بلانا اپنے کسی لاٹ صاحب کو جس کے سامنے مجھے اپنے کرتوتوں کا جواب دینا ہے... بلانا اب۔" اس نے میرے پھٹے ہوئے گریبان کو جھنجوڑ کر مزید پھاڑ دیا۔

چودھری بشارت جلدی سے ہمارے درمیان آیا۔

اس نے ایک بار پھر انسپکٹر کی منت سماجت کی۔ وہ اپنے کپڑوں سے باہر ہو رہا تھا۔ پھر دہاڑا۔ ''تو جانتا نہیں ہے مجھ کو۔ تیرے جیسے میرے پیشاب کی دھار میں بہہ جاتے ہیں...'' فقرے کے آخر میں اس نے بلا دریغ مجھے ایک گالی سے نواز دیا۔

میرا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا۔ سر سے پاؤں تک جیسے ایک برق کوند گئی۔ میں نے کچھ کہنے کی غرض سے منہ کھولا تھا لیکن چچا شاید میرے منہ کھولنے سے پہلے ہی میرا ارادہ بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا منہ ڈھانپ لیا اور مجھے زور سے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولے۔ ''چپ... چپ ایک لفظ نہیں کہنا... چل نکل اب یہاں سے... نکل۔'' انہوں نے مجھے اپنی اوٹ میں لے لیا۔ شکر کا مقام تھا کہ عین اس وقت تھانے دار کے فون کی گھنٹی بج اٹھی اور وہ ذرا ٹھٹک کر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ چچا اور عبداللہ وغیرہ مجھے پھر لاک اپ کی طرف لے آئے۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ شاید معافی مانگنے کے بعد میں گھر جا سکوں گا۔ مجھے پھر لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد تھانے دار کے کمرے کی طرف سے ایک بار پھر گفت و شنید کی آوازیں آنے لگیں۔ اب غالباً لین دین والا معاملہ طے ہو رہا تھا۔ میں اندر سے بے طرح ابل رہا تھا۔ پتا نہیں کہ ٹھوڑی پر لگنے والی ایک چوٹ کے عوض اس راشی تھانے دار نے چچا سے کتنی رقم وصولنا تھی۔

رات کے قریباً ساڑھے تین ہو چکے تھے۔ یہ سرد رات کچھ زیادہ ہی طویل محسوس ہو رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد تھانے دار کو کسی واردات کی اطلاع ملی اور وہ جیپ پر بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔ تاہم چچا حفیظ اور عبداللہ بدستور تھانے میں ہی موجود رہے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ تھانے دار کے واپس آنے پر پھر میرا اور اس کا سامنا ہو جائے اور وہ میرے ساتھ کوئی بدسلوکی کرے۔

خدا خدا کر کے اجالے کی جھلک نظر آئی۔ چچا نے میرے اور نثار کے لیے حلوہ پوری اور چنے کا ناشتا لاک اپ میں بھجوایا۔ یہ ناشتا جوں کا توں پڑا رہا بعد میں میرے اصرار پر تینوں حوالاتیوں نے یہ ناشتا کیا۔

پروگرام کے مطابق سات بجے کے قریب ہمیں ضلع کچہری لے جانے والی گاڑی تھانے پہنچ گئی۔ اس میں کسی دوسرے تھانے کے چار حوالاتی اور بھی تھے۔ ایک حوالاتی کی ناک سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری گاڑی لاہور میں داخل ہوئی اور پھر کچہری پہنچ گئی۔ اب ایڈووکیٹ کا کام تھا۔ اس نے اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے کیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ لڑکی یا اس کے وارث کچہری میں موجود ہوں گے جس نے اسپتال میں ہم دونوں پر دانستہ ٹکر مارنے کا الزام لگایا تھا مگر یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔ ڈرائیور نثار کا لائسنس جج کو پیش کیا گیا اور مختصر کارروائی کے بعد ہم دونوں کی ضمانت ہو گئی۔

چچا کے علاوہ میرا چچا زاد بھائی ولید اور دو تین دیگر عزیز بھی کچہری میں موجود تھے۔ سب نے مجھے فرداً فرداً گلے لگایا اور پھر پرائیوٹ گاڑی میں بٹھا دیا۔ نثار کو ابھی تک ٹیکسی واپس نہیں ملی تھی۔ میرا سامان بھی تھانے میں ہی تھا۔ میں نے نثار کو ہر طرح تسلی دی اور وکیل سے کہا کہ وہ جلد از جلد سپرداری کروا کے نثار کی ٹیکسی اس کے حوالے کر دے۔ آئندہ پیشی پر بھی میں نے اسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ کرائے کے علاوہ میں نے مرہم پٹی اور ٹیکسی کی مرمت کے لیے چار ہزار روپے اسے نقد دیے۔ وہ دعائیں دیتا رخصت ہوا۔ ہم لاہور سے واپس چچا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

چچا کے گھر میں رونق تھی۔ چچی آمنہ بھی تھانے کچہری کا سن کر بے حد پریشان تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ سے شفقت کی تھی۔ وہ دیر تک مجھے گلے سے لگائے کھڑی رہیں۔ چچا کے صرف دو ہی بچے تھے۔ ایک فائزہ جس کی شادی ہو رہی تھی اور دوسرا ولید جو قریباً میرا ہی ہم عمر تھا۔

اپنوں میں آ کر میں جیسے کل رات والے دکھ بھول سا گیا لیکن سینے کے اندر سلگنے والی آگ مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ جیسے بادلوں کے اندر گاہے بگاہے بجلی چمک جاتی ہے اسی طرح دو مناظر بار بار آنکھوں کے سامنے آتے تھے اور دل میں خنجر سا گھونپ دیتے تھے۔ ایک نثار کے نیم برہنہ ہونے کا منظر اور دوسرا وہ منظر جب میں نے بپھرے ہوئے تھانے دار سے معافی مانگی اور اس نے مجھے گالی دی۔

اگلے پانچ چھ دن رشتے داروں اور واقف کاروں سے ملنے ملانے میں گزر گئے۔ گھر میں بھی خوب گہما گہمی رہی۔ اس گھر سے میرے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ اُن دنوں میں بھی اپنے والدین کے ساتھ یہیں رہتا تھا۔ ہم بچے اس وسیع گھر میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ احاطے میں دوڑتے بھاگتے تھے، باغیچے کے درختوں پر چڑھتے

تھے اور پرندوں کی طرح کچے پکے پھل کھاتے تھے۔ میری دونوں بہنیں بھی اس کھیل کود میں میرے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ اس گھر میں آکر وہ ساری سنہری یادیں تازہ ہوگئیں۔ چچا نے اس گھر کو حال ہی میں رنگ وروغن کروایا تھا۔ باغیچے کی تراش خراش درست کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے اس آبائی عمارت کو بڑی اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔

گھر کے پچھواڑے ایک کارخانہ نما جگہ تھی۔ ہمارے دادا کے زمانے میں یہاں سردیوں کے موسم میں بڑے بڑے کڑاہوں میں گڑ تیار ہوتا تھا اور تہواروں یا تقریبات پر میدے اور بوندی کے لڈو بنتے تھے لیکن اب یہاں باقاعدہ بیکری کا سامان تیار ہوتا تھا۔ یہ اعلیٰ کوالٹی کا سامان نہ صرف لاہور شہر میں سپلائی کیا جاتا تھا بلکہ لاہور کے ایک اچھے علاقے میں بیکری کے سامان کی ایک شاندار دکان بھی تھی جس کی دیکھ بھال ولید کرتا تھا۔

چچا کے گھر گزرنے والے پانچ چھ دنوں میں، میں نے صاف محسوس کیا کہ چچا کچھ پریشان ہیں۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید مقامی تھانے دار سے جو اَن بن ہوئی تھی اس کا اثر ہے لیکن پھر محسوس ہوا کہ کوئی اور بات ہے۔ شاید کوئی کام کاج کا مسئلہ ہے۔ میں نے اس بارے میں ولید سے بھی ٹوہ لی۔ اس نے بھی یہ بات تسلیم تو کی کہ ابو دو تین مہینوں سے پریشان ہیں لیکن کیوں؟ اس بارے میں وہ بھی الجھن میں تھا۔ میں نے سوچا کہ عین ممکن ہے یہ بھی کوئی لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہو۔ ولید طبیعت کا بہت تیز تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ چچا گڑبڑ والی باتیں اس سے چھپا لیتے ہیں۔

تھانے سے واپسی کے تیسرے دن مجھے میرا وہ سامان بھی واپس مل گیا جو ٹیکسی کی ڈکی میں رکھا گیا تھا۔ حسبِ اندیشہ اس میں سے دو تین قیمتی چیزیں غائب تھیں۔ غائب ہونے والی چیزوں میں ایک لیڈیز گھڑی بھی تھی جو میں نے ... فائزہ کو دیگر تحائف کے ساتھ دینی تھی۔ بہرحال وکیل کے بقول اس سلسلے میں صبر وشکر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک دن سردی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ شام سے پہلے ہی ہلکی سی دھند چھانا شروع ہوگئی تھی۔ میں اور ولید گھر کی وسیع وعریض بیٹھک میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے کوئلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ اتنے میں گھر کا کام کرنے والی ماسی اندر آئی۔ اس نے ولید سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''ولید پتر! گاڑی میں کوئی ملنے آیا ہے تم سے۔''

ابھی چند سیکنڈ پہلے ہم نے گلی میں کسی گاڑی کے انجن کی مدھم سی آواز بھی سنی تھی۔ ولید اپنی گرم چادر درست کرتا ہوا باہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''حاجی نذیر صاحب کی گاڑی ہے۔ اس میں وہی لڑکی ہے جس نے اس دن اسپتال میں تمہیں برا بھلا کہا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے حاجی صاحب کی بیٹی؟''

''ہاں، وہ ملنا چاہ رہی ہے تم سے۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پچھلے چھ سات دنوں میں، میں نے کئی بار اس لڑکی اور اس کے رویے کے بارے میں سوچا تھا۔ اگر وہ یہاں نہ آتی تو شاید ایک دو دن میں، میں خود اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔ میں ولید کے ساتھ باہر آگیا۔ ایک ٹویوٹا کار میں پچھلی نشست پر وہی خوبرو لڑکی موجود تھی جو اس رات اسپتال میں مجھ پر بے طرح برسی تھی۔ سیاہ گرم چادر میں سے اس کے چہرے کی ایک سائیڈ دکھائی دے رہی تھی۔ ناک میں شاید چاندی کا چھوٹا سا کوکا جگمگا رہا تھا۔ گاڑی کا ڈرائیور ایک طرف مؤدب کھڑا تھا۔

میں قریب پہنچا تو لڑکی نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی حسین آنکھوں میں حزن وملال کی کیفیت نظر آئی، وہ بولی۔ ''میرا نام عاشرہ ہے۔ میں حاجی نذیر صاحب کی بیٹی ہوں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو دو منٹ کے لیے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔''

میں ذرا سا ہچکچایا پھر اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ میرے پاؤں زمین پر تھے یوں میں اگلی نشست پر بیٹھے ہونے کے باوجود لڑکی کی طرف دیکھ بھی سکتا تھا۔

''جی فرمایئے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک دم نمی آگئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اس روز میری طرف سے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ ٹکر مارنے والے آپ نہیں تھے۔ آپ نے تو عارف کو بچانے میں مدد کی تھی۔ اگر آپ اسے اسپتال نہ پہنچاتے تو... اللہ جانے کیا ہوجاتا۔'' میں نے دیکھا دو آنسو اس کے شفاف رخساروں پر لڑھک گئے۔

میں نے کہا۔ ''چلو، آپ کو غلطی کا احساس ہوگیا۔ جلد بازی میں جو ردِعمل دکھایا جاتا ہے وہ اکثر غلط ہی ہوتا

ہے۔''

''میں جانتی ہوں، آپ کو اس خدا ترسی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ آپ کے ساتھ مار پیٹ ہوئی، آپ کو حوالات میں رات گزارنا پڑی۔ اب بھی ایک دو پیشیوں کے بعد آپ کی خلاصی ہوگی۔'' اس کے لہجے میں ہمدردی آمیز دکھ تھا۔

''ایک انسانی جان بچ گئی، اس کے عوض یہ سب، کچھ معنی نہیں رکھتا۔'' میں بولا۔ ہمارے درمیان چند جملوں کا تبادلہ مزید ہوا پھر میں نے کہا۔ ''عاشرہ صاحبہ! آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھوں، اگر آپ برا نہ مانیں؟''

''پوچھیے۔'' وہ ذرا توقف سے بولی۔

''اس رات آپ کے شدید غصے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو کسی پر شک تھا۔ آپ کا خیال ہے کہ عارف کی بائیک کو کسی نے جان بوجھ کر ٹکر ماری ہے، آپ کا... ایسا کون دشمن ہے جو اس حد تک جا سکتا ہے؟''

عاشرہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''سوری شاہ زیب صاحب! میں آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔'' اس کے چہرے پر کرب کے آثار صاف دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''اچھا... یہی بتا دیجیے کیا اب آپ کا شک رفع ہو چکا ہے... میرا مطلب ہے، جان بوجھ کر ٹکر مارنے کے حوالے سے؟''

''ج... جی ہاں... وہ بس ایک غلط فہمی تھی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔

عین اس وقت میری نگاہ اتفاقاً اس کی کلائی پر پڑی۔ دودھیا جلد پر ایک دو نیل تھے اور کٹ کا نشان تھا۔ یوں لگا کہ دو چار روز پہلے کانچ کی چوڑیوں نے ٹوٹ کر اس کی کلائی زخمی کی ہے۔ شاید اس سے کھینچا تانی ہوئی تھی۔ یہ منظر بس ایک سیکنڈ کے لیے دکھائی دیا پھر اس کی گرم شال نے کلائی کو ڈھانپ لیا۔

عاشرہ نامی لڑکی تو معافی تلافی کر کے چلی گئی لیکن میرے ذہن میں کئی سوال چھوڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اور ولید پھر بیٹھک میں گرم انگیٹھی کے پاس آ بیٹھے اور اس لڑکی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ ولید اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ اس علاقے کے ایک بڑے زمیندار حاجی نذیر کی بیٹی ہے۔ اپنے شوق کی وجہ سے لاہور میں کسی جاب کے لیے جاتی ہے اور اس کا ماموں زاد عارف غالباً اس کا منگیتر ہے۔

''یار ولید! میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس لڑکے عارف سے ایک بار ملا جائے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''بس بڑی الجھن سی ہو رہی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں... تجسس پیدا ہو رہا ہے۔''

''وہ جنرل اسپتال میں ہے۔ کل میرے ساتھ شہر چلنا مل لیں گے اس سے۔'' ولید بولا۔

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے چچا حفیظ کے کھانسنے کی مسلسل آواز آنے لگی۔ چچی آمنہ پکار کر بولیں۔ ''ولید! اپنے ابا جی کی دوائی دیکھنا کہاں ہے۔'' ہم دونوں چچا کو دیکھنے ان کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

اگلے روز میں ولید کے ساتھ جنرل اسپتال پہنچا۔ عارف سے ملاقات ہوئی۔ حادثے کی رات بھی اسے دیکھا تھا لیکن وہ افراتفری کا عالم تھا۔ آج دھیان سے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک خوش رُو نوجوان تھا۔ شلوار قمیص پہنے بستر پر نیم دراز تھا۔ مضافاتی علاقے کا رہائشی ہونے کے باوجود پڑھا لکھا نظر آتا تھا۔ طبی امداد کے دوران میں اس کا سر مونڈ دیا گیا تھا اور کنپٹی کے قریب دس پندرہ ٹانکے نظر آ رہے تھے۔ ایک ہاتھ پر بھی آٹھ دس دن پرانا زخم تھا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسے جائے حادثہ سے اٹھا کر اسپتال پہنچانے والا میں ہوں تو اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ ''بہت شکریہ۔'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔

میں نے کہا۔ ''یار! آپ پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔ آپ کو ہیلمٹ ضرور پہننا چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید یہ حادثہ اتنا سنگین ثابت نہ ہوتا۔''

''ہو ہی جاتا تو اچھا تھا۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا مطلب؟''

''کک... کچھ نہیں۔'' وہ ایک دم پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگا کہ اپنی جان بچ جانے کی اسے کوئی خوشی ہی نہیں۔ اس کے چہرے پر غم و اندوہ کی کیفیت جیسے نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اور ولید اس کے لیے پھل وغیرہ لے کر گئے تھے۔ اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی۔

باتیں کرتے کرتے وہ اچانک سسک پڑا۔ کراہ کر

بولا۔ ''اس دنیا میں کمزور بندے کی کوئی زندگی نہیں۔ اسے مر ہی جانا چاہیے۔ میں بھی مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔''

میں نے اسے کریدنا چاہا لیکن وہ کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ''عارف! تمہاری باتیں سن کر پتا نہیں کیوں لگ رہا ہے کہ وہ شک درست ہی ہے۔''

''کون سا شک؟''

''یہی کہ اس رات تمہاری بائیک کو جان بوجھ کر ٹکر ماری گئی تھی۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی گواہی دینے لگی کہ وہ میری بات کی تائید کر رہا ہے۔ ولید تو کچھ دیر بیٹھ کر اپنی شاپ کو دیکھنے چلا گیا لیکن میں وہیں عارف کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسے اعتماد میں لیتا رہا۔ میں نے اسے اس رات والا واقعہ بھی بتایا جب عاشرہ حادثے کے بعد اسپتال پہنچی تھی اور اس نے بڑے جذباتی انداز میں مجھے اور ڈرائیور کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ عاشرہ کا نام سننے کے بعد عارف کے چہرے پر کرب کے آثار بڑھ گئے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سارا معاملہ کسی ''رشتے'' کا ہے۔ کوئی اور بھی تھا جو عاشرہ کو حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس حوالے سے عارف کو مزید کریدا تو اس بار اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وہ جیت گئے ہیں۔ میں ہار گیا ہوں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا... کچھ نہیں۔''

''کیا تم ان لوگوں کی بات کر رہے ہو جنہوں نے تمہیں مارنے کی کوشش کی؟''

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''وہ بڑے زور والے ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اپنے حق میں کر لیا ہے۔ اب... اب وہ بھی مجھے دھتکار گئی ہے۔ اس نے بھی اپنا نفع نقصان دیکھ لیا ہے۔ اچھا تھا میں مر ہی جاتا... مجھے نہ اٹھاتے آپ وہاں سے۔''

''کون ہے وہ، جو اس طرح تم سے دشمنی چکا رہا ہے؟'' میں نے اپنائیت سے اپنا ہاتھ اس کے زخمی ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

عارف کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ بولا۔ ''وہ بہت زور والا ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔ پتا نہیں کیوں اللہ نے اس کی رسی اتنی لمبی کی ہوئی ہے۔''

میری نگاہوں کے سامنے وہی منظر گھوم گیا جب میں نے ایسی ہی بات عبداللہ کے منہ سے سنی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ایسا ہی سایہ لہرایا تھا اور تقریباً یہی الفاظ اس نے بھی کہے تھے۔

میرے تجسس کا بڑھ جانا ایک فطری عمل تھا۔ میں کافی حد تک عارف کو اپنے اعتماد میں لے چکا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میرے اور اس کے درمیان جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔ شاید وہ بھی ایک ایسی کیفیت میں تھا جب بندہ دیوار سے بھی بات کرنے کو تیار ہو جاتا ہے تاکہ اس کا غم ہلکا ہو سکے۔

میرے اصرار پر اس نے ایک بھاری بھرکم سیاسی شخصیت کے بیٹے کا نام لیا۔ اس سیاسی شخصیت کا نام میں نے ڈنمارک میں بھی اکثر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر سنا تھا۔ عطاء اللہ داراب صاحب خود تو عملی سیاست میں نہیں تھے لیکن پسِ پشت رہ کر وہ سب کچھ کر رہے تھے۔ آسان لفظوں میں کہا جائے تو یوں ہوگا کہ عطا داراب نامی یہ بندہ ان لوگوں میں سے تھا، جو کنگ نہیں ہوتے... کنگ میکر ہوتے ہیں۔

عطا داراب صاحب ایک بڑے صنعت کار تھے اور اب بڑے زمیندار بھی بنتے جا رہے تھے۔ عام طور پر لوگ پہلے زمیندار ہوتے ہیں پھر صنعت کار بنتے ہیں لیکن یہاں معاملہ دوسری طرح کا چل رہا تھا۔ بیٹے کا نام بھی میں نے کافی سنا ہوا تھا لیکن اس وقت اس کی صورت ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ کچھ دیر کے لیے میں بھی گم صم رہ گیا۔ مجھے اس بات پر سخت حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ وہ لوگ جو قوم کے رہنما کہلاتے ہیں اور عوام کو عدل و انصاف مہیا کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں، خود ایسی من مانیوں میں ملوث ہیں۔ اگر کہیں ڈنمارک میں اس طرح کی صورتِ حال ہوتی تو ایک طوفان برپا ہو گیا ہوتا۔

میرے کریدنے پر عارف نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اسے جان سے مارنے کی کوشش کرنے والے داراب فیملی کے آدمی تھے۔ وہ عرصے سے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ آخر انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس کارروائی کے بعد حاجی نذیر کے گھر والے اور خاص طور سے ان کی بیٹی عاشرہ اتنے ہراساں ہوئے ہیں کہ ان کی ہر بات ماننے کو تیار ہو گئے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ''ہر بات ماننے سے تمہاری کیا مراد ہے عارف؟''

وہ کچھ دیر ہچکچاتا رہا پھر اشکبار لہجے میں بولا۔ ''وہ خبیث شکیل داراب، عاشرہ پر بہت عرصے سے نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ عاشرہ کو حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمانے کے لیے تیار ہے اور... میرا خیال ہے کہ وہ کامیاب ہو چکا ہے۔ پہلے شکیل کا باپ اس شادی پر راضی

نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حاجی نذیر اس کا ہم پلّہ نہیں۔ بے شک حاجی نذیر بھی ایک بڑا زمیندار ہے لیکن عطا داراب جیسے شخص کے لیے تو وہ ایک معمولی خاندان کا حقیر سا بندہ ہی ہے۔ وہ صرف اس لیے راضی ہوا ہے کہ بیٹا اس رشتے پر اڑا ہوا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ عاشرہ اور شکیل داراب ایک ہونے والے ہیں؟''

''ہونے والے نہیں، سمجھو کہ ہو چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ایک دو ہفتے کے اندر ہی ان کا نکاح ہو جائے گا۔ جہاں تک میری اطلاع ہے یہ شادی لاہور میں ہی بڑی سادگی سے ہوگی۔ گنے چنے افراد کو بلایا جائے گا۔'' عارف کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''سادگی سے کیوں؟ دھوم دھام سے کیوں نہیں؟''

''ایسے لوگ دھوم دھام سے تو پہلی شادی ہی کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب... یہ اس کی پہلی شادی نہیں ہے؟''

''نہیں اس کی پہلی شادی دس بارہ سال پہلے ہوئی تھی۔''

''لیکن... جہاں تک میرا اندازہ ہے شکیل داراب کی عمر اتنی زیادہ نہیں۔ چھبیس ستائیس کا ہوگا۔''

''اس کی پہلی شادی بڑی چھوٹی عمر میں ہوگئی تھی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں۔ پہلی بیوی سے بچہ کوئی نہیں۔ یہ بہانہ بھی مل گیا ہے اس کو۔ ویسے کوئی بہانہ نہ بھی ہو تو بھی یہ لوگ اپنا کام تو کر ہی گزرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ تیسری شادی کرے اور یہ شادی بغیر کسی بہانے کے ہی کرلے۔'' عارف کی آواز طیش اور دکھ کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

میں کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔ ''عارف! تم اپنے حق کے لیے لڑتے کیوں نہیں ہو؟''

''کس کے لیے لڑوں؟ کس کے بھروسے پر لڑوں؟''

''عاشرہ کے لیے لڑو، اس کے بھروسے پر لڑو۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔

''آپ باہر کے ملک سے آئے ہو نا۔ آپ نہیں جانتے یہاں اپنے حق کے لیے لڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور پھر عطا داراب... شکیل داراب جیسے لوگوں سے لڑنا تو سمجھو ممکن ہی نہیں اور جو تم عاشرہ کی بات کر رہے ہو وہ بھی اب ممکن نہیں۔ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ میرے اور اپنے خاندان کی زندگی اور عزت کی خاطر اس نے مجھ سے ہر ناتا توڑ لیا ہے۔''

''کیا اس طرح ناتے توڑ لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں؟ کیا وہ تمہیں بھول پائے گی؟ کیا تم اس کو بھول پاؤ گے؟ تم اسے کیوں ایک جھوٹی زندگی شروع کرنے دے رہے ہو؟ تم کسی پرانے دور کے جاہل قبیلے کے فرد نہیں ہو۔ جو کچھ بھی ہے، یہ ایک آزاد ملک ہے۔ یہاں عدالتیں ہیں، ادارے ہیں، آزاد پریس ہے، الیکٹرانک میڈیا ہے۔''

''سب کچھ ہے لیکن عام بندے کی شنوائی نہیں ہے۔'' عارف نے دکھی لہجے میں کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ابھی خود بتایا ہے کہ حادثے والی رات تمہارے اور ڈرائیور کے ساتھ کیا ہوا؟ اور میرے خیال میں تم نے کم ہی بتایا ہے۔ اس سے زیادہ ہوا ہوگا۔ کیا تم اس کے لیے انصاف لے سکے ہو؟ اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے جہاں شکیل داراب جیسے لوگوں سے سامنا ہو وہاں کسی کا کچھ نہیں ہوسکتا۔''

میں کچھ دیر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اگر میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کرنا چاہوں تو؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''نہیں بھائی، اب مجھے معافی دے دو۔ تم نے پہلے ہی میرے لیے اتنا دکھ اٹھایا ہے کہ میں اپنے سینے پر پہاڑ جیسا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ میں تمہیں کسی اور مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم یہاں نئے نئے آئے ہو۔ پہلے کچھ دن یہاں رہ کر یہاں کی اونچ نیچ سمجھ لو۔ عطا داراب اور شکیل جیسے نورانی چہرے والوں کے اندر کی کالک دیکھ لو پھر اس قسم کی باتیں کرنا۔''

میں نے دل میں سوچا۔ ''تب تک تو تمہارے لیے بہت دیر ہو چکی ہوگی عارف احمد۔ تمہاری عاشرہ ایک دو بچوں کی ماں بن چکی ہوگی۔'' پھر میرے ذہن میں عاشرہ کی زخمی کلائی آئی۔ کسی نے اس کی چوڑیاں توڑی تھیں اور شاید اس پر سختی بھی کی تھی۔ وہ کون ہوسکتا تھا، کہیں وہ عارف ہی تو نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ کسی غصے بھری جذباتی ملاقات میں اس نے عاشرہ کے ساتھ ایسا کیا ہو؟ لیکن وہ تو زخمی حالت میں یہاں اسپتال میں پڑا تھا وہ یہ کیسے کرسکتا تھا۔ تو کہیں اس کا ذمے دار وہی شکیل داراب تو نہیں تھا؟ بہت سے سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے۔

میں عارف کے پاس کچھ دیر مزید بیٹھا اور اس سے

تسلی تشفی کی باتیں کرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں ناانصافی برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی سے زیادہ کسی دوسرے سے ہونے والی ناانصافی مجھے تکلیف دیتی تھی۔ میں مار دھاڑ کی جس فیلڈ میں گیا تھا اور آج جس مقام پر تھا اس کی بنیادی وجہ ایسی ہی ایک ناانصافی تھی جو کسی دوسرے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بدلا تھا اور کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اسپتال سے میں سیدھا ولید کی شاپ پر پہنچ گیا۔ یہ کافی بڑی شاپ تھی اور پورے علاقے میں بیکری کے سامان کے لیے مقبول تھی۔ ہم شاپ کے پچھلے حصے میں واقع چھوٹے سے دفتر میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے وہ سب کچھ ولید کے گوش گزار کیا جو مجھے عارف سے معلوم ہوا تھا۔

میں نے ولید سے کہا۔ ''یار! میں نے اس کی جان بچانے میں مدد کی ہے لیکن وہ اتنا دکھی ہے کہ زندگی اسے بوجھ لگ رہی ہے۔ میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا ہوں یار۔''

''کیا کرنا چاہ رہے ہو؟''

''کیوں نا ہم حاجی نذیر صاحب سے ملیں اور ان کو بتائیں کہ عاشرہ اور عارف ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اگر عاشرہ کی شادی اس کی مرضی کے بغیر ہوگئی تو دونوں کی زندگیاں تباہ ہوجائیں گی۔''

ولید کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو شاہ زیب بھائی، حاجی نذیر کو ان باتوں کا پتا نہیں ہوگا۔ اسے سب پتا ہوگا لیکن عاشرہ کی طرح وہ بھی مجبور ہوگیا ہوگا۔''

''یار! وہ کوئی غریب غربا تو نہیں جسے کوئی چودھری یا وڈیرا دھمکا کر اپنی مرضی پر چلا لے گا۔ وہ علاقے کا ایک بڑا زمیندار ہے۔''

''زمیندار تو ہے لیکن عطا داراب اور شکیل داراب وغیرہ کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ شکیل داراب بہت بڑی مچھلی ہے اور حاجی نذیر اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی مچھلی ہے۔''

''کچھ بھی ہے یار لیکن میں ایک بار حاجی نذیر صاحب سے ضرور ملنا چاہوں گا۔''

''خوامخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالو۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہونا بلکہ ایس ایچ او قیصر جیسے پالتو ہمارے پیچھے پڑجائیں گے اور ہمارا جینا حرام کردیں گے۔''

''پالتو... کیا مطلب؟''

''قیصر بھی ان کرائے کے لوگوں میں سے ہے جو داراب فیملی کے لوگوں کے اشاروں پر دم ہلاتے ہیں۔''

انسپکٹر قیصر کی کرخت صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی اور وہ سب کچھ بھی یاد آگیا جو اس نے ایکسیڈنٹ والی رات ہم سے کیا تھا۔ سینے میں پھر چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''تو کیا قیصر جیسے لوگوں کی وجہ سے تم سب اپنی آنکھیں بند کرلیتے ہو اور تمہارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اسے ہونے دیتے ہو۔ ولید! میں نے تو سنا تھا کہ تم بڑے سچے کھرے بندے ہو۔ زیادتی نہیں سہتے اور فوراً زیادتی کرنے والے کا گریبان پکڑتے ہو۔''

''یہ تو میں کرتا ہوں۔'' ولید دھیرے سے مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے جیسی چمک ابھری، وہی چمک جو بلا جھجک خطرات کا سامنا کرنے والے لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اس نے اپنی پی کیپ اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو آؤ۔'' اس نے کہا۔

''کہاں؟''

''جہاں تم کہہ رہے ہو۔''

ہم کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر دفتر سے باہر نکل آئے۔ باہر دسمبر کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہم سوزوکی کار میں آبیٹھے۔ ولید بولا۔ ''ایک بات میں تمہیں ابھی بتادوں۔ ہماری کوشش سے ہونا ہوانا کچھ نہیں۔''

''یہ تو کھیلنے سے پہلے ہی ہار ماننے والی بات ہے۔''

''اگر تم اسے کھیل سمجھ رہے ہو تو یہ ہے بڑا خطرناک... لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، حاجی نذیر صاحب کچھ نہیں سنیں گے؟''

''مجھے لگتا ہے شاہ زیب وہ سن ہی نہیں سکتے۔ ان میں داراب فیملی نے اتنی سکت ہی نہیں چھوڑی ہوگی۔''

''تو پھر ہم ڈائریکٹ عاشرہ سے بات کریں گے۔ اگر وہ اس معاملے میں اسٹینڈ لینے کو تیار ہوگئی تو ہم آگے تک جائیں گے۔ قانون کی مدد لیں گے۔ پریس تک اور میڈیا تک بات پہنچائیں گے۔ وہ عاقل بالغ لڑکی ہے۔ اپنا اچھا

برا سمجھ سکتی ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی اور مجھے لگتا ہے کہ شاید اس کے ساتھ زبردستی ہو بھی رہی ہے۔ میں نے اس کے جسم پر تشدد کے نشان دیکھے ہیں۔''

''شاہ زیب تم جو کچھ کہہ رہے ہو اپنی جگہ درست ہے اور ہوسکتا ہے کہ زبردستی کے بارے میں جو اندازے تم لگا رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہوں لیکن یہاں وہ کچھ نہیں ہوگا جو تم آج تک باہر کے ملک میں دیکھتے آئے ہو۔ یہ پاکستان ہے اور یہاں رسموں، رواجوں اور پابندیوں کا گورکھ دھندا کچھ زیادہ ہی ہے۔ اگر تم عاشرہ کے لیے کچھ کرنا چاہو گے تو مجھے یقین ہے کہ سب سے پہلے عاشرہ ہی تمہاری مخالفت کردے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''ظاہر ہے کہ وہ رشتوں، رواجوں اور مجبوریوں میں جکڑی ہوئی لڑکی ہے۔ اپنی اور اپنے خاندان کی بدنامی نہیں چاہے گی اور پھر جب واسطہ عطا داراب جیسی فیملی سے پڑا ہو تو کیا نہیں ہوسکتا۔ پریس، میڈیا، عدالتیں ہر جگہ ان لوگوں کا زور چلتا ہے۔ عطا داراب کا بیٹا شکیل ایسے معاملوں میں باپ سے دو ہاتھ آگے ہے۔''

''اچھا یار! تم ڈرانے والی باتیں ہی کرو گے یا کوئی اچھا رخ بھی دکھاؤ گے تصویر کا۔'' میں نے کہا۔

''میں تو تمہارے پیچھے چل پڑا ہوں۔ جہاں کہتے ہو چلے جاتے ہیں۔ پہلے تم عاشرہ سے بات کرکے ہی دیکھ لو۔ پتا چل جائے گا کہ وہ اس معاملے میں کسی طرح کا اسٹینڈ لے بھی سکتی ہے یا نہیں۔''

''اس سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس میں۔ میری معلومات کے مطابق اسی سال گرمیوں میں اسے وہاں لیکچرار کی جاب ملی ہے۔ اگر اس پر پہرے وغیرہ نہیں بٹھادیے گئے تو وہ یقیناً آج کل بھی یونیورسٹی جارہی ہوگی۔''

''اس کا پتا کیسے چلے گا؟''

''ابھی چل جاتا ہے۔'' ولید نے کہا اور اپنے سیل فون سے کسی کو کال کرنے لگا۔ یہ ولید کی کوئی فرینڈ تھی اور پنجاب یونیورسٹی میں ایم ایس سی کررہی تھی۔ ولید نے اس سے بات کی تو پتا چلا کہ عاشرہ آج بھی یونیورسٹی آئی ہوئی ہے لیکن دو چار دن میں وہ یہ جاب چھوڑ رہی ہے۔

بات ختم کرکے ولید بولا۔ ''چلو، یہ سنہری موقع ہے۔ ابھی اس سے مل سکتے ہیں۔''

ہم بیکری کی کشادہ پارکنگ سے نکلے اور ولید کی سوزوکی کار میں پندرہ بیس منٹ کے اندر نہر کنارے نیو کیمپس میں پہنچ گئے۔ کیمپس اور اس کے گردونواح سے میری بھی کچھ حسین یادیں وابستہ تھیں۔ جب میں پچھلی دفعہ آیا تھا تو صرف تین دن کے لیے پاکستان رکا تھا لیکن 72 گھنٹے یعنی تین دنوں میں ہی ایک ایسے حسین چہرے سے میری راہ و رسم بڑھی تھی جس کے خدوخال، دل و دماغ پر نقش ہوکر رہ گئے تھے۔ میں نے پچھلے ساڑھے تین برسوں میں جب بھی اس چہرے کو یاد کیا تھا، دل میں ایک عجیب سی کسک جاگی تھی، میٹھی میٹھی، نہ بہت دھیمی نہ بہت تیز... درد کی ایک ایسی دلگداز لہر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ یہ معاملہ ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ابھی کچھ باقی ہے... ابھی کچھ نہ کچھ باقی ہے ورنہ دنیا کی بھیڑ میں گم ہوجانے کے بعد حسین چہروں اور مسکراہٹوں کے جھرمٹوں میں رہنے کے باوجود میں نے اس طرح اسے یاد نہ کیا ہوتا۔ میری سماعت اور میری نگاہیں اس کی تلاش میں بھٹکی نہ ہوتیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین سا تھا کہ وہ پھر ملے گی اور پتا نہیں کیوں یہ بھی یقین سا تھا کہ وہ بھی مجھے یاد کرتی ہوگی۔

نیو کیمپس اور نہر کے گردونواح کو دیکھ کر کئی بھولے بسرے مناظر آنکھوں کے سامنے آگئے۔ یہاں ہم دونوں نے گاڑی روکی تھی۔ یہاں ہم گھاس پر بیٹھے تھے۔ یہاں سے ہم نے انرجی ڈرنک پیے تھے اور پھر یہاں سے موڑ مڑ کر ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ اس بے مثال چہرے سے میرے رابطے کا واحد ذریعہ بس ایک سیل فون نمبر تھا۔ تین ساڑھے تین برسوں میں، میں نے شاید سیکڑوں بار اس نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔ پھر میں نے ڈنمارک سے پاکستان کال کرکے ایک پاکستانی دوست کی مدد حاصل کی تھی۔ اس نے مجھے پتا کرکے بتایا تھا یہ نمبر سرگودھا کے کسی اللہ رکھا کے نام پر رجسٹرڈ ہے یعنی ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا تھا۔

میں اپنے خیالوں سے اس وقت چونکا جب ولید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو شاہ زیب! میرا خیال ہے کہ محترمہ کلاس روم سے نکل رہی ہیں۔''

میں نے چونک کر دیکھا۔ سرو کے دراز قد پودوں کی دوسری جانب ایک برآمدے میں عاشرہ کا اجلا اجلا چہرہ نظر آیا۔ تین چار اسٹوڈنٹس اس کے اردگرد تھے۔ وہ سینے سے ایک فائل لگائے ان سے باتیں کرتی ہوئی ایڈمنسٹریشن

بلاک کی طرف جارہی تھی۔ چہرے پر وہی حزن وملال کی کیفیت تھی جو پچھلی ملاقات میں نظر آئی تھی۔

میں اور ولید تیزی سے آگے بڑھے۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے یوں لگا جیسے وہ مجھے نظرانداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی ہو لیکن میں نے یہ موقع نہیں دیا۔

''السلام علیکم... کیسی ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام... آپ یہاں؟'' وہ ذرا پریشان لہجے میں بولی۔

''بے وقت تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔ اگر آپ چند منٹ مجھے دے سکیں۔''

اس نے کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح اردگرد دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کچھ نادیدہ نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں پھر خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''کہیے... کیا کہنا ہے آپ کو؟''

''میں چند منٹ اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔ یہ بات کہتے ہوئے میری نظر اتفاقاً اس کی گردن کے نچلے حصے پر پڑی۔ وہاں بھی مجھے ایک ہلکے سے نیل کے آثار نظر آئے۔ میرے ذہن میں اس کی کلائی کے نیل تازہ ہو گئے۔

میری گزارش سن کر اس کی خوبصورت پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھری۔ ''سوری، میرے لیے یہ ممکن نہیں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن...''

''ویری سوری شاہ زیب صاحب۔'' اس نے بے رخی سے میری بات کاٹی۔ ''میں بات نہیں کرسکتی۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

مجھے ایسے رویے کی توقع نہیں تھی۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کیا کروں کہ اچانک کسی کا ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا میرے سامنے گھنی مونچھوں والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص کھڑا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

''السلام علیکم سر!'' اس نے بھاری آواز میں کہا پھر اپنے سیاہی مائل ہاتھ سے مونچھیں سہلا کر کہنے لگا۔ ''آپ ذرا میرے ساتھ آئیں، کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کون ملنا چاہتا ہے؟'' ولید نے ذرا تنک کر پوچھا۔

''یار آپ آؤ تو سہی۔'' مونچھوں والے نے ترشی سے کہا۔

''پہلے بتاؤ کس نے ملنا ہے؟'' ولید کا پارا چڑھنے لگا۔

''چودھری صاحب نے... وہ سامنے گاڑی میں بیٹھے ہیں۔'' مزید ترشی سے جواب دیا گیا۔ ولید اور میں نے یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر کھڑی ایک سفید کار کی طرف دیکھا۔ کار کے قریب ہی ایک دراز قد شخص کھڑا نظر آیا۔ مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ وہی دیوہیکل تھانیدار قیصر چودھری تھا۔ رگوں میں خون سنسنا سا گیا۔ وہ گالی یاد آگئی جو اس کی گندی زبان سے نکلی تھی اور میرے کانوں تک پہنچی تھی۔

قیصر اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ ایک اور پولیس والا بھی سادہ لباس میں اس کے پاس کھڑا تھا۔ ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ شاید یہ لوگ عاشرہ کی نگرانی کررہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اتنی بے رخی کے ساتھ بولی تھی۔

میں اور ولید مونچھوں والے سادہ پوش اہلکار کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھے اور پھر قیصر کے پاس پہنچ گئے۔ وہ حسب سابق بڑی ملائمت سے بولا۔ ''السلام علیکم جناب! کیا حال چال ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''آپ سے ایک دو باتیں کرنی ہیں۔ کیا آپ گاڑی میں تشریف رکھیں گے؟''

''کیا یہاں کھڑے ہو کر بات نہیں ہوسکتی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ہوسکتی تو میں آپ سے یہ گزارش ہی کیوں کرتا۔'' اس نے کہا۔ اس کی ٹھوڑی کے کٹ پر ابھی تک میڈیکل ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ اس میں عملے کے باوردی افراد موجود تھے۔ دو تین مسلح بھی تھے۔ میں اب تک قیصر کی فطرت کو کافی حد تک جان گیا تھا۔ وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ میں نے ولید کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اس سے کہا کہ ہمیں گاڑی میں بیٹھ جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی میں.... کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

ولید نے قیصر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میری گاڑی ادھر سڑک پر کھڑی ہے۔''

''کوئی بات نہیں برادر۔ گاڑی کوئی بندہ لے آتا

ہے۔ آپ مجھے چابی دے دیجیے۔'' قیصر نے شائستہ لہجے میں کہا۔ تاہم اس لہجے کے پیچھے چھپی ہوئی زہریلی پھنکار کو بھلا کون محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لیے لگا کہ ولید بھڑک اٹھے گا اور ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور چابی قیصر کے ایک ماتحت کے حوالے کر کے گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایک سادہ پوش اہلکار جس نے اپنی قمیص کے نیچے یقیناً کوئی ہتھیار لگا رکھا تھا ہمارے ساتھ ہی پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ قیصر نے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھالی اور کار تیز رفتاری سے ایک جانب روانہ ہو گئی۔ پولیس موبائل ہمارے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے قیصر سے پوچھا۔

''یہ آپ لوگ کہاں لے جا رہے ہیں ہمیں؟''

''زیادہ دور نہیں حضور والا۔ بس ایک لوکیشن دکھانی ہے آپ کو۔''

''کون سی لوکیشن؟''

''جہاں فلم ہیر رانجھا کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ فردوس اور اعجاز وغیرہ پر سین پکچرائز کیے گئے تھے۔''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''سمجھ تو اس خاکسار کو بھی کئی باتوں کی نہیں آرہی۔ مثلاً یہ کہ آپ جناب کو جنرل اسپتال جا کر محترم عارف صاحب سے ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں تک گٹ مٹ کرنے کی کیا لوڑ پڑ گئی تھی اور پھر یونیورسٹی جا کر آپ نے حاجی صاحب کی بیٹی سے ملنے کی زحمت کیوں فرمائی ہے؟ اگر وہ آپ کو ایسی ہی اچھی لگی تھی تو ہمیں حکم کیا ہوتا، ہم اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ویسے مجھے لگ رہا ہے آپ اپنے لیے نہیں کسی اور کی خاطر اس سے ملنا چاہ رہے تھے؟''

''فضول کی باتیں نہ کرو انسپکٹر۔ یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''واہ ذاتی معاملات... پرسنل لائف... پرائیویسی... کیسے کیسے لفظ گھڑے ہوئے ہیں ان پڑھے لکھے لوگوں نے۔ ذاتی معاملات کی چادر اوڑھ کر اندر جو بھی گند مارتے رہو کوئی آپ کو پوچھنے والا نہیں۔''

میں نے بمشکل اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر! بہتر یہ ہے کہ کام کی بات کرو۔''

''گستاخی معاف جناب! آپ خود ہی بات کو دوسری طرف لے گئے۔ میں نے تو آپ کو کام کی بات ہی بتائی تھی کہ آپ کو ہیر رانجھا فلم کی ایک لوکیشن دکھانے لے جا رہا ہوں۔ جناب نے زیادہ عرصہ ملک سے باہر گزارا ہے لیکن ہیر رانجھا تو باہر کی دنیا میں بھی دیکھی گئی تھی۔ اس میں ایک کردار سہتی کا بھی تھا۔ میں اس وقت آپ کو ہیر رانجھا سے زیادہ سہتی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ آپ نے بھی یقیناً فلم میں دیکھا ہوگا کہ سہتی کے پیٹ میں ہمدردی کی مروڑ اٹھی تھی۔ اس نے فی سبیل اللہ ہیر اور رانجھے کو ملانے کی کوشش کی تھی نتیجہ کیا نکلا، ہیر بھی ماری گئی اور رانجھے کا بھی بولو رام ہو گیا۔ سہتی بہرحال بچ گئی لیکن ہر دفعہ تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ جب ہیر رانجھے پر فلم بنے تو اس میں وہ دونوں تو زندہ رہیں لیکن بے چاری سہتی ماری جائے۔''

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ خطرناک تھانیدار بڑی معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ غالباً وہ عارف اور عاشرہ کو ہیر رانجھے سے تشبیہ دے کر مجھے سہتی کی جگہ دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی جان سے مار دینے کی دھمکی بھی میرے کانوں تک پہنچا رہا تھا۔ یہ عجیب سا بندہ تھا۔ قد کاٹھ غیر معمولی تھا لیکن شکل وصورت سے بہت سخت گیر نہیں لگتا تھا۔ بات چیت کا انداز بھی شائستہ تھا اور اپنی گفتگو میں تعلیم یافتہ لوگوں جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا لیکن ذرا سا غور کرنے پر پتا چل جاتا تھا کہ اس بظاہر بااخلاق تھانے دار کے لہجے کے نیچے نیلی آگ کا دریا بہہ رہا ہے۔ زمین کے نیچے دبی ہوئی ایک ایسی بارودی سرنگ جو کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے۔

کار اب تیز رفتاری سے چلتی ہوئی شہر سے باہر آ چکی تھی۔ ہم ملتان روڈ پر سفر کرتے ہوئے کافی آگے نکل آئے تھے۔ یہ ایک بالکل سنسان ذیلی سڑک تھی۔ کہیں کہیں امرود اور کینو وغیرہ کے باغات نظر آ رہے تھے۔ ایک کچے راستے پر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ قیصر نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیے جناب! یہ وہ تاریخی درخت ہیں جہاں ہیر رانجھا کی شوٹنگ ہوئی تھی۔'' اس نے شوٹنگ کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا اور مجھے ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کیا۔

چند سیکنڈ بعد پولیس موبائل میں سے تین اہلکار نکلے اور چوکس کھڑے ہو گئے۔ وہ موبائل میں سے کسی شخص کو نکلنے کا کہہ رہے تھے مگر وہ نکل نہیں رہا تھا۔ حوالدار رمضان ہماری طرف آیا اور انسپکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''وہ باہر نہیں نکل رہا ہے جناب۔''

انسپکٹر باہر نکلا اور ہم دونوں کو بھی اپنے ساتھ آنے کا

اشارہ کیا۔ ہم پولیس موبائل تک پہنچے۔ وہاں ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ہمیں موبائل کے فرش پر ایک شخص ہتھکڑی میں جکڑا نظر آیا۔ یہ وہی حوالاتی تھا جسے چند روز پہلے میں نے تھانے کے لاک اپ میں اوندھا لیٹے دیکھا تھا۔ اس بے چارے کو اتنی مار لگائی گئی تھی کہ وہ سیدھا لیٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب بھی وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل پولیس موبائل کے سخت فرش پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے ہلدی ہورہا تھا اور آنکھوں میں دنیا جہاں کی منت سماجت سمٹی ہوئی تھی۔

وہ انسپکٹر کو دیکھ کر گھگیایا اور اس نے اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ مائی باپ ہو صاحب۔ میں ساری زندگی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔ مجھے معاف کردیں... مجھے معاف کردیں۔'' اس نے اپنا اگلا دھڑ گاڑی کے پچھلے حصے سے باہر نکالا اور اپنا سر انسپکٹر کے گھٹنوں سے رگڑنے کی ناکام کوشش کی۔

انسپکٹر نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''کلمہ پڑھ لو میرے بچے، اس وقت میں تجھے اس سے بہتر مشورہ اور کوئی نہیں دے سکتا۔''

وہ بے چارہ پوری جان سے تڑپ گیا۔ ''خدا کے لیے نہیں... خدا اور رسولؐ کے لیے بس ایک دفعہ میری جان بخش دیں پھر آپ جو کہیں گے، میں کروں گا جو آپ کہیں گے...'' وہ باقاعدہ رونے لگا۔ وہ چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا لیکن اس وقت کسی بچے کی طرح اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے لیے کسی بچے ہی کی طرح بلک رہا تھا۔

انسپکٹر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تو اب بات نہیں مان رہا تو کل کیسے مانے گا۔ میں تجھ سے گزارش کررہا ہوں کہ کلمہ پڑھ اور تو اس سے انکار کررہا ہے۔''

وہ ایک بار پھر دلدوز انداز میں منت سماجت کرنے لگا۔ حوالدار نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ''سر مجھے تو لگتا ہے کہ یہ مسلمان ہی نہیں۔ اگر اس کو کلمہ آتا ہوتا تو ضرور سنا دیتا۔''

انسپکٹر نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اب تھوڑا تھوڑا شک مجھے بھی ہورہا ہے۔ اس کا نام راجو ہے نا... اور ایسے نام تو اکثر ہندوؤں کے ہوتے ہیں۔ راج کمار سے راجو یا پھر راجیش سے راجو وغیرہ ویسے اگر یہ ہندو ہے تو پھر تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''آپ کا کیا مطلب ہے جناب؟'' حوالدار نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔


# کیا آپ

## لبوب مقوی اعصاب

## کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

**المسلم دارالحکمت** (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

**0300-6526061**

**0301-6690383**

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

"بھئی ہندو برادری کے لوگوں کے لیے میرے دل میں بڑی نرمی ہے۔ تین چار سال پہلے جب میں سندھ کے اندرونی علاقے میں تھا، دو مہاشوں نے بڑے سخت وقت میں میری یادگار مدد کی تھی۔"

حوالدار نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے راجو کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا اور بڑے پیار سے پوچھا۔ "جناب ذرا ٹھیک ٹھیک ارشاد فرمائیں کہ آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟"

وہ زاروقطار روتے ہوئے بولا۔ "مم... میں کچھ بھی نہیں ہوں مائی باپ۔ آپ جو کہیں میں وہی ہوں۔ بب... بس میری جان بخش دیں۔ میں اور میرے بچے آپ کو زندگی بھر دعائیں دیتے رہیں گے۔" اس نے ایک بار پھر اپنا سر قیصر کے گھٹنوں سے رگڑنے کی کوشش کی اور اس بار کسی حد تک کامیاب رہا۔

قیصر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "یعنی اگر میں آپ جناب کو راجیش کہہ کر بلاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض وغیرہ تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں مائی باپ! آپ جو مرضی کہہ کر بلائیں۔ مجھے اپنا کتا کہہ لیں۔ آپ کا جو دل چاہے کہہ لیں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا۔" اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ خوف کی زیادتی سے کبھی اس کا چہرہ ہلدی ہو جاتا تھا۔ کبھی امید کے سبب آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ راجو نامی یہ شخص شکل وصورت سے کوئی شریف آدمی تو نہیں لگتا تھا لیکن کوئی بہت بڑا بدمعاش یا خطرناک شخص بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پتا نہیں اپنے کس گناہ کے پاداش میں وہ اس وقت قیصر جیسے خطرناک پولیس افسر کے ہتھے چڑھا ہوا تھا۔

اگلے ایک دو منٹ میں ولید اور میں نے راجو کی منت سماجت و گریۂ وزاری کے اندوہناک مناظر دیکھے۔ وہ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ آخر قیصر کا رویہ کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھٹنے کی ہلکی سی ٹھوکر سے راجو کا سر پیچھے ہٹایا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، آپ ایک موقعے کا کہہ رہے ہیں تو میں ایک موقع آپ کو دے دیتا ہوں لیکن آئندہ کی کیا گارنٹی ہے؟"

راجو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کئی سیکنڈ تک وہ کوشش کے باوجود بول نہیں سکا۔ تب اس نے ہتھکڑی لگے ہاتھوں کے ساتھ اپنا اگلا دھڑ گاڑی کے پچھلے حصے سے آگے کی طرف گرایا اور انسپکٹر قیصر کے پاؤں چومنے کی کوشش کی۔

"مائی باپ! آپ جو گارنٹی کہیں میں دے دیتا ہوں۔ میرے مکان کی رجسٹری رکھ لیں۔ مم... میرے بیوی بچے ضمانت کے طور پر رکھ لیں۔ آپ جو کہیں..." وہ بے ربط انداز میں بولتا چلا گیا۔

آخر قیصر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وعدہ کرتے ہو کہ آئندہ وہ نہیں کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو؟"

"سو جان سے وعدہ کرتا ہوں سرکار۔ بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔" راجو کی ہچکی بندھ گئی۔

قیصر نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ایک لمبی سی چابی نکالی اور راجو کی ہتھکڑی کھول دی۔ وہ موبائل سے نیچے اترا۔ اس نے پہلے حوالدار کے اور پھر قیصر کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاید ان کے تلوے چاٹنا شروع کر دیتا۔

یکایک مجھے قیصر کی آنکھوں میں درندگی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے اچانک اپنا سرکاری پستول نکالا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر دو گولیاں راجو کے سینے میں اتار دیں۔ دھماکوں سے میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اپنی ہی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ راجو پشت کے بل گرا۔ اس کی آنکھیں خوف اور حیرت کے سبب پھٹی ہوئی تھیں۔ خون تیزی سے اس کے دھاری دار سوئٹر کو رنگین کرتا چلا گیا۔

قیصر نے جیسے انسان کو نہیں کسی مکھی کو مارا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی سفاک مسکراہٹ سج گئی۔ دم توڑتے راجو سے مخاطب ہو کر بولا۔ "راجو، راجیش! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آئندہ کے لیے نیک چلنی کا وعدہ تم سے اس جنم کے لیے نہیں آئندہ جنم کے لیے لیا تھا۔ تمہارے مذہب میں تو دوسرے جنم کی گنجائش موجود ہے نا۔"

راجو سوال کرنے یا جواب دینے کے قابل کہاں تھا ورنہ وہ اس سے پوچھتا۔ "راجو، راجیش کا نام تو تم نے خود میرے منہ میں ڈالا۔ ورنہ میں تو جیسا بھی تھا، مسلمان ہی تھا۔"

ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس خون آشام پولیس افسر پر ٹوٹ پڑوں لیکن اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ کچھ مجبوریوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں ولید ہی کی طرح ساکت و جامد کھڑا رہا۔ ہمارے اردگرد کم از کم تین باوردی

اہلکاروں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ان کا رخ ہماری طرف تو نہیں تھا لیکن کسی بھی وقت ہو سکتا تھا۔

حوالدار آگے بڑھا اور اس نے ایک پستول دم توڑتے راجو کی مٹھی میں تھما دیا۔ (پستول ایک رومال میں لپٹا ہوا تھا) پھر اس نے پستول کا رخ پولیس موبائل کی طرف کر کے دو بار ٹریگر دبایا، دھماکوں سے شعلے نکلے۔ ایک گولی گاڑی کی باڈی میں لگی دوسری نے ایک کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ حوالدار نے یہ سارا کام بالکل عام سے انداز میں کیا۔ جیسے یہ اس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔

قیصر نے عجب سفاک نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''چلو بھائی جان، اب آپ کی باری ہے۔''

میرے سر سے لے کر پاؤں تک چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ مجھے لگا کہ ایک سیکنڈ کے لیے میرے چہرے کا رنگ بدلا ہے۔ یہ شخص کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ ہمارے بارے میں بھی کوئی خطرناک ارادہ رکھتا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اتنا بڑا اقدام ہمارے خلاف کیسے کیا جا سکتا تھا؟ لیکن یہ دیوانہ پن بھی تو ہو سکتا تھا اور دیوانے پن کے لیے کسی دلیل یا وجہ کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔

دو تین سیکنڈ میں درجنوں سوالات ذہن میں اٹھے اور اوجھل ہوئے۔ شاید میرے چہرے پر لہرانے والے رنگ کو قیصر کی عقابی نگاہوں نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ''گھبرائیں نہیں جناب! میں مارا ماری کی نہیں ''بات چیت'' کی بات کر رہا ہوں۔ ہم خاکساروں کی یہ ہمت کہاں کہ آپ کو انگلی بھی لگائیں۔ گولی شولی تو بہت دور کی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ تم لوگ قانون کے محافظ ہو اور تم نے ہماری آنکھوں کے سامنے ایک جیتے جاگتے بندے کو پولیس مقابلے کے ڈرامے میں مارا ہے۔''

''تو یہ ہماری غلطی ہے نا۔ اب آپ جناب اس قتل کے چشم دید گواہ بن گئے ہیں۔ کل کلاں آپ کی کھوپڑی میں کیڑا رینگ گیا اور آپ نے عدالت میں جا کر گواہی دے دی تو ہم بے چارے تو بے موت مارے گئے نا۔ کیوں بھئی رمضان علی؟''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ یہ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے، ہو سکتا ہے کہ میڈیا والوں کے پاس جا پہنچیں یا پھر کچہری سے ہمارے خلاف پرچے کا آرڈر شاڈر کروا لیں۔ یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں جی۔ میرا تو خیال ہے جی کہ ان دونوں کو بھی...'' حوالدار نے معنی خیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں نہیں، اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ شکل و صورت سے شاہ زیب صاحب سیانے بندے لگتے ہیں۔ ابھی نئے نئے تشریف آور ہوئے ہیں۔ انہیں سوچنے سمجھنے کا کچھ موقع دینا چاہیے۔ امید ہے کہ کچھ لوگ ان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کریں گے۔ ان میں ان کے چاچا محترم حفیظ صاحب بھی شامل ہوں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جناب عالی! اللہ آپ کی عمر لمبی کرے۔ ایسا کیجیے گا کہ یہاں جو کچھ ہوا ہے سب سے پہلے اپنے چچا حضور کے گوش گزار ہی فرمائیے گا۔ وہ آپ کے کان مبارک میں ضرور کچھ مفید باتیں ڈالیں گے۔'' راجو ٹھنڈا ہو چکا تھا اس پر ایک بوسیدہ چادر ڈال دی گئی۔

میرے اندر ایک لاوا سا دہک رہا تھا۔ اگر میرے ضبط کا بند ٹوٹ جاتا تو کچھ بہت خطرناک ہو سکتا تھا۔ کچھ ایسا جو یہ لوگ زندگی بھر یاد رکھتے اور جس کی یاد بھی انہیں تھر تھر کانپنے پر مجبور کر دیتی۔

اسی دوران میں ہماری سوزوکی کار بھی موقع پر پہنچ چکی تھی۔ اسے ایک اہلکار ہی چلا کر یہاں لایا تھا۔ قیصر نے بڑی خندہ پیشانی سے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''لیجیے سرکار! آپ کی سواری تشریف لے آئی ہے۔ اب بیٹھیے اور ہمیں موقع دیجیے کہ ہم آپ کو خدا حافظ کہہ سکیں۔''

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ یہ شخص ابھی تک پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ہاں اتنا پتا چل گیا تھا کہ یہ خطرناک ہے لیکن کتنا؟ یہ طے ہونا ابھی باقی تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ولید کے ساتھ سوزوکی کار کی طرف بڑھا۔ قیصر نے کہا۔ ''ہیر رانجھا کی لوکیشن آپ نے ملاحظہ فرمالی ہے۔ ہیر رانجھا میں ان دونوں کی ہمدردی بھی زندہ رہی تھی لیکن ضروری نہیں کہ وہ ہر بار زندہ ہی رہے۔''

میں اور ولید گاڑی میں آبیٹھے اور گاڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ گاڑی سے دس گنا رفتار کے ساتھ میرا ذہن بھاگ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کچھ ہم نے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھا، وہ کسی سنسنی خیز ایکشن فلم کا حصہ ہی لگتا تھا۔ ایک زندہ سلامت بندہ ہمارے سامنے خون اور مٹی میں لت پت ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ولید یار! یقین نہیں آرہا کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کے حوصلے تو بہت بڑھے ہوئے ہیں۔''

''میں نے تمہیں غلط تو نہیں کہا تھا نا کہ یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔ یہ لوگ حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ ان کا مقابلہ تب تک نہیں ہو سکتا جب تک خود بھی حد سے نہ گزرا جائے۔ ایسا سین دیکھ کر جب میرے جیسے کسی بندے کا میٹر گھومتا ہے نا تو پھر سچ مچ کا پولیس مقابلہ ہو جاتا ہے۔'' اندرونی تپش سے ولید کا چہرہ تمتما رہا تھا اور گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

گاڑی چلاتے چلاتے اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک پسٹل نکال لیا۔ پھنکارتے لہجے میں بولا۔ ''قیصر جیسے لوگوں کو کوئی قانون نہیں پکڑ سکتا۔ ان کا بس یہی ایک سیدھا سادہ علاج ہوتا ہے۔'' میں نے دیکھا ولید کی آنکھوں میں شعلے سے لپک گئے۔

''نہیں یار! اس کو نیچے رکھو۔'' میں نے پسٹل اس کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ سیٹ کے نیچے گھسا دیا۔ ''ہم کوئی ڈاکو نہیں ہیں ولید جو پولیس مقابلہ کریں گے۔ ہم شریف شہری ہیں اور بات صرف یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک بندے کو غیر قانونی طور پر جان سے مارا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجرم ہی ہو لیکن جس طرح اسے مارا گیا ہے یہ کسی طور بھی ٹھیک نہیں تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ٹھیک تھا؟''

''تو جو حادثے کی رات تمہارے ساتھ ہوا وہ ٹھیک تھا؟ اگر نہیں تھا تو ہم اس کے لیے کیا کر سکے ہیں؟ معافی ہی مانگنا پڑی تھی نا۔''

''وہ میری ذات کا معاملہ تھا۔ یہ کسی اور معاملہ ہے۔ میں اس بارے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ایک شریف شہری کی حیثیت سے، قانون کے دائرے میں رہ کر مجھے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔''

''تو کیا کرو گے بھائی؟''

''میں دیکھوں گا کہ قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے۔''

اچانک ولید کو زور سے بریک لگانا پڑے۔ سامنے چوک کا اشارہ بند ہو گیا تھا۔ ہم تو رک گئے لیکن ہمارے پیچھے آنے والی دو تین گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی سگنل کراس کر گئیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان میں ایک ایسی موٹر سائکل بھی تھی جس پر تین پولیس اہلکار بیٹھے تھے۔

ولید نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''لو دیکھ لو، یہ ہے ہمارے ہاں کا قانون۔ اگر سگنل کی خلاف ورزی پر روکنے والا کوئی نہیں تو پھر سگنل توڑنے کی آزادی ہے۔''

میں خاموش رہا۔ میرے ذہن میں کچھ اور طرح کی ہلچل تھی۔ کانوں میں ابھی تک ان دو گولیوں کے دھماکے گونج رہے تھے جو حیرت زدہ راجو کے سینے پر چلائی گئی تھیں۔ چند لمحے پہلے اس بے چارے سے آئندہ نیک چلنی کا وعدہ لیا گیا تھا لیکن بقول قیصر یہ وعدہ اگلے جنم کے لیے تھا۔ قانون کے محافظوں کی طرف سے ایسی دیدہ دلیری میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

ٹھیک دو گھنٹے بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے احاطے میں موجود تھا اور ایڈووکیٹ عبداللہ کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں پڑی تھیں اور ایش ٹرے میں سگریٹس کی راکھ تھی۔ عبداللہ نے لاہور کے نواح میں ہونے والے جعلی پولیس مقابلے کی روداد بڑی تسلی سے سنی تھی۔ دھچکا تو اسے ضرور پہنچا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ اس قسم کی خبریں اب عام لوگوں کے علاوہ قانون دانوں کے لیے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجھے حیرت ہوئی جب اپنی گفتگو میں عبداللہ نے بھی تقریباً وہی باتیں کہیں جو راستے میں ولید نے کہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''کچھ نہیں ہو پائے گا شاہ زیب۔ یہ قیصر جیسے لوگ تو کٹھ پتلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی ڈوریاں اوپر سے ہلائی جاتی ہیں اور جو ڈوریاں ہلانے والے ہوتے ہیں وہ اپنی کٹھ پتلیوں کی پوری پوری حفاظت بھی کرتے ہیں۔ تم تو صرف زبانی کلامی گواہ ہو، اگر تم نے اس سارے واقعے کی وڈیو بھی بنالی ہوتی اور اس وڈیو میں دو چار گواہیاں بھی شامل کر لی ہوتیں تو اس سے بھی قیصر اور اس کے ٹولے کو کچھ فرق نہیں پڑنا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے؟''

''کر سکتے ہیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلنا۔ الٹا یہ ہوگا کہ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کسی چکر میں پھنسا دیا جائے گا۔ تم راجو کو بھول جاؤ گے اور اپنی پڑ جائے گی۔ وہ کیا کہتے ہیں... تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو... اور ویسے ایک بات میں تمہیں اور بتاؤں کبھی کبھی راجو جیسے لوگوں کو ٹھکانے لگا دینا ٹھیک ہوتا ہے۔ ان کا جرم بالکل ثابت ہو رہا ہوتا ہے لیکن عدالتی کارروائیوں اور قانون کی خامیوں کا سہارا لے کر یہ لوگ بچ جاتے ہیں اور پھر سے اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔''

''لیکن سوال تو یہ ہے اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ جس شخص کو گولی سے اڑایا جا رہا ہے یہ واقعی مجرم ہے اور پھر یہ قانون پڑھانے والے ادارے، یہ سارا عدالتی نظام

کس کام کا؟ اور تم بھی کس کام کے؟''

عبداللہ کے چہرے پر غصے کا رنگ سا لہرا گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ میری بات کا جواب سخت انداز میں دے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور لمبی سانس لے کر بولا۔ ''میرا خیال ہے شاہ زیب! تمہیں پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے بجائے پہلے اپنے اردگرد بھی دیکھنا چاہیے۔ مم... میرا مطلب ہے...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے لگا کہ وہ شاید بے دھیانی میں ضرورت سے کچھ زیادہ کہہ گیا ہے۔

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اردگرد سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

وہ پہلے تو کچھ تذبذب میں رہا پھر پہلو بدل کر بولا۔ ''شاہ زیب تم کئی دن سے یہاں ہو، کیا تم نے چاچا حفیظ کے سلسلے میں کوئی خاص بات نوٹ کی ہے؟ میرا مطلب ہے ان کی کوئی پریشانی وغیرہ؟''

میں نے چونک کر کہا۔ ''ہاں، کچھ گم صم تو ان کو دیکھا ہے میں نے...''

''وجہ نہیں پوچھی؟''

''دو تین بار پوچھا بھی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔''

عبداللہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ایک دو بار میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ اس بارے میں ولید سے بات کروں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ وہ بہت تیز مزاج کا ہے۔ اپنے غصے کی وجہ سے وہ کئی دفعہ اپنا اچھا بھلا کام بگاڑ بھی چکا ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ میں کم از کم اس سے تو شیئر نہیں کر سکتا۔''

''کوئی لڑائی جھگڑے والا معاملہ ہے؟''

''لڑائی جھگڑے والا ہوتا تو میں اس کو خود ہی نبٹانے کی کوشش کرتا مگر بات کچھ اور ہے... تم پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہو۔ اگر تم وعدہ کرو کہ بات اپنے تک رکھو گے تو میں تمہیں اس بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔''

میں نے عبداللہ کو پوری پوری تسلی دی کہ یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی اور اگر میں نے اس سلسلے میں چاچا سے بات کی بھی تو اس طرح کروں گا جیسے مجھے از خود کوئی جانکاری حاصل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔

اسی دوران میں کونے میں رکھے ٹی وی پر اس پولیس مقابلے کی پٹی چلنا شروع ہوگئی تھی جو چینل کی معلومات کے مطابق کوئی دو گھنٹے پہلے لاہور کے مضافات میں ہوا تھا۔ بتایا جا رہا تھا کہ پیشی پر جاتے ہوئے راجو نامی غنڈا پولیس کی حراست سے فرار ہوا۔ بعد میں پولیس مقابلہ ہوا۔ راجو کے مددگار تین افراد بھاگنے میں کامیاب ہوئے جبکہ راجو موقعے پر مارا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

عبداللہ نے بیزاری سے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ وہ اصل موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لے کر دھواں ایک جانب چھوڑا اور ٹھہرے انداز میں بولا۔ ''تمہارے گھر اور تمہاری آبائی زمین کا مسئلہ ہے، کچھ لوگ اسے خریدنا چاہتے ہیں بلکہ یوں کہہ لو کہ زبردستی خریدنا چاہتے ہیں۔''

''کون لوگ؟'' میں چونک گیا۔

''سمجھو کہ یہ لوگ بھی داراب فیملی کے کارندے ہیں۔ یہ چکر پچھلے چھ مہینے سے چل رہا ہے۔ ابھی تو یہ لوگ پیار و محبت سے کام لے رہے ہیں لیکن زیادہ دیر تک ایسا نہیں ہوگا۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی کر لی جائیں گی۔''

''تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے؟''

''قریباً دو مہینے پہلے اس بارے میں چچا حفیظ نے مجھے خود سب کچھ بتایا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے وہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔ ہر مصیبت، پریشانی سے اپنے گھر والوں کو دور رکھتے ہیں۔ اب بھی وہ یہ سب کچھ اپنے اوپر لیے ہوئے ہیں۔ ولید کے کانوں میں بھنک بھی نہیں پڑنے دی انہوں نے... وہ جانتے ہیں، وہ مرنے مارنے پر اتر آئے گا اور معاملہ بہت خراب کرلے گا۔ مجھے بھی انہوں نے رازداری کی سخت شرط کے ساتھ بپتا سنائی تھی۔''

میری نگاہوں میں اپنے آبائی گھر کا منظر گھوم گیا۔ وہاں کے ایک ایک چپے پر ہماری یادیں نقش تھیں۔ یہ ساری قریباً دو ایکڑ جگہ تھی۔ اندازاً ڈیڑھ کنال میں ہمارا وہ پرانا حویلی نما مکان تھا جہاں ہم نے تایا اور چچاؤں کے ساتھ اپنا بچپن گزارا تھا۔ مکان کے عقب میں وہ جگہ تھی جہاں دادا کے زمانے میں سادہ اور باداموں والا گڑ تیار ہوتا تھا اور دیہاتی سوغاتیں بنتی تھیں۔ اب وہاں بیکری کا کام چل رہا تھا۔ آگے کی قریباً ڈیڑھ ایکڑ زمین پر ایک باغ اور دو تین کھیت تھے جو اب چچا نے ٹھیکے پر دے دیے تھے۔ یہ ساری جگہ ہم سب کو اور خاص طور سے چچا حفیظ کو بہت عزیز تھی کیونکہ باقی بھائیوں کے بکھر جانے کے باوجود وہ یہیں

پر مقیم رہے تھے۔

ایک دم میرا دل بھر آیا۔ میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ چچا نے پورے گھر کو رنگ و روغن کیوں کروایا ہے۔ کیوں وہ کھوئے کھوئے سے اس کے در و دیوار کو دیکھتے اور راہداریوں میں گھومتے رہتے ہیں اور آج کل ان کی روز بروز گرتی صحت کا اصل سبب کیا ہے؟

میں نے کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا یہ بالکل ہی اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے؟ کیا یہاں سرے سے کوئی قانون ہے ہی نہیں۔ وہ چچا کی جگہ ہے، اس جگہ کو ان کی مرضی کے بغیر کیسے خریدا جاسکتا ہے؟''

''جو لوگ خریدنے والے ہیں، ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ خرید سکیں۔ کیا تمہارے سامنے انہوں نے حاجی نذیر جیسے بندے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسے تیار نہیں کرلیا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ شکیل داراب کے ہاتھ میں دے دے۔ شاید تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا۔ اگلے مہینے کی دس بارہ تاریخ کو عاشرہ اور شکیل داراب کا نکاح ہو رہا ہے۔''

میں ششدر رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنی جلدی طے پا جائے گا۔ میں تو وہاں اسپتال میں عارف کو بہت حوصلہ اور تسلی دے کر آیا تھا۔ میں نے اسے باور کرایا تھا کہ اس کی آواز عاشرہ اور حاجی نذیر کی فیملی تک پہنچانے کی کوشش کروں گا اور اس زبردستی کی شادی کو رکوانے کے لیے جو بھی ہوسکا کروں گا۔

''تمہیں کیسے پتا ہے کہ اگلے مہینے یہ شادی ہو رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کنفرم اطلاع ہے۔ ویسے اب یہ شادی ہو ہی جائے تو بے چاری عاشرہ کے لیے اچھا ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی۔'' عبداللہ کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ایک بھید سا تھا۔

''تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟ حاجی نذیر اور عاشرہ نے اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈال دیے؟''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ سوچو، انہوں نے اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈالے اور اگر وہ اتنی جلدی ہار مان سکتے ہیں تو پھر چچا حفیظ بے چارے کہاں تک مزاحمت کرسکتے ہیں۔''

اس دوران میں عبداللہ کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور آٹھ دس منٹ تک بات کی۔ دوسری طرف غالباً اس کا کوئی صحافی دوست تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بات حاجی نذیر اور اس کی بیٹی کے بارے میں ہو رہی ہے۔ یہ پتا بھی چلا کہ حاجی نذیر صاحب چند دن پہلے لاہور کے پنجاب کارڈیالوجی میں ایڈمٹ ہوئے تھے اور ان کی انجیوگرافی ہوئی ہے۔

بات ختم کر کے عبداللہ نے ٹھنڈی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''وہی ہوا نا جس کا اندیشہ تھا۔ داراب فیملی کے لوگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ بس کاریگری یہی ہے کہ قانون ان کو پکڑ نہیں سکتا اور عدالتیں ثبوت اور گواہوں کے بغیر بے بس ہوجاتی ہیں۔ پتا ہے پچھلے دنوں کیا ہوا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کالے کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے بولا۔ ''حاجی نذیر صاحب کو درمیانے درجے کا اٹیک ہوا ہے اور اس اٹیک کی وجہ پتا ہے کیا ہے؟ ایک فائل... جو ایک سرکاری دفتر میں کہیں فائلوں کے نیچے دبی پڑی ہوگی دس پندرہ سال سے۔ داراب فیملی کے وکیلوں نے اس فائل کو باہر نکال لیا ہے اور جھاڑ پونچھ کر کسی میز پر سجا لیا ہے۔''

''کیسی فائل؟''

''ایک پرانے مقدمے کی۔ حاجی نذیر کی ایک شوگر مل بھی ہے۔ اس شوگر مل میں ایک بوائلر پھٹ گیا تھا۔ بوائلر پھٹنے سے تین افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ ان میں شوگر مل کی مزدور یونین کا جنرل سیکریٹری بھی تھا بعد میں یہ شور اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ سازش ہے۔ جنرل سیکریٹری کے ساتھ ایک طرح سے حاجی نذیر اور اس کے بیٹے کی دشمنی چل رہی تھی۔ اس شخص کو اسی دشمنی میں قتل کیا گیا ہے۔ ڈیڑھ دو سال کے بعد ناکافی شہادتوں اور گواہوں کی عدم موجودگی کے سبب یہ کیس سرد خانے میں چلا گیا لیکن اب اس باسی کڑی کو پھر... ابال دیا گیا ہے اور کیس کو بنا سنوار کر اس میں نئی جان ڈال دی گئی ہے۔ اس کیس کے ری اوپن ہونے پر ہی حاجی نذیر صاحب نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور خراماں خراماں دل کے اسپتال پہنچ گئے۔ ان کے اسپتال پہنچنے کا نتیجہ پتا ہے کیا نکلا؟''

''کیا نکلا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے صحافی دوست کی اطلاع کے مطابق دو تاریخ کو سہ پہر چار بجے حاجی صاحب کی بیٹی عاشرہ از خود شکیل سے ملنے اس کے شیخوپورہ والے ریسٹ ہاؤس میں پہنچی۔ وہ ایک عام سی نیلی مہران کار میں گئی جس کی کھڑکیوں پر بلائنڈر لگے ہوئے تھے۔ وہ قریباً دو گھنٹے یعنی شام سات

بجے تک اس ریسٹ ہاؤس میں رہی ہے اور اس بارے میں اب بہت سی چہ میگوئیاں بھی گردش کر رہی ہیں۔''

''کیسی چہ میگوئیاں؟''

عبداللہ نے سگریٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد کہا۔''کسی کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ اس پر بات کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بہرحال جو معلومات گردش کر رہی ہیں ان کے مطابق عاشرہ نے شکیل سے مل کر اس سے خود معاملات طے کیے ہیں اور اس سے نکاح پر رضامندی... ظاہر کی ہے۔ معاملہ طے ہونے سے پہلے ان دونوں کے درمیان جھگڑا وغیرہ بھی ہوا تھا۔ ایک موقع پر عاشرہ بڑے غصے میں شکیل کے دفتر سے باہر نکلی تھی اور اپنی مہران گاڑی میں آ بیٹھی تھی لیکن کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو شکیل بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ نہ صرف اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا بلکہ اس نے اپنے گارڈز والی ایک گاڑی عاشرہ کے ساتھ بھی بھیجی تاکہ وہ اسے مرادپور تک پہنچا آئیں۔''

میں نے گہری نظروں سے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔''تم نے شروع میں یہ کیوں کہا کہ اب عاشرہ، شکیل سے شادی کر ہی لے تو اچھا ہے؟''

عبداللہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی، بولا۔''تم بات تاڑ جاتے ہو... میرا خیال ہے بات وہی ہے جو اب تمہارے دماغ میں بھی آرہی ہے۔ وہاں عاشرہ کو بڑی بے چارگی کے عالم میں کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر معاملہ طے کرنا پڑا ہے۔ اللہ کرے ہمارا اندازہ غلط ہو لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی... شادی شدہ ہوگئی ہے۔ شکیل جیسے گھاگ کاروباری لوگ نو نقد نہ تیرہ ادھار پر یقین رکھتے ہیں۔'' عبداللہ کے لہجے میں تاسف کی جھلک تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ نشانات گھوم گئے جو عاشرہ کے دودھیا جسم پر موجود تھے اور جن پر اتفاقاً ہی میری نظر پڑی تھی۔ خاص طور سے گردن کا نشان گواہی دیتا تھا کہ وہ کسی کی آتشیں دست درازی کا شکار ہوئی ہے۔

''اوہ گاڈ۔'' میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ نہ جانے ان لمحوں میں کیوں مجھے لگا کہ میں دورِ حاضر کے کسی ملک میں نہیں قدیم زمانے کی کسی اندھی تہذیب میں رہنے والا شخص ہوں۔ جہاں عیار عقل نے سو بھیس بدل رکھے ہیں اور نت نئے طریقوں سے جبر اور مجبوری کی تاریخ رقم کر رہی ہے۔

عبداللہ کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔''شاہ زیب! میری بات کا برا نہ مانتا۔ میں اسی لیے تمہیں کہتا ہوں کہ پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میرے خیال میں تو حاجی نذیر کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو چکا ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ ان کی شادی ہو جائے اور جلد سے جلد ہو جائے۔'' میں سناٹے میں تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگا اور اتنی جلدی ہوگا۔

عبداللہ نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔''اللہ نہ کرے... اللہ نہ کرے... میرے منہ میں خاک۔ ہم پر بھی اس طرح کی کوئی آفت آجائے۔ میرا مشورہ تو چچا حفیظ کے لیے یہی تھا کہ ان لوگوں سے متھا لگانا اور ٹین شین پالنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ وہ لوگ مارکیٹ کے مطابق جگہ کی معقول رقم دے رہے ہیں بلکہ شاید وہ زیادہ بھی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ ایسے میں بہتر ہے کہ یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا جائے اور جگہ بیچ کر فوراً ہی کہیں اور جگہ خرید لی جائے۔ ولید کی بیکری شاپ بھی ابھی کرائے کی جگہ پر ہے۔ ڈھائی تین کروڑ میں اسے شاپ کے لیے اچھی جگہ مل سکتی ہے۔ مکان بنا کر باقی رقم کسی بینک میں جمع کروا دیں لیکن...''

''لیکن کیا؟''

''چچا اس جگہ پر ایسے دھنسے ہوئے ہیں جیسے بوڑھے پیپل کی جڑیں زمین میں اندر تک چلی جاتی ہیں۔ جب وہ وہاں سے جانے کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے اور بات صرف چچا ہی کی نہیں چچی کو بھی اس گھر سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔''

''وہ دونوں وہیں پلے بڑھے، وہیں جوان ہوئے، وہیں پر انہیں محبت ہوئی اور ان کی شادی بھی ہوئی پھر باقی بھائی تو ایک ایک کر کے دوسری جگہوں پر آباد ہو گئے لیکن چچا حفیظ نے اپنے حصے کی جائداد میں یہی جگہ رکھی۔ ان کی ساری عمر یہیں پر گزری ہے۔ میں جانتا ہوں یہاں کی ایک ایک اینٹ سے انہیں پیار ہے۔'' میں نے دل گیر لہجے میں کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے اب اس پیار کے خاتمے کا وقت آگیا ہے۔ جو بڑے بڑے مگرمچھ اس جگہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں، وہ اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہیں گے، بہت مشکل ہے۔''

میں نے کہا۔''ان مگرمچھوں کے کوئی نام بھی ہیں یا صرف مگرمچھ ہی کہتے ہیں انہیں؟''

وہ بولا۔''مگرمچھ نمبر ایک تو وہی لالہ نظام چودھری ہے۔ یہ شکیل داراب کے خطرناک گماشتوں میں سے ایک

ہے۔ بے حد چال باز اور زہریلا شخص ہے۔ زمیندار اور کاشت کار اس کی صورت دیکھ کر جل تو جلال تو پڑھنے لگتے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو داراب فیملی کے ذاتی منصوبوں کے لیے مختلف جگہیں اور رقبے حاصل کرتے ہیں۔ دھن، دھاندلی، دھونس سب کچھ چلاتے ہیں یہ لوگ۔ لالہ نظام نامی یہ بندہ خود بھی کروڑ پتی بن چکا ہے۔ لاہور میں دو تین پلازوں کا مالک ہے۔ مزے کی بات یا پھر کہہ لو کہ سر پیٹنے کی بات یہ ہے کہ لالہ نظام چودھری اپنے محترم و معظم ایس ایچ او قیصر چودھری کا سسر ہے۔''

''تم تو کہتے ہو کہ یہ بہت بڑے لوگ ہیں، پھر یہ اس دو ایکڑ جگہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہوئے ہیں؟''

عبداللہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''نمک معمولی سی چیز ہے لیکن ہزاروں لاکھوں روپے سے پکا ہوا کھانا بھی دس بیس روپے کے نمک کی وجہ سے بے کار ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال تم لوگوں کی دو ایکڑ زمین کی ہے۔ داراب فیملی کے لوگ یہاں ایک بڑی رہائشی اسکیم بنا رہے ہیں۔ مین سے لے کر پیچھے تک وہ سیکڑوں ایکڑ رقبہ حاصل کر چکے ہیں۔ بس فرنٹ پر دو تین لوگ ہیں جن کی دو دو تین ایکڑ زمین ہے۔ یہ زمین اسکیم میں شامل نہ ہوئی تو یہ لوگ اسے اپنے پروجیکٹ میں ٹاٹ کا پیوند سمجھیں گے۔''

عبداللہ کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ شخص جس کو تھپک تھپک کر میں نے اپنے اندر سلا رکھا تھا کسمسا کر بیدار ہو رہا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان کافی دیر تبادلۂ خیال ہوا۔ ذہن میں سیکڑوں اندیشے اور وسوسے لے کر میں عبداللہ کے پاس سے اٹھ آیا۔ میں سب سے پہلے چچا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ کی بات بار بار میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے بجائے اپنے گھر کو دیکھو شاہ زیب۔''

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر چچا کی روز بروز گرتی صحت اور پریشانیوں کا سبب یہی زمین والا معاملہ تھا تو پھر اس مسئلے کو سمجھنے اور اس کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

رات بڑی سرد تھی۔ تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ دیہاتی علاقوں میں یہ وقت مکمل خاموشی اور ویرانی کا ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنے بستروں میں دبک چکے ہوتے ہیں۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی مگر میں جاگ رہا تھا۔ میں چچا حفیظ سے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ عشا کے بعد سے اپنے ایک ہم عمر دوست کے ساتھ بیٹھے تھے اور یہ شخص جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس شخص نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر پگڑی اور بال قدرے لمبے تھے۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھے حقہ گڑگڑا کر مسلسل باتیں کر رہے تھے۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ پروگرام کل تک ملتوی کر دوں کہ اچانک مجھے لگا کہ چچا کا دوست اٹھ کر جانے والا ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے چچا اور ان کے دراز گیسو دوست کو بیٹھک سے نکل کر احاطے کی طرف جاتے دیکھا۔ جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ دونوں ہی کہیں جا رہے ہیں۔

رات کے اس پہر اتنی سردی میں وہ کہاں کا ارادہ رکھتے تھے؟ میں نے شلوار قمیص پر چادر کی بکل لپیٹی اور چپل پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں احاطے کی نیم تاریکی میں داخل ہوئے تو میں بھی خاموشی سے ان کے عقب میں چل پڑا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بیرونی پھاٹک کی طرف جانے کے بجائے باغ کی طرف جا رہے ہیں پھر مجھے ایک اور چیز نظر آئی۔ باغ کے اندر شاید کہیں تھوڑی سی آگ بھی جل رہی تھی۔ آگ تو نظر نہیں آئی لیکن سرخ روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ حویلی کے باقی حصے پر مکمل سناٹے کا رواج تھا۔ زنانہ حصے میں فقط ایک بلب کی مدھم روشنی موجود تھی۔ چچا اور ان کا دوست ٹھٹھرے ہوئے اوس زدہ باغ میں داخل ہوئے تو میں بھی احتیاط سے درختوں کے اندر چلا گیا۔ یہاں کینو اور امرود کے بہت سے کوتاہ قد درخت موجود تھے۔ میں نے ان درختوں کے اندر سے ایک عجیب منظر دیکھا۔ آگ کے دو الاؤ روشن تھے۔ ایک چھوٹا اور ایک قدرے بڑا۔ بڑے الاؤ کے پاس ایک لڑکی، لڑکا ڈرے سہمے سے بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیوں ان کے لباس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ شاید ایک آدھ دن پہلے ہی۔ دونوں لباس اور صورت سے غریب طبقے سے لگتے تھے بلکہ کافی زیادہ غریب۔ لمبے بالوں والے شخص نے ان دونوں کے پاس جا کر کچھ کہا اور دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چچا حفیظ کا ایک اعجاز نامی ملازم بھی یہاں موجود تھا۔ اعجاز حجام کا کام بھی کرتا تھا۔ اعجاز اور لمبے بالوں والے شخص نے الاؤ کے سامنے دو تین بڑی بڑی چادریں اس طرح تان دیں کہ لڑکی لڑکا نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

چچا حفیظ اور لمبے بالوں والا شخص کچھ دور جا کر چھوٹے الاؤ کے پاس بیٹھ گئے۔ چچا حفیظ تو حقہ گڑگڑانے لگے جبکہ لمبے بالوں والا ایک مالا نکال کر کچھ پڑھنے میں مصروف

ہو گیا۔ یکا یک مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ چادروں کے پیچھے اوجھل لڑکی، لڑکا یونہی نہیں بیٹھے ہوئے بلکہ وہ لیٹے ہوئے ہیں اور شاید نئے نویلے دولھا دلہن کی حیثیت سے قربت کے لمحات گزار رہے ہیں۔ یہ سب کچھ بے حد انوکھا اور تحیر خیز تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سب کچھ کسی جادو ٹونے یا سفلی عمل کا حصہ ہے۔ میں چچا حفیظ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پختہ عقیدہ رکھتے تھے اور توہمات سے دور تھے پھر یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا اور کیوں؟ لمبے بالوں والا شخص مسلسل اپنی مالا کو گردش دینے میں مصروف تھا۔

قریباً ایک گھنٹا اسی عالم میں گزرا۔ سرد تاریکی میں پنجوں کے بل بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑنے لگا تھا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی اس طرف آ نہ جائے۔ بالآخر یہ امتحان ختم ہوا۔ میں نے دیکھا کہ غریب صورت لڑکے نے سامنے والی چادر ہٹائی اور خجل خجل سا لمبے بالوں والے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لڑکی ابھی تک الاؤ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ایک لمبے گھونگٹ میں چھپا لیا تھا۔ تب الاؤ کی مدھم روشنی میں مجھے وہ فرشی بستر بھی دکھائی دیا جس پر لڑکا، لڑکی موجود رہے تھے۔ دراز بالوں والا آگے بڑھا، اس نے گھاس پر بچھا ہوا بستر تہ کیا اور ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے دلہن نما لڑکی کی چوڑیاں اتروائیں، اس کے گہنے اتروائے جو غالباً پیتل وغیرہ کے تھے پھر اس نے لڑکی کی کلائیوں سے پھولوں کے گجرے بھی اتروائے۔ یہ سب چیزیں اس نے تہ شدہ بستر کے اندر رکھیں۔ میری نگاہ الاؤ کی دوسری جانب ایک چھوٹے سے گڑھے پر پڑی۔ یہ گڑھا شاید دو تین گھنٹے پہلے ہی کھودا گیا تھا۔ اطراف میں تازہ مٹی نظر آتی تھی۔

دراز گیسو شخص نے بستر کو دیگر اشیا سمیت بڑی احتیاط سے گڑھے میں رکھوا دیا۔ پھر اس نے اعجاز کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا، اس نے گردن کے پیچھے سے لڑکے کے کچھ بال قینچی کی مدد سے کاٹ لیے۔ پھر یہی عمل اس نے لڑکی کے ساتھ دہرایا۔ تاہم لڑکی کے بال چاروں طرف سے کاٹے گئے اور اس بے چاری کو تقریباً مونڈ کر رکھ دیا گیا۔ وہ شرم وحیا سے سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ یہ سارے بال اور لڑکے کے بال اکٹھے کیے گئے اور انہیں بستر کے ساتھ ہی گڑھے میں رکھ دیا گیا۔ پھر اعجاز نے بیلچے کی مدد سے گڑھے پر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔

چچا نے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چچا کی مدھم آواز ہوا کے دوش پر تیر کر میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ وہ اس سے کہہ رہے تھے۔ ”مجھے معاف کرنا بچی، یہ ہماری مجبوری تھی۔ تم نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے اور تم نے بھی۔“ انہوں نے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے واسکٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور لڑکے کے حوالے کیے۔ اس کے بعد سب لوگ پھاٹک کی طرف چلے گئے۔ بڑا الاؤ پانی کے چھینٹے دے کر بجھا دیا گیا۔ بس چھوٹا الاؤ جلتا رہا اور لمبے بالوں والا شخص اس کے پاس بیٹھ کر کچھ پڑھتا رہا۔

یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی کہ یہ کوئی جھاڑ پھونک کا عمل ہوا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق چچا کی اس پریشانی سے ہو جس نے انہیں گھیرا ہوا ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ شدید پریشانیاں راسخ العقیدہ لوگوں کو بھی شدید واہموں کے سپرد کر دیتی ہیں۔

اگلے روز چچا حفیظ سے میری ملاقات ہوئی۔ تاہم میں نے رات والے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اشارہ تک نہیں دیا۔ میں نے بیکری کے کام کی اور پھر زمین کے ٹھیکے کی بات چھیڑ دی۔ باتوں باتوں میں، میں نے وہ کہہ دیا جس کے لیے میں موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چچا! مجھے پتا چلا ہے کہ اس علاقے میں کوئی بڑی رہائشی اسکیم بن رہی ہے اور کچھ لوگ اردگرد کے رقبے خرید رہے ہیں؟“

چچا کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”ہاں کچھ ایسا سلسلہ چل تو رہا ہے لیکن جو بیچنا چاہے گا وہی بیچے گا۔ ہم تو نہیں بیچیں گے۔“

”آپ سے کسی نے رابطہ نہیں کیا؟“

”ہاں، کچھ دن پہلے ایک بندہ آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ یہ ہماری آبائی جگہ ہے۔ ہمارے چند بزرگوں کی قبریں بھی ہیں یہاں۔ ہم نے اسے فروخت نہیں کرنا۔“ چچا نے گول مول سا جواب دیا۔

چچا اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن میں مسلسل ان کے کان کھاتا رہا۔ وہ واضح طور پر اپنی پریشانیاں چھپا رہے تھے۔ مجھے ان پر بے حد ترس آیا۔ وہ سب کچھ اپنے اوپر لیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اکلوتے بیٹے ولید کو بھی بے خبر رکھا ہوا تھا۔

اس نئے چکر کا علم ہونے کے بعد عاشرہ اور اس پر ہونے والے جبر کا واقعہ تو وقتی طور پر میرے ذہن سے نکل گیا۔ اگلے چھ سات روز میں، میں نے کچھ بھاگ دوڑ کی۔ میں نے عبداللہ کو اپنے ساتھ ملایا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ اگر ہم یہ جگہ نہ بیچنا چاہیں تو اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایسی بات ہرگز نہیں تھی کہ اگر دو تین شہریوں کا یہ

پانچ چھ ایکڑ رقبہ اسکیم میں شامل نہ ہوتا تو اسکیم کو کسی طرح کا نقصان پہنچتا۔ اتنے بڑے پراجیکٹ کے لیے اس ٹکڑے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بس اتنا تھا کہ اسکیم کی باؤنڈری وال میں ایک جگہ تھوڑا سا خم آجاتا تھا اور بڑے لوگ ایسے خم برداشت نہیں کرتے۔ نہ باؤنڈری والز میں نہ اپنی گردنوں میں۔ وہ ضد بنالیتے ہیں اور اسے پورا کرنے کے لیے ہر حد تک جاتے ہیں۔ ان چھ سات دنوں میں مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ فی زمانہ ہمارے جیسے ملکوں میں انصاف کا حصول کتنا مشکل ہے۔ آگے جانا تو دور کی بات ہے پہلا قدم اٹھانا ہی دشوار ہورہا تھا۔ کہیں بدنیت پٹواری بیٹھا تھا، کہیں تنگ مزاج تحصیل دار، کہیں کرپٹ ایم پی اے اور کہیں قیصر چودھری جیسا خودسر افسر۔ آجا کے صرف ایک شخص ایسا تھا جس نے کچھ توجہ سے ہماری بات سنی لیکن عملی طور پر وہ بھی بے بس نظر آیا اور یہ تھا جواں سال ایس پی تبریز۔

میں ایک سینئر وکیل سے مل کر رات کو گھر واپس آیا تو چچا حفیظ دوا کھا کر سوگئے تھے۔ چچی نے مجھ سے کھانے کا پوچھا اور شکوہ کیا کہ میں نہ جانے کہاں بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں۔ چچا زاد بہن فائزہ نے بھی اسی طرح کا گلہ شروع کردیا۔ وہ سب اس بات سے بے خبر تھے کہ اس گھر پر کیا مصیبت آئی ہوئی ہے۔ جس طرح کی صورتِ حال تھی عین ممکن تھا کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر ان لوگوں کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے نکلنا پڑتا اور فائزہ بے چاری جو بابل کے اس پیارے آنگن سے شہنائیوں کی گونج میں رخصت ہونے کا سوچ رہی تھی۔ اس رخصتی سے پہلے ہی زبردستی یہاں سے نکال دی جاتی۔

میں نے چچی سے پوچھا۔ ''ولید کہاں ہے؟''

وہ بولیں۔ ''کہہ رہا تھا سر میں درد ہے۔ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔''

میں برآمدے سے گزر کر ولید کے کمرے تک پہنچا۔ دو تین بار دروازے پر دستک دی آخر اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟''

وہ جان چکا تھا کہ دروازے پر میں ہوں پھر بھی دروازہ کھولنے سے ہچکچا رہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ کافی تاخیر سے اس نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک ناگوار بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ولید نے شراب پی رکھی ہے یا شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے تک بھی پی رہا تھا۔ بہرحال کمرے میں کسی طرح کا کوئی ثبوت دکھائی نہیں دیا۔

میں نے اسے سرتاپا دیکھا اور غصے سے کہا۔ ''ولید! تم نے نشہ کررکھا ہے؟''

پہلے تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرایا پھر وہ ایک دم بے پروا نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے بجائے غصے کی سرخی پھیلتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ تب میری نگاہ ایک اور چیز پر پڑی اور میری پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ ولید نے شلوار قمیص اور چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی جیکٹ کی ایک جیب مجھے غیر معمولی طور پر پھولی نظر آئی۔ میں نے اس کی جیب ٹٹولی، اس نے ایک دم میرا ہاتھ پیچھے ہٹادیا۔ میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ اس کی جیب میں وہی پسٹل موجود تھا جو چندروز پہلے میں نے اس کی کار میں نشست کے نیچے دیکھا تھا۔

''یہ سب کیا ہے ولید؟'' میں نے تلملا کر پوچھا۔

اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ پھنکار کر بولا۔ ''شاہ زیب! یہ مارا جائے گا۔ میں تمہیں لکھ کر دیتا ہوں یہ مارا جائے گا... میں ماردوں گا اسے۔''

''کس کی بات کررہے ہو؟ کون مارا جائے گا؟''

''یہی کمینہ قیصر چودھری۔ اس کی موت میری گولی سے ہونی ہے۔ سیدھی ماتھے پر ماروں گا، سیدی اس جگہ۔'' اس نے انگلی سے اپنی پیشانی کو چھو کر بتایا۔

''ہوا کیا ہے یار؟ کچھ پتا تو چلے؟''

''وہ رذیل کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اب میں اسے بتاؤں گا کہ جب شریف آدمی بدمعاشی پر اترتا ہے تو پھر اس جیسے تھانے دار کا کیا حشر ہوتا ہے۔''

ولید کا انداز خطرناک سے خطرناک ہوتا جارہا تھا۔ اس کے غیظ وغضب کو الکحل کی گرمی نے دوآتشہ کردیا تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ جو باتیں اب تک چچا حفیظ اور عبداللہ تیز مزاج ولید سے چھپارہے تھے وہ اس کے علم میں آگئی ہیں۔ اگر ساری نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور آگئی ہیں۔

میں نے اس کے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب رہا۔ میں نے اصرار کرکے پوچھا تو اس نے انکشاف انگیز لہجے میں مجھے وہی کچھ بتایا جو مجھے کئی دن پہلے معلوم ہوچکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''لالہ نظام نامی بندہ زبردستی ہماری یہ آبائی جگہ خریدنا چاہ رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ بدفطرت شخص رشتے میں ایس ایچ او قیصر چودھری کا سسر ہے اور دراصل قیصر ہی وہ شخص ہے جو بار بار اس کے والد (چچا حفیظ) سے رابطہ کررہا ہے اور زمین بیچنے کا تقاضا

کر رہا ہے۔'' یہ باتیں بتاتے ہوئے ولید کی آنکھوں میں دکھ آمیز طیش کی لالی تھی جسے شراب کی لالی نے دو چند کر دیا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ''مجھے اب پتا چلا ہے شاہ زیب بھائی کہ اباجی کی صحت روز بروز خراب کیوں ہو رہی ہے۔ یہ خبیث تھانے دار جونک کی طرح ان کو چمٹا ہوا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، اباجی کس طرح کے بندے ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی جادو ٹونے اور جھاڑ پھونک والی باتوں پر یقین کیا ہے۔ کیا وہ ایسی باتیں کرنے والوں سے جھگڑ نہیں پڑا کرتے تھے؟''

''ہاں ایسا ہی تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب دیکھو، وہ اس قدر پریشان ہیں کہ ان جیسا بندہ بھی ایسی چیزوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مجھے استاد کھ ہوا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ شاید تمہیں بھی سن کر حیرانی ہو۔ کچھ دن پہلے وہ ایک عامل سے ملے ہیں۔ وہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ اس نے اباجی سے کافی روپے بٹورے ہیں اور جھاڑ پھونک کا عمل بھی کیا ہے۔''

''کیسا عمل؟'' میں نے جانتے بوجھتے پوچھا۔

ولید کچھ دیر تو تذبذب میں رہا پھر اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کہا کہ عامل نے اباجی کو بتایا کہ اگر کوئی شریف پاک دامن لڑکی شادی کے بعد اپنی پہلی رات اس گھر میں گزارے اور پھر اس کی سہاگ رات کی نشانیاں یہیں پر کسی گڑھے میں دفن کرنے کے بعد خاص وظیفہ پڑھا جائے تو یہ جگہ محفوظ ہو سکتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اباجی نے یہ سب کچھ کیا۔ انہوں نے بڑی رازداری کے ساتھ اعجاز کو یہ سب کچھ بتایا اور اس نے قریبی کچی بستی سے ایک ایسا جوڑا ڈھونڈ نکالا جس کی آٹھ دس روز میں شادی ہونے والی تھی۔ ان کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا گیا کہ وہ نکاح کے بعد حویلی میں رات گزاریں۔

ولید نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو میں ایک رات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور جس نے مجھے حیرت کے دریا میں غوطے دیے تھے۔ میں نے ولید سے پوچھا کہ اسے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس نے باغ میں وہ گڑھا خود دیکھ لیا تھا۔ شک ہونے پر اس نے وہ گڑھا کھودا تو اس میں سے بستر اور دوسری چیزیں نکلیں۔ اس کے ساتھ ہی کٹے ہوئے بال اور ایک قینچی بھی ملی جو شاید غلطی سے گڑھے میں چلی گئی تھی۔ یہ قینچی دیکھنے کے بعد ولید کو اعجاز پر شک ہوا۔ اس نے سختی کے ساتھ اعجاز سے پوچھ گچھ کی تو اس نے سب کچھ بتا دیا۔ بعد میں طیش سے بھرے ہوئے ولید نے پہلے والدہ اور پھر والد سے بات کی، اسے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اس کے بعد آج شام بپھرا ہوا ولید تھانے پہنچا۔ وہاں تھانے دار قیصر سے تو اس کی ملاقات نہیں ہوئی تاہم قیصر کے حوالدار سے اس کا سامنا ہوا۔ دونوں میں سخت تلخ کلامی اور گالم گلوچ بھی ہوا۔ اب تلملایا ہوا ولید آبلہ پا پھر رہا تھا اور اپنے اندر کی آگ کو جام سے بجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ابھی میری اور ولید کی گفتگو جاری تھی کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور مجھے چچا حفیظ کی صورت نظر آئی۔ ان کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ انہوں نے غضب ناک نظروں سے ولید کو دیکھا اور گرجے۔ ''اپنا اوچھا پن دکھا دیا نا تو نے... اپنی مرضی کر لی نا؟ تو ہے ہی لعنتی۔ تجھ سے ایسی ہی امید تھی۔''

ولید بھی دہاڑا۔ ''ہاں... میں ہوں لعنتی اور میں وہی کچھ کروں گا جو میرے دل میں آئے گا۔ میں جان لے لوں گا اس کمینے کی۔''

چچا حفیظ آگے بڑھے اور انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ ولید کے گال پر رسید کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھنکارے۔ ''تو ٹھیک ہے، مار دے اس کو اور اس سے پہلے ہم کو مار دے۔ ہماری ہڈیاں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ اب پولیس کی مار سہنے اور جیلیں کاٹنے کے لائق نہیں ہیں ہم۔ پہلے ہمیں گولی مار۔''

اس کے ساتھ ہی چچا حفیظ نے دیکھ لیا کہ ولید کی جیکٹ کی سائڈ والی جیب میں پستول ہے۔ انہوں نے جھپٹ کر پستول نکال لیا اور اسے ولید کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے۔ ''چل مار گولی پہلے اپنے اس منحوس باپ کو۔ مار... مار... پھر جا کر اپنی ماں کو مارنا اور پھر بہن کو بھی ختم کرنا، نہیں تو وہ دونوں ذلیل ہو جائیں گی تھانوں کے اندر۔''

چچا حفیظ کا پورا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا اور غیظ و غضب کے سبب گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں انہیں اٹیک ہی نہ ہو جائے۔ میں نے پستول ان کے ہاتھ سے لیا اور انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہی وقت تھا جب گھر سے باہر پولیس موبائل کا تیز سائرن سنائی دیا۔

چچا حفیظ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے زرد رنگ لہرایا گیا۔ وہ ایک سیکنڈ خاموش رہے پھر کراہتی ہوئی آواز میں ولید سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''لے اب کر لے بدمعاشی۔ لڑ لے پولیس والوں کے ساتھ... تیرے ایک تھپڑ کے بدلے انہوں نے تیری ساری ہڈیوں سے گوشت الگ نہ کر دیا تو نام بدل دینا میرا۔''

ولید سینہ تان کر آگے بڑھا۔ شاید وہ باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا اور دھکیل کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا میں نے اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا۔ برآمدے کی طرف سے چچی آمنہ کے رونے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں یقیناً انہیں بھی اندر ہونے والے ہنگامے کا پتا چل گیا تھا۔ میں نے چچا حفیظ کو ساتھ لیا اور برآمدے میں آگیا۔ چچی کے علاوہ فائزہ بھی ڈری سہمی کھڑی تھی۔ بیرونی پھاٹک دھڑادھڑ بجایا جارہا تھا۔ چچا حفیظ لڑکھڑاتے ہوئے میرے ساتھ چل دیے۔ ہم نے پھاٹک کا چھوٹا سا دروازہ کھولا۔ لمبا تڑنگا قیصر چودھری اور اس کا عملہ تیزی سے اندر آگیا۔ قیصر ہمیشہ کی طرح پُرسکون نظر آرہا تھا مگر آنکھوں میں قہر کی بجلیاں سی کوندرہی تھیں۔ ساتھ میں حوالدار بھی تھا۔ اس کے گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور چہرہ ایک طرف سے سرخ تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ تھانے میں ولید اور حوالدار کے درمیان صرف تلخ کلامی ہی نہیں ہوئی تھی ہاتھا پائی بھی ہوئی ہے اور شاید ولید نے یہ فاش غلطی بھی کی ہے کہ حوالدار پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس نے یقیناً اپنے لیے بڑی مشکل پیدا کرلی تھی۔ شاید گھاگ حوالدار نے اسے جان بوجھ کر مشتعل کیا تھا۔

''کدھر ہے وہ آپ کا بدمعاش پتر؟ اسے تھانے لے جانا ہے۔'' قیصر چودھری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

چچا حفیظ نے لرز کر کہا۔ ''نہیں تھانے دار پتر، اس کی غلطی کی سزا ہم سب کو نہ دو...... میں... میں خود اسے چھتر ماروں گا۔ وہ... معافی مانگے گا تم سب سے، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے گا۔''

''معافی تو اس نے مانگنی ہی ہے بزرگو اور چھتر شتر مارنے کا بھی بڑا تسلی بخش انتظام ہے ہمارے پاس۔ آپ اسے بس ہمارے ساتھ رخصت کردیجیے۔''

میں نے دیکھا ایک طرف سے چچی آمنہ تڑپ کر آگے بڑھیں اور انہوں نے تھانے دار قیصر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''نہ میرا پتر، وہ تو بچہ ہے، بے عقل ہے۔ اس کی طرف سے ہم تجھ سے معافی مانگتے ہیں۔ اس کی بہن کی برات آنے والی ہے کچھ دنوں میں... اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس کی غلطی کا جو ہرجانہ کہو ہم دے دیتے ہیں۔''

چچی اشک بار آنکھوں کے ساتھ قیصر کی منت سماجت کرنے لگیں۔ میں نے چچی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''چچی! آپ اندر جائیں۔ ہم بات کررہے ہیں ناں۔''

تھانے دار طنزیہ انداز میں بولا۔ ''آہو جی، آپ اندر جاؤ۔ آپ کے یہ ببر شیر جوان پتر بات کررہے ہیں ناں ہم سے۔ ان کے ہوتے ہوئے آپ کو منت ترلے کرنے کی کیا ضرورت۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اے ایس آئی کو اشارہ کیا۔ وہ دو تین سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس بار چچا حفیظ سامنے آگئے۔ انہوں نے قیصر کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا۔ ''ہماری بڑی بے عزتی ہوگی پتر۔ تم...... تم بس ایک منٹ کے لیے ایک طرف ہوکر میری بات سن لو۔''

چچا منت کرکے قیصر کو ایک طرف لے گئے اور بڑے التجا بھرے لہجے میں اس سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ وہ لوہے کا تھن بنا کھڑا تھا۔ اس کا عملہ دزدیدہ نگاہوں سے چچی کے علاوہ ڈری سہمی فائزہ کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو زبردستی زنان خانے کی طرف بھیج دیا۔ چچا حفیظ اور قیصر میں بات لمبی ہوتی جارہی تھی۔ بات لمبی ہونے سے یہ امید پیدا ہونے لگی کہ شاید بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے پھر میں نے دیکھا چچا حفیظ تیزی سے زنان خانے کی طرف گئے۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹے تو ان کے ہاتھوں میں ایک موبائل فون تھا۔ یہ شاید فائزہ کا فون تھا۔ چچا نے اس پر ایک نمبر پریس کیا۔ کسی سے تھوڑی سی بات کی پھر کانپتے ہاتھوں سے یہ فون قیصر کی طرف بڑھادیا۔ قیصر فون پر بات کرنے لگا۔ آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن قیصر کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دوسری طرف سے بولنے والے شخص کو اہمیت دینے پر مجبور ہے۔ اس نے ایک دوبار اثبات میں بھی سر ہلایا اور تھوڑی سی بات بھی کی پھر اس نے بڑی ناگواری سے بات ختم کرنے کے بعد فون سیٹ چچا حفیظ کی طرف بڑھادیا۔

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے بزرگو! آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ ہم آپ کے خادم تو بس چھتر شتر کھانے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے پتر جی سے پوچھ لیں اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو میں اپنا منہ بھی حاضر کردیتا ہوں اس کے چھتروں کے لیے۔''

اس کے زہریلے لہجے نے چچا کو ایک بار پھر لرزا دیا۔ انہوں نے قیصر کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا۔ ''کیسی بات کررہا ہے پتر، آپ تو حاکم ہو۔''

''حاکم آپ ہو چاچا جی۔ کسی بھی وقت ہماری پیٹی اتروا سکتے ہو اور پینٹ بھی... چلیں ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوگی۔''

میں نے چونک کر قیصر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک برق سی تھی اور ایسی ہی برق اس کے لہجے میں بھی کوند رہی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس خطرناک تھانے دار نے یہ سب کچھ ہضم نہیں کیا اور ہوسکتا ہے کہ وہ اس کا کوئی بہت سنگین ردِعمل ظاہر کرے۔

قیصر چودھری اپنے عملے سمیت واپس چلا گیا۔ چچا حفیظ برآمدے سے گزر کر اندرونی حصے میں پہنچے۔ انہوں نے بند کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک بار پھر ولید پر برس پڑے۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں اور کہا کہ وہ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے بنے بنائے کام کا بیڑا غرق کرنے والا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''اللہ سائیں ہم پر کرم کر رہے ہیں۔ ہماری مصیبتیں دور ہونے کی امید بن رہی ہے اور تم اپنی خرد ماغی کی وجہ سے نئی مصیبتیں ہمارے گلے میں ڈال رہے ہو۔''

ولید باپ کے ادب کی وجہ سے خاموش تھا ورنہ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے چیخ رہا ہے اور قیصر اور اس کے ماتحتوں کے خلاف غصے سے بھرا ہوا ہے۔ یہ ہنگامہ ذرا کم ہوا تو میں اور چچا حفیظ بیٹھک میں آ بیٹھے۔ چچا بدستور بول رہے تھے۔ ''تم لوگ ابھی بچے ہو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ تمہیں پتا نہیں قیصر چودھری کا کلّہ کتنا مضبوط ہے۔ یہ بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ سوچو جب حاجی نذیر جیسے لوگ ان کا ایک جھٹکا نہیں سہہ سکتے تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔''

اس دن چچا حفیظ نے کھل کر مجھے زمین والے معاملے کی ساری رُوداد سنائی اور بتایا کہ ان کی پریشانیوں کی بنیاد کیا ہے۔ یہ سب کچھ مجھے پہلے سے معلوم تھا تاہم میں نے ایسے ہی سنا جیسے پہلی بار سن رہا ہوں۔ چچا حفیظ نے اسلام آباد کے ایک بااثر شخص اخلاق پراچہ کا نام لیا اور بتایا کہ اللہ نے شاید اس شخص کو ان کے لیے رحمت کا فرشتہ بنایا ہے۔ وہ اس سلسلے میں دل وجان سے مدد کر رہا ہے اور امید پیدا ہوگئی ہے کہ ان کی زمین اسکیم میں آنے سے بچ جائے گی۔

اخلاق پراچہ کا نام چچا حفیظ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی لیا تھا جب انہوں نے بپھرے ہوئے قیصر چودھری کو فون کروایا تھا۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ فون بھی اسی اخلاق پراچہ نامی شخص کا تھا۔ چچا نے مجھے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ تاہم مجھے اپنے طور پر ہی اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نیک نام بیوروکریٹ ہے۔

چچا حفیظ نے کہا۔ ''میں پرسوں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ اللہ سوہنے سے بڑی امید ہے کہ یہ معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔''

چچا کی باتوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اندرونی طور پر خود کو کافی مضبوط محسوس کر رہے ہیں۔

چچا کے کہنے پر میں نے ولید کے ساتھ ایک طویل نشست کی اور اسے سمجھا بجھا کر کچھ ٹھنڈا کیا۔ چچا نے پرسوں کا کہا تھا لیکن وہ اگلے روز ہی شام کو اسلام آباد چلے گئے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سادہ سی گٹھی اور باداموں دستش والا گڑ بھی لے کر گئے تھے۔ قیصر چودھری کے ساتھ ولید نے جو جھگڑا کیا تھا اس کی وجہ سے چچی آمنہ کے ہونٹ ابھی تک سوکھے ہوئے تھے۔ فائزہ بھی پریشان نظر آتی تھی۔ اس کی شادی کے دن قریب آرہے تھے لیکن گھر میں خوشی کا ماحول کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چچا کی واپسی کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں عاشرہ والا معاملہ بھی کبھی کبھی بجلی کی طرح کوندجاتا تھا۔ عبداللہ نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ بے چاری بن بیاہی بیوی بن چکی ہے اور اب کلی طور پر شکیل اور اس کی زور آور فیملی کے رحم وکرم پر ہے۔ میرے ذہن میں بار بار ویران آنکھوں اور غمزدہ چہرے والے عارف کا تصور بھی ابھرتا تھا۔ میں نے حادثے والی رات اس کی جان بچائی تھی لیکن وہ کہتا تھا کہ میں نے اسے مرنے دیا ہوتا تو اچھا تھا۔ میں اسپتال میں اس سے وعدہ کرکے آیا تھا کہ اس کے لیے جو کچھ ہوسکا ضرور کروں گا لیکن میرے کچھ سوچنے یا کرنے سے پہلے ہی حالات کیا سے کیا ہوگئے تھے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک بااثر گھرانے کی تعلیم یافتہ عاقل بالغ لڑکی کو اس طرح مجبور و بے بس کیا جاسکتا ہے۔ میں اس بارے میں عبداللہ سے بھی مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

چچا حفیظ کی واپسی دوسرے روز شام کو ہوئی۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ مطمئن واپس آئے ہیں۔ ان کے سنجیدہ چہرے کے نیچے دبی دبی خوشی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ واپس آنے کے بعد وہ دیر تک زنان خانے میں رہے پھر بیٹھک میں آئے اور مجھے اور عبداللہ کو بتایا کہ ان کا سفر بڑا کامیاب رہا ہے۔ وہ کھل کر نہیں بتا رہے تھے لیکن ان کے لب ولہجے سے پتا چل رہا تھا کہ آج شاید کئی ماہ کے بعد وہ پہلی بار قدرے سکون محسوس کر رہے ہیں۔

اگلے روز شام کو فائزہ کی مایوں کی رسم ہونا تھی۔ چچا نے اعلان کیا کہ یہ رسم حویلی کی چھت پر شامیانوں کے

اندر ہوگی۔ دراصل وہ ایک پرانی تقریب کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ پرانی تقریبوں کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو حویلی میں ہونے والے کئی فنکشن گھر کی وسیع چھت پر ہوئے تھے۔ ہم لوگ اسے بہت انجوائے کرتے تھے۔ دوپہر سے ہی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ قمقمے لگائے گئے، شامیانے تانے گئے، بہت تھوڑی تعداد میں مہمان بلائے گئے تھے لیکن سب قریبی تھے۔ رات دس گیارہ بجے تک ہلا گلا رہا۔ فائزہ کے لیے مایوں کی چھوٹی موٹی رسمیں ادا کی گئیں۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ہم دو تین کزن کچھ دیر دہکی ہوئی انگیٹھی کے قریب بیٹھے رہے اور اس گھر سے وابستہ بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

بارہ بجے کے قریب سب سونے کے لیے چلے گئے اور قریباً ایک بجے کے قریب وہ واقعہ ہوگیا جس نے سب کچھ تہ و بالا کیا اور ہمارے اس حویلی نما مکان میں قیامت صغریٰ برپا کردی۔

میں اوپر تلے ہونے والے دو یا تین دھماکوں کی وجہ سے بیدار ہوا تھا۔ ولید بھی میرے قریب ہی پلنگ پر سو رہا تھا۔ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ہم دونوں ننگے پاؤں ایک ساتھ کمرے سے باہر نکلے۔ کلیجا منہ کو آگیا۔ زنان خانے کا بیشتر حصہ آگ کی لپیٹ میں تھا پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ آگ کسی طوفانی ریلے کی سی تیزی سے مردانے حصے کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ گیس کے سلنڈر پھٹ رہے ہیں۔'' ولید چلّا کر بولا۔

یقیناً یہ گیس سلنڈر ہی تھے۔ بیکری کا کام زنان خانے کے بالکل عقب میں ہوتا تھا۔ وہاں پکائی کے کام کے لیے گیس کے سلنڈر رکھے گئے تھے۔ اچانک میری نگاہوں نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ شاید میرے لفظوں میں وہ سکت نہ ہو کہ میں اس منظر کی ہولناکی کو بیان کرسکوں۔ میں نے فائزہ کو دیکھا۔ اس کے بالوں اور سارے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ دوسری منزل پر تھی۔ دیوانہ وار چلّاتی ہوئی بالکونی کی طرف آئی۔ اس نے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن بالکونی کے جنگلے میں ہی کہیں اٹک گئی۔ اسی دوران میں بالکونی کا جلتا ہوا بہت بڑا چھجا ایک دھماکے سے بالکونی پر گرا اور سب کچھ آگ کے بے اماں الاؤ میں گم ہوگیا۔

ولید ''فائزہ... فائزہ!'' پکارتا ہوا شعلوں کی طرف بڑھنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے کمر سے تھام کر اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ مجھے ایک طرف چچا حفیظ نظر آئے۔ انہیں تین چار افراد نے تھام رکھا تھا۔ وہ خود کو چھڑا کر آگ کی طرف جانا چاہ رہے تھے۔ وہ دلدوز انداز میں چچی کا نام لے رہے تھے۔

''آمنہ اندر ہے... مجھے چھوڑ دو... آمنہ اندر ہے۔''

انہیں تھامنے والے شاید جانتے تھے کہ اب اندر جانا بے سود ہے اور یہ واقعی بے سود ہی لگتا تھا۔ دروازوں کے اندر آگ کے پھنکارتے ہوئے مہیب شعلوں کے سوا اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حویلی کے دو تین ملازم اور اردگرد کے چند رہائشی قریبی جوہڑ سے بالٹیاں بھر بھر کر آگ پر ڈال رہے تھے لیکن یہ آگ ایسے بجھنے والی کہاں تھی۔ چچا حفیظ زمین پر پچھاڑیں کھانے کے بعد نیم بے ہوش سے ہوگئے تھے۔ کئی افراد نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ ولید کی بھی بری حالت تھی۔ میں کوشش کرکے ڈیوڑھی کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر ماسی کو شعلوں سے نکال لایا تھا اور اب سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا تھا پھر میری ٹانگوں میں سے جان جیسے ختم ہوگئی۔ میں پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میرے چاروں طرف جیسے کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ہر طرف رونے چلّانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

''یہ سب کیا ہوا... یہ سب کیسے ہوا ہے؟'' اور جب یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا تب نہ جانے کیوں اس وقت ایک چہرہ بھی تصور کے پردے پر ابھر آیا۔ یہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ قیصر چودھری کا چہرہ تھا۔ وہ بہت زہریلی نظروں سے چچا حفیظ کی طرف دیکھ رہا تھا پھر میری سماعت سے اس کے فقرے کی بازگشت ٹکرائی۔ اس نے تیزابی لہجے میں کہا تھا۔ ''چلیں ٹھیک ہے پھر ملاقات ہوگی۔''

اچانک ولید میری طرف آیا اور مجھے دونوں کندھوں سے جھنجوڑ کر بولا۔ ''دیکھ لیا نا تم نے... یہی ہونا تھا... یہی ہونا تھا... یہ کسی اور نے نہیں کیا۔ یہ اسی کمینے کا کام ہے۔ اس نے برباد کردیا ہے ہمیں۔ اس نے ہمیں جیتے جی مار دیا۔ میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔ اس کا خون پی جاؤں گا۔ میں ان سب کے ٹکڑے کردوں گا... ابھی، اسی وقت...'' وہ جیسے غیظ و غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

ابھی ثبوت کوئی نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بھی کہہ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا، سچ ہے۔ اس حویلی کو آگ حادثاتی طور پر نہیں لگی تھی۔ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ تھا۔ اس

کے پس منظر میں کسی کی درندگی پھنکار رہی تھی۔۔۔ اور اس کے ڈانڈے کسی کی ہوس سے اور سازش سے جڑے ہوئے تھے۔

یکا یک ولید دیوانہ وار بیرونی پھاٹک کی طرف دوڑا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں بھرا ہوا پستول موجود ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھاٹک پار کر گیا۔ میں سب کچھ بھول بھال کر اس کے پیچھے لپکا۔

''رک جاؤ ولید۔۔۔ رک جاؤ۔'' میں پکار رہا تھا۔

ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے حویلی سے نکلے۔ وہ قصبے کی گلیوں میں اندھا دھند بھاگتا ہوا اس چوراہے کی طرف جا رہا تھا جہاں قصبے کا تھانہ واقع تھا۔ میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ بہت تیز دوڑنے کے باوجود میں اس کے قریب پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ لوگ گلیوں میں بھاگتے ہوئے جائے وقوعہ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم مخالف سمت میں بھاگ رہے تھے۔ دور کہیں فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ نہ جانے اب یہاں کیا کرنے آ رہی تھیں۔ ولید دیوانہ وار بھاگتا تھانے کے عین سامنے پہنچا تو ایک گاڑی گیٹ سے نکلتی دکھائی دی۔ یہ کھلی چھت والی پولیس جیپ تھی۔ میں نے دور سے دیکھ لیا اس میں انسپکٹر قیصر چودھری موجود تھا پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ میرے ذہن میں موجود تھا۔ پولیس پارٹی کو دیکھتے ہی ولید نے انہیں للکارا۔ اس کی آواز چنگھاڑ سے مشابہ تھی۔ اس چنگھاڑ میں اپنی ماں اور بہن کی اندوہناک موت کا غم کسی برق کی طرح کوند رہا تھا۔ اس نے جیپ کے رخ پر دو فائر کیے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ لگتا تھا کہ دوسری طرف پولیس پارٹی بالکل تیار بیٹھی تھی۔ انہوں نے فوراً جوابی فائر کیے۔ دھماکوں سے شعلے نکلے۔ میں نے دیکھا، گولیاں ولید کے سینے میں لگیں۔ اس کا متحرک جسم ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف آیا پھر ایک دیوار سے ٹکرا کر وہ پہلو کے بل کیچڑ میں گر گیا۔ میری آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ میں بھاگتا ہوا ولید تک پہنچا۔ اس کا سینہ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ وہ شاید آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔

''ولید۔۔۔ ولید۔۔۔'' میں دلدوز آواز میں پکار اٹھا۔ میں نے اسے جھنجوڑا۔

یہی وقت تھا جب قیصر چودھری کے ساتھی جیپ سے کود کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے رائفل کے وزنی دستے سے میرے سر کے عقب میں ایک طوفانی ضرب لگائی تھی۔ یہ ایسی بھیانک ضرب تھی کہ اپنے اندر غیر معمولی برداشت رکھنے کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ دوسری ضرب میرے سر پر کنپٹی کی طرف لگی۔ میں اوندھے منہ گرا۔ کوئی نصف درجن اہلکار مجھ پر چمٹ گئے۔ مجھے لگا میرا سینہ اور چہرہ سرد کیچڑ میں لتھڑے گئے ہیں۔ وہ لوگ چلا رہے تھے اور میرے بازو پشت کی طرف موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید ہتھکڑی پہنانا چاہتے تھے۔ ضبط کی ایک حد ہوتی ہے اور میرے اندر یہ حد ختم ہو رہی تھی۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔

''شاہ زیب! ایک بار تمہیں ہتھکڑی لگ گئی تو پھر شاید کبھی کھل نہ سکے گی۔ یہ لوگ تمہیں بھی کسی ہیر رانجھا یا سوہنی مہینوال والی لوکیشن پر لے جا کر پولیس مقابلے کا شکار بنا دیں گے۔''

دل کے اندر سے ہی دوسری آواز آئی۔ ''لیکن تمہارے وعدے شاہ زیب، تمہارے ارادے، تمہارا عہد نامہ کہ تم کبھی اپنے ماضی کی طرف نہیں پلٹو گے۔ کبھی اس خونریزی کی طرف نہیں جاؤ گے جس نے تمہارے شب و روز کو لہو رنگ کیا تھا۔''

پہلی آواز نے دوبارہ کہا۔ ''لیکن وہ سب کچھ تو زندگی سے مشروط تھا اور یہاں تو شاید زندگی ہی ختم ہونے والی ہے۔''

اور پھر یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے فائزہ کی تصویر ابھری۔ اس نے مایوں کا زرد جوڑا پہنا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر شگنوں کی مہندی تھی۔ وہ اپنی معصوم آنکھوں میں حسین سپنے سجائے چچا کی حویلی میں کسی خوش رنگ تتلی کی طرح چکرا رہی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اس تتلی کے پر ہی نہیں اس کا کومل جسم بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔۔۔ طیش کی ایک فلک بوس لہر میرے اندر سے اٹھی اور ضبط کے بندھن میں ان گنت دراڑیں پڑ گئیں۔ میں نے سرد کیچڑ میں اوندھے پڑے پڑے گرانڈیل قیصر چودھری کی طرف دیکھا۔ وہ خود پر ٹوٹنے والی آفت سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا، آج کی رات، اس تاریک گلی میں اس کا سامنا کس شخص سے ہونے والا ہے۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا۔

**خونریزی اور بربریت کے خلاف**
**صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ**
**باقی واقعات آئندہ پڑھیے**

# سراغ

تنویر ریاض

کبھی کبھی وہ حرکتیں وبالِ جان بن جاتی ہیں... جن کے کرنے سے کسی دوسرے کو خاص فرق نہ پڑتا ہو... لیکن ایسا سوچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں... وہ خوش حال تھی... کامیاب سیاست داں اور سوشل ورکر تھی... مگر ایک مشکل تھی... جو اس کی جان کی دشمن تھی...

**مغرب کے ماحول اور مزاج میں بسی ناقابل برداشت وبائی وغذائی قباحتیں...**

ورکس نامی یہ ریسٹورنٹ عام طور پر اتوار کے روز بند ہوتا تھا لیکن دسمبر کی اس یخ بستہ شام میں اس کا میزنائن فلور مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور عملے کے تمام افراد ایک پُرتکلف ضیافت کی تیاری میں مصروف تھے جو لولا لیمبرگ کے اعزاز میں دی جارہی تھی۔ وہ حال ہی میں سٹی کیمشن کی نشست پر دوبارہ منتخب ہوئی تھی اور اس ضیافت کا اہتمام ریستوران کے سب سے زیادہ تجربہ کار اور ماہر شیف پارکر زیڈ کے سپرد تھا جو سر پر ہیڈ فون لگائے، مائیکرو

فون کے ذریعے کچن اسٹاف کو ہدایات دے رہا تھا۔ مسز لیمبرک کا شمار ان سیاست دانوں میں ہوتا تھا جو کبھی محفلوں میں تنقید اور مذاق کا نشانہ بننے کے باوجود ہمیشہ بھاری اکثریت سے انتخابات میں کامیابی حاصل کر لیا کرتے تھے۔ وہ جب بھی کسی عوامی اجتماع میں شرکت کرتی تو اپنی فصیح و بلیغ تقریروں کے ذریعے ناقدین کا منہ بند کر دیتی اور دلیلوں سے ثابت کرتی کہ اس پر لگائے گئے الزامات جھوٹے اور بے وزن ہیں۔

لیکن مقامی لوگ جو باقاعدگی سے اخبار پڑھتے اور سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ مسز لیمبرک کا انتخاب سیاسی فریب دہی کی ایک اور مثال ہے۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ جس گروپ نے اس ضیافت کا اہتمام کیا ہے وہ موقع پرست تاجروں اور سرمایہ کاروں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے یہ قدم صرف اس لیے اٹھایا ہے تاکہ اس سخت گیر عورت کی حمایت حاصل کی جا سکے۔ مہمانوں میں شہر کی سرکردہ شخصیات شامل تھیں جن میں سٹی منیجر، سٹی کمیشن کے پانچ اراکین، بورڈ آف ایجوکیشن کا چیئرمین اور بزنس گروپ کے تین اراکین خاص طور پر قابل ذکر تھے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز آمد سی ڈی بوسن کی تھی جسے اس ضیافت میں مدعو کیا گیا بلکہ اسے مسز لیمبرک کے بالکل برابر میں بائیں جانب نشست دی گئی۔ وہ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کا پروفیسر تھا جسے حالیہ انتخابات میں مسز لیمبرک نے شکست دی تھی۔ اس کے بالمقابل مسز لیمبرک کا بھتیجا ہنری بیٹھا ہوا تھا جو سٹی کمیشن میں ڈائریکٹر فنانس تھا اور مسز لیمبرک کی دائیں جانب برابر میں اس کی سیکریٹری ایسٹرڈ کینس بیٹھی ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ زرخرید غلاموں جیسا سلوک کیا کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کی سیکریٹری اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس کی اطاعت شعاری بھی کرتی رہے۔

مسز لیمبرک نے اپنے کیریئر کا آغاز کاؤنٹی سوشل سروسز میں ایک سماجی رضاکار کے طور پر کیا اور اب بھی اس نے اپنا آدھا وقت اس کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسے شروع سے ہی اپنی چیزیں بھول جانے کی عادت تھی لہٰذا یہ بھی ایسٹرڈ کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ صرف پرس ہی نہیں بلکہ لیپ ٹاپ، نظر کا چشمہ، بالوں کا برش، کریڈٹ کارڈ اور کھانوں کی فہرست جن سے مسز لیمبرک کو الرجی ہے، ہمیشہ اپنے ساتھ لے کر چلے۔

دائیں بائیں بیٹھے مہمانوں سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ہنری اپنی عقابی نگاہوں سے مسز لیمبرک کے سامنے رکھے ہوئے کھانوں کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ وہ مسز لیمبرک کے مرحوم بھائی کا بیٹا تھا اور عرصہ دراز سے سٹی کمیشن میں ٹیکس کے ماہر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت تک مسز لیمبرک نے سیاست میں حصہ لینا شروع نہیں کیا تھا۔ اس مقام تک پہنچنے میں اس کی اپنی محنت و صلاحیت کا دخل تھا اور اس ترقی میں اس کی پھوپی نے کوئی مدد نہیں کی تھی۔ اسی لیے مسز لیمبرک اس کے ساتھ اپنی سیکریٹری جیسا سلوک نہیں کرتی تھی اور شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اس کی تمام جائیداد اور اثاثوں کا متوقع واحد وارث تھا۔

کھانا شروع ہو چکا تھا اور گوشت کے پارچے چبانے کے دوران مسز لیمبرک اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں ایسٹرڈ اور ہنری کی جانب جملے پھینکتی رہی۔ اس کا نشانہ دراصل بائیں جانب بیٹھا ہوا سیاسی حریف تھا جس نے مسز لیمبرک کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور خاموشی کے ساتھ اپنی پلیٹ سے کھیلتا رہا۔ شیف پارکر زیڈ کو بھی آخری آرڈر دیے ہوئے کئی منٹ گزر چکے تھے۔ بیشتر مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور بیروں نے ان کے سامنے سے خالی برتن اٹھانا شروع کر دیے تھے۔

کھانے کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مہمانوں نے اپنی کرسیاں کھسکا کر آرام دہ پوزیشن اختیار کر لی تاکہ سکون سے تقاریر سن سکیں۔ میز کے ایک کونے پر بیٹھے ہوئے ویڈیو کیمرا مین اور رپورٹر نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کیمرے اور نوٹ بک سنبھال لی اور کارروائی ریکارڈ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔

یہ ہنری ہی تھا جس نے سب سے پہلے نوٹ کیا کہ اس کی پھوپی کسی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش بگڑنے لگے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کے حلق سے کسی جانور جیسی غراہٹ نکل رہی تھی۔ وہ ایسی آوازیں نکال رہی تھی جس سے لگتا تھا کہ اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ اسی اثنا میں دوسرے لوگوں کی توجہ بھی اس جانب مبذول ہو گئی۔ ہنری پہلے ہی اپنے سیل فون سے نو گیارہ کو فون کر چکا تھا۔

چند ہی لمحوں میں ریستوران کا میز نائن فلور بدنظمی اور افراتفری کا منظر پیش کرنے لگا۔ سبھی مہمان یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ مسز لیمبرک کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا بڑی مشکل سے کچھ لوگوں نے راستہ بنایا اور اسے فرش پر لٹا کر اس کی سانس کی نالی سے غذا نکالنے کی کوشش کرنے

لگے تاکہ اسے ہوش میں لایا جاسکے۔ اسی وقت سیکریٹری ایسٹرڈ نے چلاتے ہوئے کہا کہ اس کی مالکن کو کھانے میں کوئی ایسی چیز دی گئی ہے جس سے اسے الرجی ہے۔ ٹی وی کیمرا مین نے فوراً ہی یہ منظر اپنے کیمرے میں محفوظ کرلیا جبکہ اس کے ساتھی نیوز رپورٹر نے درجنوں تصاویر بنالیں۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں فوری طبی امداد دینے والا عملہ پہنچ گیا۔ انہوں نے مسز لیمبرک کو آکسیجن لگائی اور ایمبولینس میں منتقل کردیا۔ اس کے جانے کے بعد دوسرے مہمان اونچی آواز میں اس واقعے پر تبصرہ کرنے لگے۔ میزبان گروپ کے صدر کو افسوس تھا کہ وہ اس اہم موقع پر تقریر کرنے سے محروم ہوگیا۔ اب اس کی نظریں شفاف پلاسٹک باکس میں رکھے ہوئے اس ایوارڈ پر جمی ہوئی تھیں جو مسز لیمبرک کو پیش کیا جانا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ عورت زندہ نہ بچی تو اس ایوارڈ پر کسی دوسری شخصیت کا نام کندہ کروانا پڑے گا۔

کاؤنٹی چیف سراغ رساں ٹک اسٹیمی کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا جب فرٹز ڈولنگر اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے وردی کے بجائے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ اسٹیمی نے اسے غور سے دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم اس لیے بھی سراغ رساں سارجنٹ بننا چاہتے ہو تاکہ اس وردی سے نجات مل جائے لیکن وہ منزل ابھی دور ہے۔“

”میں جم جارہا تھا جب مجھے تمہارا فون ملا۔“ فرٹز نے صفائی پیش کی۔

”میں نے تمہیں اس کیس کے سلسلے میں بلایا ہے اور میرے خیال میں یہ ممکنہ طور پر قتل کا کیس ہے۔“

”کیا میں مرنے والے کا نام جان سکتا ہوں؟“

”سٹی کمشنر مسز لیمبرک۔“

”میرا خیال ہے کہ اس کی موت کوئی ایسی چیز کھانے سے ہوئی جس سے اسے الرجی تھی۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتاتی ہے لیکن ریستوران کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے کھانوں میں مونگ پھلی یا اس سے بنی ہوئی کوئی چیز استعمال نہیں کرتے۔ ان بیانات کی روشنی میں قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مسز لیمبرک کی موت ایک حادثہ نہیں ہے۔“

اسٹیمی نے اسے ایک فائل پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں تمام رپورٹس موجود ہیں۔ تم انہیں ایک نظر دیکھ لو۔“

ڈولنگر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یہ ڈاکٹر ہرمن بولڈ یک کون ہے؟“

”چلفونٹ اسپتال کا پیتھالوجسٹ۔“

”کیا ان دنوں وہ موت کا سبب دریافت کرنے والے ڈاکٹر کے طور پر کام کررہا ہے؟“

”نہیں ویسے تو یہ کام میڈیکل آفیسر ہی کا ہے لیکن حال ہی میں اس کی آنکھ کا آپریشن ہوا ہے۔ اس لیے یہ ذمے داری ڈاکٹر ہرمن کو سونپ دی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرنے والی کو کئی چیزوں سے الرجی تھی۔“

”کیا مونگ پھلی کے علاوہ اور بھی ایسی اشیا ہیں؟“

”ہاں اور ان اشیا کی فہرست مرنے والی کی سیکریٹری مس کینیں نے اسپتال والوں کو دی ہے اور ضیافت سے ایک روز قبل وہ یہ فہرست ریستوران کی انتظامیہ کو بھی دے چکی تھی۔“

اس فائل میں بھی اس فہرست کی نقل موجود تھی۔ ڈولنگر نے اسے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”مسز لیمبرک کو سویابین سے بھی الرجی تھی جبکہ آج کل اس کا استعمال عام ہے۔“

”ممکن ہے لیکن ریستوران والے اپنے اشتہار میں خاص طور پر واضح کرتے ہیں کہ وہ اپنے کھانوں میں مونگ پھلی یا سویابین کا تیل استعمال نہیں کرتے۔“

”کیا اس ضیافت میں شریک کوئی اور شخص بھی بیمار ہوا؟“ ڈولنگر نے پوچھا۔

”بظاہر تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اس فائل میں ان چوبیس مہمانوں کی فہرست موجود ہے جو اس ضیافت میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مرنے والی نے جو کچھ کھایا پیا، اس کی تفصیل تمہیں اس فائل میں مل جائے گی۔ محکمۂ صحت نے سوموار کی سہ پہر سے کارروائی شروع کی۔ اس وقت تک ضیافت میں استعمال ہونے والے تمام برتن دھوئے جاچکے تھے اور بچا ہوا کھانا بھی کوڑے میں پھینک دیا گیا۔ انہوں نے اس کے کچھ نمونے حاصل کرلیے ہیں تاہم مونگ پھلی یا سویابین کا استعمال ان کے قواعد کی خلاف ورزی نہیں ہے۔“

ڈولنگر نے اس مرتبہ غور سے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھی اور بولا۔ ”اس بات کے کیا امکانات ہیں کہ یہ مونگ پھلی یا سویابین سے الرجی کے بجائے زہر دینے کا کیس ہے؟“

”ہمارے پاس اس بارے میں بہت کم معلومات ہیں اور ڈاکٹر نے اس موت کا سبب الرجی قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے خون یا معدے میں موجود اجزا کے

نمونے بھی نہیں لیے۔''
ڈولنگر نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس اس کے علاوہ کیا معلومات ہیں؟''

''مسز لیمبرک کی عمر چوّن سال، غیر شادی شدہ اور تنہا رہتی تھی۔ اسے باپ سے ورثے میں بے پناہ دولت اور جائداد ملی جو پراپرٹی کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے رشتے داروں میں واحد زندہ فرد اس کا بھتیجا ہنری ہے جو ان دنوں سٹی فنانس ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ وہ بھی اس ضیافت میں موجود تھا۔ مسز لیمبرک کئی برسوں سے سماجی خدمت کے کاموں میں مصروف تھی اور حال ہی میں چوتھی بار دو سال کے لیے سٹی کمیشن کی رکن منتخب ہوئی تھی۔''

''اس کے دشمنوں کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟''

''تم اخبار تو ضرور پڑھتے ہوگے۔ ایسے لوگوں کے سیاسی حریف ہو سکتے ہیں اور ذاتی دشمنی کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں موجود تیئس مہمانوں اور ریستوران کے عملے کے نو افراد میں سے کوئی بھی اس کے کھانے میں زہر ملا سکتا ہے۔''

جم جانے کے بجائے ڈولنگر ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر فائل کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک کاغذ پر ان کھانوں کی تفصیل درج تھی جو مسز لیمبرک کو دیے گئے تھے۔ ان میں فروٹ کپ، سوپ، بھنی ہوئی چانپ، تلے ہوئے مٹر، گوشت کا شوربا، ٹھنڈا پانی اور کافی شامل تھی۔ ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے والا عملہ پہنچا تو اس وقت مسز لیمبرک کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اور ناخن نیلے ہو چکے تھے۔ چہرہ سوج گیا تھا اور گردن پر سرخ دھبے نظر آ رہے تھے۔ جب انہیں مس کینس اور ہنری نے الرجی کے بارے میں بتایا تو انہوں نے فوری طور پر مریضہ کو آکسیجن لگائی اور دورانِ خون بحال رکھنے کا انجکشن بھی دے دیا۔

اسپتال پہنچنے تک وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ دوسرا انجکشن لگاتے ہی اس کا بلڈ پریشر غیر معمولی طور پر بڑھ گیا اور سانس بند ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے دل کا شدید دورہ پڑا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی اور نو بج کر چوبیس منٹ پر اس کی موت واقع ہوگئی۔

اس کے بعد ڈولنگر نے انٹرنیٹ پر فوڈ الرجی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور اس ریستوران کی جانب روانہ ہو گیا جہاں اس ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

وہاں اس وقت کافی کا دور چل رہا تھا اور دوپہر کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ شیف پارکر زیڈ بھی اس وقت اپنے سفید کوٹ کے بٹن بند کر رہا تھا جب ڈولنگر اس کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک معمول کی کارروائی ہے۔ اتوار کی شام یہاں جو واقعہ پیش آیا، میں اس کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں تیار ہوں آفیسر۔'' زیڈ نے کہا۔ ''اخبارات میں کچھ غلط تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم کسی بھی بامقصد کارروائی کا خیر مقدم کریں گے۔''

اس نے مانیٹر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''محکمۂ صحت کے انسپکٹروں نے یہاں کا معائنہ کرنے کے بعد یہ اطمینان کر لیا ہے کہ مرنے والی کو کھانے میں مونگ پھلی یا سویابین سے بنی ہوئی کوئی چیز نہیں دی گئی تھی لیکن اس کی فہرست میں کچھ دوسری چیزیں بھی شامل تھیں جیسے چاکلیٹ اور کوکونٹ۔''

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی سیکریٹری نے ضیافت سے ایک روز قبل ریستوران کے کسی فرد کو ان اشیا کی فہرست فراہم کر دی تھی جن سے مسز لیمبرک کو الرجی تھی۔''

پارکر زیڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ فہرست ولڈا کو دی گئی تھی جو مستند غذائی ماہر ہے۔ دراصل میں اور وہ مل کر ہی یہ ریستوران چلا رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو صحت بخش کھانے فراہم کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے میز پر سے مینیو اٹھا کر ڈولنگر کو دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری طرف سے تمہارے لیے ہے۔''

''گزشتہ اتوار کو تم کہاں تھے؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''میں اسی جگہ موجود تھا جبکہ ضیافت کا اہتمام میزنائن فلور پر کیا گیا۔ مجھے تو طبی امداد کے عملے کے آنے پر معلوم ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ البتہ ولڈا وہاں سرو کر رہی تھی اور اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔'' یہ کہہ کر اس نے مائیکروفون کے ذریعے ولڈا کو بھی وہاں بلا لیا۔ وہ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ جب اسے ڈولنگر کی آمد کا مقصد معلوم ہوا تو وہ اسے کچن کے راستے اپنے دفتر میں لے گئی اور اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہم زیادہ تر کھانے خود ہی تیار کرتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی مونگ پھلی یا سویابین کا استعمال نہیں ہوتا۔ دوسرے کھانوں کے مقابلے میں مونگ پھلی سے الرجی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے

یہاں اس کا استعمال بالکل نہیں ہوتا۔ اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ مسز لیبرک کی موت کی وجہ مونگ پھلی سے ہونے والی الرجی نہیں ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایسی کوئی چیز لائی ہو۔''

''اناناس کے بارے میں کیا کہو گی؟ اسے جو پھلوں کا پیالہ دیا گیا اس میں اناناس تھا؟''

''بالکل نہیں، ہمارے فروٹ کپ میں بغیر بیجوں کے سرخ اور سفید انگور، سیب کے چوکور ٹکڑے، چھوٹی نارنگی، کٹے ہوئے آڑو اور ناشپاتی وغیرہ ہوتی ہیں۔ اناناس، خربوزہ یا کوئی ایسا پھل مہمانوں کو پیش نہیں کیا جاتا جس سے الرجی کا خطرہ ہو۔''

''مجھے معلوم ہوا کہ تم اس رات سرو کر رہی تھیں؟''

''میں بلیز کی مدد کر رہی تھی۔ وہ کھانا لگا رہی تھی جبکہ میں پانی، کافی، چائے اور دودھ میزوں پر رکھ رہی تھی۔''

''کیا تم دونوں ہی سروس کر رہی تھیں؟''

''ہاں، میں نے ہی بلیز کی ڈیوٹی لگائی تھی کیونکہ وہ مجھ سے بہتر یہ کام کر سکتی ہے اور ویسے بھی اسے اس کا معاوضہ ملتا ہے۔''

''کیا اس ضیافت میں شراب بھی پیش کی گئی تھی؟''

''وہ نہیں، ہمارے پاس اس کا لائسنس نہیں ہے۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ کھانے کی ڈشیں تبدیل ہو گئی ہوں؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''ہم انسان ہیں اور غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ کیونکہ کچن کو سیٹ نمبر کے مطابق آرڈر دیا جاتا ہے اور اس کی نشست کا نمبر سات تھا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے کھانے میں کچھ ملا دیا ہو؟''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر کوئی ایسی چیز اس کے کھانے میں ڈال دی جس سے اسے الرجی ہو سکتی ہے۔ یہ اسی وقت ہوا ہو گا جب کھانا میز پر لگ گیا ہو کیونکہ کوئی بھی مہمان اوپر نہیں جا سکتا۔ کیا تم ہمارے عملے پر شک کر رہے ہو؟''

''بالکل نہیں۔ کیا بلیز آج کام پر آئی ہے؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''ہاں، وہ ڈش روم میں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بلیز کو اپنے دفتر میں بلایا اور خود باہر چلی گئی۔ ڈولنگر نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تم سے گزشتہ اتوار پیش آنے والے واقعے کے بارے میں کچھ سوالات کرنا ہیں۔''

''پوچھو۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔ ڈولنگر کے سوالوں کے جواب میں اس نے تصدیق کر دی کہ اس ضیافت میں تمام چیزیں اسی نے سرو کی تھیں۔ ''ولڈا صرف جوس، کافی، چائے اور سوپ وغیرہ رکھ رہی تھی جو سب مہمانوں کے لیے ایک جیسے تھے جبکہ وہ ہر نشست سے ملنے والے آرڈر کے مطابق چیزیں پیش کر رہی تھی جب یہ چیزیں کچن سے تیار ہو کر آتیں تو ان پلیٹوں کو ڈھک دیا جاتا تھا جس پر آرڈر دینے والے کی نشست کا نمبر پڑا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں کھانا سرو کرنے سے پہلے ایک مرتبہ اور چیک کرتی تھی۔ اگر تم چاہو تو میں دکھا سکتی ہوں کہ ہمارے یہاں کس طرح کام ہوتا ہے۔''

ڈولنگر اس کے ساتھ میز ٹائن فلور پر چلا گیا اور جب بلیز نے اسے سسٹم کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو اسے یقین آ گیا کہ پارٹی میں شریک کسی مہمان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کچن یا پینٹری تک رسائی حاصل کرے اور مسز لیبرک کی پلیٹ کا ڈھکنا اٹھا کر اس کے کھانے میں کوئی زہریلی چیز ملا دے۔ اس نے بلیز کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ ولڈا کے دفتر چلا گیا تاکہ ان ملازمین کی فہرست حاصل کر سکے جو اتوار کی شب ڈیوٹی پر تھے۔ اس نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ تحقیقات محض ایک معمول کی کارروائی ہے لیکن اس مرتبہ ولڈا کی پیشانی پر بل آ گئے اور اس کی بھویں تن گئیں تاہم ڈولنگر نے اس سے وہ فہرست حاصل کر لی۔

سراغ رساں لیفٹیننٹ سائرس اوبرن عدالت کے کورٹ روم میں اپنے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے سیل فون پر سارجنٹ ڈولنگر کا پیغام موصول ہوا جو کسی کیس کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ اوبرن نے جوابی پیغام کے ذریعے اسے مطلع کیا کہ وہ تین بجے کے بعد اس کے دفتر آ سکتا ہے۔ جب ڈولنگر اس سے ملنے آیا تو اس کے ہاتھ میں وہ فائل بھی تھی جو اسے اسٹیمی نے دی تھی۔ اوبرن نے فائل کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد کہا۔

''گویا یہ یقینی نہیں ہے کہ اس کی موت فوڈ الرجی کی وجہ سے ہوئی۔''

''نہیں، لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی کہتی ہے۔''

''تم فوڈ الرجی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''میں نے جو کچھ انٹرنیٹ سے معلوم کیا، اس کے

مطابق مونگ پھلی کی وجہ سے آدھے سے زیادہ مہلک کیسز میں فوڈ الرجی ہوتی ہے اور ایک حساس شخص دس منٹ سے بھی کم وقت میں مرجاتا ہے۔''

وہ دونوں کافی دیر تک یہ بحث کرتے رہے کہ ڈولنگر نے ریستوران کے عملے سے جو پوچھ گچھ کی تھی، اس کی مزید چھان بین کی جائے یا نہیں۔ اس مرحلے پر مسز لیمبرک کی موت ایک جرم سے زیادہ حادثہ معلوم ہورہی تھی پھر وہ دونوں اس پر متفق ہوگئے کہ اس چھان بین کو فی الحال مرنے والی کے پس منظر تک محدود رکھا جائے۔ اسٹیمی کی دی ہوئی فائل دیکھنے کے دوران اوبرن کے سامنے ڈیرل میجم کا نام بھی آیا جو محکمۂ صحت میں انسپکٹر تھا اور اس نے ضیافت کے اگلے روز ریستوران کا دورہ کیا تھا۔ بیس سال پہلے اوبرن نے میجم کی جڑواں بہنوں کورا اور زورا کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور اوبرن کو یقین تھا کہ اس حوالے سے وہ میجم سے فون یا ای میل کے ذریعے ہی مفید معلومات حاصل کرسکتا ہے لیکن اوبرن نے اس سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا مناسب سمجھا اور ٹیلی فون پر تصدیق کرنے کے بعد کہ وہ دفتر میں موجود ہے اوبرن اس سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔

ڈیرل میجم کو معلوم تھا کہ اوبرن کس سلسلے میں اس سے ملنے آرہا ہے لہٰذا وہ پہلے سے ہی ریستوران کی فائل کھولے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے اوبرن کو دیکھتے ہی کہا۔ ''تم نے ان کا مینیو دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غذا اور علم غذا سے متعلق کسی درسی کتاب کے دو صفحات ہیں۔ اس کے باوجود خلاف ورزیاں عام ہیں۔ مثلاً فریج میں رکھے ہوئے ایلومینیم فوائل میں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس طرح ان فوائل میں ہوا کا گزر نہیں ہوتا اور ان میں رکھی ہوئی چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ کچرے کے ڈھیر کے پاس کاکروچ بھی نظر آئے لیکن اس کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ اس موت کا ہمارے محکمے سے کیا تعلق ہے؟''

''شاید ایسا کچھ نہ ہو لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اشارہ دیا گیا ہے کہ یہ ایک قتل بھی ہوسکتا ہے۔''

''قتل!'' میجم نے چونکتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ کسی شخص نے اس کے کھانے میں زہر ملایا ہوگا تو وقت گزرنے کے ساتھ اس کا ثبوت بھی ضائع ہوگیا اور یہ سچ بھی ہوسکتا ہے، اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر اسے کوئی ایسی چیز دی ہو جس سے وہ الرجک تھی لیکن میں نے پیر کے روز معائنے کے دوران وہاں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس میں سویابین یا مونگ پھلی کا تیل استعمال کیا

گیا ہو۔''

ہیڈ کوارٹر واپس آتے ہوئے اوبرن راستے میں ورکس ریستوران پر ڈنر کے ارادے سے رک گیا جو اس وقت تک تین چوتھائی بھر چکا تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ عورتیں تھیں جو کرسمس کی خریداری کرنے کے بعد وہاں کچھ دیر سستانے اور کھانا کھانے کی غرض سے آئی تھیں۔ البتہ میز نائن فلور اس وقت بند تھا۔ اوبرن اس سے پہلے بھی چند مرتبہ یہاں کھانا کھا چکا تھا لیکن یہ جگہ اس کے مزاج کے مطابق نہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح شیف پارکر زیڈ روسٹرم پر کھڑا مائیک کے ذریعے کچن کے عملے کو ہدایات دے رہا تھا۔

اوبرن کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اسے کن چیزوں سے الرجی ہے لیکن اس کا معدہ مصالحے دار اور چٹپٹی اشیا قبول نہیں کرتا تھا لہٰذا اس نے احتیاطاً اپنے لیے سینڈوچ، سلاد اور بھنے ہوئے گوشت کا آرڈر دیا اور چند منٹوں میں ہی یہ چیزیں اس کی میز پر پہنچ گئیں لیکن اسے محسوس ہوا کہ پارکر زیڈ نے اس آرڈر کے بارے میں ہدایات جاری کرتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیا جس میں تنبیہ کا شائبہ جھلکتا تھا۔ اوبرن سمجھ گیا کہ شیف اسے پہچان گیا ہے اور اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے عملے کو یہ کہہ کر چوکنا کردیا ہے کہ مرغیوں کے ڈربے میں ایک لومڑی آگئی ہے۔

پارکر زیڈ نے بعد میں اس کا اعتراف کرلیا اور کہا۔ ''عام طور پر اس طرح کی وارننگ اس وقت جاری کی جاتی ہے جب صحافی اور سراغ رساں یہاں آئیں۔ گو کہ ہم سب انہیں دور سے ہی پہچان لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے عام آدمیوں جیسا لباس پہن رکھا ہوتا ہے اور انہی جیسی حرکتیں بھی کرتے ہیں جبکہ اس ریستوران میں عام آدمی کا کبھی گزر نہیں ہوتا۔''

''اس وضاحت کے لیے میں تمہارا مشکور ہوں۔'' اوبرن نے کہا۔

''جیسا کہ میں آج صبح تمہارے ساتھی کو بھی بتا چکا ہوں کہ اگر اس عورت نے مونگ پھلی یا سویابین سے بنی کوئی چیز کھائی تھی تو وہ اسے اپنے ساتھ لائی یا اس کے کسی ساتھی نے دی ہوگی۔''

''کیا میں اوپر جاکر ایک جائزہ لے سکتا ہوں؟'' اوبرن نے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' پارکر زیڈ نے کہا اور ایک ویٹر کو اس کے ہمراہ کردیا جس نے اوبرن کو اوپر لے جاکر وہاں کے سسٹم کے بارے میں تفصیل سے بتادیا۔

قتل کے محرکات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری تھا کہ مسز لیمبرک کے پس منظر کو کھنگالا جائے۔ چنانچہ اوبرن اور ڈولنگر اسی کام پر لگ گئے۔ جو کچھ انہیں معلوم ہوا، اس کے مطابق مسز لیمبرک کا ماضی بے داغ تھا اور اس کے خلاف کبھی کسی سنگین جرم کا الزام عائد نہیں کیا گیا اور نہ ہی وہ کسی بینک یا ادارے کی مقروض تھی۔ وہ ایک عوامی عہدے پر فائز تھی اور اس نے مالی امور میں کبھی کوئی بے قاعدگی نہیں کی۔ کئی اخباری مضامین میں اس کے سیاسی کیریئر کے نشیب و فراز، سخت گیری، انا پرستی اور ہٹ دھرمی کا حوالہ تو ضرور دیا گیا لیکن کسی ذاتی دشمنی یا مخالفت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

مسز لیمبرک کو اس کے مرنے کے بعد ٹی وی اور اخبارات نے نمایاں کوریج دی۔ مسلسل تین روز سے ٹیلی وژن کی خبروں میں اس واقعے کی فوٹیج چلائی جا رہی تھی۔ اخبارات میں بھی اس سے متعلق تصاویر شائع ہو رہی تھیں۔ اوبرن اپنی میز پر صبح کا اخبار پھیلائے بیٹھا تھا جس میں پورے صفحے پر اس واقعے کی تصاویر شائع ہو رہی تھیں۔ اس نے دو تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈولنگر سے کہا۔ ”یہ لوگ بار بار انہیں دہرا رہے ہیں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسی درجنوں تصویریں ابھی شائع نہیں ہوں گی جو آؤٹ آف فوکس اور غلط زاویوں سے لی گئی ہوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے اخبار کے دفتر فون کر کے فائل روم میں جانسن سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اوبرن کا بے تکلف دوست تھا جس کا اندازہ ان دونوں کی ابتدائی گفتگو سے ہو گیا۔ جانسن نے وعدہ کیا کہ وہ اس ضیافت میں لی جانے والی تمام تصویریں اسے ای میل کر دے گا۔ اسی طرح ٹی وی اسٹیشن والے بھی اس پر متفق ہو گئے کہ وہ چار بجے تک تمام فوٹیج بھیج دیں گے۔

اوبرن نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی اور جھلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم ابھی تک ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکے۔ ہمیں ان لوگوں سے بات کرنا ہو گی جو اس پارٹی میں موجود تھے۔“

”ان میں سے ایک یعنی مسز لیمبرک کا انتقال ہو چکا ہے۔“ ڈولنگر نے اسے یاد دلایا۔ ”ریستوران کے عملے سے میں بات کر چکا ہوں، اب باقی تیئس مہمان رہ جاتے ہیں جن پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔“

اوبرن نے نشستوں کی ترتیب والے چارٹ پر نظر


جولائی 2015ء کی جولانیاں

**رات کا مسافر**

ساحل سے پیاسے لوٹنے والے ایک مسافر کی لمبی مسافت کا احوال......
**طاہر جاوید مغل** کے قلم سے آخری صفحات پر سوغات

**سرشت آدم**

ابتدائی صفحات پر **الیاس سیتاپوری** کے قلم سے ایک اور حقیقت کا احوال......
جب ہادی اور ہارون کے درمیان بادشاہت کے احساس نے دوریاں پیدا کر دی تھیں

**سودائے جنوں**

بغاوتوں کا سر کچلنے والے سرفروشوں کی دلیری اور دانشمندی کا امتحان......
**ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے خیالات کی پرواز

**ماروی**

روٹھی ہوئی محبوبہ اور پرجوش دلربا کے درمیان الجھے ہوئے مراد کی بے بسی کا احوال...... **محی الدین نواب** کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ

منظر امام، ڈاکٹر شیر شاہ سید، کاشف زبیر، تنویر ریاض اور فاروق انجم کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ان لوگوں سے شروع کرنا چاہیے جو مسز لیمبرک کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ دائیں جانب اس کا بھتیجا ہنری لیمبرک تھا جو فنانس ڈائریکٹر ہے۔ پہلے اسی سے ملتے ہیں۔''

ہنری کا دفتر سٹی کمیشن کی عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ وہ ان دونوں کو ایک پرائیویٹ روم میں لے گیا اور انہیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم دونوں یہاں کیوں آئے ہو۔ میں نے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر کے سامنے شبہ ظاہر کیا تھا کہ میری پھوپی کی موت کوئی حادثہ نہیں ہے۔''

''کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''نہیں لیکن لگتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا تھا۔ اس پارٹی میں میری پھوپی مرکزِ نگاہ تھی اور شہر کے بڑے بڑے لوگ بشمول ان کے حریف بھی اس پارٹی میں موجود تھے لیکن کھانے کے بعد جو ردِعمل ہوا، وہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ویسے بھی وہ کھانے میں بڑی احتیاط کرتی تھی کیونکہ ہمارے خاندان میں سبھی لوگوں کو فوڈ الرجی ہے۔ میرے والد کو یہ مرض لاحق تھا اور میں بھی مونگ پھلی یا اناس سے بنی ہوئی چیز نہیں کھا سکتا۔''

''کیا تم نے اس ردِعمل سے پہلے یا بعد میں کوئی غیر معمولی چیز دیکھی؟''

''نہیں، جیسے ہی پھوپی کو دم گھٹنے کا احساس ہوا تو میں نے فوراً ہی نو گیارہ کو فون کر کے اس واقعے کے بارے میں بتایا اور خود نیچے چلا گیا تاکہ طبی عملے کو اپنے ساتھ لا سکوں۔ اس وقت تک ریستوران عام لوگوں کے لیے بند ہو گیا تھا۔''

''تم نے حریفوں کا ذکر کیا، یہ سیاسی ہیں یا ذاتی؟'' ڈولنگر نے کہا۔

''یہ میں نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی کسی ایسے مقامی شخص کو جانتا ہوں جس کے پاس اس قتل کا کوئی محرک ہو۔''

''اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو۔ کسی کے ساتھ ذاتی نوعیت کا تعلق یا حالیہ عرصے میں کوئی علیحدگی؟''

''اگر ایسی کوئی بات ہوگی تو وہ اس کی ذات تک محدود تھی۔ البتہ ہم خیال لوگوں سے اس کے سماجی تعلقات تھے لیکن میں نے کسی کے ساتھ اس کا سنجیدہ تعلق نہیں دیکھا۔''

ہنری سے گفتگو کرنے کے بعد یہ دونوں سراغ رساں نچلی منزل پر واقع مسز لیمبرک کے دفتر میں گئے جہاں ان کی ملاقات اس کی سیکریٹری ایسٹرڈ کینس سے ہوئی جو غم زدہ صورت بنائے ڈاک دیکھ رہی تھی۔ اوبرن نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔ ''اس موقع پر تمہیں زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہیں تاہم یہ ایک معمول کی تحقیقات ہے اور ہمیں خوشی ہوگی اگر تم چند سوالوں کے جواب دے سکو۔''

کینس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان کی جانب دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟

''شاید تمہارے علم میں ہو۔'' اوبرن نے کہنا شروع کیا۔ ''کچھ لوگوں کو شبہ ہے کہ اس ضیافت میں کسی نے تمہاری مالکن کو دانستہ طور پر کھانے میں کوئی ایسی چیز دے دی جو اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔''

''وہ میری مالکن نہیں تھی۔ میں سٹی کمیشن کے لیے کام کرتی ہوں۔'' ایسٹرڈ کینس نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس دنیا سے جا چکی ہے جبکہ میں اب بھی یہاں موجود ہوں۔''

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جب اس کی طبیعت بگڑنا شروع ہوئی تو تم اس کے برابر والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں۔''

''ہاں، یہ درست ہے۔''

''کیا تم نے پہلے بھی کبھی اس کی یہ کیفیت دیکھی؟''

''صرف ایک مرتبہ جب اس نے دفتر کی ایک پارٹی میں ایسا بسکٹ کھا لیا جس میں مونگ پھلی شامل تھی۔ ہم نے فوراً ہی طبی عملے کو فون کر کے بلایا لیکن ان لوگوں کے آنے تک اس کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ ویسے وہ کھانے کے معاملے میں بہت احتیاط رکھتی تھی اور اس ضیافت سے ایک روز پہلے میں نے ریستوران کی انتظامیہ کو ان اشیا کی فہرست دے دی تھی جن سے اسے الرجی ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اوبرن کو پکڑا دیا۔ یہ وہی فہرست تھی جس کی نقل اسٹیمی کی بنائی ہوئی فائل میں بھی لگی ہوئی تھی۔

''کیا تم نے ضیافت کے دوران کسی شخص کو اسے کوئی چیز دیتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ مثلاً چاکلیٹ، ٹافی، چیونگ گم، کریم، چینی یا سلاد وغیرہ؟''

''اس نے صرف بلیک کافی پی تھی جبکہ کھانے کی میز پر سلاد کی جگہ پھلوں کا پیالہ رکھا گیا تھا۔''

''ریستوران پہنچنے سے پہلے کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ مثلاً وہ راستے میں کچھ پینے کے لیے رک گئی ہو؟''

''وہ شراب یا سگریٹ نہیں پیتی تھی۔''

''کیا وہ باقاعدگی سے کوئی دوا لیتی تھی؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں، اسے ڈاکٹروں پر یقین نہیں تھا۔''

''کیا تمہارے علم میں کوئی ایسی بات ہے جو تنازع کی وجہ بن سکتی ہو۔ مثلاً حالیہ دنوں میں اسے کوئی دھمکی یا گمنام خطوط ملے ہوں۔''

''اس نے ہمیشہ ایسے تنازعات کا سامنا کیا۔ وہ فطرتاً جنگجو تھی اور عوامی نمائندہ ہونے کی وجہ سے اس پر تنقید بھی ہوتی تھی۔ میں آئے دن ایسے کئی خطوط اور ای میل دیکھا کرتی تھی جن میں اس پر شدید تنقید اور غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی تھی لیکن مجھے یاد نہیں کہ اسے کبھی کوئی دھمکی ملی ہو۔''

مسز لیمبرک کی ذاتی زندگی کے حوالے سے ایسٹرڈ کا جواب بھی ہنری سے ملتا جلتا تھا۔ ''سٹی کیبنٹ کی مصروفیات اور سماجی خدمات کے بعد اس کے پاس پارٹیوں میں جانے کا بالکل وقت نہیں تھا۔ اگر تم چاہو تو میں گزشتہ برسوں میں اس کی مصروفیت کی تفصیل بتا سکتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اوبرن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن انہوں نے یونیورسٹی جانے اور مسز لیمبرک کے سیاسی حریف پروفیسر ہرمن بولڈ یک سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ پندرہ برس قبل جب گریجویشن کر رہا تھا تو اس نے پولیٹیکل سائنس میں پروفیسر ہرمن بولڈ یک کی کتاب پڑھی تھی۔ اس کی اشاعت کے بعد سے ہی پروفیسر مقامی سیاست میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ابھی تک اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

گو کہ یونیورسٹی میں کرسمس کی وجہ سے تعطیلات ہو گئی تھیں لیکن پروفیسر اپنے دفتر میں بیٹھا امتحانی کاپیاں چیک کر رہا تھا۔ اسے ان دونوں کی مداخلت ناگوار گزری لیکن ایک سابق شاگرد ہونے کے ناتے اس نے اوبرن کو برداشت کرلیا۔

''مجھے تمہارے آنے کی توقع تھی۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''کیا تم واقعی اس واقعے کو قتل سمجھ کر تحقیقات کر رہے ہو؟''

''فی الحال ہم صرف معلومات اکٹھی کر رہے ہیں۔'' اوبرن نے کہا۔ ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جب مسز لیمبرک کی طبیعت بگڑی تو تم وہاں موجود تھے؟''

''ہاں، میں اس کے بالکل قریب بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے اچانک ہی اپنا گلا پکڑ لیا اور مینڈک کی طرح اچھلنے لگی۔ میں سمجھا کہ شاید اس کے گلے میں کچھ پھنس گیا ہے۔ میں نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی سیکریٹری نے چلاتے ہوئے کہا کہ اسے الرجی ہو گئی ہے۔''

''سیاسی میدان کے باہر تم اس سے کس حد تک واقف تھے؟''

''ہماری ملاقات ضرور ہوتی تھی لیکن بات چیت کبھی نہیں ہوئی۔''

''یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔ ''کوئی شخص اس کے قریب آیا ہو اور اس کی پلیٹ میں کوئی چیز ڈال دی ہو؟''

''نہیں، میں ویسے بھی اپنی دنیا میں رہتا ہوں اور ادھر ادھر نہیں دیکھتا اور کیونکہ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی اس لیے میں تمام وقت اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہرب کینن سے گفتگو کرتا رہا جو بزنس ایسوسی ایشن کا صدر ہے۔''

''اگر تمہارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں تھا تو اس کے مخالفین کون ہو سکتے ہیں؟''

''ہر وہ شخص جو اس شہر کی ترقی چاہتا ہے۔'' پروفیسر نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہر بات کی مخالفت کیا کرتی تھی، چاہے وہ مرکز شہر کی بحالی کا پروگرام ہو یا نئے کاروبار کے لیے چھوٹ، غیر قانونی کچی آبادیوں کو ہٹانے کی بات ہو یا سٹی چارٹر میں ترمیم کا معاملہ۔''

''کیا تم کسی ایک ایسے مخالف کا نام بتا سکتے ہو جو اسے اس عہدے سے ہٹانا چاہتا ہو؟''

''نہیں، اس کا دفاع کرنے والے بھی بہت تھے۔''

وہ دونوں پروفیسر کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لنچ کے بعد اوبرن نے ڈولنگر کو ہیڈ کوارٹر چھوڑا تا کہ وہ ایسٹرڈ کینس، ڈاکٹر ہرمن بولڈ یک اور ہنری لیمبرک کے پس منظر کے بارے میں تفصیلات اکٹھی کرے اور خود وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اب اسے چیف پیتھالوجسٹ رچرڈ ویلنٹائن سے ملنا تھا جو موتیا کے آپریشن کے بعد گھر پر آرام کر رہا تھا۔ ستر سال کی عمر میں بھی وہ ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح چاق چوبند تھا۔ اس نے اوبرن کا خوش دلی سے استقبال کرتے ہوئے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' اوبرن نے کہا۔ ''صرف تم سے مسز لیمبرک کی موت کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں جو فوڈ الرجی کی وجہ سے ہوئی۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے بریف کیس سے کاغذات کا ایک پلندا نکال کر ڈاکٹر ویلنٹائن کو پکڑا دیا جس میں طبی عملے

کی رپورٹ، اسپتال کی جاری کردہ رپورٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ شامل تھی۔ ڈاکٹر نے ان کاغذات کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ ''اس عورت کو کن چیزوں سے الرجی تھی؟''

اوبرن نے بریف کیس سے وہ فہرست نکالی جو اسے ریستوران سے ملی تھی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ''ناشپاتی، بیئر، برازیل نٹ، پنیر، اطالوی شراب، چاکلیٹ، کوکونٹ، بادنجان، گوشت، مونگ پھلی، اناناس، تخم بھی کا اچار، سویابین، سفید شراب......''

ابھی اس نے آدھے نام ہی پڑھے تھے کہ ویلنٹائن نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور بولا۔ ''ان سب میں ٹائرامین ہوتی ہے جو اعصابی نظام کے لیے نقصان دہ ہے۔''

''کیا یہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے وہ الرجک ہو سکتی تھی؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''الرجک نہیں۔ تم اسے حساسیت کہہ سکتے ہو۔ وہ کون سی دوائیں لے رہی تھی؟''

''جہاں تک میرے علم میں ہے وہ کوئی دوا نہیں لے رہی تھی۔ اس کی سیکریٹری کا کہنا ہے کہ وہ ڈاکٹروں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔''

''اگر تم مزید تحقیقات کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ افسردگی دور کرنے والی دوائیں لے رہی تھی۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اسے مونگ پھلی سے الرجی نہیں تھی۔'' اوبرن نے پوچھا۔

''میں نے یہ بالکل نہیں کہا۔'' ڈاکٹر کسی اسکول ٹیچر کے انداز میں سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''مونگ پھلی، اناناس، سویابین وغیرہ الرجی پیدا کرنے والی عام اشیا ہیں لیکن اس فہرست میں کچھ ایسی اشیا کے نام بھی موجود ہیں جو یہ دوائیں استعمال کرنے والے شخص کے لیے زہر قاتل ہو سکتی ہیں۔''

''اور ان کی وجہ سے بھی مونگ پھلی جیسا ردِعمل ہو سکتا ہے۔''

''نہیں۔'' ڈاکٹر غراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس بارے میں بالکل بھی شبہ نہیں کہ اس عورت کو مونگ پھلی یا اناناس سے الرجی تھی لیکن اس کی موت کی وجہ ایڈرینالین ہے جو پہلے طبی عملے اور بعد میں اسپتال والوں نے دی، یہ دوا عام طور پر دورانِ خون بحال رکھنے کے لیے دی جاتی ہے لیکن اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مریض نے کھانے میں کیا لیا تھا ورنہ اس کا ردِعمل خطرناک حد تک بلڈ پریشر بڑھنے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے پرس میں ڈاکٹروں کی جانب سے جاری کردہ کارڈ رکھنا چاہیے تھا جس پر یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ مریض افسردگی دور کرنے والی دوائیں استعمال کر رہا ہے لہٰذا اسے ایڈرینالین یا اس سے ملتی جلتی کوئی دوا نہ دی جائے۔''

''ہم نے اس کا والٹ نہیں دیکھا۔'' اوبرن نے اعتراف کیا۔ ''اور میں نہیں سمجھتا کہ عملے یا پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے بھی اس جانب دھیان دیا ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ڈاکٹر نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ اپنی دانست میں وہ مسز لیمبرک کی موت کا معما حل کر چکا تھا۔

ڈاکٹر سے ملاقات کرنے کے بعد اوبرن اور ڈولنگر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے تین مرتبہ وہ ڈی وی ڈی دیکھی جو ٹی وی اسٹیشن سے موصول ہوئی تھی پھر پچاس سے زیادہ ان تصاویر کا معائنہ کیا جو ہینسن نے بھیجی تھیں۔ ڈاکٹر کی باتوں سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسز لیمبرک کے قریب بیٹھنے والا کوئی بھی فرد بہ آسانی اس کے کھانے یا کافی میں مونگ پھلی یا سویابین سے بنی کوئی چیز ڈال سکتا تھا جس سے غیر معمولی ردِعمل ہوتا اور ہنگامی علاج کی ضرورت پیش آتی۔ قاتل کو معلوم تھا کہ مسز لیمبرک افسردگی دور کرنے والی دوائیں استعمال کرتی ہے اور ہنگامی صورتِ حال میں دی جانے والی ایڈرینالین اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹر ویلنٹائن کے مفروضہ کو درست مان لیا جائے تو وہ کون سا شخص تھا جسے یہ بات معلوم تھی کہ مسز لیمبرک اس طرح کی دوائیں لے رہی تھی۔ عوامی عہدے پر فائز ہونے کی حیثیت سے یہ ایک فطری امر تھا کہ وہ اپنی بیماری کو چھپاتی۔ کیا اس کی سیکریٹری کو یہ بات معلوم تھی اور اس نے ممنوعہ اشیا کی فہرست میں ردوبدل کر دیا تھا۔

ڈولنگر نے انٹرنیٹ کے ذریعے ڈاکٹر بولڈ یک، ہنری لیمبرک اور کینس کے ماضی کے بارے میں جو تفصیلات حاصل کیں ان سے بھی اس کیس کو حل کرنے میں کوئی مدد نہ مل سکی۔ ایک گھنٹا تک ان کا تجزیہ کرنے اور بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ ابھی تک موت کا سبب جاننے سے قاصر ہیں۔ پیر کی صبح اوبرن نے فارنسک لیبارٹری کے انچارج سارجنٹ کارل کو فون کر کے اسے ریستوران پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی ڈولنگر کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔ ریستوران کے باہر والی سڑک پر کرسمس کی خریداری کرنے والوں کا رش تھا۔ سارجنٹ

کارل نے اپنی وین ریستوران کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی کر رکھی تھی۔ دروازے کے برابر میں ایک لمبا مخروطی شکل کا کوڑے دان رکھا ہوا تھا جس میں سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے پھینکے جاتے تھے۔ کارل نے چار مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر لیں اور جب ڈولنگر نے اس کے ڈھکنے پر لگا ہوا بٹن دبایا تو کچرے سے بھری ہوئی بالٹی باہر آگئی جس میں سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ موجود تھی۔ کارل اسے لے کر اپنی وین کے عقبی حصے میں گیا۔ جبکہ اوبرن اور ڈولنگر بھی سردی سے بچنے کے لیے وین کی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اب انہیں کارل کی رپورٹ کا انتظار کرنا تھا۔

منگل کی سہ پہر وہ دونوں ایک بار پھر سٹی کمیشن کے دفتر گئے اور انہوں نے ایسٹرڈ کینس سے تنہائی میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ انہیں مسز لیمبرک کے دفتر میں لے گئی۔ جہاں کئی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن انہوں نے بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ڈولنگر نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں چند سوالات مزید کرنا ہیں، کیا تم جانتی تھیں کہ مسز لیمبرک کوئی دوا لے رہی تھی؟“

”یہ سوال تم پہلے بھی کر چکے ہو اور میں نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹری علاج پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ اگر وہ کوئی دوا لے رہی ہوتی تو اس کا نسخہ مجھے ضرور دیتی تاکہ میں اس بات کو یقینی بنا سکوں کہ وہ دوا ہر وقت اس کے پرس میں موجود رہے۔“

”کیا گزشتہ اتوار کی شب وہ ضیافت میں اپنا پرس ساتھ لے کر گئی تھی؟“

”نہیں، میں ہی ہمیشہ اس کا پرس سنبھالتی تھی۔“

”اس کے بٹوے میں کیا ہوتا تھا صرف چابیاں۔۔۔؟“

”اس کے علاوہ بھی بہت کچھ مثلاً سیل فون، لپ اسٹک، ٹشو پیپر، چھوٹی ٹارچ، پیپر منٹ، فیتہ، پنسل، کاغذ وغیرہ وغیرہ۔“

”وہ پرس اب کہاں ہے؟“

”جب اس کی موت کا اعلان ہوا تو میں نے وہ اس کے بھتیجے کو دے دیا تھا۔“

اوبرن نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”کیا وہ یہاں کچھ ذاتی اشیا بھی رکھتی تھی؟“

”کچھ خاندانی تصاویر، کتابیں، ایک ریڈیو، اسنیکس، پانی کی بوتل، مسٹر ہنری گزشتہ ہفتے اس کی تمام چیزیں لے گئے۔“

سیکریٹری سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہنری سے ملنے گئے جس سے ان کی ملاقات دروازے پر ہی ہوگئی۔ وہ لنچ کر کے واپس آیا تھا۔ ڈولنگر نے اس سے بھی یہی کہا۔ ”ہم تم سے مزید کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ صرف دو تین منٹ کی بات ہے۔“ یہ کہہ کر ڈولنگر نے دروازہ بند کر دیا۔

”ہم ابھی تک یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تمہاری پھوپی کی موت کس طرح واقع ہوئی؟“ اوبرن نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کوئی دوا لے رہی تھی؟“

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔ یہ بات تم کینس یا اس کے ڈاکٹر سے پوچھو۔ میں اور پھوپی اتنے قریب نہیں تھے۔“

”میری بات غور سے سنو شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔ ہماری معلومات کے مطابق گزشتہ مئی میں مسز لیمبرک نے ایک تقریب میں شرکت کی تھی جہاں مونگ پھلی سے اسے ری ایکشن ہوگیا اور اسے اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں آکسیجن کے ذریعے اس کی سانس بحال ہوگئی لیکن ڈاکٹروں نے اسے ایڈرینالین نہیں دی کیونکہ وہ کوئی دوا استعمال کر رہی تھی۔ اس کے پرس میں ان اشیا کی فہرست ہمیشہ موجود رہتی تھی جن سے اسے الرجی تھی۔ تاہم ڈاکٹروں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اسے ایڈرینالین کیوں نہیں دی گئی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اب مجھے یاد آگیا۔“ ہنری نے کہا۔

”کیا تمہاری پھوپی نے کوئی وصیت تیار کی تھی؟“

”اس بارے میں تم اس کے وکیل سے پوچھو۔“

”اس نے وصیت کی ہو یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس وقت ممکنہ طور پر تم ہی اس کے واحد وارث ہو۔ گزشتہ اتوار کی ضیافت میں تمہارے پاس اچھا موقع تھا کہ اس کے کھانے میں کوئی ایسی چیز ملا دو جس سے اسے ری ایکشن ہو پھر جب تم نے طبی عملے کو بلایا تو انہیں ان چیزوں کے بارے میں تو بتا دیا جن سے مسز لیمبرک کو الرجی ہوسکتی تھی لیکن انہیں ان دواؤں سے لاعلم رکھا جو تمہاری پھوپی استعمال کر رہی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تم نے پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر سے اشارتاً کہا کہ مسز لیمبرک کی موت حادثاتی نہیں تھی لیکن اس وقت تک دیر ہوچکی تھی اور ڈاکٹر نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیے تھے بلکہ تمہاری پھوپی کی تدفین بھی ہوچکی تھی۔

جیسے ہی ڈولنگر نے اپنی بات ختم کی۔ ہنری نے غصے سے کہا۔ ''تم دونوں کا دماغ چل گیا ہے، تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر جیوری کے اراکین صرف قہقہے لگا سکتے ہیں۔''

''گزشتہ ہفتے تم نے ہمیں بتایا تھا کہ تم خود بھی مونگ پھلی سے الرجک ہو۔'' اوبرن نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں۔'' ہنری نے تائید کی۔ ''اس کے علاوہ اناناس اور کیوی فروٹ سے بھی مجھے الرجی ہو جاتی ہے۔''

''کیا تم یہ وضاحت کر سکتے ہو کہ اس ضیافت میں تمہارے پاس پلاسٹک کی شیشی میں صاف شدہ اور گاڑھا مونگ پھلی کا تیل کہاں سے آیا؟''

ہنری لیمبرک یوں ساکت ہو گیا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مار دیا ہو۔

''تم صرف طبی عملے کو لینے کے لیے نیچے نہیں گئے تھے۔ بلکہ تمہیں جلد از جلد اس شیشی سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا، جب تم ریستوران کے دروازے پر پہنچے تو تمہاری نظر باہر رکھے ہوئے اس کوڑے دان پر گئی جس میں سگریٹ کے ٹکڑے پھینکے جاتے ہیں۔ تم نے وہ شیشی اس میں پھینک دی۔ تمہیں یقین تھا کہ کسی کا دھیان اس جانب نہیں جائے گا۔ اسی لیے تم نے شیشی پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ لیکن خوش قسمتی سے ہم اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کی بیرونی سطح پر تمہارے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کا نشان بالکل واضح ہے۔ ان کی تصدیق ان نشانات سے بھی ہو گئی ہے جو تم نے کئی سال پہلے سٹی فنانس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت شروع کرتے وقت ریکارڈ کروائے تھے۔''

ہنری کرسی پر بیٹھ گیا اور مدافعانہ انداز میں بولا۔ ''ہر شخص کو میری پھوپی سے شکایت تھی کہ وہ مختلف معاملات میں رکاوٹ ڈالتی اور جمود طاری کر دیتی ہے لیکن کسی کو اس کی دیانت داری پر کبھی شک نہیں ہوا جبکہ وہ بہت فریبی اور شیطان صفت عورت تھی۔ اسے گزر اوقات کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پاس کروڑوں کے اثاثے ہیں اور وہ ہاتھ ہلائے بغیر زندگی بھر پُرتعیش زندگی گزار سکتی تھی لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی اور ہر کام میں ٹانگ اڑا کر اپنا الو سیدھا کرتی رہی۔ جہاں تک میرے علم میں ہے اس نے کوئی وصیت تیار نہیں کی تھی لیکن جب سے وہ سٹی کمیشن کی رکن منتخب ہوئی تھی، اس نے مجھے وراثت سے محروم کرنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ اس کے کہنے پر عمل کروں۔ پہلے اس نے چھوٹے موٹے مالی مفادات حاصل کیے پھر بڑی بڑی بے قاعدگیاں ہونے لگیں اور نوبت فراڈ تک پہنچ گئی جس میں نقد رقومات کی خرد برد، سفری الاؤنس کے جھوٹے کلیم، جعلی رسیدیں، عوامی خدمت کے نام پر بے دریغ ذاتی اخراجات وغیرہ شامل تھے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا تو ایک دن بات کھل جاتی جس کے نتیجے میں صرف میری ملازمت ہی نہیں جاتی بلکہ جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی لیکن اگر میں اس کے ناجائز مطالبے پورا کرنے سے انکار کر دیتا تو وہ مجھے جائداد سے محروم کر دیتی اور سب کچھ رفاہی اداروں کو چلا جاتا۔

''گزشتہ مئی میں جب ایک پارٹی میں بسکٹ کھانے سے اسے الرجی ہوئی اور مجھے اسپتال والوں نے فون کر کے اس بارے میں بتایا تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایک اتفاقی حادثے کے ذریعے اسے راستے سے ہٹانا کتنا آسان اور محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے بھاری مقدار میں مونگ پھلی کا تیل دینا ہوتا تاکہ اس حالت میں اسے ایڈرینالین دینا ضروری ہو جائے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسی دوائیں استعمال کرتی ہے جن کے ہوتے ہوئے ایڈرینالین نہیں دی جا سکتی۔''

وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ یہ کرسمس جیل میں ہی گزرے گا۔''

''یہ معاملہ مجسٹریٹ اور تمہارے وکیل کے درمیان ہے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے جب تک جیوری تمہارے کیس کی سماعت شروع نہیں کرتی اور یہ کام کرسمس اور سالِ نو کی تعطیلات کے بعد ہی شروع ہوگا۔''

اس کیس کو خوش اسلوبی سے حل کرنے پر ڈولنگر اور اوبرن کی خوب واہ واہ ہوئی۔ ریستوران کی جانب سے انہیں پیشکش ہوئی کہ وہ مستقلاً رعایتی نرخوں پر وہاں کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس واقعے سے ریستوران کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا تھا ان دونوں سراغ رسانوں نے اصل مجرم کا سراغ لگا کر اس کی تلافی کر دی۔ خاص طور پر شیف پارکر زیڈ تو ان کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی کافی پینے وہاں جاتے، وہ انہیں دیکھتے ہی نعرہ لگاتا۔ ''خوش آمدید! آج کی خاص ڈش تمہارے نام۔'' اور وہ دونوں مسکرا کر رہ جاتے کیونکہ انہیں کسی کا احسان لینے کی عادت نہیں تھی۔

وہ جیلی نما زرد رنگ کی انوکھی مخلوق تھی۔ ایلین مخلوق یا کچھ اور، اسے کوئی نام دینا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک بڑے سے بلبلے کے مانند تھی۔ جس میں چھوٹے بڑے مزید بلبلے ابھر رہے تھے اور ڈوب رہے تھے۔ ان کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ جسامت چھوٹی سوزوکی کار سے لے کر بڑے ٹرک جیسی تھی۔

زرد جیلی نما مخلوق ناقابلِ فہم انداز میں متحرک تھی۔ ہاتھ، پیر، سر، آنکھیں، کچھ بھی نہیں تھا۔ تاہم نہ صرف وہ زندہ

# بد قسمت

بشریٰ امجد

صبر... ہمت اور کردار بڑی چیز ہے... وہ کمانڈر کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرتا تو جان بچانے کی شاید کوئی صورت نکل آتی... اس کی بزدلی اور کم ہمتی نے جان بچانے کا ہر دروازہ بند کر دیا... جبکہ خوش قسمتی اس سے ذرا دور منتظر کھڑی تھی...

**لمحہ بہ لمحہ سنسنی خیزی کی جانب گامزن ایک اعصاب شکن کہانی کے لرزا خیز موڑ**

صبر..

تھے بلکہ ''تھیٹا کیمپ'' پر یلغار کر رہے تھے۔ ''گریمن'' نامی سیارچے پر واحد زمینی سائنسی اسٹیشن ''تھیٹا کیمپ'' تھا۔ جو زرد مخلوق کی چڑھائی کو روکنے کے لیے ہر قسم کے جدید ہتھیار بھاری مقدار میں استعمال کر رہا تھا۔ تاہم وہ ایلین کی کون سی قسم تھی جس کی پیش قدمی تھمنے میں نہیں آرہی تھی۔

بھاری اسلحہ ان کو ٹکڑوں میں تقسیم تو کر دیتا تھا، تاہم نامعلوم نظام کے تحت یہ ٹکڑے ازخود مل کر دوبارہ ایک ہو جاتے تھے۔ تھیٹا کیمپ کا اسلحہ زرد جیلی کی یلغار کو روکتا تو کجا، ان کی پیش قدمی کو سست کرنے میں بھی ناکام نظر آرہا تھا۔

زرد جیلی دو اسپیس شپس پہلے ہی تباہ کر چکی تھی۔ مکمل تباہی سر پر منڈلا رہی تھی۔ تھیٹا کیمپ کا کمانڈر ہاورڈ ہارکنس بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ اسے جلد ہی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا تھا۔

ہیوز، چیف ٹیکنالوجی آفیسر تھا۔ اس نے کیمپ کو بچانے کے لیے انتہائی طاقتور حصار قائم کیا تھا۔ یہ حصار ہی امید کی کرن تھا۔ تاہم جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، اسے توقع نہیں تھی کہ حصار زیادہ دیر ان کو محفوظ رکھ سکے گا۔ خود کو دھوکا دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیمپ کی سیکڑوں زندگیاں داؤ پر لگی تھیں، ہیوز نے کمانڈر ہارکنس سے خدشے کا اظہار کر دیا۔

''ہم اس خطرے کو کتنی دیر روک سکتے ہیں؟'' کمانڈر نے ہیوز کی بات سن کر سوال کیا۔

''شاید، تیس منٹ......'' ہیوز نے شانے اچکائے۔ ''یا کچھ کم اور زیادہ...... لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ روکنا ممکن نہیں ہے۔ ان پر کسی چیز کا اثر نہیں ہو رہا۔''

''ایک، صرف ایک شپ محفوظ ہے۔ بیس کیمپ کے عقب میں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ ''تھیٹا'' کو خالی کرنا پڑے گا۔'' کمانڈر ہارکنس نے کہا۔

''کمانڈر لیکن ایک بڑا مسئلہ ہے۔'' ہیوز بڑبڑایا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں۔ ہم سب محفوظ شپ کے ذریعے زمین تک نہیں پہنچ سکتے۔ شپ میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ غالباً 20، 25 افراد کو یہیں رکنا پڑے گا۔'' کمانڈر کے چہرے پر گمبھیرتا تھی۔

''کمانڈر! یقیناً تم فیصلہ کرو گے کہ کون جائے گا، کون یہاں موت کا انتظار کرے گا؟'' سوال پوچھنے والا مارٹن فینک تھا۔ وہ ٹیم کا سینئر پائلٹ تھا۔ اس کی مہارت لاجواب تھی۔ اسی وجہ سے اس کا نک نیم ''ایس ہائی'' پڑ گیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ جانے والوں میں میرا نام ٹاپ پر رکھا جائے گا۔''

کمانڈر ہارکنس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''معذرت خواہ ہوں، فینک۔ یہاں کافی افراد ہیں۔ کوئی بھی موت کے منہ میں رکنا پسند نہیں کرے گا۔ اس طرح افراتفری پھیل جائے گی۔ ہر ایک کی اپنی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کی بنیاد پر کوئی بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔'' کمانڈر کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ''میں بھی اس سے مبرا نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھاری ذمے داری ہے۔''

''کم آن کمانڈر۔'' فینک کے چہرے نے رنگ بدلا۔ ''میں مشن کو یہاں سے نکال لے جانے کے لیے بہترین انتخاب ہوں اور تم یہ بات جانتے ہو۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں کمانڈر ہوں اور بہ آسانی یہاں سے نکل سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔''

فینک کے چہرے پر پریشانی نظر آئی اور وہ بحث پر اتر آیا۔ کوپائلٹ ڈین میری نے اپنے سینئر کو بازو سے پکڑ کر وہاں سے ہٹایا۔

''جناب، کمانڈر کی بات صحیح ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ سب کا حق ہے کہ برابر کا چانس لیں۔ سب اپنی اپنی جگہ پر فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کمانڈر اتھارٹی رہا ہے اور اب بھی ہمیں کمانڈر کے فیصلے پر صاد کرنا چاہیے۔''

''کیا رکنے کے لیے رضاکار آگے آئیں گے؟'' فینک ہنس پڑا۔ ''کمانڈر! تم کتنے اور کن افراد کو لے جا سکو گے؟''

''کسی کو رضاکارانہ موت کے لیے طلب نہیں کیا جائے گا۔'' کمانڈر ہارکنس نے جواب دیا۔

''فیصلہ تم کرو گے؟''

''نہیں، فیصلہ میکس کرے گا۔ اس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ چاہے مجھے ہی کیوں نہ رکنا پڑے۔'' کمانڈر نے سکون سے کہا۔

میکس، تھیٹا کیمپ کا مین کمپیوٹر تھا۔ محفوظ شپ میں ایک سو چالیس افراد کو لے جانے کی گنجائش تھی۔

کمانڈر نے ڈپٹی کمانڈر کو کمپیوٹر آپریٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ فینک کا چہرہ مکدّر ہو گیا۔ حالانکہ یہ ایک بہترین اور غیر جانبدارانہ فیصلہ تھا۔ قرعہ اندازی کی طرح۔ ایسا فیصلہ ایک قابل اور مضبوط اعصاب کا کپتان ہی کر سکتا تھا۔ تمام

گروپ لیڈرز کو مطلع کر دیا گیا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ فہرستیں فراہم کی گئیں۔

کمانڈر کی ہدایت کے مطابق ڈپٹی نے نام فیڈ کرنے شروع کیے۔ اعصاب کھنچاؤ کا شکار تھے۔ ماحول پر سکوت طاری تھا۔ تمام افراد سینٹرل کنٹرول ایریا میں تھے۔ چند سیکنڈ میں کمپیوٹر نے پرنٹ آؤٹ دے دیا۔ جذبات سے عاری مشین نے زندگی اور موت تقسیم کر دی تھی۔

دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کیمپ پر رکنے والے کم تعداد میں تھے۔ جانے والے ایک سو چالیس تھے۔ کمانڈر نے رکنے والوں کی فہرست کو ''ڈوم لسٹ'' (doom list) کا نام دیا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔ فینک کا نام ڈوم لسٹ میں شامل تھا۔ تیز خود کمانڈر کا بھی .... فینک بھڑک اٹھا۔ ''میرے علاوہ کون فلائی کر سکتا ہے؟''

''ڈین کیری۔'' کمانڈر نے مختصر جواب دیا۔ جن کے نام ''ڈوم لسٹ'' میں نہیں تھے، ان کے چہروں پر زندگی کا رنگ بحال ہو گیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' فینک نے کہا۔ ''تمام اسپیس۔ فلیٹ کا بہترین پائلٹ مرنے کے لیے یہاں رکے گا اور سزائے موت اس بے جان مشین نے سنائی ہے۔ سن لو، میں اسے مسترد کرتا ہوں۔''

''میں نے میکس کا فیصلہ قبول کیا ہے۔'' کمانڈر نے کہا۔ ''تم اپنے کردار کی بہت بڑھکیں مارا کرتے تھے۔ ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا موقع ہوگا۔''

فینک کے چہرے پر پسینا نمودار ہوا، ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔

''آئی ایم سوری، فینک۔'' ڈپٹی ڈین کیری نے اظہارِ افسوس کیا۔

''دیکھو، ناقابلِ شکست ایلینز کے مقابلے میں اب تک ہمارے درجن بھر سے زیادہ لڑاکا مارے جا چکے ہیں.... جس پر زرد رنگ کی پچکاری پڑتی ہے وہ 30 منٹ میں زرد محلول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حوصلہ شکن صورتِ حال ہے۔ وہ بھی اپنی جان نچھاور کر رہے ہیں۔ سچویشن یہی رہی تو ممکن ہے ہمیں ''میکس'' کو دوبارہ چلانا پڑے اور تم خوش قسمت رہے تو تمہارا نام ''ڈوم لسٹ'' سے نکل سکتا ہے۔'' کیری نے فینک کو سمجھایا۔

فینک نے اپنا بازو ڈپٹی کی گرفت سے آزاد کرایا۔ ''شٹ اَپ، ڈین۔'' وہ بولا۔ فینک کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

☆☆☆

خوش قسمت عملے کو محفوظ شپ پر منتقل کرنے کے احکامات جاری کر دیے گئے۔ ہر فرد اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ دس، پندرہ پونڈ وزن رکھ سکتا تھا۔ وہاں دوست اور رشتے دار بھی تھے۔ جانے والے رہ جانے والوں سے آنکھ نہیں ملا پا رہے تھے۔

فینک جانتا تھا کہ اس کا ڈپٹی ڈین، اس کی بہت عزت کرتا ہے۔ تاہم یہ احترام فینک کی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ منسلک تھا۔ فینک، منت سماجت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ تاہم اس وقت وہ ڈین کیری سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ فینک کو جانے دے۔

''ڈین۔'' وہ گڑگڑایا۔ ''میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھا ہے۔ تم جانتے ہو، میں نے تمہیں سکھانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میری فیملی ہے۔ مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں.... پلیز ڈین۔''

ڈین، دنگ رہ گیا۔ اسے گمان نہیں تھا کہ فینک اتنی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا۔ ''ڈوم لسٹ'' میں فینک تنہا نہیں تھا۔ ڈین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ خوش قسمتی سے کمانڈر ہارکنس نے ڈین کی مشکل آسان کر دی۔

''میں نے سن لیا ہے، تم ڈین سے کیا کہہ رہے تھے۔ شرم آنی چاہیے۔ لگتا ہے کہ تم اکیلے مرنے جا رہے ہو۔ جاؤ نمبر پانچ پر اپنا اسٹیشن سنبھالو۔''

فینک کی آنکھوں میں وحشت تھی، ہراس تھا۔ ''دیکھو۔'' اس کی آواز گھٹ گئی۔ ''زمین پر میرا خاندان بہت امیر ہے، بہت زیادہ۔ اگر مجھے جانے دو گے تو تمہارے جانے والوں کو میں اتنی دولت دوں گا کہ وہ فکرِ فردا سے آزاد ہو جائیں گے۔''

کمانڈر کی آنکھوں میں نفرت کا تاثر ابھرا۔ ڈین بھی حیران رہ گیا۔ فینک اپنی سطح سے نیچے گر گیا تھا۔

''میرے احکامات کی نفی کرو گے تو میری گولی سے مرو گے۔'' کمانڈر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

وہاں رہ جانے والوں کی ٹیم بنا کر کمانڈر، جیلی نما مخلوق سے آخری معرکے کی تیاری کرنے لگا۔ اگرچہ وہ انجام سے آگاہ تھا۔

☆☆☆

فینک کے اعصاب جواب دے گئے۔ اسے اپنی

جان کی فکر پڑی تھی۔ وہ دفاعی ٹیم میں شامل ہونے کے بجائے شپ نمبر 3 میں جا پہنچا۔ اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جن افراد نے زمین کی جانب سفر کرنا تھا، وہ ابھی شپ تک نہیں پہنچے تھے لیکن فلائٹ ڈیک پر اسے عملے کا ایک آدمی مل گیا۔ فینک نے دیوانگی کے عالم میں جو چیز ہاتھ میں آئی، اس کے سر پر دے ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور خوابِ غفلت میں چلا گیا۔ فینک نے اسے لڑھکا کر کوریڈور میں پہنچایا اور دروازے سیل کر دیے۔ خود اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس نے ماسٹر سوئچ کے ذریعے تمام سسٹم لاک کر دیے۔ پائلٹ سیٹ میں بیٹھ کر اس نے منتشر اعصاب کو سنبھالا اور کمیونیکیشن کونسول پر ہاتھ مارا۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز شپ کے باہر گونج رہی تھی۔

کیمپ تھیٹا کے سینٹرل کمانڈ روم میں کمانڈر ہارکنس اپنی جگہ پر منجمد رہ گیا۔

''اوکے، ہارکنس۔'' فینک کی آواز آئی۔ آواز میں دیوانگی کی جھلک تھی۔''شپ تھری میرے کنٹرول میں ہے۔ جب تک میں نہیں جاؤں گا، کوئی بھی نہیں جائے گا۔ سن رہے ہو؟ میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔''

''فینک، میں سن رہا ہوں۔'' کمانڈر نے دانت پیسے۔''حماقت مت کرو۔ خود پر قابو پاؤ۔ یہ بلیک میلنگ ہے۔ تم میرے احکامات کے پابند ہو۔''

''اوہ، کمانڈر یہاں کون سی عدالت لگی ہے۔'' فینک کی آواز آئی۔''میں مروں گا تو سب مریں گے۔''

ہارکنس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سو سے زیادہ افراد کو یہاں سے روانہ کرنا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ناقابلِ شکست زرد ایلینز سر پر تھے۔

''میری کے'' تھیٹا کیمپ کی انجینئر اسپیشلسٹ تھی۔ ہارکنس نے اس کا بازو پکڑا۔ میری کا نام بھی ڈوم لسٹ میں تھا۔

''میری، فلائٹ ڈیک میں گھسنے کی کوئی ترکیب نکالو۔ فینک کو وہاں سے نکالنا ہے اور جلدی.....''

''کمانڈر وقت بہت کم ہے پھر بھی میں کوشش کرتی ہوں۔ مجھے لیزر کٹر کے ساتھ ایک آدمی درکار ہے۔''

''ہارورڈ بہتر رہے گا۔'' ہارکنس نے اشارہ کیا۔

''ایکسکیوزمی سر۔'' ڈین کیری نے دخل اندازی کی۔ ''میں فینک کو خوب جانتا ہوں..... میرا خیال ہے کہ میں بات چیت کے ذریعے اسے رام کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''میری'' اپنا کام کرے گی۔ تم اپنا کرو، دونوں میں سے جو پہلے کامیاب ہو جائے، چانس کم ہے اور وقت بھی قلیل..... گڈ لک۔''

☆☆☆

اوپن لائنز پر فینک نے اگر کمانڈر کا منصوبہ سنا بھی تھا تو کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ اپنی نشست میں آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ مختلف اسکرینز پر خوفناک لجلجی زرد مخلوق کو روکنے کے لیے کمانڈر ہارکنس کی ٹیم ہر ترکیب آزما رہی تھی۔ فینک محفوظ مقام سے یک طرفہ لڑائی دیکھ رہا تھا۔

وہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ہیرو بن کر زمین پر اترے گا..... اچانک اسے ڈپٹی کیری کی آواز سنائی دی۔

''میں، ڈین کیری ہوں، تم مجھے سن رہے ہو؟''

''آہ، ڈین..... کیا مسئلہ ہے؟''

''مجھے اندر آنے دو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

ڈین نے اپنے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دیکھا۔

''تم مجھے پاگل سمجھتے ہو۔ تم لوگوں نے میری آفر مسترد کر دی تھی۔ اب کیا بات کرنی ہے؟'' فینک کا لہجہ زہر آلود تھا۔''تم لوگوں نے میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''تمہیں احساس کرنا چاہیے کہ کمانڈر خود ڈوم لسٹ پر ہے پھر بھی ہم دونوں کوئی حل نکال لیں گے۔'' ڈپٹی کیری کی خواہش تھی کہ فینک بات کرتا رہے۔ اگر وہ فینک کو قائل نہ کر سکا تو اتنی دیر میں ''میری'' اپنا کام کر لے گی۔

''تمام لوگ جانے کے لیے تیار ہیں، انہیں تو اندر آنے دو.....''

''اور میں خود باہر آجاؤں؟'' فینک نے کڑی آواز میں سوال کیا۔

''نہیں، تم میری جگہ لے سکتے ہو۔''

''دھوکا دے رہے ہو مجھے؟''

''نہیں، میں سچ بول رہا ہوں۔ اس طرح ایک سو چالیس افراد کی جان بچ جائے گی۔''

شپ کے نیچے ''میری'' ہارورڈ کے ساتھ مل کر تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی۔

''میں کیسے یقین کر لوں؟'' فینک نے اعتراض کیا۔

''تم خود بتاؤ، میں تمہیں کیسے یقین دلا سکتا ہوں؟'' ڈپٹی کیری نے الٹا سوال کر ڈالا۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

بربادی یقینی تھی۔ ایلینز نے آخری حصار تہس نہس کر دیا تھا۔ دیوقامت زرد بلبلوں سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

کمانڈر ہارکنس کے ذہن میں شرارہ لپکا۔ ایک کارڈ باقی تھا۔ اسے کیوں نہ آزمایا جائے۔

''فائر گنز تیار کرو، جلدی۔'' وہ دہاڑا۔

آگ پھینکنے والی مخصوص گنیں آناً فاناً پہنچ گئیں۔ واٹر کینن کے مانند، آگ کے شعلے دور تک جا رہے تھے.....

حیرت انگیز منظر تھا۔ ایلینز کی یلغار تھم گئی۔ آگ ان کو بدبودار پانی میں تبدیل کر رہی تھی۔ اچانک آگ کی زد سے بچنے والی زرد جیلی کا رنگ بدل کر نارنجی ہو گیا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز میں ایک اور ناقابلِ فہم سیٹی نما آواز شامل ہو گئی۔ یلغار رکے ہوئے ایک منٹ ہو چلا تھا۔ یہ نہایت قیمتی مہلت تھی.... سرخ رنگت اختیار کرنے والی جیلی پر آگ اثرانداز نہیں ہو رہی تھی۔

کمانڈر نے دوبارہ لیزر اٹیک کا آرڈر دیا۔

☆☆☆

میری جانتی تھی کہ شپ میں گھسنے سے پہلے وہ سب ایلینز کے بلبلوں کے اندر جذب ہو چکے ہوں گے۔ معاً فائر اٹیک نے امید کی نئی کرن دکھائی۔ وہ شدومد سے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ہارورڈ اس کی مدد کر رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنی مطلوبہ جگہ کاٹ کر شپ میں داخل ہو گئے.... میری نے ڈپٹی کیری کو اشارہ کر دیا تھا۔ کیری کی گفت و شنید تقریباً فینک سے لاحاصل رہی تھی۔ وہ تینوں احتیاط سے شپ نمبر 3 میں پہنچ گئے۔

ہارورڈ نے کیری کو دوسرا کوریڈور استعمال کرنے کو کہا۔ فینک، اسکرینز پر لڑائی کی صورتِ حال دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ہارورڈ کی آواز نے اسے ہڑبڑا دیا۔ وہ نہ صرف پلٹا بلکہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے ہاتھ میں گن تھی۔

فینک، سخت اعصابی کشمکش میں مبتلا تھا۔

''مجھے کوئی نہیں روک سکتا، تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔'' وہ چیخا اور گن سیدھی کی۔

''گن پھینک دو۔'' کیری کی آواز دائیں جانب سے آئی۔ فینک حواس کھو بیٹھا، اس نے گردن گھما کر اپنے ڈپٹی کو غیر یقینی انداز میں دیکھا۔ ڈپٹی کیری کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔

پھر وہ ہوا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ فینک کے اعصاب ٹوٹ گئے، رنگت سفید پڑ گئی۔ اس نے اچانک ڈپٹی پر گولی چلائی پھر گن اپنے سر پر رکھ کر فائر کر دیا۔ ہارورڈ نے کیری کو بچانے کے لیے فائر کیا تاہم فینک پہلے ہی خودکشی کر چکا تھا۔

''میری'' نے منہ پھیر لیا اور ہارورڈ نے تاسف سے سر ہلایا۔

☆☆☆

خوش قسمت افراد، ڈپٹی کیری کے ساتھ زمین کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔

کمانڈر، ڈوم لسٹ کے افراد کے ساتھ موت سے نبرد آزما تھا۔ اس کا حوصلہ قابلِ دید تھا۔ وہ سب بہادری کی موت مرنا چاہتے تھے اور شانہ بشانہ کمانڈر کے ساتھ تھے۔

ایلینز رکے تھے، پسپا نہیں ہوئے تھے۔ نیز آگ کی دھاریں تبدیل شدہ سرخ رنگ کی جیلی پر بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ کمانڈر کے خیال میں یہ وقتی مہلت تھی۔

کمانڈر کو فینک اور عملے کے ایک آدمی کی موت کا صدمہ تھا۔ دوسرا مرنے والا وہی تھا جس کے سر پر فینک نے آہنی ضرب لگائی تھی۔ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔ شپ 3 زمین کی جانب محوِ سفر تھا۔ لیکن ایک مسافر کم تھا فینک نے جس آدمی کو مارا تھا اس کی جگہ کوئی اور جا سکتا تھا۔ تاہم کون جاتا؟ یہ معلوم کرنے کے لیے ''میکس'' کی مدد حاصل کرنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔

''ایک فرد اور بچ سکتا تھا۔'' میک نے کہا۔

''ہاں لیکن دیر ہو گئی تھی۔'' ہارورڈ نے جواباً کہا۔

میک فلسفیانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اب تو جلدی نہیں ہے۔ ''میکس'' سے پوچھا جا سکتا ہے کہ آخری فرد کون ہو سکتا ہے۔ کون خوش قسمت گنجائش کے باوجود جانے سے رہ گیا؟''

''کیا فائدہ؟''

''ہاں، دیکھنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' کمانڈر اداس مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا اور ''میکس'' کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

ایک سیکنڈ میں کمپیوٹر نے ایک نام ظاہر کر دیا۔

''مارٹن فینک۔''

تینوں نام پڑھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

# پرچی

کاشف زبیر

کچھ لمحے بڑے کرشماتی ہوتے ہیں... جو چاہا ہو... وہ پل کے پل پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے... جلیل بھی اپنے عزمِ صمیم کے ساتھ گھر سے نکلا تھا... دوستوں کے عدم استحکام اور سازشی تانے بانوں سے قطعِ نظر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا جنوں اسے ہر در پر دستک دینے پر مجبور کررہا تھا... مخصوص کرداروں کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی اور دشمنوں کی دل ربا و دل جلی کارروائیوں کے ہمراہ اچھلتا کودتا دلچسپ سلسلہ...

**بھتے کی پرچی کا پراسرار معما جسے حل کرنے کا سہرا جلیل کے سر تھا...**

میں بروقت چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں داخل ہوا جہاں چھوٹے پیمانے پر بدامنی کے آثار نظر آرہے تھے۔ چھوٹا بھائی بڑا کی طرح دار سیکریٹری چیخ مار کر نوجوان اکاؤنٹنٹ کی باہوں میں جھول گئی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے ذرا فاصلے پر تھا مگر اسے پکڑنے کے لیے بروقت پہنچا اور اس کا باس یعنی چیف اکاؤنٹنٹ یہ اعزاز حاصل نہ کرنے پر چیں بہ چیں نظر آرہا تھا اور منہ میں موجود پان کو ایمرجنسی میں گھونٹ رہا تھا۔ دفتر کا منیجر لرزے کا پرانا مریض تھا اور حلیے

سے چھوٹا بھائی بڑا کا پارٹ تو نظر آتا تھا مگر خود چھوٹا بھائی بڑا اس وقت لرزے میں منیجر کی کاپی کر رہا تھا اور اپنی میز سے ممکنہ حد تک دور ایک کونے میں کھڑا جون کی گرمی میں دسمبر کے جاڑے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ البتہ اس کا چپراسی جان پر کھیل کر میز کے پاس ہی کھڑا تھا۔ جان پر کھیل کر کیوں؟ اس کا علم مجھے ذرا دیر سے ہوا تھا۔

دفتر کی دوسری خاتون ملازم اور واحد ہنسنے والی گلو جی اس وقت بھی ہنس رہی تھیں، جب باقی افراد کے رونے کی کسر رہ گئی تھی۔ گلو جی کا اصل نام گل جی تھا مگر گول مٹول ہونے کی وجہ سے گلو جی کہلاتی تھیں۔ ان کا قد پانچ فٹ دو انچ اور وزن ستر کلوگرام تھا اس لیے وہ صرف منہ سے نہیں ہنستی تھیں، ماہرین کے مطابق پانچ فٹ دو انچ قامت پر کسی خاتون کو ساٹھ کلوگرام سے زیادہ وزنی نہیں ہونا چاہیے۔ گلو جی جب ہنستیں تو ان کا اضافی دس کلوگرام وزن جہاں جہاں ہوتا وہیں سے ہنسی میں شریک ہو جاتا۔ یہ منظر قابلِ دید کم مگر نا قابلِ بیان ہوتا تھا۔ دفتر میں جب گلو جی ہنستیں تو کوئی کام نہیں کرتا تھا، سب انہیں دیکھتے تھے۔ اسے حالات کی سنگینی نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کوئی گلو جی کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ گلو جی بھی ہنس نہیں رہی تھیں۔ وہ بھی اصل میں رو رہی تھیں۔

بعض لوگوں کی صورت ایسی ہوتی ہے کہ ہنستے بھی ہیں تو لگتا ہے رو رہے ہیں مگر گلو جی ان خواتین میں سے تھیں جو روتیں تب بھی ہنستی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دفتر کا واحد فرد جو نارمل دکھائی دے رہا تھا، وہ چپراسی چچا پون تھا۔ اس کا سر چھوٹا بھائی بڑا کی میز کی کھلی دراز پر جھکا ہوا تھا اور وہ کسی چیز کا بہ غور معائنہ کر رہا تھا۔ چھوٹا بھائی بڑا گنگنانے کے انداز میں چلا رہا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہا تھا۔

”اسے دور رہ ۔۔۔ پھٹ جائے گا۔“

اماں نے جب سے شادی کے لیے ہاں کی تھی، میرا مطلب ہے میری شادی پر نیم رضامندی ظاہر کی تھی تب سے میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ جلد از جلد جہاں جہاں میری رقم پھنسی ہے نکلوا لوں۔ بدقسمتی سے میرے دو بڑے نادہندگان چھوٹا بھائی بڑا اور جمی تھے۔ دونوں میں مشترک قدر خسیس پن تھا۔ اگر کنجوسی کی عالمی چیمپین شپ ہوتی تو منتظمین مشکل میں پڑ جاتے کہ پہلا انعام ان دونوں میں سے کس کو دیں۔ خود میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ جوئے شیر کہاں سے نکالوں اس لیے ٹاس کر کے چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر کا رخ کیا تھا مگر یہاں حالات خراب لگ رہے تھے۔

میں نے پوچھنے کے بجائے چچا پون کے اوپر سے جھانک کر دراز میں دیکھا اور پھر بھاگنے کا سوچا کیونکہ دراز میں۔۔۔۔ ایک عدد دستی بم رکھا ہوا تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ بے شک یہ دستی بم ہے مگر از خود پھٹنے سے رہا، ورنہ اب تک پھٹ چکا ہوتا۔ میں نے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف دیکھا۔

”سیٹھ، یہ کیا چکر ہے؟“

”تجھے نظر نہیں آتا ہے۔“ اس نے خفگی سے کہا۔

”نظر تو آ رہی ہے۔“ میں نے احتیاط سے نزدیک ہو کر بم کا معائنہ کرنے کے لیے چچا پون کو پیچھے کیا۔ پیچھے ہٹائے جانے پر چچا پون نے یوں سکون کا سانس لیا جیسے وہ اب تک دستی بم پکڑے کھڑا تھا۔ یہ انناس کی شکل و سائز و رنگ کا بم تھا جس کے اوپر ایک کی چین جیسا رِنگ تھا۔ ”یہ روسی ساختہ ہینڈ گرینیڈ ہے۔ مگر فکر مت کرو اس کی پن لگی ہے۔ جب تک اسے نہیں کھینچا جائے گا یہ نہیں پھٹے گا۔“

”تجھے کیسے پتا؟“

میں نے دانت نکالے۔ ”میں جلیل الزماں ہوں۔ پرچی کہاں ہے؟“

اس بار چھوٹا بھائی بڑا اچھل پڑا۔ ”تجھے معلوم ہے، کہیں تو نے ہی تو نہیں رکھا ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں رکھتا تو تمہارے نیچے رکھتا۔ پن نکال کر اور پھر آواز آتی ۔۔۔۔ بوم۔۔۔۔ اور اس وقت یہاں تم سب زندہ سلامت نہیں کھڑے ہوتے بلکہ ایک پیس میں بھی نہ ہوتے مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے اگر مجھے میرے واجبات نہ ملے تو اگلی بار میں ہی یہ کام کر جاؤں گا۔“

چھوٹا بھائی بڑا نے چلا کر کہا۔ ”میں تجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔“

”ضرور کرو۔“ میں نے دانت نکالے۔ ”اس سے بم بھیجنے والے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہاں تم نے اس کو بھتہ نہیں دیا تو وہ خود آئے گا اور ایسا ہی دستی بم یہاں مار کر جائے گا۔“

چھوٹا بھائی بڑا پھر لرزنے لگا۔ ”تو سچ کہہ رہا ہے؟“

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کی طرح دار سیکریٹری کو غور سے دیکھا۔ ”اسے کیا ہوا ہے؟“

”بے ہوش ہے۔“ اسسٹنٹ اکاؤنٹس نے مسرور لہجے میں مطلع کیا۔ وہ اسے ”سنبھالے“ ہوئے تھا۔

”اسے کبھو ہوش میں آ جائے عین ممکن ہے۔ بم بھیجنے والا خود بھی آنے والا ہو۔ آج کل وطنِ عزیز میں یہی لوگ قول

کے بکے رہ گئے ہیں، جو کہتے ہیں اسے پورا بھی کرتے ہیں۔ خالی دھمکی نہیں دیتے اگر رقم نہ ملے تو گولی یا بم مارنے آجاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بے ہوشی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے۔''

یہ سنتے ہی طرح دار سیکریٹری کو ہوش آگیا اور وہ بادلِ ناخواستہ اکاؤنٹس اسسٹنٹ کی بانہوں سے الگ ہوگئی۔ اس پر زیادہ ... خوشی چیف اکاؤنٹنٹ کو ہوئی تھی اور اس نے نارمل انداز میں پان چبانا شروع کر دیا اور فوراً گلو جی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ٹھرکی پن کی اس منزل پر تھا کہ اگر اسے بجلی کے کھمبے میں بھی ذرا سی نسوانیت دکھائی دیتی تو وہ اسی کے گرد منڈلانا شروع کر دیتا۔ دستی بم کے ساتھ آنے والا پرچہ دراز میں بم کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ صبح دفتر آنے کے بعد جیسے ہی چھوٹا بھائی بڑا نے دراز کھولی پورے دفتر میں سنسنی پھیل گئی۔ پہلے تو چھوٹا بھائی بڑا کی ریلوے انجن کی سیٹی نما چیخ نے سارے دفتر کو اس کے کمرے میں جمع کر لیا۔ خود چھوٹا بھائی بڑا اسی کونے میں جا کھڑا ہوا تھا جہاں وہ اس وقت بھی موجود تھا۔ اس کے بعد جس جس نے بم کی زیارت کی، اپنی عقیدت کا اظہار اپنے اپنے انداز میں کرنے لگا تھا۔

پرچی اٹھانے کے لیے پہلے بم اٹھانا لازمی تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میں کون سا اتنا بڑا ایکسپرٹ ہوں .... اگر بم اٹھانے سے ہی پھٹ جاتا تو شنو بغیر شادی کے بیوہ ہو جاتی۔ مگر یہ اچھا موقع تھا چھوٹا بھائی بڑا سے اپنی رقم نکلوانے کا، اس لیے میں نے دل کڑا کر کے دستی بم اٹھا لیا۔ فوراً ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اصلی نہیں تھا۔ اول یہ پلاسٹک کا بنا ہوا تھا دوسرے اس کا وزن نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے ٹینس بال سائز اور شکل کے کریکر بھی دیکھے تھے مگر وہ خاصے وزنی ہوتے تھے کیونکہ بارودی مواد کسی قسم کا بھی ہو، وزن رکھتا ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور چھوٹا بھائی بڑا کی طرف بڑھا اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔ ''دور.... دور رہ.... پاس مت آ۔''

میں رک گیا مگر بم ہاتھ میں بال کی طرح اچھالنا شروع کر دیا۔ ''پاس نہیں آتا مگر چھوٹا بھائی، تمہیں یاد ہے مختلف اوقات میں تم نے مجھ سے کام لیے اور مجھے پوری ادائیگی نہیں کی۔ کیوں نا آج اس کا حساب ہو جائے۔ ہو سکتا ہے جلد ہی یہ بم بھیجنے والا خود دوسرا بم لے کر آئے اور تم دنیا میں نہ رہو۔ میری رقم پھر کون دے گا؟''

چھوٹا بھائی بڑا نہایت ڈھیٹ قسم کے کنجوسوں میں سے ایک تھا، اس موقع پر بھی وہ مکر گیا۔ ''کیسا حساب، تیرا میرا حساب صاف ہے۔''

اب میں بم اچھالتے ہوئے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف بڑھا اور اس کی حالت خراب ہوگئی۔ حالت باقیوں کی بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ سب اتنے دم بہ خود تھے کہ کسی نے کمرے سے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ چھوٹا بھائی بڑا نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''جلیل..... دور رہ۔''

''نہیں چھوٹا بھائی آج میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''مالی مشکلات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں کچھ کر گزروں، کیا خیال ہے اس کی پن نہ کھینچ لوں۔''

چھوٹا بھائی بڑا کی آنکھیں حلقوم سے باہر آگئی تھیں اور اتنی زیادہ باہر آگئی تھیں کہ مجھے خدشہ ہوا کہ اب ان کی واپسی ممکن نہیں ہوگی کم سے کم کسی سرجن کی مدد کے بغیر یہ شاید اپنی جگہ فٹ نہ ہو سکیں۔ مگر ان آنکھوں کے پیچھے اس کا ذہن کام کر رہا تھا اور اس نے فوراً کہا۔ ''میرے کو یاد آگیا جلیل تیرے دس ہجار دینے ہیں۔''

''تمہاری یادداشت ٹھیک سے کام نہیں کر رہی ہے۔'' میں نے بم اس کے منہ کے عین سامنے اچھالا۔

''بیس ہجار....'' اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

''اس میں کم سے کم اتنا ہی اضافہ اور کر لو۔'' میں نے بم بلائیں لینے کے انداز میں اس کے سر کے گرد گھمایا تو چھوٹا بھائی بڑا نے ہتھیار ڈال دیے۔

''اچھا بابا اکھا تیس ہجار.... جلیل تو پکا بلیک میلر ہے۔''

''دنیا شرافت کی زبان کہاں سنتی ہے چھوٹا بھائی۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''اب اس سے پہلے کہ تمہاری یادداشت پھر متاثر ہو یا یہ بم پھٹ جائے میرے واجبات ادا کر دو۔''

چھوٹا بھائی بڑا نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے پانچ ہزار کے چار اور ہزار کے دس نوٹ دو بار گن کر میرے ہاتھ پر رکھے۔ میں نے پہلے نوٹ چیک کیے اور انہیں حفاظت سے جیب میں رکھ کر دستی بم چھوٹا بھائی بڑا کو تھما دیا۔ اس نے پھر ریلوے انجن کی سیٹی کی سی چیخ ماری اور بم جھٹک دیا۔ وہ اچھل کر منیجر کے قدموں میں جا گرا جو لرزنا بھی بھول گیا تھا۔ دم بہ خود ہونے کی وجہ سے اس نے آنکھیں گھما کر اشارے سے انا للہ کہا۔ طرح دار سیکریٹری اس بار سچ مچ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔ کیونکہ اس نے انتظار نہیں کیا تھا کہ اسسٹنٹ اکاؤنٹس اسے ''سنبھال'' سکے۔ یہ

فریضہ چیف اکاؤنٹنٹ نے انجام دیا تھا۔ گلو جی کی خوش مزاجی میں اضافہ ہوا تھا۔ میں نے منیجر کے پیروں سے بم اٹھایا اور واپس احتیاط سے دراز میں رکھ دیا اور باہر کا رخ کرتے ہوئے بولا۔

''چھوٹا بھائی کسی نے مذاق کیا ہے۔ بم نقلی ہے۔''

''نقلی ہے۔'' چھوٹا بھائی بڑا بولا اور میز کی طرف لپکا تھا۔ میں وہاں سے نکل آیا۔ عقب سے چھوٹا بھائی بڑا کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے میرے پیچھے کوئی آتا، میں وہاں سے نکل گیا تھا۔ جب سے میں نے اماں کا کام کرکے دیا تھا تب سے اماں کا موڈ خوشگوار تھا اور میری پوری کوشش تھی کہ اس سے پہلے اماں کا موڈ واپس اپنے ٹریک پر آئے میں شنو کو دلہن بنا کر گھر لے آؤں۔ مگر جب میں نے شنو کو دیے ہوئے جہیز فنڈ کا آڈٹ کیا تو انکشاف ہوا کہ اس کا وہی حشر ہوا تھا جو سرکار کے ہاتھوں عوام کے پیسے کا ہوتا ہے۔ فنڈ کا بیشتر حصہ خرد برد ہو گیا تھا اور شنو نے پورا حساب دیا کہ اس نے بیوٹی پارلر، سلمنگ سینٹرز، بوتیک اور شاپنگ پر کب اور کتنا خرچ کیا تھا۔ مجھ پر بجلی سی گری تھی کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ فنڈ نہ صرف شادی بلکہ اس کے بعد ایک درمیانے درجے کے ہنی مون کے لیے بھی کافی ہوگا۔ مگر یہاں بری ایک طرف رہی شادی کے اخراجات بھی پورے ہوتے نظر نہیں آرہے تھے۔

اماں نے واضح کر دیا تھا کہ ان کے بڑے بیٹے کی شادی تھی اس لیے وہ پوری دھوم اور دھام سے کریں گی۔ جیسے حکومت غبن کرنے والے سرکاری اعمال کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اسی طرح شنو سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ البتہ میں نے یہ کیا تھا کہ بچ جانے والا فنڈ اس سے واپس لے لیا تھا۔ میرا موڈ دیکھتے ہوئے شنو نے بلا چون وچرا باقی کی رقم میرے حوالے کی اور میں نے اسے اس بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا جو میں نے شنو سے بھی چھپایا ہوا تھا۔ رقم اب بھی کم تھی اور اس کمی کو پورا کرنے کے مشن پر نکلا ہوا تھا۔ چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں پیش آنے والے واقعے سے میں نے اندازہ لگایا کہ آج میری قسمت اچھی تھی، اس لیے جمی سے ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ممکن ہے وہاں سے بھی کچھ مال نکل آتا۔

مگر جب میں جمن خانے پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جمی نے جمن خانے کے دروازے پر سبزی کی دکان لگائی ہوئی تھی اور دکان پر خاصا رش بھی تھا۔ کیونکہ صبح کا وقت تھا اس لیے خواتین اہل و عیال کے لیے کدو کریلے کی شاپنگ کررہی تھیں۔ میں نے چشم عبرت سے وہ وقت دیکھا جب شنو بھی کسی ایسی دکان پر سبزی کی شاپنگ کررہی ہوگی اور مجھے جھرجھری آگئی۔ خلاف توقع جمی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ اس کی ایک وجہ تو اس کے آس پاس موجود کسٹمرز تھے اور دوسرے اسے ایک مددگار کی ضرورت تھی اس لیے اس نے فوراً مجھے سبزی تولنے پر لگا دیا اور خود کیش سنبھال لیا۔ دو آدمیوں کی وجہ سے رش کم ہوا اور مجھے جمی سے بات کرنے کا موقع ملا۔ ''یہ تو نے کیا شروع کردیا ہے؟''

''تو نے دیکھا نہیں، ایک گھنٹے میں دو ہزار کی سیل ہوئی ہے۔ روز دس بارہ ہزار کی سیل ہوتی ہے۔'' اس نے مسرور لہجے میں کہا۔ ''ایک مہینے سے دکان چلا رہا ہوں۔ سات آٹھ ہزار کی سبزی ڈلواتا ہوں تو اتنی سیل ہو جاتی ہے۔ کچھ سبزی بچ جاتی ہے اور جو خراب ہو جائے اسے بکروں کو ڈال دیتا ہوں۔ اگر اسی طرح دکان چلتی رہی تو ایک سال بعد سامنے والی بلڈنگ بھی خرید لوں گا۔''

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ ''سبزی بیچ کر؟''

''آج کل اس سے اچھا دھندا کوئی نہیں ہے۔'' جمی نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ ''وہ بھی اب سبزی کھانے لگے ہیں جو پہلے مٹن اور چکن سے کم بات نہیں کرتے تھے۔ سبزی کے دام بھی آسمان پر ہیں کوئی بھی سو روپے سے کم نہیں ہے۔ منڈی سے پچاس کی ملے تب بھی سو کی بکتی ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں جلیل اپنے محلے میں دکان لگا لے۔ مال میں سستا دلوا دوں گا۔''

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ''لیکن اس کے لیے بھی تو مال چاہیے اور میری جیب خالی ہے۔''

''ادھار پکڑ لے۔''

''لا تو دے دے۔''

جمی بدکا۔ ''میں..... پر یار میرا ہاتھ تنگ ہے آج کل۔''

''ابھی تو تو سامنے والی بلڈنگ خرید رہا تھا۔''

''وہ مستقبل کا منصوبہ ہے۔'' جمی نے چالاکی سے کہا۔ ''ابھی تو میں اس دکان کے لیے لیا ہوا قرض اتار رہا ہوں۔''

''جمی بے وقوف مت بنا تو خود دسیوں کو قرض دیتا ہے۔''

''اسی لیے تو خود قرض لینے پر مجبور ہوا۔'' جمی نے برجستہ جواب دیا۔ ''اپنی ساری رقم دوسروں کے پاس ہے۔'' جمی نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا جب

تک اس کی گوٹ نہیں پھنسے گی اس سے ایک روپیہ بھی نکلوانا محال تھا۔ گاہکوں کا دوسرا ریلا آرہا تھا اور اس سے پہلے میں مفت میں پھنستا، میں نے وہاں سے روانگی اختیار کی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جمی وقع ہو کہنے کے بجائے رو کتا رہ گیا تھا۔ آج میں تیس ہزار وصول کر چکا تھا۔ یہ بھی برا نہیں تھا۔ اس وقت راجا یا کیفے ڈی پھوس کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے میں نے دکان کا رخ کیا۔ استاد اکرم پولیس، ڈاکٹرز، حکیموں اور پہلوانوں کی مختلف تھراپیوں سے گزر کر اب کہیں جا کر اس قابل ہوا تھا کہ کپڑا ناک کی سیدھ میں کاٹ سکے۔ اگرچہ وہ لیڈیز سوٹ کی کٹنگ کا ماہر تھا اور اس میں کہیں بھی صراطِ مستقیم نہیں آتا ہے۔ اگر کٹنگ خراب بھی ہو جائے تو اس سے نیا فیشن نکل آتا ہے۔

دو کاری گروں میں سے ایک بھاگ گیا تھا اور دوسرا ہاتھ آیا تھا، استاد فی الحال اسی سے کام چلا رہا تھا مگر اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ اگر جلد دوسرے کاری گر کا بندوبست نہیں ہوا تو دکان حملے کا نشانہ بن سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ برابر والا لیڈیز ٹیلر ہے اسے چند دن پہلے عبرت ناک حملے کا سامنا کرنا پڑا جب دو خواتین نے سوٹ لیٹ ہونے کی پاداش میں اسے اسی کے اوزاروں سے زدوکوب کیا۔ ایک نے قینچی اس کے کولہے میں گھونپ دی اور دوسری نے گرم استری اس کی چاند جیسی سطح رکھنے والے سر پر آزمائی تھی۔ سیزن عروج پر تھا اور کام بہت زیادہ آیا ہوا تھا۔ استاد اکرم نے بتایا کہ اسے سر کھجانے تو کیا جس کا سوٹا لگانے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا۔ میں نے استاد سے کہا۔

''کاری گر تم پکڑو۔''

''اس کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔'' اس نے فریاد کی۔ ''پہلے گھر میں پڑا تھا تو بیوی کو صورت بری لگتی تھی اب گھر اتنی دیر سے جاتا ہوں کہ وہ صورت بھول جاتی ہے۔''

یہ ایک مصیبت تھی، میں کاری گر کہاں سے لاتا۔ مجھے تو اس کام کا ٹھیک سے پتا بھی نہیں تھا۔ سوٹ کے معاملے میں شتو کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری خواتین کا کہاں سے کرتا۔ درحقیقت دکان استاد اکرم ہی چلاتا تھا اور وہی سب دیکھتا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے اس نے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ استاد اکرم نے وارننگ دی۔ ''کچھ کرو جلیل بھائی، یا خود ادھر آ کر کھڑے ہو اور آنے والی عورتوں سے بات کرو۔ مجھے قینچی گھونپوانے کا شوق نہیں ہے۔ اللہ معاف کرے عورتیں پاگل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے جیسے مہنگائی بڑھ رہی ہے، ان کا کپڑے خریدنے اور سلوانے کا شوق جنون بنتا جا رہا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی کہ میں جلد کاری گر تلاش کر دوں گا۔ میں باہر آیا تو برابر والی دکان میں خوف و ہراس کا عالم تھا۔ سر پر ٹوپی نما پٹی باندھے اور ترچھا کھڑا استاد کپڑا کاٹ رہا تھا اور اس کے کاری گر سر جھکائے دھڑا دھڑ مشین چلا رہے تھے۔ یہ شاید اگلے حملے کو ٹالنے کی کوشش تھی۔ میں گھر آیا اور راجا کو کال کی۔ اس کی جان پہچان وسیع تھی اور شاید اس میں کوئی کپڑے سینے والا بھی نکل آتا۔ مگر راجا خود چند دن سے اپنے باپ کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا اور وہ رات کو گدھے سے زیادہ اس کی نگرانی کرتا تھا کہ وہ فرار نہ ہو جائے۔ بہ قول راجا کے زندگی میں پہلی بار اسے گدھے سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی تھی مگر یہ اہمیت اسے مہنگی پڑ رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کال ریسیو کی اور میری بات نے بغیر فریاد کی۔ ''جلیل مجھے ابا کے چنگل سے نکال ورنہ کل پرسوں تک تو میرے انتقال کی خبر سنے گا۔''

''انشاء اللہ۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو۔ ویسے مدعی لاکھ برا چاہے تب بھی کچھ نہیں ہوتا ہے۔''

''جلیل میں شاعری والے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''ہاں عارفہ کے ہوتے ہوئے تجھے خیالی شاعری کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''یہ تو ہم جیسے فارغ لوگوں کا مشغلہ ہے۔''

''جلیل خدا کے لیے۔''

''دیکھ یار ان معاملات میں خدا کو درمیان میں مت لایا کر۔ یہ بتا میرا ایک کام کر دے گا تو میں تجھے بچانے کے لیے آتا ہوں۔''

''میں سب کروں گا اگر تو کہے گا تو عارفہ کو بھی چھوڑ دوں گا۔'' راجا بلبلا کر بولا۔ عارفہ کو چھوڑنے کی پیشکش سے مجھے اندازہ ہوا کہ راجا کتنے عبرت ناک حالات سے گزر رہا ہے۔

''نہیں یار اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ مجھے بس سلائی کے ایک ماہر کاری گر کی ضرورت ہے۔''

''میں دس لا دوں گا۔'' راجا نے دعویٰ کیا۔ ''تو جانتا ہے تیرے بھائی کی ہر جگہ سیٹنگ ہے۔ بس تو مجھے یہاں سے نکال لے۔''

''صبر، میرے چاند ہر چیز میں اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تجھے نکالوں اور خود پھنس جاؤں، تیرا ابا میرے گھر آ جائے۔''

''ابا کچھ نہیں کرسکتا۔''

''ابا تو نہیں کرسکتا لیکن اماں تو کرسکتی ہیں، پہلے ہی بڑی مشکل سے وہ میری شادی پر رضامند ہوئی ہیں۔''

''اچھا۔'' راجا نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن جلیل تو مجھے نکال دے گا نا؟''

''اس کی تو فکر نہ کر۔'' میں نے کہا اور کال کاٹی تھی کہ بیل بجی۔ چھوٹا بھائی بڑا کال کررہا تھا۔ میں متفکر ہوگیا۔ کال ریسیو کی تو چھوٹا بھائی بڑا نے غرا کر کہا۔

''جلیل تو نے اچھا نہیں کیا ہے، تو میرے کو جانتا ہے۔''

''جانتا ہوں لیکن اپنی ہی رقم وصول کرلینا کون سی بری بات ہے۔''

''بم تو نے رکھا تھا۔'' اس نے الزام دیا۔

میں ہنسا۔ ''اچھا ہے سیٹھ اگر تم ایسا سمجھ رہا ہے تو خوش رہو کہ اب تمہیں بھتا دینا نہیں پڑے گا۔''

چھوٹا بھائی بڑا فون پر اچھلا۔ ''دیکھ.... دیکھ تجھے پتا ہے کہ پرچی بھتے کی تھی۔''

''چھوٹا بھائی لگتا ہے آج تم عینک کی طرح اپنی عقل بھی گھر بھول آئے ہو۔ دستی بم کے ساتھ کیا دوا کی پرچی آئے گی۔''

''پر بم نقلی تھا۔''

''دھمکی کے لیے اصلی بم کون رکھتا ہے۔ اگر تم پن کھینچ کر دیکھ لیتے تو پرچی بھیجنے والے کی ایک آسامی کم ہوجاتی۔ بم بھی مفت میں ضائع ہوجاتا۔''

''جلیل تو سچ کہہ رہا ہے، یہ تیرا کام نہیں ہے۔'' چھوٹا بھائی بڑا کی آواز کانپنے لگی۔ ''کسی نے سچ مچ بھیجا ہے۔''

''میں تمہاری طرف آرہا ہوں لیکن یہ بتا دو تم نے پولیس کو تو نہیں بتایا۔''

''سچ مچ عقل بھول کر نہیں آیا۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''دوسرے تم میرے ساتھ کوئی لفڑا نہیں کروگے؟'' میں نے یقین دہانی چاہی۔

''آجا بابا کوئی لفڑا نہیں ہوگا۔''

کچھ دیر بعد میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں تھا جہاں معمول کے مطابق کام ہورہا تھا۔ ظاہر ہے بھتے کی پرچی کا تعلق ملازموں سے نہیں تھا اس لیے وہ سب مطمئن تھے کہ ادائیگی سیٹھ کو کرنی ہے۔ تمام تر ٹینشن چھوٹا بھائی بڑا کے منہ پر تھی۔ اس کا تعلق اس بم سے نہیں تھا جس سے وہ اب خود کھیل رہا تھا بلکہ اس پرچی سے تھا جو اس کے سامنے میز پر رکھی تھی۔ میں اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے پرچی میری طرف سرکا دی۔ میں نے ہاتھ لگائے بغیر پیپر نائف سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس پر نہایت خراب ہینڈ رائٹنگ میں اس سے بھی زیادہ خراب اردو میں لکھا ہوا تھا۔

''چھوٹا بھائی، میرے کو پانچ لاکھ چاہئیں۔ تیرے پاس دو دن کا مہلت ہیں۔ اگر رقم نہیں دیا تو اگلی بار... بم پھینک کر جائیں گا۔ کوئی دوسرا بات نہیں۔ اگر منجور ہے تو دفتر کے دروازے پر سفید رنگ سے او کے لکھ دینا۔''

میں نے پرچہ نائف پیپر سے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف واپس سرکا دیا اور سوالات کا آغاز کیا۔ ''سب سے پہلے یہ کس نے دیکھا؟''

''میں نے اور کون دیکھے گا۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''دراز لاک ہوتی ہے؟''

''یہ نہیں ہوتا۔''

''تمہارا کمرا لاک ہوتا ہے؟''

''نہیں بس باہر کا دروازہ بند ہوتا ہے۔''

دفتر کا داخلی دروازہ نہایت مضبوط فولادی پلیٹوں کا بنا ہوا تھا کیونکہ دفتر میں ایک بڑی سی تجوری تھی جس میں عام ضرورت کے لیے بیس تیس لاکھ کیش موجود رہتا تھا۔ ٹیکس اور دوسرے معاملات سے بچنے کے لیے چھوٹا بھائی بڑا عام طور سے نقد ادائیگی و وصولی کرتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر کا دروازہ بند ہوجائے تو اندر بند کرنے کی ضرورت نہیں تھی ویسے بھی پلائی کا بنا ہوا یہ دروازہ کسی کا ایک مکا برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اسے لاک کرنا بیکار تھا۔ میں نے کہا۔ ''تب چوکیدار کو پکڑو کہ کوئی اندر کیسے آیا اور بم کیسے رکھ گیا؟''

''اس سے پوچھ لیا ہے۔ وہ بولا کہ صبح دروازہ منیجر نے کھولا۔ اس کے بعد دس لوگ آیا اور ان میں سے کوئی بھی بم رکھ سکتا ہے۔''

جو دس لوگ آئے، ان میں صفائی والا اور والی، چائے والا، سپلائی والا اور پان والا شامل تھا۔ سب سے آخر میں دوپہر کے کھانے کا آرڈر لینے والا آیا تھا۔ کل تین کمروں کا دفتر تھا۔ ایک میں چھوٹا بھائی بڑا اور اس کی سیکریٹری بیٹھتی تھی جبکہ دوسرے میں منیجر اور اکاؤنٹس والے بیٹھتے تھے۔ تیسرا کمرا جو ہال تھا وہاں باقی عملہ ہوتا تھا۔ باقی دو کمرے ہال کے ساتھ تھے اور ایک کونے میں چھوٹی سی جگہ دو واش روم بنے ہوئے تھے۔ ایک لیڈیز کے لیے اور ایک جینٹس کے لیے۔ تمام جگہیں کھلی ہوتی تھیں اور کوئی بھی

آنے والا کہیں بھی جا سکتا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''ان دس میں یقیناً میں نہیں تھا تب تم نے میرا نام کیوں لیا؟''

''اپنا بھیجہ گھوم رہا ہے۔'' اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''اس وقت سمجھ میں نہیں آیا تھا۔''

''چلو اب سمجھ میں آ گیا ہے نا۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''سیٹھ یہ کوئی اور چکر ہے تم استاد ٹی ٹی سے بات کرو۔''

''اس سے بات کیا ہے پر وہ کہتا ہے کہ اس کی ہیڈک نہیں ہے۔''

''تم اسے بھتا دیتے ہو تو اس کا فرض ہے، تمہیں دوسرے بھتا خوروں سے محفوظ رکھے۔''

''ایسا پہلے ہوتا تھا اب تو دس بھتا مانگنے والا ہے بابا۔'' اس نے فریادی لہجے میں کہا۔ ''اگر مانگنے والا جینوین ہے تو دینا پڑتا ہے۔''

''تب دے دو۔''

''پانچ لاکھ۔'' اس نے اپنے ابھرے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ''دے سکتا ہے پر یہ تو معلوم ہو کہ مانگنے والا جینوین ہے۔''

''تب کیا چاہتے ہو؟''

''دیکھ جلیل میرے کو لگ رہا ہے کہ یہ کوئی موقع سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ادھر سب کو پتا ہے کہ استاد ٹی ٹی کا ہولڈ ہے اور کوئی دوسرا بھتا مانگنے نہیں آ سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ کوئی فصلی بٹیرا ہے؟''

''ایک دم، تو سوچ کہ کس میں اتنا جرأت ہے؟''

''ٹھیک ہے تب بھتا نہ دو۔''

''اس میں بھی خطرہ ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اسے پکڑنا چاہتا ہے۔''

''تو پولیس کو بول دو، آج کل ویسے بھی پولیس بہت سرگرم ہے۔''

''پولیس والے کون سے کم بھتا خور ہیں۔'' اس نے جل کر کہا۔ ''دیکھ جلیل اگر تو اسے تلاش ....''

''مجھے تو معاف رکھو۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔''

''جلیل میں تجھے فیس دوں گا۔''

فیس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ رقم کی مجھے اشد ضرورت تھی۔ میں نے چھوٹا بھائی کو ٹالا نہیں تھا، سچ مچ انکار کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بھتا خوری کے پیچھے ایسی مافیائیں ملوث ہیں جن کے سامنے آنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہ آدمی کو ایسے مار دیتی ہیں جیسے آدمی مچھر مارتا ہے مگر فیس کے لالچ نے میرے رال بنانے والے غدود کی کارکردگی میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے سوچا اور پوچھنے کے بجائے چھوٹا بھائی بڑا سا مطالبہ کر دیا۔ ''ٹھیک ہے اگر تم پانچ کے آدھے یعنی ڈھائی لاکھ مجھے دیتے ہو تو میں تلاش کر دوں گا۔''

خلاف توقع چھوٹا بھائی بڑا اچھلا نہیں تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ڈھائی لاکھ زیادہ ہے۔''

''پانچ لاکھ سے کم ہے۔''

''دیکھ میں اسے پانچ نہ دے کر رسک لے گا اور تجھے ڈھائی دے گا تو بھی رسک ہے۔''

''دیکھ لو، اگر تم آدھے دے کر آدھے بچا سکتے ہو تو کیا برا ہے اور دوسرا تمہاری جان کی قیمت پانچ لاکھ ہے تو میری بھی ڈھائی لاکھ بن جائے گی۔ رسک میرے لیے بھی ہو جائے گا۔'' میں پھر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جا جلیل۔'' چھوٹا بھائی بڑا ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ''جیادہ جلدی کا نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے مگر جیادہ دیری کا بھی نہیں ہے۔ فیصلہ کر لو کہ وقت تمہارے پاس بھی کم ہے۔''

بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا اور اٹھ کر اپنی تجوری کا ایک خانہ کھولا۔ اس کی تجوری میں دو الگ خانے تھے۔ دونوں الگ الگ کھلتے تھے۔ اس نے ادھر سے ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میرے سامنے رکھیں اور بولا۔ ''یہ ڈیڑھ لاکھ ہے اگر تیرے کو منظور ہے تو بول، ورنہ جا۔''

مچھلی کے سامنے چارا ڈال کر اسے بولا جائے کہ جا تب وہ بھی نہیں جاتی۔ چارے پر منہ مارے بغیر نہیں رہتی ہے۔ مجھے ڈیڑھ لاکھ مل جاتے تو میرا مسئلہ حل ہو جاتا۔ میں نے گڈیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

مگر چھوٹا بھائی بڑا نے مجھ سے پہلے گڈیاں اچک لیں اور بولا۔ ''ایسے نہیں پہلے بندہ میرے سامنے آئے گا تب تجھے ڈیڑھ ملے گا۔''

''چھوٹا بھائی ادائیگی کے معاملے میں تمہارا ٹریک ریکارڈ بہت خراب ہے اور میری قسمت کہ ایک نقلی دستی بم کے طفیل تم نے میرے پچھلے واجبات ادا کیے۔ اب تم کام ہونے کے بعد مکر گئے تو میں کیا کروں گا؟''

چھوٹا بھائی بڑا نے سوچا اور اپنی قمیص کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ایک تعویذ برآمد کیا۔ سیاہ ڈوری سے لٹکا چاندی

کے بکس والا تعویذ بہت ہی پرانا تھا۔ غالباً چھوٹا بھائی بڑا کو پیدائش کے وقت پہنایا گیا تھا۔ اس نے عقیدت سے اسے چوما اور میری طرف بڑھا دیا۔ ''جلیل یہ میرے کو ماں نے پہنایا تھا جب میں پانچ سال کا تھا۔ تعویذ کا معلوم نہیں پر یہ میری ماں کا نشانی ہے۔ تو بدلے میں اسے رکھ لے۔ چھوٹا بھائی اپنی ساری دولت کے بدلے بھی اسے نہیں دے گا۔''

میں نے تعویذ دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''میں یہ نہیں لے سکتا۔''

وہ خفا ہو گیا۔ ''تو چھوٹا بھائی پر اعتبار نہ کر مگر اس پر کر سکتا ہے۔''

''بات اعتبار کی نہیں چھوٹا بھائی رشتے کی ہے۔ تم ماں کو درمیان میں لے آئے ہو اب میں تعویذ لوں یا نہ لوں اگر تم نے دینا ہے تو دو گے اور نہیں دینا تو تعویذ کے بدلے بھی نہیں دو گے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''تمہارا کام ہو جائے گا لیکن تمہیں میرے کہنے پر عمل کرنا ہے۔''

''تو کیا کہتا ہے۔'' چھوٹا بھائی نے خوش ہو کر کہا۔

''پرسوں صبح دروازے پر سفید رنگ سے او کے لکھوا دو مگر بہت نمایاں نہ ہو۔ ایسا لگے جیسے کسی بچے نے شرارت میں لکھ دیا ہے۔''

''ہو جائے گا۔'' اس نے کہا تو میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔ اب مجھے راجا کو اس کے باپ کی قید سے آزاد کرانا تھا کیونکہ اس سے مجھے دونوں کام لینے تھے۔ سلائی کے ماہر کا تو اس نے وعدہ کیا تھا مگر راجا سے وعدہ جبراً وفا کرانا پڑتا تھا اور دوسرا کام اب چھوٹا بھائی بڑا کو بھتے کی پرچی بھیجنے والے کی تلاش تھی۔ مجھے چھوٹا بھائی بڑا کی بات درست لگ رہی تھی کہ یہ کسی نقلی بٹیرے کا کام ہے۔ ورنہ آج کل بھتا مانگنے والے اتنے دیدہ دلیر ہو گئے ہیں کہ علی الاعلان مانگتے ہیں اور اپنی شناخت کرا کے جاتے ہیں کہ آدمی کے دل میں کوئی ابہام نہ رہے۔ اس قسم کے پلاسٹک سے بنے اصل نظر آنے والے دستی بم بچوں کے کھلونوں کی دکانوں پر عام ملتے ہیں۔ صرف دستی بم ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے پستول اور خود کار رائفلیں ہر سائز میں اور بالکل اصل کے مشابہ نقل ملتی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ جو چور ڈاکو اصل ہتھیار لینے کی سکت نہیں رکھتے ہیں، وہ ان کھلونا ہتھیاروں سے کام چلاتے ہیں۔ لٹنے والا ان کو اصل سمجھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور بلا چون و چرا اپنا سب کچھ لٹیروں کے حوالے کر دیتا ہے۔

لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے آتش فشاں دلی والی بریانی کے ٹھیلے کا رخ کیا۔ مگر اس کی بارودی بریانی نے میرا وہ حشر کیا جو نادر شاہ نے دلی کا کیا تھا یا پھر حوالدار نادر شاہ تھانے آنے والوں کا کرتا تھا۔ بریانی والے کی اصل سیل کولڈ ڈرنک کی ہوتی تھی کیونکہ ایک پلیٹ کھانے والا جب تک دو بوتل پیٹ میں نہیں ڈال لیتا، اسے کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ یہ زبان شاعر اک آگ سی پیٹ میں لگی ہے۔ یا پھر یہ پہلو سلگتا ہے تو وہ پہلو بدلتے ہیں۔ مجھے بھی دو بوتلیں حلق میں اتارے بغیر چین نہیں آیا اور بریانی والے کو پیسے دیتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''مرچوں کے کھیت اپنے ہیں یا چاول مرچوں کے ساتھ اگائے جاتے ہیں اس بریانی کے۔''

اس نے دانت نکالے اور پیسے وصول کر کے اگلے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹھنڈی کولڈ ڈرنک سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ برابر والے ٹھیلے سے کھوئے والی قلفی کھائی تو ذرا سکون ہوا۔ یہ ٹھیلا بریانی فروش کے بھائی کا تھا۔ دونوں بھائیوں کا بزنس ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ راجا اور اس کا باپ اس وقت تک گھاٹ سے آ چکے ہوتے تھے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ دکان پر آئیں تو میں جاؤں کیونکہ میرا گھاٹ پر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ڈھائی بجے راجا دکان پر تھا اور گلی کے کونے سے وہ استری کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کا باپ آس پاس ہے یا نہیں۔ میں نے راجا کا نمبر ملایا اور اس نے چونک کر پہلے اندر دیکھا اور پھر موبائل نکالتا ہوا دکان سے ذرا باہر آیا۔ اس نے کال ریسیو کی اور سرگوشی میں بولا۔ ''جلیل کچھ دیر بعد کال کرنا ابا دکان میں ہے۔''

''میں گلی کے کونے پر ہوں اگر تیرا ابا شام تک دکان سے نہ گیا تو کیا میں یہیں بیٹھا رہوں گا۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاید ابا کھانا کھانے جائے۔'' راجا نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے تیرا کیا خیال ہے اگر ابا کھانے کے لیے گیا تو مجھے چھوڑ دے گا۔ وہ رات سوتا بھی میری چارپائی کے پاس ہی ہے۔ اگر میں کروٹ بھی لوں تو وہ اٹھ بیٹھتا ہے۔ جلیل تو سوچ نہیں سکتا کہ میں کس مشکل میں ہوں۔''

''راجا بدحرام کہاں مر گیا ہے۔'' پیچھے سے راجا کے باپ کی چنگھاڑتی آواز آئی۔ ''استری تیرا باپ کرے گا؟''

''میں جا رہا ہوں۔'' راجا نے کہا اور فون رکھتے ہوئے عجلت میں اندر چلا گیا۔ فی الحال میرے ذہن میں بھی کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی جس پر عمل کر کے میں راجا کو

وہاں سے نکال سکتا۔ ہاں راست اقدام کیا جاسکتا تھا کہ میں بائیک دوڑاتا ہوا لے جاتا اور راجا بھاگ کر پیچھے بیٹھتا اور میں اسے دکان سے اس طرح لے جاتا جیسے پرتھوی راج سوئمبر سے سنجوگتا کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا کر لے گیا تھا۔ مگر اول تو میں پرتھوی راج نہیں تھا۔ دوسرے راجا سنجوگتا نہیں تھا اور تیسرے میرے پاس بائیک آدھے ہارس پاور کی بھی نہیں تھی۔ اگر میں راجا کو لے کر فرار ہونے کی کوشش کرتا تو اس کا باپ ہمیں گلی کراس کرنے سے پہلے پکڑ لیتا۔ بالفرض محال میں کامیاب بھی ہو جاتا تو راجا کا باپ سیدھا میرے گھر پہنچتا اور اماں کو شادی ملتوی کرنے کا جینوئن بہانہ ہاتھ آجاتا۔

---

ابھی میں وہاں سے روانہ ہونے کا سوچ رہا تھا کہ دو خطرناک نظر آنے والے مسٹنڈے راجا کے باپ کی دکان میں داخل ہوئے۔ ان کے عزائم دور ہی سے خطرناک نظر آرہے تھے۔ میں ذرا آگے بڑھا تو دکان کے نظر آنے والے حلیے سے بھی تصدیق ہوگئی۔ استری والی ٹیبل الٹی پڑی تھی اور تمام ہینگر گرا دیے گئے تھے۔ اندر سے آتی آوازوں سے ظاہر تھا کہ آنے والے بدمعاش بے جان اشیا کے بعد جاندار اشیا پر مشقِ ستم کر رہے تھے اور وہاں جاندار صرف راجا اور اس کا باپ تھا۔ آگے آنے پر مزید تصدیق ہوئی۔ ایک مسٹنڈا راجا کو پنچنگ بیگ کے طور پر استعمال کر رہا تھا اور دوسرا راجا کے باپ کی گردن دبا کر اسے یتیم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دوسرے کی کوشش پر کوئی اعتراض نہیں تھا جیسا کہ راجا کو بھی نہیں ہوتا مگر راجا میرا دوست تھا اور میں اسے یوں مار کھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دخل در معقولات کا نتیجہ میرے حق میں برا نکل سکتا تھا اس لیے میں نے حکمتِ عملی سے کام لیا اور واپس آکر بائیک اسٹارٹ کی۔ ہیلمٹ پہنا۔ نمبر پلیٹوں پر سیاہ شاپر چڑھائے۔ بائیک تیزی سے دکان کے پاس لاکر روکی اور چلا کر کہا۔

''یہاں سے نکل لو پولیس موبائل آرہی ہے۔''

یہ کہتے ہی میں نے بائیک واپس موڑ کر دوڑا دی اور عقبی آئینے میں ان دونوں کو عجلت میں دکان سے نکلتے دیکھا۔ انہوں نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی تھی۔ میں گلی کے سرے تک پہنچا اور موڑ کر بائیک روکی۔ اتر کر جھانکا تو وہ دونوں دوسرے سرے پر غائب ہو رہے تھے۔ ان کے جاتے ہی میں واپس دکان پر آیا جہاں راجا اپنا بگڑ جانے والا منہ آئینے میں ملاحظہ کر رہا تھا اور اسے جاں بلب باپ کی ذرا بھی پروا نہیں تھی مگر اس کے بہ ظاہر دم توڑتے باپ نے جیسے ہی مجھے دیکھا، وہ اٹھ کر بیٹھا اور سرگوشی میں غرایا۔ ''جلیل دفع ہو جا یہاں سے۔''

''ابا اسی نے بچایا ہے۔'' راجا نے اسے مطلع کیا۔ ''بائیک پر یہی آیا تھا اور آواز لگائی تھی ورنہ اس وقت تم فرشتوں کو حساب دے رہے ہوتے۔''

راجا کے باپ نے اسے گھورا۔ ''بکواس مت کر۔''

''اس سے پہلے وہ دوبارہ آئیں، تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ۔'' میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر فوت ہونے کا ارادہ ہو تو یہیں بیٹھے رہو۔''

میں نے اشارہ دے دیا تھا اور حسبِ توقع راجا اندر سے دوڑتا ہوا برآمد ہوا جب میں بائیک آگے بڑھانے والا تھا، وہ اچک کر پیچھے بیٹھ گیا اور میرے کان میں بولا۔ ''جلیل بھاگ لے۔''

میں پہلے ہی ایکسی لیٹر گھما چکا تھا۔ بائیک نے جھٹکا لیا اور راجا پیچھے گرتے گرتے بچا۔ مگر اس نے قطعی برا نہیں منایا کیونکہ پیچھے اس کا باپ تھا جو راجا کے فرار پر اس کی ولدیت میں نامناسب تبدیلیاں کر رہا تھا۔ جب تک ہم گلی کے کونے تک پہنچے تبدیلیوں کی تعداد درجن سے تجاوز کر چکی تھی۔ مُلا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے ہماری دوڑ کیفے ڈی پھوس تک تھی۔ اس بھاگ دوڑ میں بائیک کا تو نہیں پتا لیکن ہمارا سانس پھول گیا تھا اور ایک ایک کپ دودھ پتی حلق سے اتار کر ہمارے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ میں نے راجا سے کہا۔ ''میں نے اپنا کام کر دیا ہے اب تو میرا کام کر دے۔''

حسبِ روایت راجا نے عیاری کا مظاہرہ کیا۔ ''تو نے کیا کیا..... یہ تو بھتا مانگنے والوں کا کام تھا۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔''

''بیٹے اگر میں آکر تم باپ بیٹے کو نہ بچاتا تو اس وقت تو عارفہ تو کیا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''پھر میں ہی تجھے بائیک پر لاد کر فرار ہوا اور تیرے باپ سے گالیاں کھائیں۔''

راجا قطعی شرمندہ نہیں ہوا مگر بہرحال میرا کام کرنے پر راضی ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یہ تو ہو گیا وہ کام جو تو بلا معاوضہ کرے گا۔ ایک دوسرا کام بھی ہے جس میں آمدنی کی توقع ہے، اس سے تجھے بھی شیئر ملے گا۔''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسٹاک مارکیٹ بہت گری ہوئی ہے، میں شیئر نہیں لوں گا۔''

''جاہل وہ والا شیئر نہیں حصے والا شیئر۔ تجھے حصہ ملے

گا۔"

راجا یقیناً مفت میں بیگار کر رہا تھا اور اس کی جیب خالی تھی اس لیے رقم کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "مجھے کیا ملے گا؟"

"تو چاہے تو دیہاڑی پر کام کر لے۔ روز کا ایک ہزار ملے گا۔ یا پھر اکٹھا دس ہزار لے لینا۔"

"پندرہ دیتا ہے تو میں غور کرتا ہوں۔"

پندرہ بھی برے نہیں تھے مگر میں فوراً مان جاتا تو راجا مشکوک ہو جاتا کہ مجھے بڑی رقم مل رہی ہے اس لیے میں خاصی ردوکد اور چخ چخ کے بعد میں پندرہ پر مان گیا۔ مگر اس پر واضح کر دیا کہ پیسا اس وقت ملے گا جب کام ہو جائے گا کیونکہ مجھے بھی اسی وقت ملے گا۔ راجا نے کام کا پوچھا لیکن میں نے اسے اصل بات نہیں بتائی۔ وہ بھتے اور دستی بم کی دھمکی کا سن کر بدک سکتا تھا۔ "تجھے کل صبح سے چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر کی نگرانی کرنی ہے۔ وہاں کون آتا جاتا ہے نوٹ کرنا ہے اور کیوں آتا ہے، یہ بھی جاننا ہے۔"

راجا متفکر ہو گیا۔ "سارا دن نگرانی کرنی ہو گی؟"

"نہیں کل صرف صبح اس وقت تک نگرانی کرنی ہے جب تک باہر کے لوگ دفتر میں آتے جاتے رہیں۔"

"دفتر میں تو سارا دن باہر کے لوگ آتے جاتے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے وہ لوگ جو کسی کام سے دفتر میں آتے ہوں۔"

"جلیل تیرا دماغ چل گیا ہے چھوٹا بھائی کے دفتر میں کیا کوئی تفریح کرنے آئے گا۔"

"پوری بات تو سن لیا کر۔" میں نے بھنا کر کہا اور پھر اسے تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کن لوگوں کی آمد چیک کرنی ہے۔ راجا نے سر ہلایا۔

"میں سمجھ گیا، لیکن وہاں سب میرا تھوبڑا پہچانتے ہیں۔"

"فکر مت کر، میں تیرا حلیہ ایسے بدلوں گا کہ تیرا باپ بھی تجھے پہچان نہیں سکے گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" راجا نے خوش ہو کر کہا۔ "حلیہ مستقل نہیں ہو سکتا؟"

"ہو سکتا ہے اگر تو اپنے ان بالوں کی قربانی دے سکے جو کانٹوں والے جانور سے مل رہے ہیں۔"

راجا نے بڑی مشکل سے اسپائک ہیئر اسٹائل بنایا تھا اور وہ بادلِ ناخواستہ ان کی قربانی پر آمادہ ہوا تھا۔ میں اسے

## بچے کا باپ

ایک عورت سے کسی نے پوچھا۔ "کیا تمہارا بچہ اپنے باپ پر گیا ہے؟"

"خدا کا شکر ہے، نہیں...... ورنہ میرے شوہر تو غصے سے دیوانے ہو جاتے۔"

☆☆☆

چھوٹے بڑے سبھی میچ ہار کر غیر ملکی دورے سے واپس آنے والی ٹیم کے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا اور عشائیہ کے بعد کپتان سے درخواست کی گئی کہ وہ ان اسباب سے آگاہ کرے جن کے باعث ٹیم کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

"کون کہتا ہے ہماری ٹیم کو شکست ہوئی ہے۔" کپتان نے گرج کر کہا۔ "ہم نے گیارہ میچ کھیلے تھے اور ملکی و غیر ملکی اخبارات گواہ ہیں کہ ہماری ٹیم نے گیارہ میں سے پورے سات عدد ٹاس جیتے تھے۔"

☆☆☆

ایک بوڑھا: "میرا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن، اخبار کی جگہ لے لے گا۔"

دوسرا: "احمق کہیں کے، بھلا ٹیلی ویژن سے بھی کوئی مکھیاں اڑا سکتا ہے۔"

☆☆☆

ایک محفل میں ایک لڑکی دوسری لڑکی کو اپنی پرانی سہیلی سلمیٰ سمجھ بیٹھی۔

"سلمیٰ۔" اس نے کہا۔ "اللہ، تم کتنی بدل گئی ہو؟ پہلے تم موٹی ہوا کرتی تھیں، اب دبلی ہو چکی ہو۔ پہلے تمہارے بال سنہرے تھے، اب سیاہ ہیں۔ پہلے تمہاری نظر ٹھیک تھی، اب تم چشمہ لگاتی ہو۔ پہلے تم بھدی لگتی تھیں، اب حسین لگ رہی ہو۔"

دوسری لڑکی نے حیرت سے پہلی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میرا نام سلمیٰ نہیں، شکیلہ ہے۔"

"اوہ، اوہ۔" پہلی نے ہنس کر دوسری کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "شریر کہیں کی، تم نے اپنا نام تک بدل لیا ہے۔"

کراچی سے آسیہ مینا کا انکشاف

ایک سیلون لے گیا۔ وہاں اس کی دوسرے اسٹائل میں ہیئر کٹنگ اور شیو بنوائی۔ پھر اس کے بالوں کو ڈائی کرایا۔ ڈل گولڈن کلر میں آنے سے راجا کا ستر فیصد حلیہ ویسے ہی بدل گیا تھا۔ وہاں سے نکلے تو ایک ٹھیلے سے میٹرکس اسٹائل کے سن گلاسز لے کر راجا کو دیے تو حلیے میں تبدیلی نوے فیصد ہو گئی۔ راجا نے آئینے میں خود کو دیکھا اور بولا۔ ''ابا اب بھی پہچان لے گا۔ وہ میرے کپڑوں سے شناخت کرلے گا۔''

ظاہر ہے راجا نے جو پہنا ہوا تھا، وہ اس کے باپ کے گاہکوں کا تھا۔ مجبوراً مجھے راجا خبیث کو دوسرے کپڑے بھی دلوانے پڑے۔ لنڈے سے لی گئی امپورٹڈ جینز اور ٹی شرٹ میں راجا بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اس کے بعد اسے پانچ سو بھی دینے پڑے تھے تب اس نے جا کر جان چھوڑی۔ میں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ ہڈحرامی بالکل نہیں چلے گی اور مجھے کل بارہ کے بعد کیفے ڈی پھوس میں مکمل رپورٹ چاہیے۔ راجا نے مجھے دو لڑکوں کا پتا بتایا جو سلائی کا کام کرتے تھے اور ان دنوں بے روزگار تھے۔ میں راجا سے نمٹ کر ان کے پاس پہنچا اور ان میں سے ایک مجھے ڈھنگ کا لگا تھا۔ اسے لے جا کر میں نے استاد اکرم کے حوالے کر دیا۔ ''فی الحال اس سے کام چلاؤ اگر بات نہ بنی تو دوسرا تلاش کریں گے۔''

''مجھے کام آتا ہے جی۔'' لڑکے نے احتجاج کیا۔ ''اگر آپ نے رکھنا ہے تو ابھی بتادیں۔''

''ابھی سے کیسے بتادیں۔'' استاد اکرم اسے گدی سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ ''پہلے کچھ کر کے تو دکھا۔''

ایک مسئلے سے نمٹ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب دوسرا مسئلہ رہ گیا تھا یعنی چھوٹا بھائی بڑا کا۔ اگلے دن میں کیفے ڈی پھوس پہنچا تو وہاں راجا کے بجائے اس کا باپ بیٹھا ہوا تھا اور بدقسمتی سے میں نے اس وقت اسے دیکھا جب وہ میرے سر پر آ گیا تھا۔ بھاگنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''وہ ولدالحرام کہاں ہے؟''

''کون تمہارا برخوردار یا گدھا؟''

''دیکھ جلیل میرے ساتھ اڑی بازی نہ کر، ورنہ میں تیرے گھر پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے دھمکی دی تو میں فوراً سیدھا ہو گیا۔

''خالو ناراض کیوں ہوتے ہو۔ راجا کل شام تک میرے ساتھ تھا۔ اس کے بعد اسے نادر شاہ لے گیا۔''

''نادر شاہ۔'' راجا کے باپ نے فکرمند ہو کر کہا۔ ''مگر کیوں؟''

''یہ تم نادر شاہ سے جا کر پوچھ لو۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے رات تھانے میں اس کا جبری نکاح ہوا ہو نادر شاہ کی دختر بداختر کے ساتھ اور ویسے بھی اب صرف نکاح ہی باقی رہ گیا تھا۔''

راجا کا باپ خودکشی چکر میں چند دن پہلے تھانے سے آیا تھا اور دوبارہ اس طرف جانے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے مجھے برا بھلا کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی نزدیکی میز پر بیٹھا ہوا راجا اٹھ کر میرے پاس آیا تو میں دنگ رہ گیا۔ راجا کے باپ کیا میں نے بھی نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ بغل میں بیٹھا ہے اور اس کا باپ اس کا ڈھنڈورا پتا نہیں کہاں پہنچ گیا تھا۔ راجا نے دانت نکالے۔ ''تو نے ٹھیک کہا تھا ابا بھی نہیں پہچان سکے گا۔ مگر یہ تو کیا بکواس کر رہا تھا کہ تھانے میں میرا جبری نکاح ہو چکا ہے۔''

''اگر ایسا نہ کہتا تو تیرا باپ اتنی آسانی سے جان کہاں چھوڑتا۔ اب رپورٹ دے فٹافٹ۔''

''پہلے چائے منگوا۔'' راجا نے مطالبہ کیا۔ میں نے اس کا مطالبہ پورا کیا اور اس نے پہلا گھونٹ لیا اور بولا۔ ''چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر میں صبح کے وقت چھ سات افراد آتے ہیں ایک منٹ۔۔۔'' اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ ''سب سے پہلے ایک مہترانی اپنے میاں کے ساتھ آئی اور کیا خوب آئی، اس نے جو لباس پہن رکھا تھا۔۔۔۔''

''کام کے وقت شعروشاعری سے پرہیز کیا کر۔''

بادلِ ناخواستہ راجا نے آگے پڑھا۔ ''اس کے بعد ایک کباڑی آیا جو روز کی بنیاد پر دفتر میں استعمال ہونے والا کاغذ، کارٹن اور دوسری چیزیں لے جاتا ہے۔ پھر ایک چائے والا لڑکا آیا۔ ساڑھے دس بجے سپلائر آیا اور اس نے مال سپلائی کیا۔ سب سے آخر میں گیارہ بجے سامنے والے ہوٹل کا لڑکا آیا۔ وہ لنچ کا آرڈر لینے آیا تھا۔''

''ان کے پاس اندر جاتے ہوئے سامان کیا کیا تھا؟''

صفائی کرنے والے جوڑے کے ہاتھوں میں جھاڑو اور ٹوکریاں تھیں۔ تیلے جیسے میاں نے صرف بنیان اور شارٹ پہن رکھی تھی البتہ اس کی ترقی پذیر بیوی نے جو چولی۔۔۔۔''

''راجا کام کی بات کر۔'' میں نے پھر بات کاٹی۔

راجا کی باقی رپورٹ کا خلاصہ یوں تھا۔ کباڑی ایک خالی تھیلا لایا تھا اور بھر کر لے گیا تھا۔ چائے والا لڑکا چینک اور کپ لایا تھا۔ سپلائر کارٹن میں سامان لایا تھا اور سکندر کی

طرح خالی ہاتھ واپس گیا تھا۔ جبکہ آرڈر لینے والا لڑکا آیا اور گیا خالی ہاتھ تھا۔ راجا سے گفتگو کے دوران میں میرا ذہن اس رپورٹ کا تجزیہ کر رہا تھا۔ سپلائر اور کباڑی کو میں نے اس سے نکال دیا کیونکہ وہ چھوٹا بھائی بڑا کے کمرے تک نہیں جا سکتے تھے۔ ان کا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ چائے والا لڑکا اور لنچ کا آرڈر لینے والا لڑکا صرف اس صورت اندر جاتے جب چھوٹا بھائی یا اس کی سیکریٹری اندر ہوتے۔ اب صرف صفائی کرنے والا جوڑا بچتا تھا۔ وہ صبح سب سے پہلے آتے تھے اور انہیں ہر کمرے میں جانا ہوتا تھا، کوئی انہیں نہیں روکتا اور نہ چیک کرتا۔ وہ آتے بھی سب سے پہلے تھے۔ راجا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''جلیل یہ کیا چکر ہے جب تک تو مجھے پوری بات نہیں بتائے گا، میں ٹھیک سے کام کیسے کروں گا اور ہو سکتا ہے پھر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے۔''

میں نے سوچا اور راجا کو اصل بات بتادی۔ وہ بھتے کی پرچی اور جعلی دستی بم کا سن کر یوں اچھلا جیسے بم اس کے نیچے رکھا تھا۔ ''جلیل تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ اس شہر میں ہونے والے ہر پانچ میں سے تین قتل اسی چکر میں ہو رہے ہیں۔''

''یہ وہ چکر نہیں ہے۔ کوئی چھوٹا بھائی بڑا کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''اور وہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔'' راجا خفگی سے بولا۔ ''اس نے تجھے مرنے کے لیے کیا معاوضہ دیا ہے۔ تیس چالیس ہزار دے دیا ہوگا۔ اتنی رقم کے پیچھے تو موت کے فرشتے کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔''

''راجا میں احمق نہیں ہوں اور نہ ایسا لالچی ہوں کہ موت خرید لوں۔ تو جانتا ہے میں ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا ہوں۔ میں نے چھوٹا بھائی سے کہہ دیا ہے کہ جس وقت مجھے لگا اس معاملے میں کچ کچ کا کوئی بھتا خور ملوث ہے، میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔''

''تو پیچھے ہٹ جائے، کیا وہ پیچھے ہٹے گا۔'' راجا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تو نے تو مجھے بھی مروا دیا تھا۔ میں وہاں تین گھنٹے کھڑا رہا اگر پرچی بھیجنے والا دفتر کی نگرانی کرا رہا ہوگا تو کیا اس نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا؟''

''راجا اس میں خطرہ اتنا نہیں ہے۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ کھڑا ہو گیا۔

''جلیل مجھے معاف کر، مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب تو ایسے چکروں میں بھی ہاتھ ڈالنے لگا ہے۔'' راجا سچ مچ ڈر گیا تھا یا حرام خوری پر اتر آیا تھا۔ بہرحال اس نے مزید میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ''تو نے کل جو خرچ کیا تھا سمجھ لے وہی میرا معاوضہ ہے، مجھے تجھ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

راجا دفع ہوا تو میں طیش میں چائے کے گھونٹ پیتا رہ گیا۔ اس کے بعد میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر روانہ ہوا۔ وہ حسب معمول کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہوا پان چبا رہا تھا۔ طرح دار سیکریٹری شدومد سے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیوں خار کھاتی تھی کیونکہ میں جب آتا اس کی تیوری پر بل سے پڑ جاتے تھے۔ حالانکہ میرا اس سے کبھی کسی قسم کا کوئی معاملہ نہیں رہا اور نہ ہی ہمارے درمیان بات ہوئی تھی۔ میں نے چھوٹا بھائی بڑا سے کہا۔ ''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

کی بورڈ پر سیکریٹری کی چلتی انگلیاں رک گئیں۔ غالباً اس کے کان ہماری طرف لگ گئے تھے۔ چھوٹا بھائی بڑا منہ اوپر کر کے غرغرایا۔ ''غرو۔''

''چھوٹا بھائی بات اکیلے میں کرنے کا ہے۔''

چھوٹا بھائی بڑا نے اپنی سیکریٹری کو دیکھا جو نظر کا اشارہ بھی سمجھتی تھی مگر وہ بادلِ ناخواستہ اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ہماری گفتگو سننا چاہتی تھی مگر یہ تجسس ایک فطری چیز تھی۔ غالباً اسے اور دفتر والوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ چھوٹا بھائی بڑا مجھ سے کام لے رہا ہے اور مقصد بھتے کی پرچی بھیجنے والے کا پتا چلانا ہو سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا۔ ''چھوٹا بھائی جب تم کل دفتر آئے تو کیا وقت ہوا تھا؟''

''دس بجے کا ٹیم تھا۔''

''سپلائر، چائے والا اور لنچ والا تینوں میں سے کون تمہارے سامنے آئے تھے؟''

''تینوں۔'' اس نے میری بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''کباڑ اٹھانے والا تمہارے کمرے میں آتا ہے؟''

''نہیں اس کے مطلب کا سامان ادھر واش روم کے سامنے ڈھیر کر دیا جاتا وہ ادھر سے لیتا ہے اور جاتا ہے، کمروں میں نہیں آتا۔''

میرا اندازہ رفتہ رفتہ درست نکل رہا تھا لیکن میں نے اپنا شبہ ظاہر کرنے کے بجائے چھوٹا بھائی بڑا سے پوچھا۔ ''جب تم دفتر میں آئے تو کون کون آچکا تھا؟''

''یہ جینت (زینت)۔'' اس نے اپنی سیکریٹری کی

طرف اشارہ کیا۔ ''حاجی بھائی (منیجر) اور ضمیر الدین (ضمیر الدین چیف اکاؤنٹنٹ) آ گیا تھا۔ باقی میرے سامنے آیا۔''

''جب تک تم نے دراز نہیں کھولی تھی۔''

''نہیں، اِدھر کام کا چیز ہوتا ہے جب کام ہو تو کھولتا ہے۔''

''چھوٹا بھائی تم نے بھی اپنے طور پر تفتیش کی ہوگی۔ یعنی ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہوگی جو تم سے پہلے آئے تھے۔ اس کی کیا رپورٹ ہے؟''

چھوٹا بھائی بڑا نے تحسین آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''جلیل تو سچ مچ جینیس ہے بالکل اپنا دیسی شرلاک ہومز ہے۔''

صبح سب سے پہلے منیجر حاجی بھائی آیا تھا اور وہی دفتر کھولتا تھا۔ اس کے بعد چیف اکاؤنٹنٹ ضمیر الدین آیا تھا اور تیسرے نمبر پر زینت آئی تھی۔ حاجی بھائی کا کہنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی صفائی کرنے والے میاں بیوی آئے تھے اور ضمیر الدین کی آمد سے پہلے انہوں نے پورے دفتر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ ضمیر الدین اور زینت تقریباً آگے پیچھے دفتر میں آئے تھے۔ رپورٹ سننے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''چھوٹا بھائی فرض کرو یہ دفتر میں آنے والوں میں سے کسی کا کام ہے تو تمہیں کس پر شک ہے؟''

وہ ہچکچایا۔ ''آدمی کس پر شک کرے۔ یہ صفائی کرنے والا میاں بیوی پندرہ سال سے آرہا ہے۔ دفتر سے کبھی ایک روپے کا چیز بھی غائب نہیں کیا۔ کئی بار لوگوں کا پرس، موبائل اور دوسرا چیز اِدھر اُدھر ہو گیا پر یہ ہمیشہ ایمان داری سے لا کر دیا۔''

مجھے مایوسی ہوئی۔ چھوٹا بھائی بڑا کا شک بھی ان پر گیا تھا مگر ساتھ ہی وہ ان کی صفائی بھی پیش کر رہا تھا اگر چھوٹا بھائی بڑا کو ان پر شک نہیں تھا تو بہت زیادہ امکان تھا کہ اس معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں تھا ورنہ چھوٹا بھائی بڑا نہایت شکی طبیعت کا مالک تھا اور غالباً اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہ کرتا۔ ایسا شخص جب کسی کی صفائی پیش کرے جبکہ وہ معمول میں زیادہ مشکوک نظر آرہا ہو تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''تم کل نشان لگوا دو۔ یہ کام صبح سویرے ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ کون اس نشان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔''

''تو کہاں سے دیکھے گا؟''

''یہ مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ میں باہر آیا اور منیجر حاجی بھائی کے کمرے کے پاس سے گزرا تو سیکریٹری اندر اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں چھوٹا بھائی بلا رہا ہے۔''

جب وہ منہ بنائے چھوٹا بھائی بڑا کے کمرے میں جا رہی تھی تو میں مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔ کیونکہ گزشتہ روز مجھے دلی بریانی کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے آج میں نے لنچ کے لیے دلی نہاری کا رخ کیا۔ مگر یہاں بھی مرچوں کی شمولیت ہول سیل میں تھی۔ آتش فشاں نہاری افغانی نان کے ساتھ کھا کر اور اوپر سے ایک جگ پانی پی کر میں اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ بائیک پر گھر جا سکوں مگر گھر تو جانا تھا۔ اماں نے کچھ سودا منگوایا تھا اور خبردار کیا تھا کہ شام سے پہلے لا کر دوں ورنہ برے انجام کے لیے تیار رہوں اور فی الحال میرا برا انجام اماں کے ہاتھوں یہی ہو سکتا تھا کہ میری شادی کے لیے ہونے والا راضی نامہ واپس لے لیا جاتا۔ اس لیے میں کسی نہ کسی طرح بائیک چلاتا ہوا گھر واپس پہنچ گیا۔ ویسے تو شہر قائد میں اب صراطِ مستقیم پر سفر کرنا آؤٹ آف فیشن ہو گیا۔ کیونکہ سڑکیں اور گلیاں اس قابل نہیں ہیں۔

جہاں مین ہول نہیں کھلے وہاں بجلی اور گیس والوں نے صرف پبلک کی خاطر گڑھے کھود رکھے ہیں جن میں خلاف محاورہ گرتی بھی پبلک ہے۔ سڑکوں کے گڑھے اب کسی توجہ کے لائق نہیں رہے ہاں اگر کوئی سڑک چند میٹرز بھی سلامت ہو تو گزرنے والے شبہ کرنے لگتے ہیں کہ وہ غلطی سے شہر سے باہر تو نہیں نکل گئے۔ راستے میں بچھے فقیروں، اشتہاری حکیموں، دندان سازوں، پہلوانوں اور حجاموں سے بچ کر نکلنا آپ کی ذاتی ذمے داری ہے۔ ان میں سے کسی پر بھی بائیک چڑھانے کا انجام عبرتناک ہو سکتا تھا۔ کتوں کا ذکر میں نے یوں نہیں کیا کہ وہ بہرحال آپ کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں اور آپ کے ساتھ ریس لگاتے ہیں۔ ایسے میں عموماً بائیک سوار دونوں پاؤں اوپر کر کے بائیک چلانے کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر مجھ میں پاؤں اٹھانے کی سکت بھی نہیں تھی۔

اس لیے جب ایک ناہنجار کتے نے تفریحاً بائیک کے ساتھ ریس لگائی۔۔۔ تو میں ایک چلتے پھرتے خیمے میں گھستے گھستے بچا۔ خیمے میں موجود خاتون نے فلک شگاف چیخ ماری حالانکہ میں اس سے کئی انچ کے فاصلے سے گزر چکا تھا۔ اس پر اس کے غیرت مند شوہر نے کتے کی پیروی کی اور ریس کا آغاز کیا تھا کہ کتا خیمے میں گھس گیا۔ اسے نکالنے کے لیے شوہر کو بھی خیمے میں جانا پڑا اور جب تک عقبی آئینے میں خیمہ نظر آتا رہا، اس میں سے کتا اور شوہر کوئی برآمد نہیں ہوا تھا۔

میں اس دن ایکٹ کا میڈی سے محظوظ نہیں ہو سکا تھا مگر راہ گیر ضرور محظوظ ہوئے ہوں گے۔ صحیح سلامت گھر پہنچا تو اطمینان کا سانس لیا۔ سامان اماں کے حوالے کیا اور داد چاہی۔ ”دیکھا اماں کیا وقت پر آیا ہوں؟“

”ہاں بیٹا مجھے معلوم ہے کیوں وقت پر آیا ہے۔“ اماں نے آئینہ دکھایا۔ ”یہ بتا صبح سے کہاں غائب تھا؟“

”نوکری کی تلاش کرنے گیا تھا۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا تو عقب سے اماں کی ہنسی سنائی دی تھی۔ ظاہر ہے انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اماں سے بہتر مجھے کون جان سکتا تھا؟

☆☆☆

صبح سویرے منہ اندھیرے یعنی ٹھیک نو بجے میں چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر سے کچھ فاصلے پر ایک کوئٹہ ہوٹل میں موجود تھا۔ چائے پراٹھا کا ناشتا کرتے ہوئے میں نے نگرانی بھی جاری رکھی تھی۔ دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ دروازے پر سفید رنگ سے ذرا غیر واضح او کے لکھا تھا۔ گویا چھوٹا بھائی بڑا نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ ٹھیک سوا نو بجے حاجی بھائی نازل ہوا اور اس نے دفتر کا دروازہ کھولا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے شوخ و چنچل مہترانی اور اس کا سنگل پسلی شوہر نمودار ہوئے۔ بیوی پان سے شوق کرتی تھی تو شوہر یقیناً چرس پیتا تھا یہ بات دونوں کی شکلوں سے عیاں تھی۔ بیوی کے ساتھ شوہر ایسا لگ رہا تھا جیسا ہنڈا ففٹی کا کئی سال پرانا پہیا کسی نئے چمکتے دمکتے ریڈیل ٹائر کے ساتھ لگ سکتا ہے۔ وہ دفتر کے اندر چلے گئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ عمارت سے نکلے تو مہترانی کے شوہر نے غور سے دروازے کو دیکھا اور پھر بیوی کے پیچھے باہر آیا۔ اس نے کچرے سے بھری ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ روانہ ہوئے تو میں ان کے پیچھے تھا۔ بائیک میں نے ہوٹل کے پاس ہی چھوڑ دی تھی۔ کل میں نے راجا کو ٹوک دیا تھا مگر آج مہترانی کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ وہ خاصی آفت قسم کی چیز تھی۔ اسے دیکھنے والے بہت تھے مگر شوہر کی وجہ سے کوئی پاس نہیں آتا تھا۔ وہ اسی چیز کا فائدہ اٹھاتی تھی اور اپنے حسن کی نمائش کر کے لوگوں کے دل جلاتی تھی۔ کچھ دور جا کر انہوں نے کچرا ایک کچرا کنڈی میں الٹا اور شوہر اس میں سے اپنے کام کی چیزیں نکالنے لگا ساتھ ہی اس نے پہلے سے جیب میں موجود اور آدھی پی ہوئی سگریٹ نکال کر سلگائی اور چند کش لیے۔ میرا اندازہ درست تھا وہ چرس پی رہا تھا۔

بیوی کچرا کنڈی کی دیوار پر ایک نظر نواز میں ٹکی ہوئی تھی۔ میں ایک درخت کے پیچھے سے ان کی نگرانی کر رہا تھا۔

اگر پرچہ اور جعلی بم رکھنے کا کام ان سے لیا گیا تھا تو جلد یا بدیر کوئی ان سے رابطہ کرتا۔ مگر یہ لازمی بھی نہیں تھا۔ پرچہ بھیجنے والا خود بھی آنکھیں رکھتا ہوگا اور وہ چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر پر بنا ہوا او کے خود بھی دیکھ سکتا تھا۔ کچرا کنڈی ایک چوراہے پر تھی۔ مگر یہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے یہاں ٹریفک کا رش بہت کم تھا۔ سامنے سے ایک گاڑی آرہی تھی اور جب وہ نزدیک آئی تو میں چونکا کیونکہ اس کی فرنٹ سیٹوں پر دو جانی پہچانی شخصیات براجمان تھیں۔ گاڑی چورنگی سے ذرا پہلے رکی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھی شخصیت نیچے اتر گئی۔ وہ چورنگی کی طرف آنے لگی اور گاڑی مڑ کر واپس چلی گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب وہ شخصیت اس درخت سے آگے نکلی جس کے پیچھے میں روپوش تھا تو چند لمحے کے تذبذب کے بعد میں نے فیصلہ کیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

میں اب تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ جانے والی شخصیت کا موجودہ صورتِ حال سے کوئی واسطہ بھی تھا یا یہ کوئی اور ہی چکر تھا۔ تعاقب کا یہ سلسلہ چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر تک جاری رہا اور پھر وہ شخصیت اندر چلی گئی۔ میں کوئٹہ ہوٹل پر رک گیا تھا۔ مشکل سے ایک منٹ بعد گاڑی آکر چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر کے سامنے پارکنگ میں رکی اور اس سے دوسری شخصیت اتر کر اندر چلی گئی۔ دس بجے تک چھوٹا بھائی بڑا اور دوسرا عملہ آچکا تھا۔ میں اندر پہنچا تو چھوٹا بھائی بڑا ایک ہاتھ سے سر اور دوسرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھامے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ چھوٹا بھائی بڑا بچپن سے قبض کا مریض تھا اور اس پوز کا عادی ہو گیا تھا۔ میں پرچہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے آیا؟“

”ادھر دراز میں رکھا تھا۔“ چھوٹا بھائی بڑا نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”یہ جو بھی ہے، بہت گھسا پٹا ہے۔“

زینت ابھی تک کمرے میں نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہ دفتر آچکی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا لکھا ہے؟“

”خود پڑھ لے۔“ چھوٹا بھائی بڑا نے پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس بار بھی احتیاط سے پکڑا کہ میری انگلیوں کے نشانات نہ آئیں۔ اس پر اسی خراب تحریر اور خراب ترین اردو میں لکھا تھا۔

”شاباش تو نے اپنا جان بچا لیو ہے۔ اب پانچ لاکھ روپیہ ہزار کے نوٹوں کی گڈیوں میں رکھ کر پیکٹ بنالے۔ نوٹ سارے پرانے ہوں۔ ہر گڈی پر بینک کی سیل

ہوئے۔ جلد تجھے بتاتا ہوں کہ رقم کیسے بھیجنی ہے۔''

چھوٹا بھائی بڑا نے ایک ناقابلِ بیان لقب دے کر کہا ''۔۔۔۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ رقم کیسے بھیجنا ہے۔''

''چھوٹا بھائی رقم کا بندوبست کرلو۔'' میں نے کہا تو وہ چڑ کر بولا۔

''تو نے اب تک کیا، کیا ہے؟''

''میں جو کررہا ہوں، اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکل آئے گا۔ ناکامی یا کامیابی دونوں صورتوں میں تم خسارے میں رہو گے بس خسارے کی مقدار کم زیادہ ہوگی۔''

اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''اپن کا نصیب ہی ایسا ہے، باپ بولا تھا چھوٹا تو جب چالاکی دکھائے گا تیرے کو نقصان ہوگا۔''

''تو کیا یہ سب تم نے بے وقوفی دکھا کر کمایا ہے۔'' میں نے کہا۔ زینت اندر آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ''اچھا سیٹھ اب میں چلتا ہوں تمہارا کام نہیں ہونے کا ایسا کرو پانچ لاکھ دے دو۔ سمجھ لو جان کا صدقہ نکالا ہے۔ زندہ رہو گے تو ایسے پانچ لاکھ دن میں کماتے رہو گے۔''

چھوٹا بھائی بڑا ذرا حیران ہوا تھا مگر میں اس کے تاثرات پر توجہ دیے بغیر باہر نکل آیا۔ میں نے منیجر حاجی بھائی سے ایک بات پوچھی اور اس نے جو جواب دیا، وہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میں باہر آیا اور پھر سے کوئٹہ ہوٹل میں آکر بیٹھ گیا۔ دوپہر تک میں وہیں رہا پھر ایک قریبی برگر والے سے برگر لے کر لنچ بھگتایا۔ شام کے قریب وہی شخصیت دفتر سے نکلی اور اسی سمت چل پڑی جس طرف سے صبح آئی تھی۔ میں نے بتایا کہ یہ رہائشی علاقہ تھا اور یہاں پبلک ٹرانسپورٹ نہیں چلتی تھی۔ میں نے کچھ دیر بعد بائیک اٹھائی اور اپنا مکھڑا ہیلمٹ میں چھپا کر اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ مگر فاصلہ رکھا تھا کیونکہ اس نے بہرحال میرا لباس دیکھا ہوا تھا اور مجھے اس سے پہچانا جاسکتا تھا۔ چورنگی سے پہلے میں کچرا کنڈی کے پاس رک گیا۔ اس سے اٹھنے والا دھواں مجھے آڑ مہیا کررہا تھا۔

حسبِ توقع دوسری طرف سے گاڑی آئی اور پیدل آنے والی شخصیت اس کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے بائیک گاڑی کے پیچھے لگادی اور تقریباً بیس منٹ بعد گاڑی ایک فلیٹ میں داخل ہوئی۔ میں باہر ہی رک گیا۔ مجھے معلوم کرنا تھا کہ گاڑی میں موجود دو افراد میں سے کون یہاں آیا ہے اور کیا وہ پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ جب گاڑی اندر چلی گئی تو میں بائیک سے اتر کر چوکیدار کے پاس آیا اور سو کا ایک نوٹ ہاتھ میں دبا کر اس سے پوچھا۔ ''یار ایک بات بتاسکتے ہو؟''

''پوچھو۔'' اس نے نوٹ کو تاڑتے ہوئے کہا۔

''یہ جو ابھی گاڑی اندر گئی ہے، اس میں کون تھا؟''

وہ سیانا تھا مگر سو کا نوٹ لے کر اس نے بتادیا کہ گاڑی میں جانے والے افراد کون تھے اور ان کا آپس میں کیا رشتہ تھا؟ میں سن کر اچھل پڑا اور چوکیدار کو غالباً افسوس ہوا کہ اس نے زیادہ قیمتی معلومات بہت کم قیمت میں بیچ دی تھی۔ واپسی میں میں ایک بار پھر تذبذب میں پڑ گیا تھا کہ ان دونوں چکروں کا آپس میں کوئی تعلق ہے یا یہ الگ الگ چکر تھے۔ میں نے چھوٹا بھائی بڑا کو کال کی۔ اس نے رکھائی سے پوچھا۔

''اب کائے کو کال کرتا ہے؟''

''یہ بتاؤ کہ پرچی والے کی طرف سے اور کوئی پیغام آیا؟''

''نہیں پر تو کیوں۔۔۔۔؟''

''چھوٹا بھائی تم کہاں ہو؟''

''دفتر میں۔''

''وہیں رکو، میں آرہا ہوں اگر میں لیٹ ہوجاؤں تب بھی انتظار کرنا جانا مت۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ چھوٹا بھائی بڑا چلاتا رہ گیا تھا کہ کائے کو۔ میں تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کے دفتر پہنچا تو وہاں سب بند تھا۔ حد یہ کہ آس پاس کے ہوٹل اور دکانیں بھی بند ہوگئی تھیں کیونکہ یہ دفتری علاقہ تھا اور یہاں جب تک دفتر کھلتے تھے سب کھلا تھا اور جیسے ہی دفتر بند ہوتے باقی سب بھی بند ہوجاتا تھا۔ فولادی دروازہ چھوٹا بھائی بڑا نے خود کھولا اور کھاجانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''میں سوکھ گیا تیرے انتجار میں۔''

''چھوٹا بھائی اگر اللہ نے چاہا تو کل تک وہ بندہ گرفت میں آجائے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے کہا اور اس کے کمرے میں آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کروں گا تو اس نے ہنس کر کہا۔

''تو نے کیا پرچی بھیجنے والے کو اتنا بے وقوف سمجھا ہے۔''

''نہیں میرا خیال ہے، وہ مجبور ہے۔'' میں نے جواب دیا اس دوران میں میں اپنے کام میں بھی مصروف رہا۔ اپنا کام کرکے میں نے چھوٹا بھائی بڑا کو خبردار کیا۔

''کسی چیز کو مت چھیڑنا بلکہ اب تم بھی چھٹی کرو۔''

چھوٹا بھائی بڑا میرے ساتھ باہر آیا۔ اس نے گیٹ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ''جلیل یہ کیا چکر ہے، تجھے دفتر میں کس پر شک ہے؟''

''کل صبح تک سب سامنے آجائے گا۔ اگر میرا شک غلط نکلا تو میں سوری کرلوں گا اور ناکامی کا اعتراف کرلوں گا۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی میرے ذہن میں نہیں ہے۔''

جیسے جیسے میں کڑیاں ملا رہا تھا، مجھے لگ رہا تھا کہ ان دونوں کا معاملات کا آپس میں تعلق ہے۔ دفتر کے یہ دو لوگ ہی اس کھیل کے پیچھے تھے مگر مجھے پکا ثبوت درکار تھا۔ وہاں سے میں دکان پر آیا جہاں استاد اکرم خوش خوش ایک سل جانے والے سوٹ کو استری کررہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''جلیل بھائی تم اچھا لڑکا لایا کام میں پکا ہے۔''

میں نے دکان میں دیکھا تو مجھے پرانا والا لڑکا نظر آیا۔ ''پر وہ ہے کہاں؟''

''ادھر پیچھے والی گلی میں گیا ہوا ہے۔'' استاد اکرم نے چہک کر کہا تو میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''تمہارا مطلب ہے چرس کا سوٹا لگانے گیا ہے۔''

''ہاں اس کے بغیر کام کیسے کرے گا؟''

''تم لوگ چرس پیو یا دنیا جہاں کی منشیات استعمال کرو مگر کام میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔''

میں نے استاد اکرم سے کہا تھا کہ میں اس مہینے کی آمدنی میں سے کچھ نہیں لوں گا۔ وہ رکھے کیونکہ دکان بھی اسے دوبارہ سے جمائی تھی اور وہ جتنے عرصے بے روزگار رہا تھا اس پر قرض چڑھ گیا تھا۔ میں اگلے مہینے سے اپنا حساب کتاب کرتا۔ اس لیے استاد اکرم کوشش کررہا تھا کہ اس مہینے زیادہ سے زیادہ کام لے اور کمالے۔ البتہ میں نے اس سے شنو کے کپڑے سلوا لیے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ سارے سوٹ سردیوں والے تھے اور اب سردی تقریباً جاچکی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے شادی کے بعد ہی کوئی سوٹ سلوا کردوں گا۔ شادی تک کوئی فضول خرچی نہیں کرنی تھی۔

☆☆☆

میں تقریباً گیارہ بجے چھوٹا بھائی بڑا کے دفتر پہنچا اس وقت تک سب آچکے تھے اور اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ میں نے چھوٹا بھائی بڑا سے سلام دعا کی اور صورتِ حال کا پوچھا تو اس نے دراز سے ایک پرچہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس میں لکھا تھا۔ ''چھوٹا بھائی تم پانچ لاکھ روپیہ اپنی سیکریٹری کو دے کر شام پانچ بجے جب چھٹی ہوتا ہے بھیجے گا۔ اسے بولنا اسٹاپ کی طرف پیدل جائے اور جو اس سے روک کر پیکٹ مانگے اسے دے دے۔''

میں نے پرچہ پڑھ کر اس کی طرف سرکا دیا۔ ''تب تم نے کیا سوچا ہے؟''

چھوٹا بھائی بڑا نے سرد آہ بھری۔ ''اب کیا کرے .... بروبر دینا پڑے گا۔''

سیکریٹری زینت کان لگائے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ میں نے میز پر پین ہولڈر سے ایک پین نکالا اور چھوٹا بھائی سے کہا۔ ''پین بڑا اچھا والا رکھا ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے اس کا کیپ کھولا۔ ''اوہ یہ تو اسپائی کیم ہے۔'' میں اٹھ کر سیکریٹری کے پاس آیا اور اس سے کہا۔ ''مجھے کمپیوٹر میں لگا کر اس کی ریکارڈنگ دیکھنی ہے۔''

سیکریٹری کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ بت کی طرح ساکت ہوگئی تھی۔ میں نے پین کی یو ایس بی کمپیوٹر میں لگائی اور چند منٹ بعد اس نے فولڈر کھول دیا۔ میں نے فولڈر میں موجود ریکارڈ شدہ ویڈیو چلائی۔ چھوٹا بھائی بڑا بھی اٹھ کر میرے پیچھے آگیا تھا۔ میں نے ریکارڈنگ کو تیزی سے چلا کر اس وقت تک پہنچایا جب کیم میں سیکریٹری نمودار ہوئی جو دراز کھول کر اس میں پرچہ رکھ رہی تھی۔ میں نے حیرت سے چھوٹا بھائی بڑا کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو مس زینت ہیں، لیکن انہوں نے ایک جھوٹ اور بولا ہوا ہے یہ مس نہیں ہیں بلکہ مسز ضمیر الدین بھی ہیں اور لازمی بات ہے کہ دونوں میاں بیوی اس چکر میں شامل ہیں۔''

چھوٹا بھائی بڑا کا غصے سے برا حال ہوگیا تھا، اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''جینت تو نے میرے کو اتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ کیا برا کیا تھا؟''

''اس کے شوہر کو بھی بلا لو اور دونوں سے حساب کتاب کرتے رہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پہلے میرا حساب کردو۔''

''تو ادھر بیٹھی رہ۔'' چھوٹا بھائی نے اسے حکم دیا اور تجوری کھول کر ڈیڑھ لاکھ روپے نکال کر میرے حوالے کیے۔ ''جلیل اب تو جا تیرا کام ختم۔''

''تم نے ٹھیک کہا چھوٹا بھائی۔'' میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ''اب تمہارا کام شروع ہے۔''

جب میں باہر جارہا تھا تو چھوٹا بھائی سیکریٹری کو حکم دے رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو بھی بلائے۔ میں مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔

قسط نمبر

# آوارہ گرد

قسط نمبر: 15

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

**تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...**

دوسری چیخ شکیلہ کے حلق سے برآمد ہوئی تھی، اس چیخ میں دہشت، درد اور کرب تھا پھر وہ ہذیانی انداز میں بھائی کو پکارنے لگی۔ ''شش...... شوکی...... آہ...... تت...... تم ظالمو!...... تم نے مم...... میرے بھائی کو...... آہ......'' فرطِ غم سے شکیلہ ڈھے گئی۔ میں یہ سب دیکھتا اور سنتا ہی رہ گیا حالانکہ یہ میری فطرت کے خلاف تھا۔ ایسے کسی بھی نازک موقع پر میرے جسم کا رُواں رُواں بھڑک اٹھتا تھا مگر یہ سب خلافِ توقع اور بہت تیزی سے ہوا تھا۔ شکیلہ صدمے سے بے ہوش ہوگئی تھی، میں سرتا پا خونِ جنوں میں لتھڑ گیا، قانون کے رکھوالوں نے جس طرح اپنی وردی کے طاقت کے نشے میں نہتے مظلوموں پر سفاکی و بربریت کا جو بھیانک کھیل کھیلا تھا، اس کے سامنے تو مجھے بڑے بڑے مجرم پانی بھرتے محسوس ہوئے، پل کے پل میرے دل و دماغ کی عدالت میں مجھے ارشد اور شوکی سفید کفن پہنے کھڑے دکھائی دینے لگے۔ تب میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا۔

''آج تیرا آخری وقت ہے ڈپٹی۔'' میں دانت بھینچ کر بڑبڑایا۔

''کاکے...... اندر کیا ہورہا ہے؟'' معاً مجھے عقب سے اول خیر کی سرسراتی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ''تیرے ڈپٹی نے آج اپنی موت پر دستخط کردیے ہیں اول خیر۔''

''او خیر......'' وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔ دفعتاً مجھے ڈپٹی روشن خان کے ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔

''سر! یہ تو سب ختم ہوگئے، اب لڑکی کو کہاں لے کر جائیں گے۔ اندر ہی گلا دبا کر ارشد کی طرح اس کی لاش بھی کہیں دبادیں گے۔''

دوسرے نے بھی اپنے ''صاحب'' کو یہی مشورہ دیا۔

''پرویز ٹھیک کہہ رہا ہے سر! ایک عورت کو ٹھکانے لگانا کون سا مشکل ہے۔''

''کیا یہ مرگیا ہے۔ اس کو دیکھو تو سہی۔'' ڈپٹی کی مکروہ آواز ابھری۔ چند ثانیے کی اس دھڑکتی خاموشی میں مجھے ہر طرف خون اچھلتا دکھائی دینے لگا۔ آواز پھر ابھری۔ ''مرگیا ہے۔ میری گولی اس کے بھیجے کے پار ہوگئی۔'' یہ پرویز تھا۔ منتقم ناگ کی طرح جیسے میری آنکھوں کی پتلیوں میں ڈپٹی کے بعد پرویز کی شبیہ ثبت ہوگئی تھی۔

''ٹھیک ہے اندر چلو، اس کی بہن کو بھی اس کے پاس پہنچا کر دونوں کی لاشیں دور ویرانے میں گاڑ دینا۔'' ڈپٹی روشن کی سفاک آواز ابھری اور میرے جیسا مضبوط اعصاب کا انسان بھی اس کھلی بربریت پر ایک لمحے کو تھرا اٹھا۔ شکیلہ صدمے اور خوف کے مارے بے ہوش ہوچکی تھی اور یہ لوگ اب اسے اندر لے جاکر بے ہوشی کی حالت میں ہی گلا دبا کر مار ڈالنا چاہتے تھے، اس بربریت پر میرے دل و دماغ کی کیفیت بپھرے ہوئے آتش فشاں جیسی ہونے لگی تھی۔ میرا دل خون کے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا اور مجھے اپنے ہاتھوں پیروں سے شرارے پھوٹتے محسوس ہورہے تھے۔ جس بے رحمی اور سفاکی سے انہوں نے ہمارے دو ساتھیوں کو اپنی بربریت کی بھینٹ چڑھایا تھا، میں بھی انہیں ایسا ہی جواب دینے کے لیے بری طرح بے چین ہوکے تڑپنے لگا۔ بہ مشکل اپنی کھولتی ابلتی کیفیات پر قابو پائے ہوئے تھا۔

سن گن لینے کے بعد وہ لوگ واپس اندر کی جانب پلٹ گئے تھے، میں نے اول خیر کو قلیل ترین الفاظ میں سارے حالات سے آگاہ کیا اور اپنے خطرناک عزائم سے بھی پھر اندر قدم رکھ دیا۔ چوکیدار سے چھینا ہوا ڈنڈا میرے ہاتھ میں تھا، اگرچہ اول خیر کا دیا ہوا پستول بھی میرے پاس تھا۔ اول خیر نے میرے خطرناک جنون خیز عزائم جاننے کے بعد کچھ کہنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ مجھے کسی مصلحت کوشی اور دور اندیشی کے فلسفوں میں الجھانا چاہتا تھا۔

''اول خیر! تم کو لوٹنا ہے تو لوٹ جاؤ۔ میرے کاندھوں پر قرض کا پہاڑ آن پڑا ہے۔ میں تمہاری کسی مصلحت کو آج نہیں سمجھ پاؤں گا۔'' میں نے غراتی ہوئی سرگوشی میں کہا، مجھے ہی نہیں اول خیر کو بھی میری جلتی بلکتی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی تھی، وہ بولا۔

''خیر کاکا میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ تُو تو ایک دم یاری باشی کا ناتا توڑنے پر تل بیٹھتا ہے۔ میرا کوئی بھی ایسا مشورہ میرے اپنے اور تیری بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔''

''بس اول خیر! وقت کم ہے۔'' وہ میرا اشارہ بھانپ کر بولا۔ ''چل پھر کاکے میرے نال آ۔'' (تیرے ساتھ ہوں)

ہم نیم تاریک احاطے میں آگئے۔ ہر سُو گہری رات کا سناٹا طاری تھا۔ کسی کمرے کی کھڑکی سے روشنی پھوٹ رہی تھی، ہم دونوں تیزی کے ساتھ مرکزی دروازے کی طرف آگئے۔ خلافِ توقع دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ شاید باہر موجود چوکیدار پر انہیں کچھ زیادہ ہی بھروسا تھا پھر داخلی آہنی گیٹ کو بھی بند ہی سمجھے تھے، اسی لیے اندر کا دروازہ بند

کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جو کرنا تھا وہ فوراً اور تیزی کے ساتھ کرنے کا متقاضی تھا۔ میں نے دھیرے سے دروازے کو دھکیل کر جھری بنا کے اندر جھانکا۔

یہ نشست گاہ ٹائپ کا بڑا سا کمرا تھا۔ اندر مجھے ڈپٹی روشن خان اپنے چاروں وحشی کارندوں کی معیت میں دکھائی دیا۔ بے ہوش شکیلہ کو ایک صوفے پر ڈال دیا گیا تھا۔ دو افراد کو ڈپٹی نے حکم دیا کہ وہ جب تک شوکی کی لاش کو باہر موجود کار کی ڈکی میں ڈالیں۔ حکم سن کر وہ پلٹے، میں اور اول خیر فوراً پیچھے ہٹ کر ایک تاریک خلا میں سرک کے جا دبکے تھے۔ وہ دونوں نکلے، وہ شوکی کی لاش کو اٹھا کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ وہاں ایک جیپ کھڑی تھی، وہ اس کا عقبی دروازہ کھول کر شوکی کی لاش کو اندر رکھنے لگے تھے کہ انہیں احساس ہی نہ ہو سکا میں کب ان کے عقب میں ابھر کر بجلی بن کر ٹوٹا، اول خیر میرے ساتھ پیش قدم تھا، میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کا زوردار وار ایک کے سر پر پڑا، اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ اس کا ساتھی بری طرح ٹھٹک کر سنبھلا اور بس یہی موقع اسے مل سکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اول خیر کی زوردار لات اس کے سینے پر پڑی، وہ اچھل کر جیپ کے کھلے دروازے سے نصف اندر اور نصف باہر جا پڑا، میرا ڈنڈے والا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آیا اور اس کی پیشانی پر پڑا۔ اس بار کچھ آواز پیدا ہوئی تھی۔ تسلی تھی ہمیں کہ اندر موجود کسی نے نہیں سنی ہوگی اور اگر سنی بھی ہوگی تو اسے معمول کی کھٹر پٹر سے تشبیہ دی ہوگی۔

یہ کام نمٹانے کے بعد ہم تیزی سے مذکورہ دروازے کی طرف بڑھے۔ اندر جھانکا، ڈپٹی نظر نہ آیا۔ وہ شاید کسی اندرونی کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ اس کے دونوں کارندے صوفے پر بے سدھ پڑی شکیلہ کو گھورنے میں مصروف تھے، پھر میں نے ان میں سے ایک کو دوسرے ساتھی سے کہتے سنا۔

”چل یار! صاحب اندر آرام کر رہا ہے۔ اپنا کام نمٹا جلدی سے۔ اس کا بے ہوشی کی حالت میں ہی گلا دبا دے۔“

”یار! یہ زنانی تو بڑی مست مست ہے۔ کاش صاحب ادھر نہ ہوتا، تو پہلے...... اس کے اٹھتے شباب سے اپنی پیاس بجھاتے۔“

ان دونوں کی بوالہوسی نے میرے دماغ میں سرخ آندھیاں چلا دیں۔ اول خیر کو بھی اس کا بخوبی اندازہ تھا کہ جب میں کسی ایسی وحشت جنوں خیز کیفیات سے دوچار ہونے لگوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت شہزاد احمد خان عرف شہزی کو درانہ وار آگ میں بھی کود پڑنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ پھر میں نے ڈنڈا پھینک کر پستول ہاتھ میں لے لیا اور دروازے کو دھڑ سے کھول کے اندر جا پڑا۔ وہ دونوں بری طرح ٹھٹکے۔ ایک لمحے کو تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آسکا، یہ ہوا کیا ہے۔ پھر جب تک انہیں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے سامنے یقینی موت کو کھڑا دیکھ چکے ہیں، میرے پستول کی نال نے آتشیں قہقہہ اگلا اور دوسری گولی اول خیر کے پستول سے شعلے کی طرح لپکی، دو دھماکے تلے اوپر گونجے اور اس میں ان دونوں شیطانی چیلوں کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ ایک سینہ پکڑے اور دوسرا کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا تھا۔ پھر میں ایک دروازے کی طرف لپکا جبکہ دوسرے دروازے کی طرف اول خیر نے اچھل کر دروازے پر ضرب لگائی اور گویا کسی طوفانی بگولے کی طرح اندر جا پڑا مگر میری وحشت خوں رنگ نظروں کی بے قراری کو قرار نہ ملا۔ مجھے وہ صفت ابلیس ڈپٹی روشن کہیں نظر نہ آیا۔ یہ کمرا کچھ چھوٹا بھی تھا اور بیڈروم نظر آتا تھا۔ بہت سادہ فرنیچر تھا یہاں...... میں جس تیزی سے گھسا تھا، اسی تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ کمرے سے نکلا۔ دوسرے کمرے کی طرف لپکا جہاں اول خیر نے پیش قدمی کی تھی، وہاں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اول خیر کو میں نے ایک دوسرے دروازے پر زور آزمائی کرتے پایا۔ یہ شاید کچن کا دروازہ تھا۔ یہ کمرا نسبتاً بڑا تھا۔ بیڈ کے علاوہ صوفہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک میز کرسی بھی تھی، ٹھیک اسی وقت کمرے میں عجیب سی بو پھیلنے لگی۔ یہ گیس کی بو تھی، جو عام طور پر چولھے جلانے کی ہوتی ہے۔ میں ابھی تک نہ سمجھ پایا تھا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ اول خیر دور ہٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، مجھے ڈپٹی کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”خبردار! گولی چلانے کی بھیانک غلطی مت کرنا۔ ورنہ سب راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے۔“ اس کی آواز کچن کے اندر سے آتی محسوس ہوئی تھی، میں نے بھویں سکیڑ کر اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی پُرجوش آواز میں کہا۔

”یہ خبیث خطرہ بھانپتے ہی اندر کچن میں چھپ گیا تھا اور چولھے کا برنر کھول چکا ہے گولی مت چلانا کاکے...... اس حرام زادے سے نمٹ لیتے ہیں۔“

میں نے دیکھا کچن کے دروازے پر چوکھٹ سے ڈپٹی روشن خان کا مکروہ چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نے پستول کی نال ہمیں دکھاتے ہوئے اس بار براہ راست مجھ سے

مخاطب ہو کے کہا۔ ''شہزی! مجھے اندازہ ہے تمہارے سر پر خون سوار ہے اس لیے میں اکیلا کیوں مروں؟ تمہیں بھی ساتھ لے کر مروں گا۔''

''ڈپٹی! خود کو ہمارے حوالے کر دے۔ تجھے یہ بچوں جیسی حرکت زیب نہیں دیتی۔'' میں غرایا۔

''کسی بھول یا جوش میں مت رہنا۔.. شہزی! بہت نقصان اٹھاؤ گے۔'' وہ مکروہ آواز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''تخم سؤر...... تو تو خود کو بڑا بااختیار سمجھتا تھا، اب اس طرح چوہے کی طرح کچن میں جا گھسا ہے۔ تو نے بہت پولیس گردی دکھا دی ڈپٹی، بڑے بدمعاشوں سے تیرا پالا پڑتا رہا ہوگا مگر تو شاید یہ بھول گیا تھا کہ ایک شریف آدمی جب بدمعاشی پر اترتا ہے تو...... پھر اس سے بڑھ کر کوئی بڑا بدمعاش نہیں ہوتا، آج تیرا پالا ایسے ہی ایک شریف بدمعاش سے ہے، باہر نکل۔ ورنہ میری ایک ہی ٹھوکر کچن کا یہ معمولی دروازہ توڑ ڈالے گی۔''

''وقت ضائع مت کر شہزی! ورنہ اذیت ناک موت ہم سب کا مقدر بنے گی۔'' وہ بولا۔ اس کی آواز گھٹ رہی تھی، وہ آگے بولا۔ ''میرا دم گھٹ رہا ہے۔ گیس کچن سے نکل کر پورے کمرے میں پھیل رہی ہے۔ مرتے مرتے میری چلائی ہوئی اندھی گولی ہم سب کو بھسم کر ڈالے گی۔'' وہ کھانسنے لگا۔ مجھے پہلی بار تشویش کا جھٹکا لگا۔ گیس واقعی کچن کے دروازے کے رخنوں سے کمرے میں بھرنے لگی تھی، اور ہمیں بھی گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اول خیر بول پڑا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں فون کر چکا ہوں کسی وقت بھی میرے ساتھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تم سب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اول خیر کے چہرے پر تشویش جھلکنے لگی۔

''چل کا کے! نکل! اس بدبخت نے مارو اور مر جاؤ والی خطرناک چال چلی ہے۔'' میں متذبذب تھا۔ دشمن دیرینہ اور صفت ابلیس دشمن کو اس قدر قریب اور قبضے میں پا کر چھوڑ دینے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر......

''چل کا کا! شکیلہ کو اٹھا، نکل...... وہ بدبخت گر گیا ہے۔'' اول خیر چیخا۔ ہم پلٹے۔ صوفے پر لیٹی شکیلہ کو ہوش آنے لگا تھا۔ پھیلنے والی گیس نے گھٹن کے باعث اسے بھی ہوش دلا دیا تھا۔ پھر بھی وہ عالم نقاہت میں تھی، میں نے اس کے نرم و نازک وجود کو اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا اور باہر کو لپکے...... ہمیں یقین تھا ہمارے کمرے سے نکلتے ہی روشن خان بھی فوراً کچن سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور گرتا پڑتا سہی مکان کے کسی نسبتاً کھلے گوشے کا رخ کرے گا۔ اس مردود نے ڈبل چال چلی تھی۔ ایک طرف ہمیں نکلنے پر مجبور کیا تھا دوسرے اس نے اپنے ساتھیوں کو فون کر کے فوراً وہاں پہنچنے کا کہہ دیا تھا کہ کہیں اس کے کچن سے نکلنے کے بعد کہیں قریب میں گھات لگا کر نہ بیٹھے ہوں مگر میرے تیزی سے کام کرتے ذہن رسا میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال کوندا، باہر آ کر میں نے شکیلہ کو اول خیر کے حوالے کیا تو وہ تشویش ناک حیرت سے میری طرف تکتے ہوئے بولا۔

''تو کدھر چلا کا کے؟''

''میں اس خبیث کی چال اسی پر الٹنا چاہتا ہوں۔'' میں دانت پیس کر بولا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا مگر میں طوفانی بگولے کی طرح چلا اور جیسے ہی آہنی گیٹ کے اندر قدم رکھا، گولی چلنے کا دھماکا ہوا، پتا نہیں کس انداز میں گولی چلائی گئی تھی مجھ پر، یہ میری قسمت... کہ گولی خطا گئی، میں جھک گیا اور زمین پر رینگتے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت مجھے اس ملعون کی آواز سنائی دی۔

''خبردار شہزی! کوئی مہم جوئی دکھانے کی کوشش مت کرنا، میں تمہاری ایک ایک حرکت دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے یقیناً کسی کھلے اور ایسے گوشے سے گولی چلائی تھی جہاں گیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ مکان کی اوپری منزل کی طرف چلا گیا ہو۔ اگر اس نے گیس بند نہیں کی تھی تو بھی یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ وہ دھیرے دھیرے پورے مکان میں زہر کی طرح پھیل جائے گی۔ اسی وقت مجھے اول خیر کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ گولی کی آواز نے اسے پریشان کر دیا تھا، میں نے چلا کر اسے گیٹ سے باہر رہنے کا کہا اور خود سینے اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف آ گیا اور کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ نچلے پورشن میں گیس بھر چکی تھی، سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ میں نے گویا آتشِ جنوں میں ایک خوابیدہ جہنم کی جانب پیش قدمی کر ڈالی تھی، میں اٹھ کر زینے کی طرف لپکا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے باہر سے اول خیر کی دوبارہ آواز سنائی دی۔

''اوئے شہزی! واپس پلٹ آ...... وہ لوگ آ رہے ہیں۔'' اس کی بات پر میں ٹھٹکا۔ اس کی مراد یقیناً روشن کے ساتھی اہلکاروں سے تھی جنہیں وہ بدبخت فون کر کے بلا چکا تھا مگر میں اب کہاں پلٹنے والا تھا۔ اوپر کی جانب گھومتے

زینے کی ایک دیوار کے سوکھے سے میں نے نیچے کھڑے اول خیر سے کہا۔ ''اول خیر! اندر مت آنا، تم شکیلہ کو لے کر عمارت سے دور چلے جاؤ، مجھے اپنا کام کرنے دو۔''

''او نے نہیں کاکا، تیری جان کو شدید خطرہ ہے۔'' وہ دل دوز لہجے میں بولا۔

''اول خیر! میرا کام مت خراب کرو۔ ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ شکیلہ کو لے کر مکان سے دور ہو جاؤ۔''

جواباً میں بھی چیخا۔ ٹھیک اس وقت اوپر سے مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ زینے میں بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے دیوار پر پستول بہ دست سایہ نظر آیا یقیناً یہ روشن خان تھا۔ وہ اوپر تھا، میں نیچے تھا۔ وہ موقع ملتے ہی مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اسے میری جنوں خیز پیش قدمی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اور وہ مجھے کسی طرح نیچے دھکیلنا چاہتا تھا۔ گیس پھیلی ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ میں نے اوپر اندھا فائر کرڈالا۔ وہ شیطانی عفریت کی طرح واپس پلٹ گیا۔ میں تیزی سے زینے چڑھتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ میرے تفتہ وجود کا رُواں رُواں جوشِ غیظ کے مارے بری طرح پھڑک رہا تھا۔ اوپر نسبتاً کھلا گوشہ تھا۔ سامنے صرف دو کمرے نظر آتے تھے۔ ایک بالکونی تھی جو نیچے مکان کے اندرونی گوشے کی طرف بنی ہوئی تھی۔ وہاں ریلنگ تھی، میری لپکتی جھپکتی متلاشی نظریں تلاشِ غنیم میں تیزی سے حرکت پذیر رہیں۔ دفعتاً مجھے اپنے دائیں جانب جدھر الا بلا بکھرا ہوا تھا، ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ پھر گولی چلی، شکر تھا کہ میں پہلے ہی محتاط تھا۔ تاریکی میں چمکتے شعلے کی آتشیں جھپک محسوس کرتے ہی میں نے خود کو چھت کے فرش پر گرا دیا۔ ابھی میں زینے کے سرے پر ہی تھا۔ میں نے اس کباڑ پر تلے اوپر دو گولیاں داغ دیں۔ پھر نہ جانے اس نے مجھ پر کون سی بھاری شے دھکیل دی۔ وہ خالی ڈرم تھا جو مجھ سے ٹکرایا۔ نتیجے میں میرے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔ میں نے حواس مجتمع رکھے اور چھت کے فرش پر لیٹے لیٹے ڈرم کو لات رسید کر دی، ڈرم جس رفتار سے میری طرف آیا تھا، اسی رفتار سے دور جانے لگا تو میں بھی اس کی آڑ لیتا ہوا نہایت پھرتی کے ساتھ خود کو ڈرم کی طرح فرش پر لڑھکاتا چلا گیا اور جیسے ہی مجھے اس ملعون کا سایہ حرکت میں دکھائی دیا، میں نے اس پر ایک اندھی لات چلا دی۔ سب سے پہلے اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر لڑھک گیا اور پھر وہ خود...... میں نے زخمی شیر کی طرح خونخوار غراہٹ سے اس پر جھپٹا مارا۔ وہ موٹے بھاری بھینسے جیسا تھا۔ میں زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کرسکا۔ میں نے اسے دبوچ لیا مگر وہ ایک ٹرینڈ پولیس آفیسر بھی رہ چکا تھا مگر ترقی نے اسے سہل بنا دیا تھا، میں نے اس کے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز خارج ہوئی، اچانک اس نے اپنے پاؤں کا بھاری گھٹنا چلا دیا جو میری ناف پر پڑا۔ ضرب زوردار تھی مگر میرے سر پر سوار خوں ریزی کی آگ میں یہ تکلیف خاکستر ہوگئی، اس نے یک دم لڑھکنی کھائی اور مجھے خود پر سے نیچے گرا دیا پھر اٹھ کر دوڑا۔ وہ اپنا پستول اٹھانا چاہتا تھا، میں نے لیٹے لیٹے لات چلا دی۔ وہ الجھ کر گرا اور زینے کے سرے پر جا پڑا۔ میں نے بہ سرعت حرکت کی اور پستول چھت کے فرش سے اٹھا لیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر زینے کی طرف دوڑا۔ میں اسے بہ آسانی گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''روشن خان! تو نے تو جیتے جی جہنم کا رخ کرلیا۔''

میں آگے بڑھا...... زینے سے نیچے پے در پے گولیاں برسا دیں۔ نیچے گیس پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہولناک آتشیں جھپک نے جیسے پل کے پل نچلے پورشن کو جہنم زار بنا ڈالا۔ مجھے روشن خان کے ہولناک انداز میں چیخنے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

''خس کم جہاں پاک۔'' کہتے ہوئے میں تیزی سے پلٹا۔ چھت کی عقبی سمت ایک سیوریج کے پائپ کا سہارا لیتا ہوا نیچے اترا، یہاں تاریکی اور جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ بنگلا نما مکان کی کھڑکیوں سے آگ کی زبانیں کسی ڈریکولا کی طرح لپلپا رہی تھیں۔ مجھے اول خیر کی فکر ہوئی، کہیں وہ آگ بھڑکتے دیکھ کر میری تلاش میں اندر نہ کود پڑے۔ لہٰذا میں اسے بلند آواز میں پکارتا ہوا گیٹ کی طرف دوڑا۔ وہ اندر داخل ہونے کے لیے ہی پر تول رہا تھا۔ شکیلہ پورے ہوش میں آچکی تھی اور وہ اسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ میری آواز پر دونوں ہی چونک کر میری طرف پلٹے۔ اسی وقت مجھے دور سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ اول خیر مجھے زندہ دیکھ کر میرے ساتھ لپٹ گیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''او خیر، کاکے...... خدا کے لیے اس طرح ہاتھ سے مت نکل جایا کر۔''

''اپنی فطرت ہی کچھ ایسی ہے اول خیر! نکل چل اب...... وہ مردود جیتے جی واصل جہنم ہو چکا شاید اس کے ساتھی آرہے ہیں۔ میں نے کہا پھر ہم تینوں نے مکان کی

عقبی سمت پہلے ویرانے کی طرف دوڑ لگادی۔

☆☆☆

ہم مسلسل کئی پل تک دوڑتے خاصے دور نکل آئے۔ ہمارے عقب میں دور آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسیں بحال کرتے رہے۔ پھر کچھ باتیں کرنے کا یارا ہوا تو میں نے اور اول خیر نے غم زدہ شکیلہ کو تسلیاں دیں۔ اس کے بھائی شوکی کی موت کا ہمیں بھی افسوس تھا۔ تاہم شکیلہ کو اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میں نے اس کے قاتلوں سے بھی بڑا بھیانک انتقام لیا تھا۔ میں جانتا تھا شکیلہ کے سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ قدرے سرد ہوئی ہوگی مگر بھائی کی موت کا دکھ اپنی جگہ تھا۔ اس بدنصیب نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بھائی کو مرتے دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسا جگر پاش منظر تھا اس کے لیے جو یقیناً بھلائے نہیں بھول پاتا...... اس منحوس بنگلا نما مکان میں یقیناً اب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ ہمارے خلاف وہاں کسی ثبوت کی باقیات کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ روشن خان جیسے راتب خور قانون کے رکھوالے جس طرح جرائم پیشہ افراد کے زرخرید بن کے...... راتوں کی تاریکیوں میں بے گناہوں کے ساتھ جعلی مقابلے اور ظلم و بربریت کا کھیل کھیلتے رہے تھے، آج وہ بھی اپنی ہی پولیس گردی کا شکار ہو کے گمنامی کی حرام موت مارے گئے تھے۔

ہم تینوں تاریک اور جھاڑ جھنکاڑ ویرانوں میں گرتے پڑتے بالآخر نیشنل ہائی وے پر آگئے، یہاں سردست دور نزدیک تک کسی رکشے یا ٹیکسی کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ لوکل مسافر بسوں کی آوک جاوک کے کچھ آثار نظر آتے تھے۔ ایک ایسی ہی مسافر بس میں سوار ہو کے ہم شہر پہنچے اور وہاں سے ایک ٹیکسی میں سرمد بابا کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ ملازم مجھے بہ خوبی جانتے تھے۔ اس وقت سرمد بابا اور ان کے دونوں پوتے پوتی دانی اور پنکی اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ میں نے ان کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور شریفاں کو انہیں جگانے سے منع کر دیا۔ البتہ شکیلہ کے لیے اسے ایک کمرے کے لیے کہہ دیا جبکہ میں اور اول خیر اپنے کمرے میں آگئے۔ تھوڑا بہت کھانا زہر مار کیا تھا شکیلہ ہمارے ہی پاس بعد میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ایک کرب ناک دکھ سے دوچار تھی مگر بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب اور حوصلے کی مالک بھی تھی، میری طرح حالات نے اسے بھی کم نہیں رگڑا تھا۔ بہت کچھ جاننے پہچاننے وہ بھی لگی تھی۔ نیند لینا ضروری تھا کیونکہ اگلے دن ہمیں وزیر خان اور ثریا کے سلسلے میں ایک اہم ترین مہم کا آغاز کرنا تھا۔ شکیلہ نے خود کو کافی سنبھال لیا تھا اور اس نے کل کی ہمارے ساتھ جانے والی مہم پر شمولیت کا اظہار بھی کیا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور اول خیر اپنے بستروں پر جا لیٹے۔

اگلے روز صبح ناشتے کی میز پر سرمد بابا سے ملاقات ہوئی۔ دانی اور پنکی اپنا ناشتا جلدی نمٹا کر ہمیں خدا حافظ کہہ کر اسکول چلے گئے۔ وسیع ڈائننگ لاؤنج میں ایل سی ڈی بھی نصب تھی، وہاں میری دھڑکتی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ بریکنگ نیوز نشر ہو رہی تھی اور ملتان کے قدرے نواح میں واقع اس بنگلے نما مکان میں آتشزدگی، ڈپٹی روشن خان سمیت کچھ لوگوں کے جل مرنے کی خبریں اور فوٹیجز وغیرہ دکھائے جا رہے تھے۔ سرمد بابا بھی چونکے۔ ہم ناشتا کر چکے تھے اور چائے پی رہے تھے، شکیلہ بھی موجود تھی۔

''ارے یہ وہی پولیس آفیسر روشن خان تو نہیں...... اوہو...... یہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟'' معاً سرمد بابا بولے۔ میں اور اول خیر خاموش تھے۔ میں اس کی حقیقت کے بارے میں سرمد بابا سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اس بات پر معنی خیز مسکراہٹ اول خیر کے چہرے پر ڈالی تھی۔ میری اس مسکراہٹ میں ایک متوقع فتح کی طمانیت تھی، یعنی ہمارا کہیں نام نہیں تھا۔ ایک اینکر پرسن البتہ جائے وقوعہ کی فوٹیج پر چلا چلا کر اسے روشن خان کی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہی یہ کلپس چلا تھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ دوسری بریکنگ نیوز نے لے لی تھی۔ جو کم از کم ہمارے لیے غیر اہم ہی تھی۔

شکیلہ پہلے بھی یہاں رہ چکی تھی۔ جب میں اسے چتی بائی اور جمعہ خان وغیرہ کے چنگل سے چھڑا کر لایا تھا اور سرمد بابا کی پناہ میں لا کے رکھا تھا۔ شکیلہ سے متعلق میں نے سرمد بابا کو بھی بتایا تھا کہ اس کے بھائی شوکی کا ایک جانکاہ حادثے میں انتقال ہو گیا اور اب یہ بے چاری اکیلی تھی۔ میرے حوالے سے سرمد بابا نے میری بھی کسی بات پر اعتراض نہ کیا تھا بلکہ شکیلہ سے اب بھی شفقت سے ہی پیش آتے تھے، بلکہ شکیلہ اور سرمد بابا سمیت ہم اطفال گھر کے ہی تو سب ساتھی تھے۔ بقول آپا جی کے بوڑھے بھی بچے ہی ہوتے ہیں۔

ہمارے درمیان ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی پھر ہم ناشتے کی میز سے اٹھ کر صوفوں پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ زیادہ تر اپنی امریکا روانگی اور کاروبار کی ان کی غیر موجودگی میں دیکھ

بحال کی باتیں کرتے رہے۔ عارفہ اور عابدہ سے متعلق بھی بات ہوئی، شاید ہماری یہاں آمد کی وجہ سے سرمد بابا کو آج دفتر جانے کی جلدی نہ تھی معاً ان کے سیل فون کی گھنٹی گنگنائی۔

''ارے...... یہ اس وقت جمال الدین کیوں فون کر رہا ہے۔'' وہ اپنے بیش قیمت سیل فون کے ڈسپلے پر نظر ڈالتے ہوئے خود کلامیہ بڑبڑائے پھر فون کان سے لگا لیا۔

''ہاں! بولو جمال! خیریت......؟''

جمال الدین کے بارے میں سرمد بابا مجھے بتا چکے تھے۔ یہ وہی آدمی تھا جو ان کا قابلِ اعتماد اور جی ایم، پی اے، بیک وقت بھی کچھ تھا اور گھر میں انکل جمال کے نام سے معروف تھا۔ عارفہ کو بھی اس پر بہت اعتماد تھا۔

''کیوں......؟ وہ کیوں بضد ہے مجھ سے ملنے کے لیے؟...... میں اس خبیث کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

معاً سرمد بابا نے ناگوار لہجے میں کہا۔ میں قدرے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ریموٹ اٹھا کر ایل سی ڈی کا والیم صفر پر کر دیا۔ خاموشی کے باعث سرمد بابا کے سیل سے ان کے جی ایم انکل جمال کی آواز آرہی تھی، تاہم گفتگو زیادہ نہیں سنی جا سکتی تھی۔ ہم خاموش تھے، بابا اس سے باتوں میں مصروف تھے۔

''تو ٹھیک ہے پھر...... آفس میں آگیا ہے تو بیٹھا رہنے دو اُسے میرے انتظار میں...... خود ہی دفان ہو جائے گا۔'' وہ بدستور ناگواری سے بولے جارہے تھے۔ لگتا تھا جیسے انکل جمال انہیں کسی ایسے شخص سے ملانے کے لیے بضد تھا جن کو سرمد بابا سخت ناپسند کرتے تھے۔ بالآخر بولے۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر...... میں تو آج دیر سے ہی دفتر پہنچوں گا۔ ایک ضروری کام سے جانا ہے مجھے...... تم ایسا کرو اس سے کہو وہ ادھر ہی آجائے پھر......'' با دلِ ناخواستہ یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا اور ہولے سے بڑبڑائے۔

''بدبخت انا نجار۔''

''کون؟ انکل جمال؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے سرمد بابا کی طرف دیکھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''ارے نہیں، شہزی بیٹے! بے چارہ جمال تو میرا لائق اور بڑا فرماں بردار آدمی ہے، میں اس منحوس سیٹھ نوید ساتیچے والا کی بات کر رہا تھا، مجھے یہ آدمی سخت ناپسند ہے مگر چند کاروباری مصلحتوں اور مجبوری کے باعث اسے بھی کبھار نہ چاہتے ہوئے بھی بھگتنا پڑتا ہے۔''

''یہ ہے کون ویسے؟'' میں نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ سرمد بابا بولے۔ ''ہے کوئی تو دو لتیا قسم کا سیٹھ...... خود کو میرے بیٹے محمود (مرحوم) کا بڑا پرانا اور گہرا دوست کہتا ہے...... مجھ سے کئی بار میرے بیٹے کے حوالے سے کاروباری ڈیلنگ کا کہتا رہا ہے مگر میں جانتا ہوں ہر دو نمبر کام اس کی اٹھائی گیری کے لیے وقف ہو چکا ہے۔''

''تو پھر اس کے ساتھ کاروباری روابط رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی زمانے میں اس نے کسی اڑیسہ نامی کمپنی میں دس فیصد حصہ داری کی تھی، میرے بیٹے محمود کو بھی اس کی حصہ داری پر اکسایا۔ اس نے بھی شروع میں دس فیصد کے شیئرز خرید لیے۔ اس کے بعد جانے محمود کے سر پر کیا شوق چرایا کہ اب پتا نہیں اپنی ذاتی دلچسپی یا پھر کسی کے اکسانے پر ایک دم چالیس فیصد کے شیئرز لے لیے۔ معلوم نہیں اب کہ...... یہ...... کمپنی خسارے میں جارہی تھی یا پھر اس نے ایک دم عروج حاصل کر لیا تھا، تاہم ہمارا بھی اس ضمن میں اپنی ٹانگ پھنسانا ضروری قرار پایا۔ جس کے لیے ہمیں اس ناہنجار سیٹھ نوید ساتیچے والا کی ناقابلِ قبول شکل اور شخصیت کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔''

سرمد بابا کی باتوں سے میرے دوررس وجدانی ادراک رکھنے والے ذہن میں ایک سوالیہ نشان ابھرا کہ اب بھی سرمد بابا کی اس سیٹھ نوید ساتیچے والا...... کے ساتھ اس قدر نفرت اور ناگواری کی وجہ اور ہی تھی۔ میری متجسس فطرت نے سرمد بابا سے استفسار پر اکسایا تو میں دانستہ ہلکی اور معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''میرا خیال ہے یہ ایسی کوئی خاص وجہ تو نہیں...... اس سے آپ کی اس قدر خفگی اور نفرت کی، باقی وہ جو دو نمبر کام کرتا ہے وہ اس کا اپنا فعل ہے جس کا وہ خود ذمے دار ہے۔''

''تم بھی بڑے کائیاں ہو شہزی! میں تو تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔'' وہ بھی یک دم ہلکی ہنسی کے ساتھ بولے۔

''اطفال گھر کے تم سب سے زیادہ ذہین بچے تھے، خیر، تم نے بھی کچھ ایسا غلط اندازہ نہیں لگایا۔ سیٹھ نوید ساتیچے والا سے میری ناپسندیدگی کی اصل وجہ کچھ اور ہی ہے۔ اب تم سے کیا چھپانا۔'' کہتے ہوئے انہوں نے میرے ساتھ بیٹھے اول خیر کی طرف دیکھا۔ میں ترنت ان کی نظروں کا مطلب بھانپ گیا اور بولا۔ ''بابا! اول خیر کو بھی آپ ایک ہی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔''

''جانتا ہوں میں۔'' وہ ہولے سے مسکرا کر بولے۔
''پھر چند ثانیوں کی سوچتی ہوئی سی خاموشی کے بعد مختصراً بولے۔
''اس نابکار خبیث سیٹھ نوید نے عارفہ کے بیوہ ہوتے ہی اس کا رشتہ مانگا تھا۔''
یہ بتاتے ہوئے سرمد بابا کے چہرے پر ایسے تاثرات امڈ آئے جیسے انہوں نے کوئی کڑوی گولی نگل لی ہو۔
''اوہو......'' اس بات پر بنا اختیار میرے ہونٹ دائرے کی صورت میں سکڑ گئے۔ پتا نہیں سیٹھ نوید سانچے والا...... کے اس پروپوزل میں کوئی برائی تھی یا نہیں۔ مجھے اس کا کوئی خاص اندازہ نہیں ہو پایا تھا لیکن اس کی شخصیت بہرحال، بقول سرمد بابا کے دو نمبر تھی۔
میں نے سرمد بابا کی تائید میں کہا۔ ''یہ تو واقعی سیٹھ نوید کی نامعقول سی ہی بات ہے جبکہ وہ دیکھ بھی رہا ہے کہ عارفہ آپ کی بہو کی حیثیت سے ہی رہ رہی ہے۔ بہرحال...... آپ اسے زیادہ گھاس ڈالنے کی کوشش نہ کریں جہاں تک کاروباری مجبوری کا تعلق ہے تو اس حد تک اسے بھگتایا جا سکتا ہے۔''
''ہاں بیٹے! بس اسی مجبوری کے باعث یہ کڑوی گولی نگلنی پڑتی ہے۔'' سرمد بابا تلخ لہجے میں بولے۔
''بلکہ کاروباری مجبوری بھی کیا ہے بس اڑیسہ کمپنی والا معاملہ صاف ہو جائے تو میں اس سے ملنا تو درکنار، بات کرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔'' میں نے ان کی بات پر تائیداً سر ہلا دیا۔ دل میں یہ سوال پوچھنے کی خواہش ابھری تھی جو اچانک اس دوران میرے ذہن میں ایک تشویش کی لہر کے ساتھ ابھرا تھا۔ میں سرمد بابا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کاروبار، جائداد تو ان کی ہی ملکیت تھی تو کیا اب بھی ایسا ہی تھا؟ ایسا تو نہیں عارفہ جب امریکا سے صحت یاب ہو کر لوٹے گی تو ایک بار پھر...... اپنے نیک نفس سسر کو سیٹھ منظور وڑائچ سے سرمد بابا بنا دے گی؟
اس دوران باہر گیٹ پر متعین چوکیدار نے اندر انٹرکام پر سرمد بابا کو سیٹھ نوید سانچے والا کی آمد کی اطلاع دی۔ انہوں نے اسے اندر لانے کا کہہ دیا اور ریسیور رکھ کے بڑبڑائے۔ ''آ گیا وہ منحوس۔''
تھوڑی دیر بعد چوکیدار کے ساتھ جو شخص نمودار ہوا تھا، وہ مجھے کہیں سے بھی سیٹھ نہیں نظر آتا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا، ایک کالے موٹے اور گوندیل عمر رسیدہ آدمی کا تھا مگر میں متوقع سیٹھ نوید سانچے والا کو دیکھ کر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ عمر تو خیر اس کی چالیس پینتالیس سال سے کسی بھی طرح کم نہیں دکھائی دیتی تھی، مگر بہرحال اس کی پرسنالٹی پُروجیہہ تھی۔ دراز قد، چوڑے کاندھے، گورا رنگ مگر شکل وصورت اس کی وجیہہ شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ چہرہ کچھ زیادہ لمبوترا تھا، ناک آگے سے مڑی ہوئی تھی اور آنکھیں بالکل ہی چندی چندی سی تھیں، جن میں مکاری کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ بال کریو کٹ تھے اور کنپٹیوں کی طرف سے سفیدی جھلکتی تھی۔ بھویں بھی غیر معمولی طور پر اونچی تھیں اور صاف لگتا تھا کہ وہ بھویں اچکا اچکا کر باتیں کرنے کا عادی تھا۔ اس وقت بھی وہ ہمیں اور بالخصوص سرمد بابا کو دیکھ کر یہی کام کر رہا تھا۔ وہ بہترین تراش کے کوٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔
بادل ناخواستہ سرمد بابا اس سے ملنے کے لیے صوفے سے اٹھنے لگے تو اس نے مکارانہ فروتنی سے انہیں بیٹھے رہنے کا کہا اور بابا نے یہی کیا بھی۔ پھر ہم سے ہاتھ ملایا۔ شکیلہ کو ہولے سے آداب کہا۔ پھر سرمد بابا کے اشارے پر وہ سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ چند پل اس نے کچھ عجیب سی مسکراتی نظروں سے ہم تینوں کا جائزہ لیا پھر جیسے ہی سرمد بابا کی طرف دیکھا، انہوں نے گویا جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔
''ہاں، کیسے آنا ہوا؟'' ان کے لہجے میں چھپی تلخی کم از کم مجھے تو صاف محسوس ہوئی تھی، سیٹھ نوید اسی مسکراہٹ سے بولا۔
''کچھ کاروباری معاملے کی بات کرنا تھی جو اہم بھی ہے اور رازداری کی متقاضی بھی۔'' کہتے ہوئے اس نے دانستہ اشارۃً ہم پر بھی نظر ڈالی تھی۔ اس پر سرمد بابا نے اپنے ہاتھ کا خفیف سا اشارہ ہماری جانب کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
''یہ میرے اپنے ہی ہیں۔ تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔'' اس پر وہ بولا۔ ''ان حضرات کا تعارف؟''
''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تم بات کرو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ تمہیں جمال نے بتایا ہوگا کہ مجھے کہیں ضروری کام سے پہنچنا ہے۔'' سرمد بابا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے بہ غور سیٹھ نوید سانچے والا کے لومڑی جیسے لمبوترے اور چندی چندی آنکھوں والے چہرے کا جائزہ لیا۔ سرمد بابا کے بہ دستور روکھے لہجے اور سرد رویے نے اسے بھی یک دم ایک تلخ سی متانت میں جلا کر دیا تھا پھر وہ ایک گہری سانس

خارج کرتے ہوئے پہلے تو...... ان کے مرحوم بیٹے محمود کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہا پھر آخر میں کہا۔

''کیا آپ کو اپنے بیٹے کے کاروباری معاملات کے بارے میں پورا علم ہے وڑائچ صاحب؟ یا پھر میرا مطلب تھا...... اگر عارفہ صاحبہ بھی موجود ہوتیں تو...... زیادہ مناسب ہوتا۔ چونکہ میں جانتا ہوں وہ بہ غرض علاج امریکا میں مقیم ہیں اس لیے میں نے سوچا سرِدست آپ سے بات کرلی جائے۔''

''میں سن رہا ہوں، کہتے رہو۔'' سرمد بابا بولے۔

''مجھے بیٹے کے تمام کاروباری معاملات کا اچھی طرح علم ہے جبکہ اس کی ابتدا بھی میں نے ہی کی تھی۔'' سرمد بابا کی بات پر میں نے محسوس کیا کہ سیٹھ نوید سانچے والا کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

''معاف کیجیے وڑائچ صاحب! میرے علم میں تو یہ بھی ہے کہ آپ کے بیٹے محمود نے آپ کا سارا کچھ اپنے نام کروانے کے بعد آپ کو اولڈ ہوم......''

''یہ ہمارا ذاتی گھریلو معاملہ ہے۔ تمہیں اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم کام کی بات کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' سرمد بابا نے کسی قدر تلخی سے یہ کہتے ہوئے اس کی بات کاٹی تو جیسے سیٹھ نوید بھی یک ترنت ادھار کھائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرا پوچھنے کا مقصد بھی تھا کہ یہ بات میرے علم میں بھی ہے کہ آپ کے بیٹے محمود کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ یعنی آپ کی بہو عارفہ بیگم ہی کے نام اب سب منتقل ہو چکا ہے۔ بے شک سنبھال اب بھی آپ ہی رہے ہیں مگر قانونی طور پر تو اب بھی وہی سب کی مالک ہیں۔'' اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا تو گویا میرا شبہ ٹھیک ثابت ہوا تھا۔ سرمد بابا کا اب بھی سب کچھ ان کی بہو کے نام تھا۔ مجھے دوسرا جھٹکا اس بات کا محسوس ہوا تھا کہ سیٹھ نوید سانچے والا یہ سب جانتا تھا مگر اب وہ کہنا کیا چاہتا تھا۔

میں خاموش رہا۔ تاہم میں نے سرمد بابا کے چہرے پر غیر محسوس انداز میں دکھ کی ہلکی سی رمق ضرور امڈتے دیکھی تھی۔ وہ خاموش رہے۔ میں نے دیکھا۔ سیٹھ نوید مکاری سے مسکرایا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے دانستہ سرمد بابا کو ایک تلخ حقیقت کا احساس دلانا چاہا تھا اور جواب میں انہیں ایک نامعلوم سی دکھ بھری خاموشی میں پا کر گویا ایک اور چرکا لگاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ویسے عارفہ نے بتایا تھا کہ......''

''دیکھو مسٹر سانچے والا! عارفہ ابھی تک میری بہو اور میرے بیٹے کی بیوہ کی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے اس کی یہی حیثیت منظور ہے۔ لہٰذا مائنڈ یور لینگویج...... اسے عارفہ کے بجائے مسز محمود کہہ سکتے ہو تم...... سمجھ گئے۔'' سرمد بابا جیسے یک دم پھٹ پڑے۔ انہیں شاید سیٹھ نوید کا بار بار عارفہ کہنا برا لگا تھا۔ مجھے کچھ بدمزگی کا احساس ہونے لگا۔ خود مجھے بھی اس مکار آدمی سانچے والا پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ وہ آخر اصل بات کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی بے پر کی کیوں ہانک رہا تھا۔ یقیناً اس میں کچھ مقصد پوشیدہ تھا۔

بہرحال سیٹھ نوید ہولے سے کھنکھار کر بولا۔ ''وڑائچ صاحب! دراصل یہ سب باتیں کرنے کا میرا ایک مقصد تھا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ آپ کے علم میں کیا کچھ ہے؟ کیونکہ آپ کی بہو عارفہ...... سوری...... مسز محمود کے امریکا روانگی سے پہلے اس سلسلے میں ان سے میں ایک میٹنگ بھی کر چکا ہوں۔ سرِدست انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ البتہ میرے استفسار پر انہوں نے مجھے اپنے شوہر کے متعلق اتنا ضرور بتایا تھا کہ ان کی اچانک ناگہانی موت سے کچھ دن پہلے وہ خاموش اور پریشان رہنے لگے تھے، تو میرے دل میں ایک تشویش آمیز کھٹک سی پیدا ہوئی تھی، پھر مجھے ان سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تو مجبوراً مجھے دباؤ کے باعث آپ سے بات کرنا پڑی۔'' وہ ذرا رکا تو سرمد بابا نے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''دباؤ......؟ کیسا دباؤ؟''

میں نے محسوس کیا تھا کہ بار بار اپنے جواں مرگ بیٹے محمود کے تذکرے نے ان کی بوڑھی آنکھوں کے گوشے نمناک کر ڈالے تھے۔

''میں اسی طرف ہی آرہا ہوں۔'' سیٹھ نوید سانچے والا نے کہا اور بولا۔ ''میں چاہتا ہوں...... بلکہ وہ لوگ بھی یہی چاہتے ہیں کہ یہ معاملات ہمارے درمیان بہ خیرو اسلوبی طے پا جائیں۔ دراصل، اڑیسہ کمپنی کے کچھ شیئرز تھے آپ کے بیٹے کے پاس...... آپ کو معلوم ہے کہ وہ انہوں نے کہاں رکھے ہوں گے...... میرا مطلب ہے کسی بینک کے کسی لاکر میں؟''

''اس کا علم نہیں۔'' سرمد بابا نے سپاٹ لہجے میں کہا جبکہ میں اندر سے چونک گیا۔

''آخر یہ اڑیسہ کمپنی...... ہے کس بلا کا نام؟''

''یہ ایک تجارتی جہاز راں کمپنی ہے...... اس کا ہیڈ آفس برما کے دارالحکومت رنگون میں ہے۔ کسی زمانے میں یہ خسارے میں جا رہی تھی۔ بورڈ مالکان نے اس کے شیئرز

فروخت کرنا شروع کر دیے تھے۔ یہاں مقیم مذکورہ کمپنی کے ایک نمائندے سے آپ کے بیٹے محمود اور میں نے بھی کچھ شیئرز خرید لیے تھے۔ دس، دس فیصد...... مگر بعد میں شاید آپ کے بیٹے کو کسی طرح اس بات کا اندازہ یا علم ہونے لگا کہ یہ کمپنی نہ صرف دھیرے دھیرے سنبھلنے لگی ہے بلکہ منافع بخش بھی ہو جائے گی لہٰذا اس نے چالیس فیصد کے شیئرز مزید خریدے۔ یوں اب آپ کے بیٹے کے پاس پچاس فیصد شیئرز موجود ہیں۔ اب ان کو موت کے بعد دیگر حصے دار کمپنی کے مختار بننے کا حق رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام شراکت داروں کے پاس ان کے اصل کاغذات حصے دار موجود ہوں...... کیونکہ ان کاغذات کی عدم موجودگی میں وہ مختار نہیں بن سکتے۔'' سیٹھ نوید سانچے والا اتنی تفصیل بتا کر خاموش ہو گیا۔

''کاغذات والی بات سمجھ میں نہیں آئی؟'' سرمد بابا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ سیٹھ نوید بولا۔

''مذکورہ کمپنی کی طے شدہ شرائط کے مطابق جو بھی کمپنی کا پچاس فیصد شیئرز ہولڈر ہوگا، کمپنی کے نصف مالکانہ حقوق کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے جائیں گے۔''

''اگر وہ کاغذات ہمارے پاس ہیں بھی تو پھر وہ ہم ان کے حوالے کیوں کریں؟'' سرمد بابا نے سوال داغا۔ میں بغور یہ ساری گفتگو نہ صرف سن رہا تھا بلکہ سمجھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا اور اس کے پس منظر میں چھپی کسی گہری سازش کو بھی بھانپنے کی سعی کر رہا تھا۔ سرمد بابا کے سوال کے جواب میں سیٹھ نوید سانچے والا نے کہا۔

''پچاس فیصد مالکانہ حقوق کے ان اہم کاغذات والی شرط کے ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ شیئرز ہولڈر کی موت کے بعد انہیں کمپنی کو واپس فروخت کر دیا جائے گا۔ اس وقت مذکورہ کمپنی شدید خسارے سے دوچار تھی، ہم محمود صاحب کے مشکور ہیں کہ درحقیقت انہوں نے اس گرتی ہوئی کمپنی کو سہارا دیا تھا۔''

''تو اب میرے بیٹے کے احسان کے بدلے میں اس کے شیئرز ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ یہ کہاں کا قانون ہے اور کون سا انصاف ہے؟''

سرمد بابا بولے تو ان کا چہرہ دھیرے دھیرے کسی اندرونی جوش اور دباؤ تلے سرخ ہو رہا تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شک بھی نہ تھا کہ وہ ایک خالصتاً کاروباری شخص بھی تھے۔ شاید انہیں اب اس بات کی دل ہی دل میں خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ان کے بیٹے نے دور اندیشی اور ٹھیٹ کاروباری سوجھ بوجھ کے مطابق درست وقت پر درست فیصلہ کیا تھا کہ ایسی کمپنی کے شیئرز خرید لیے تھے جس کے دس فیصد شیئرز خریدنے کے لیے بھی لوگ ہچکچا رہے تھے، مگر اب نہ جانے کس طرح یک دم از خود یہ کمپنی ترقی کی جانب گامزن ہو گئی تھی تو کچھ مکار اور ابن الوقت لوگ اس کے بیٹے کی موت سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔

''وہ لوگ ہیں کون؟ میری ان سے میٹنگ کرواؤ۔'' بالآخر سرمد بابا نے سیٹھ نوید سے کہا۔

''ابھی وہ حصے دار خود کو گمنام رکھنا چاہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''انہوں نے تمہیں اپنا نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے؟'' سرمد بابا نے آنکھیں سکیڑیں۔

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھے ان کا قانونی مشیر بھی سمجھ سکتے ہیں۔''

''اونہہ...... قانونی مشیر......'' سرمد بابا نے استہزائیہ کہا۔ پھر سوال کیا۔ ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ جنہوں نے تمہیں نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے اور وہ جو مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اس پر حق بہ جانب ہیں۔'' سرمد بابا کے اس سوال پر سیٹھ نوید بوکھلا سا گیا۔ مجھے اس کی تنگ سی پیشانی پر جھوٹ اور دغا بازی کی جھلک صاف محسوس ہوئی ...... وہ جلدی سے گویا بات بناتے ہوئے بولا۔ ''بات یہ ہے کہ کمپنی اور اس کا جوائنٹ اکاؤنٹ ابھی تک آپ کے مرحوم بیٹے محمود کے نام ہے۔ وہ قانونی طور پر اب اس کمپنی کے واحد حصے دار ہیں...... میرا مطلب یہ ہے...... اور......''

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، آپ بھی تو دس فیصد کے حصے دار تھے؟'' سرمد بابا نے درمیان میں کہا۔

''ہاں، مگر میں نے اپنی زندگی کی بڑی غلطی کی تھی اور آپ کے بیٹے نے ایک عظیم عقل مندی، میں اپنا دس فیصد شیئر محمود کو فروخت کر چکا تھا۔ یہی نہیں، جن لوگوں نے بھی دس فیصد کے شیئرز لیے تھے، وہ سب آپ کے بیٹے نے خرید لیے تھے جبکہ دوسری طرف بھی یہی صورت حال رہی۔''

سیٹھ نوید سانچے والا سانس لینے کے لیے رکا پھر آگے بولا۔ ''باقی کے پچاس فیصد شیئرز...... رنگون کے دو مسلم تاجروں نے اور ایک امریکی نے خریدے، اس امریکی نے آپ کے بیٹے کی طرح دور اندیشی سے کام لیا اور ان دونوں رنگونی مسلم تاجروں سے ان کے حصے کے شیئرز مہنگے داموں خرید لیے، اب پچاس فیصد شیئرز امریکی سوداگر کے ہیں۔

اور پچاس آپ کے بیٹے کے۔ وہ امریکی سوداگر بھاری آفر کے ساتھ آپ کے بیٹے کے نام کے بقیہ پچاس فیصد شیئرز خریدنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ جوائنٹ اکاؤنٹ اور پارٹنرشپ کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اب میں نے آپ کو کھل کر ساری بات بتادی ہے تاکہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔''

''مگر تم ابتدا میں دھونس جمانے والے انداز میں باتیں کررہے تھے کہ ہر صورت میرے بیٹے کے نام کے شیئرز اور کاغذات تمہارے مؤکلوں کے حوالے کردوں؟'' سرمد بابا نے چبھتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر مکارانہ فروتنی سے بولا۔

''وڈرائچ صاحب! آپ ضعیف انسان ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بڑی کمپنی کا بار آپ اپنے بوڑھے کاندھوں پر اٹھا پائیں گے۔ میں راستہ سہل کرنا چاہ رہا تھا۔''

''میں اگر اتنا بوڑھا ہوگیا ہوتا تو سرمد بابا سے آج دوبارہ سیٹھ منظور وڈرائچ کی صورت میں تمہیں یہاں بیٹھا نظر نہیں آرہا ہوتا۔'' سرمد بابا نے اس کی چندی چندی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''بہرحال میں اپنے سیکریٹری سے بریفنگ لوں گا لیکن میں پچاس فیصد شیئرز سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔'' پھر ذرا رک کر پوچھا۔

''کیا تم بزنس پارٹنر..... یعنی امریکی سوداگر کا نام بتا سکتے ہو اور وہ ہوتا کہاں ہے؟''

''میں اس سلسلے میں مسز محمود (عارفہ) سے بھی بات کرچکا ہوں۔ مگر ان کی ناسازی طبیعت کے باعث تفصیل سے نہ کر پایا تھا۔ پھر اس وقت حالات بھی اور تھے۔'' سیٹھ نوید نے سرمد بابا کے سوال کو شاید دانستہ صرف نظر کردیا تھا۔

''میں نے تم سے اپنے بزنس پارٹنر کا نام پوچھا تھا؟'' سرمد بابا نے دوبارہ اپنے سوال کی طرف اشارہ دیا۔ وہ بھی چھوڑنے والے کہاں تھے۔

سیٹھ نوید ہولے سے کھنکھار کر بولا۔ ''وہ نیویارک میں مقیم ہے، مگر آج کل رنگون آیا ہوا ہے۔ معاملہ طے ہوجانے کے بعد وہ رنگون والا ہیڈ آفس نیویارک شفٹ کرنا چاہتا ہے یا پھر ممکن ہے وہ وہاں اپنا کوئی آدمی تعینات کردے۔ اس کا نام لولووش ہے۔'' اس نے بالآخر نام بتادیا۔

''لولووش.....'' مجھے یہ نام سن کر ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس کے لیے مجھے اپنی یادداشت کے خانے کو کھنگالنے کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ نام میرا آشنا سا تھا۔ مجھے اپنی حال ہی میں میجر ریاض باجوہ کے ساتھ ملاقات یاد آگئی جس میں انہوں نے ''اسپیکٹرم'' کے حوالے سے مذکورہ امریکی لولووش کا نام لیا تھا جو درحقیقت جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ اور ایک ''ڈون'' تھا۔ اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے اور مخصوص سربرآوردہ شخصیات سے حاصل کردہ اثر ورسوخ کے علاوہ اپنی کارگزاریوں کو ''شرافت'' کے پردے میں چھپانے کے لیے اس نے امریکا کی ایک معروف صیہونی سوداگروں کی ایک تنظیم JBC (جیوش بزنس کیونٹی) میں بھی بطور اہم کاروباری شخصیت ایک بزنس مین کی حیثیت سے بھی متعارف کروا رکھا تھا اور مختلف کاروباری دھندوں میں ہاتھ ڈالتا رہتا تھا۔ بقول میجر باجوہ صاحب کے وہ اسپیکٹرم کا سربراہ اور اس ادارے کو ہائی جیک کرنے والا واحد شخص لولووش ہی تھا۔ جس نے اپنے ذاتی مفادات اور اپنے کالے دھندوں اور سیاہ کرتوتوں کو وسیع کرنے کی خاطر درونِ خانہ بلیوتسی والوں سے بھی گٹھ جوڑ کر رکھا تھا بلکہ ان کے وسیع تر خفیہ مفادات کے لیے مذکورہ دونوں انٹیلی جنس نے اسے سپورٹ کررکھا تھا۔

میری نگاہ میں لولووش ایک خطرناک ترین بین الاقوامی مجرم..... ایک ''ڈون'' تھا۔ جبکہ سرمد بابا کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ کس سے ٹکر لے رہے ہیں۔ اگر تو لولووش وہی تھا۔ مجھے اس کی تصدیق کرنا چاہیے تھی۔ مگر محتاط انداز میں یا پھر موقع محل کا انتظار کرکے مگر مجھے لگ رہا تھا کہ سرمد بابا ایک ٹھیٹھ کاروباری شخصیت ہونے کے باعث اس جہاز راں کمپنی میں پوری طرح دلچسپی رکھتے تھے، اور پچاس فیصد تو کیا کسی بھی صورت میں ایک فیصد شیئرز بھی لوٹانے کے موڈ میں نظر نہیں آرہے تھے۔ اس سے متعلق آج اگرچہ سیٹھ نوید سانچے والا نے انہیں ''اپ ڈیٹ'' کیا تھا جبکہ باقی کی بریفنگ وہ اپنے سیکریٹری (انکل جمال) اور اپنی بیوہ بہو عارفہ سے حاصل کرنے کا پورا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔

سرمد بابا نے اپنی طرف سے سردست بات ختم کردی۔ حالانکہ جس قسم کی گفتگو ان دونوں کے درمیان ہورہی تھی، اس کے مطابق سرمد بابا، عارفہ سے متعلق کئی ایک باتیں مستفسرانہ طور پر اس سے پوچھ سکتے تھے مگر وہ دانستہ اپنی بہو کا ذکر سیٹھ نوید کے سامنے کرنا پسند نہیں کررہے تھے۔ وہ روادار، قدامت پرست انسان تھے اور سیٹھ نوید کو تو وہ ویسے ہی پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا وہ اپنی بات کرچکے تھے، مگر سیٹھ نوید جیسے بات کو کسی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش میں تھا لہٰذا رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ ''سوچ لیجیے

گاوڑ ائج صاحب! ممکن ہو، ساری حقیقت جان لینے کے بعد آپ کے دل میں یہ شوق جاگ اٹھا ہو کہ مذکورہ کمپنی کے اب آپ مالک ہوں گے تو میرا آپ کو دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ ہوگا کہ اس خوش فہمی کو ذہن سے اپنے نکال پھینکیے گا کیونکہ لولوش جیسے انسان کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ بزنس کی دنیا کا وہ بہت بڑا ٹائیکون ہے۔ آج وہ ایک ملک میں ہوتا ہے تو کل دوسرے ملک میں۔''

''مجھے ہی نہیں، سرمد بابا کو بھی اس کے لہجے میں چھپی تہدید صاف محسوس ہوئی تھی، شاید میرے بھڑک جانے کے ڈر سے یا کسی اور وجہ سے سرمد بابا نے ضبط سے کام لیا اور سیٹھ نوید سانچے والا کی طرف سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے فقط اتنا کہا۔ ''تم اب یہاں سے جاسکتے ہو۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔'' جواباً سیٹھ نوید سانچے والا اپنی چندی چندی آنکھوں سے سرمد بابا کو عجیب سی نظروں سے گھورتا ہوا خاموشی سے لوٹ گیا۔

''ذلیل...... کمینہ...... فریبی...... مجھے دھمکی دینے آیا تھا۔'' اس کے جاتے ہی سرمد بابا نے خودکلامیہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

''یہ آپ کو چکر دینے کی کوشش کررہا تھا شاید۔'' میں نے ہولے سے مسکراتے ہوئے بابا کی طرف دیکھا۔ مجھے کاروبار کی کوئی سوجھ بوجھ تو نہ تھی تاہم پڑھا لکھا انسان میں بھی تھا۔ عقل سلیم جسے کامن سینس کہتے ہیں، وہ میری غیر معمولی حد تک تیز تھی پھر اطفال گھر جیسے ادارے میں جو کسی بھی یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، پھر اس کے روحِ رواں بھی حاجی اسحاق ملک مرحوم جیسے نیک اور اصول پرست انسان تھے، وہ جب تک زندہ رہے...... اطفال گھر پر یتیم خانے کی چھاپ نہیں لگنے دی اور جدید خطوط پر اسے چلاتے رہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے وہاں رہتے ہوئے، پرائیویٹ طور پر بی اے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ نیز انگریزی بھی سیکھتا رہا تھا۔ پھر وہاں ٹی وی کے پروگراموں میں مجھے ڈراموں سے زیادہ خبروں، حالات حاضرہ اور ڈاکومینٹری کے پروگراموں میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ اپنی غیر معمولی فطری صلاحیتیں...... جو ہر انسان کو کسی نہ کسی شکل میں ودیعت ہوتی ہیں اور ان سے زیادہ حالات نے میرے شعور کو بڑی جلا بخشی تھی۔

''یہ مجھے کیا چکر دے گا'' مجھے حیرت اس بات پر ہورہی ہے کہ عارفہ بیٹی نے مجھے ابھی تک اس کی تفصیل کیوں نہ بتائی؟''

وہ میری بات پر گومگو سے لہجے میں بولے۔ میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے ان کی ناراضی ابھی آپ جتنی ہی آگاہی ہو، یہ تو اب آپ کو عارفہ بہن سے ہی پوچھنا پڑے گا۔''

''ہوں۔'' میری بات پر انہوں نے ایک ہنکاری بھری۔ ''امریکا تو میں دو چار روز میں روانہ ہو ہی جاؤں گا۔ کسی مناسب موقع پر عارفہ بیٹی سے بات کروں گا لیکن پہلے میں اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

''شہزی بیٹا! تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ میں ذرا ایک ضروری کام سے نکلوں گا پھر باتیں ہوں گی۔''

میں نے شکریے کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اب ہم تینوں وہاں بیٹھے رہ گئے۔

''اوخیر۔'' اول خیر نے ہولے سے کہا۔ ''شہزی کاکے! یہ تمہارے باباجی تو پکے بوڑھے شیر ہیں۔ نئے کاروبار کی سرمایہ کاری سن کے ان کی بوڑھی مگر شیر جیسی آنکھوں میں بڑی شکارانہ چمک ابھر آئی ہے۔ پر مجھے تو اس میں خطرہ ہی لگتا ہے۔ اے وڈے پینڈے والا کام لگتا ہے۔'' میں اس کی بات پر ہولے سے بے تاثر انداز میں مسکرایا۔ یہ حقیقت تھی اور خطرہ بھی کوئی معمولی نوعیت کا نہ تھا۔ اس کی خطرناکی کو صرف میں ہی جانتا اور سمجھتا تھا۔ اگر تو یہ وہی انٹرنیشنل گینگسٹر تھا تو لولوش ہشت پاؤدن کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اسے بیک وقت کئی لوگوں کی نہیں بلکہ کئی اہم خفیہ اداروں کی بھی سپورٹ حاصل تھی۔ جو اپنے اپنے مفادات کے لیے اسے استعمال کررہے تھے۔ مگر کاٹھ کا الو لولوش بھی نہ تھا۔ یہ مشترکہ مفادات کا کھیل تھا۔ لولوش اپنی سپورٹ چاردانگ عالم براعظم پھیلا رہا تھا۔ سرمد بابا اسے یقیناً معمولی آدمی سمجھ رہے تھے یا صرف ایک امریکی بزنس مین...... مجھے اب سرمد بابا کی طرف سے سخت تشویش ہونے لگی۔ میں سردست خاموش رہنا چاہتا تھا۔ پہلے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟

مگر میرے نزدیک توجہ طلب دو باتیں ہیں۔ اس سارے گھن چکر میں...... سیٹھ نوید سانچے والا کہاں فٹ ہوتا تھا؟ جو لولوش کا بظاہر نمائندہ بن کر آیا تھا اور پھر عارفہ یہاں کس خانے میں فٹ ہوتی تھی۔ تجسس آمیز کئی سوالات میرے دل و دماغ میں گردش کررہے تھے۔ بہرطور...... ہمیں ابھی اہم ترین مہم پہ نکلنا تھا۔ شکیلہ کو ابھی ہم نے کچھ

نہیں بتایا تھا اور اسے وہیں رہنے کا کہہ کر میں اور اول خیر دیسی ملبوسات سے اپنا تھوڑا بہت حلیہ بدل کے سرمد بابا کی کوٹھی سے روانہ ہوگئے۔

اس بار ہم سرمد بابا کی رہائش گاہ سے ایک کار میں سوار ہوکر نکلے تھے۔ مجبوراً ہمیں اس بار ذاتی سواری کی ضرورت پڑی تھی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ملتان سے ساہیوال 84 کلومیٹر تھا۔ نان اسٹاپ تیز رفتار ڈرائیونگ سے یہ کم وبیش گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔

وزیر جان کی عالی شان ذاتی رہائش ''کنال لاج'' مین سٹی میں تھی اور وہ شہر کا خاصا امیر ترین اور پوش علاقہ کہلاتا تھا۔ وہاں سے ہائی وے سے نواح میں تقریباً پندرہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر اسپیکٹرم کے اسٹیشن چیف یعنی وزیر خان کا خفیہ ٹھکانا اسٹیشن فور تھا۔ وزیر جان کے ان دونوں ٹھکانوں پر میں قدم رکھ چکا تھا۔ کنال لاج میں کبیل دادا کے ساتھ اور اسٹیشن فور میں ثریا کے ساتھ۔ زیرو ہاؤس...... جو اسپیکٹرم کا بیس کوارٹر کہلاتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کی میرے دل میں تمنا شدت سے موجود تھی۔

اس وقت مجھے بیک وقت کئی مشن درپیش تھے۔ وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا اور اپنے بارے میں پوری صراحت کے ساتھ ماضی سے متعلق تفاصیل جاننا...... اس کے بعد ثریا کا سراغ لگانا۔ سیٹھ نوید سانچے والا...... نے بھی ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیا تھا جس کی بھیانک خطرناکی سے بہرحال سرمد بابا آگاہ نہ تھے اور مجھے لگ رہا تھا، اب سرمد بابا کا گھرانا بھی کسی لمبے ہولناک چکر میں پھنسنے والا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ تشویش اس بات کی ہورہی تھی، جس نے مجھے خاصا پریشان کرڈالا تھا۔ اب تک میں نے حتی الوسع یہی کوشش کی تھی کہ ان سارے چکروں سے سرمد بابا کو دور ہی رکھوں مگر میرے دیدہ ونادیدہ دشمن ہشت پا کی طرح میرے بھی خوابوں تک بھی پھیلتے جارہے تھے۔ مجھے خاموش اور پریشان دیکھ کر اول خیر مخصوص لہجے میں بولا۔

''اوخیر...... کاکا! کیا بات ہے، تجھے ایک عجیب سی چپ لگ گئی ہے؟''

کار بھی وہی ڈرائیو کررہا تھا۔ میں اس کی برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں نے ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری خارج کرکے کہا۔ ''ہاں یار! اول خیر...... بات کچھ ایسی ہی ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے میرے گرد مسائل اور مشکلات کے دائرے بنتے ہی چلے جارہے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک بھنور ہے جس کے اندر میں دھنستا ہی چلا جارہا ہوں۔ جیسے نہ ختم ہونے والا ایک سلسلۂ لامتناہی ہے۔''

''اوخیر...... کاکا۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں جی دارانہ حوصلہ افزائی سے بولا۔ ''یاد رکھنا کاکا! جو جتنے بڑے میدان کا شہسوار ہوتا اس پر آزمائشیں بھی اتنی ہی آن پڑتی ہیں۔ یہ قدرت کا اصول ہے لیکن قدرت کے اصول کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ انسان کو نوازتا تو اس کی اوقات سے بڑھ کر ہے مگر تکلیفیں اس کی سکت سے کم دیتا ہے۔ پریشان نہ ہو میرے یار! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ لینے دے تقدیر کو ہم سے کام...... کب تک لے گی۔ ہمت ہارنا تو نہ تو نے سیکھا ہے نہ میں نے۔''

اول خیر کی بات پر بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرگئی۔ اس کی باتوں میں، اس کے لہجے میں اور سب سے بڑی بات اس کی سنگت یاری میں جانے کیسا سحر تھا کہ آپوں آپ میرا دل بڑا ہونے لگتا تھا۔ حوصلوں کے بادبان بلند ہونے لگتے تھے۔ میں نے اسے سرمد بابا سے متعلق اپنی اصل فکر اور تشویش کی بات بتادی۔ جسے سن کر ایک لمحے کو اول خیر جیسا نڈر اور باحوصلہ انسان بھی دم بخود سا رہ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

''اوخیر...... کاکا! اگر یہ بات ہے تو پھر واقعی میں ایک لما پواڑا (بڑا مسئلہ) پڑتے دیکھ رہا ہوں۔'' مگر پھر دوسرے ہی لمحے مشورے دینے کے انداز میں بولا۔ ''اگر یہ لولوش والی بلا وہی ثابت ہوئی تو تجھے سرمد بابا کو سمجھانا ہوگا کہ وہ اس معاملے یعنی اس سودے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ مجھے یقین ہے لولوش کی حقیقت جان لینے کے بعد بابا تیری بات رد نہیں کریں گے۔''

''ہاں۔'' میں نے دھیرے سے سر کو اثباتی جنبش دی اور آگے بولا۔ ''مگر ایک بات اور بھی ہے اول خیر۔''

''وہ کون سی؟'' اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں کار کی ونڈ اسکرین سے ہٹا کر میرے چہرے پر ڈالی تھیں۔

ہم ملتان روڈ پر سفر کررہے تھے اور کافی آگے نکل آئے تھے، میں نے اول خیر سے کہا۔ ''یار! سچی بات بتاؤں، مجھے تو سرمد بابا کی بہو...... عارفہ کی بھی شخصیت مشکوک محسوس ہونے لگی ہے۔'' میری بات پر یقیناً اول خیر کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس کے کہنے کا انداز اس بات کا غماز تھا وہ بولا۔ ''اوخیر...... کیا مطلب کاکے؟ کیا پھر کوئی نوا پواڑا......؟'' اس کے انداز پر بے اختیار میں ہنس دیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے کھنڈی ہوئی متانت سے بولا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ عارفہ، سرمد بابا کی سادہ مزاجی اور محبت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور بابا کی جذباتی کمزوری بن کر اپنا مطلب نکال رہی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں کاکا؟" اول خیر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اول خیر! سرمد بابا دنیا کے سامنے سیٹھ منظور وڑائچ ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ درحقیقت وہ اب بھی سرمد بابا ہیں لیکن بدقسمتی سے سرمد بابا کو اس تلخ حقیقت کا اندازہ نہیں۔"

"او خیر...... کاکے! تو کیا کہنا چاہتا ہے؟" اول خیر اب بھی نہیں سمجھا تھا۔ حالانکہ سرمد بابا اور سیٹھ نوید سانچے والا کی گفتگو وہ بھی سن رہا تھا۔ ممکن تھا اس کی توجہ نہ ہو۔

"اول خیر! اب بھی سب کچھ عارفہ نے اپنے ہی نام رکھا ہوا ہے۔ کاروبار...... سے متعلق معاملات، کوٹھی، جائداد اور بینک بیلنس...... حالانکہ یہ سب ابتدا سے ہی سرمد بابا کا ہی تھا۔" میں نے اول خیر کو ایک بار پھر سرمد بابا کے ماضی سے متعلق اپ ڈیٹ بھی کر دیا۔

"ان سب باتوں کا اندازہ مجھے سیٹھ نوید سانچے والا کی باتیں سن کر ہوا تھا۔ اب مجھے ڈر لگتا ہے، مطلب نکل جانے یعنی عارفہ کی صحت یاب واپسی کے بعد کہیں بے چارے سرمد بابا ایک بار پھر عضوِ معطل کی طرح کسی کونے میں نہ پھینک دیے جائیں، میں نے بھی اس وقت تہیہ کر لیا کہ اگر دوبارہ ایسا ہوا تو میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ کیونکہ سرمد بابا نے مجھے اپنا بیٹا کہا ہے۔" اول خیر نے میری بات پر تائیداً اپنا سر ہلایا تھا۔

باقی سفر خاموشی سے تمام ہوا۔ ساہیوال پہنچ کر میں نے اپنی کار کا رخ اس پوش علاقے کی طرف کر دیا تھا جدھر کنال لاج نامی کوٹھی واقع تھی۔ وہاں مجھے سناٹے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ کار تھوڑی دور کھڑی کرنے کے بعد میں نے اول خیر کو کار میں محدود رہنے کا کہہ کر خود مٹرگشت کے انداز میں چلتا ہوا کنال لاج کے قریب آ کر اس کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے تھوڑا بہت اپنا حلیہ بدل رکھا تھا کہ فوری طور پر پہچان نہ لیا جاؤں۔ مجھے یہاں وزیر جان کی موجودگی کا کچھ زیادہ وثوق نہیں تھا۔ کیونکہ بقول ثریا کے وزیر جان کے اسٹیشن چیف بن جانے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت اب اسٹیشن فور والے بنگلے میں گزرتا تھا جو درحقیقت اسپیکٹرم کا ذیلی ٹھکانا بھی تھا۔ وزیر جان کے علم میں یقیناً یہ بات تھی کہ میں اس کی یہ کنال لاج والی کوٹھی دیکھ چکا ہوں۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں اب بھی یہی مغالطہ ہو کہ مجھے اس کے اسٹیشن فور والے ٹھکانے کا علم نہ ہو۔ تاہم وثوق سے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

بادی النظر میں کوٹھی میں "آبادی" کے وہ آثار محسوس نہیں ہوئے جس کی محتاط توقع لے کر میں یہاں آیا تھا۔ میں واپس پلٹا اور کار میں آن بیٹھا۔ اس بار کار کا اسٹیئرنگ اول خیر نے سنبھال لیا تھا۔ میرے اشارے پر اس نے کار آگے بڑھا دی۔ ہائی وے پر آتے ہی کار ایک بار پھر فراٹے بھرنے لگی۔ اسٹیشن فور والے بنگلے کا محل وقوع اور وہاں تک جانے والا راستہ مجھے ازبر تھا۔ پندرہ بیس کلومیٹر بعد میں نے اول خیر کو کار سڑک کے دائیں جانب موڑنے کا اشارہ کیا۔ ساہیوال کے نواح میں بھی اچھی خاصی آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔ یہ بھی گنجان آباد علاقہ نظر آتا تھا جبکہ اسٹیشن فور کی عمارت یہاں سے قدرے مضافات میں نسبتاً الگ تھلگ مقام پر تھی، اگرچہ وہاں بھی پختہ و نیم پختہ مکانات اور گھر نظر آ رہے تھے، اسٹیشن فور سے پہلے ہم نے کار دانستہ طور پر ایک قریبی آٹو کار مکینک کی گیراج میں لے جا کر روک دی اور مستری کو اس کی معمول کی ٹیوننگ وغیرہ میں مصروف کر دیا۔ اس کے بعد میں اور اول خیر پیدل ہی آگے بڑھ گئے۔ دن کا ایک بج چکا تھا۔

اب مذکورہ عمارت ہم سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ میں دوسری بار یہاں آیا تھا۔ اب مجھے یہاں ایک بورڈ لگا نظر آیا، دو چھوٹے بڑے سائز کی گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دیں۔ ایک دو آدمی بھی دکھائی دیے، یہاں سڑک نما پختہ راستہ تھا۔ کنارے عمارت کے گیٹ کے باہر...... دو آہنی اینگل نصب کر کے وہ سفید اور سبز رنگ کا بورڈ لگا نظر آ رہا تھا جس پر گول دائرے کی صورت میں مونوگرام بھی نظر آ رہا تھا۔ بادی النظر میں اب اس عمارت پر کسی ادارے یا سرکاری عمارت کے دفتر کا ہی گمان ہوتا تھا۔ گویا ان چند دنوں میں اسپیکٹرم کی اس عمارت "اسٹیشن فور" کو مختلف ناموں سے تحفظات دے دیے تھے۔ کسی مشہور بین الاقوامی این جی او کا نام استعمال کیا گیا تھا۔ جسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی اور نہ جانے کتنے ترقی یافتہ ممالک کے نام بھی درج تھے جو انسانی خدمت کی بھلائی کے نام پر اسے سپورٹ کر رہے تھے۔ یونہی عام راہ گیروں کی طرح قریب سے گزرتے ہوئے میں نے یہ سب غور سے "ملاحظہ" کیا تھا اور اندر ہی اندر غصے سے دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ وزیر جان کا نام بھی...... سپورٹ آفیسر کے طور پر

درج تھا۔ جس فلاحی تنظیم کا نام مونوگرام کی صورت درج تھا، اسے پڑھ کر میں یکلخت مبہوت ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ نام ''اطفال گھر'' تھا۔

میں اس نام کو دیکھ کر ادھر ہی جامد ہو کے رہ گیا۔ یہ تو اول خیر تھا جس نے بازو سے پکڑ کر مجھے آگے بڑھا دیا۔

''اوخیر، کاکے! ادھر رکنا نہیں ہے۔ آگے چل۔'' ہم کافی آگے چلے گئے اور پھر رک گئے۔

میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اطفال گھر اب بھی ان مردودوں کے حوالے تھا اور یہ اس ادارے کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے یا عین ممکن ہے اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالے ہوئے تھے۔ اطفال گھر میرے بچپن اور میرے ماضی کی پہچان تھی اور میں کسی صورت میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ چودھری ممتاز خان یا زبیر جان جیسے سماجی درندوں اور ملک دشمن عناصر اس کے روحِ رواں بنیں۔

مجھے ساری کہانی سمجھ میں آرہی تھی، رفتہ رفتہ سہی..... لیکن اس دوران اول خیر نے مجھے ٹوکا۔

''شہزی کاکے! کدھر کھو گیا تو؟''

''اول خیر! مجھے یہ لمبی کھیڈ معلوم ہوتی ہے۔ اطفال گھر پر ان لوگوں نے پوری طرح اپنا قبضہ جمالیا ہے۔''

''یہ تو ہے کاکے! وزیر جان بھی لوگوں کی نظروں میں ایک مشہور صنعت کار اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں خود کو ایک سماجی کارکن کے طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کررہا ہے۔''

''کچھ بھی ہو اول خیر! میں اطفال گھر جیسے ادارے میں ان خبیث شیطانوں کا تسلط ہوتا کبھی نہیں دیکھ سکتا۔'' میں نے غیظِ جوش سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا تو اول خیر آہستگی سے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''اوخیر، کاکے! ذرا ہولا رہ۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''آہستہ آہستہ نہیں اول خیر، یہ کام فوراً ہونے کا متقاضی ہے۔'' میں مضبوط اور جمے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نہ جانے وہاں یہ معصوم بچوں کے ساتھ کون سا نیا گل کھلا رہے ہوں، پتا نہیں۔ وہاں ممتاز خان جیسے درندوں کے کسی گگل خان جیسے کارپرداز سے کوئی دوسرا شہزی نبرد آزما ہو، نہیں اول خیر نہیں۔ مجھے اطفال گھر کو دیکھنا ہے۔ وہاں کے حالات کی آگاہی حاصل کرنا مجھ پر اب ویسے بھی فرض سے بڑھ کر ایک قرض ہے۔''

''اوخیر، کاکے! لگتا ہے کہ ایک نئی پسوڑی پڑنے والی ہے۔''

''یہ پسوڑی نہیں ہے اول خیر! اطفال گھر میرا اپنا گھر ہے۔ یہ میرا اپنا خاندان ہے۔ میں بہت بے چین ہوگیا ہوں اول خیر! میں ہر صورت میں ان لوگوں کا وہاں سے قبضہ ختم کروں گا۔ ورنہ مجھے ساری زندگی چین نصیب نہیں ہوگا۔''

میں جوشِ غیظ تلے بولے جارہا تھا اور میرے سینے میں ایک دھواں سا بھر رہا تھا۔ میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ گگل خان کے خاتمے اور چودھری ممتاز خان کو ایک بڑی زک پہنچانے کے بعد ان لوگوں کا اطفال گھر سے قبضہ ختم ہو چکا ہوگا۔ مگر آج یہ میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے یاد تھا اس سلسلے میں سرمد بابا نے بھی مجھے تسلی تو دی تھی کہ وہ بذاتِ خود اطفال گھر کا نظام سنبھالنے والے تھے، پھر بدقسمتی سے نہ مجھے ان سے اس بارے میں کچھ پوچھنے کا موقع مل سکا، نہ ہی وہ مجھے اب تک کچھ بتا پائے تھے، کیونکہ انہی دنوں ایک طرف میں پولیس وغیرہ کے چکروں میں الجھا ہوا تھا تو دوسری طرف عارفہ اپنی بیماری کے سلسلے میں امریکا روانگی کی تیاریوں میں تھی اور سرمد بابا عارفہ اور عابدہ کی روانگی وغیرہ کے سلسلے میں مصروفِ کار رہے تھے۔

ہم تھوڑا آگے جا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں کچھ نئے اور زیرِ تعمیر رہائشی پروجیکٹ کے ''ڈھانچے'' ایستادہ تھے۔ میں نے اول خیر سے کہا۔ ''یہ وزیر جان تو یہاں اس عمارت میں باقاعدہ ایک دفتر بنا کر فروکش ہوگیا ہے تو کیا اس سے پہلے عام آدمی کے طور پر ملاقات کی جائے یا پھر دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے؟'' میری بات پر وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''اوخیر، کاکے! آج پہلی بار تو مجھ سے مشورہ مانگ رہا ہے ورنہ تو تو ہر پھڈے میں خود ہی ٹانگ اڑا لیتا ہے اور پھر میں بھی تیرے ساتھ چل سو چل۔'' اس کے شرارت بھرے انداز پر میں بے اختیار ہنس دیا پھر سنجیدہ ہو کے بولا۔

''نہیں یار! ایسی بات نہیں۔ کیونکہ مجھے تم پر بھروسا بھی ہے، تم کبھی مجھے کوئی غلط مشورہ نہیں دو گے۔''

''اوخیر، کاکے! تو تو جذباتی ہو گیا۔ میں نے تو تیرے ساتھ مخول (مذاق) کیا تھا۔ خیر، اب سن میری بات۔ تو نہ صرف ان لوگوں کی نظروں میں آچکا ہے بلکہ انہیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ تو ان کی اصلیت سے اچھی طرح آگاہ ہے۔

# کیا آپ

## لبوب مقوی اعصاب

## کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

**المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)**

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

**0300-6526061**

**0301-6690383**

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں


کیونکہ ثریا پر سب سے پہلے وزیر جان کو ہی شبہ ہوا تھا۔ بقول تیرے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر جان بہت شاطر آدمی ہے۔ وہ ہم پر قابو پانے کی کوشش کرے گا ہمیں دیکھتے ہی۔ میرا خیال ہے یہ باہر جو بورڈ وغیرہ نظر آرہا ہے یہ بھی لوگوں کو دھوکے میں رکھنے کے لیے ہوگا۔ اندر کوئی دفتر وغیرہ نہ ہوگا یوں بھی آج کل بنگلوں میں دفتر لگانے کا عام رواج ہے۔ ہمیں نقب لگا کر اندر داخل ہونا چاہیے۔“

”ہوں، میں تیار ہوں پھر۔“ میں نے ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر پلٹے۔

دفتر یعنی اسٹیشن فور کی عمارت کے باہر ذرا بھی کسی قسم کی آوک جاوک...... یعنی آمدورفت نظر نہیں آتی تھی۔ گویا یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ یا تو انتہائی رازداری کے ساتھ یا پردے کے پیچھے ہو رہا تھا۔

اس بار ہم نے عقبی راستہ اختیار کیا تھا۔ ابھی ہم اس راستے پر ہی تھے کہ اچانک ٹھٹک کر رکے۔ ایک گاڑی کی آواز عقب سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ہم دونوں ہی بیک وقت مڑ کر پلٹے، وہ ایک مزدا ٹرک تھا۔ یہ چھوٹے سائز کا ٹرک تھا جو عام گھریلو سامان وغیرہ اٹھانے میں مستعمل ہوتا تھا۔ ہم ایک طرف کو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمارے قریب سے گزر گیا۔ اس کے اوپر فرنیچر لدا ہوا تھا۔ یہ عام دفتری فرنیچر تھا۔ جو آفس ٹیبلو اور چیئرز پر مشتمل تھا۔ ٹرک نے موڑ کاٹا اور عمارت کے داخلی گیٹ کی طرف گھوم گیا۔ میرا سو فیصد خیال تھا کہ اس ٹرک کا فرنیچر اس عمارت کے لیے ہی لایا گیا ہوگا۔ کچھ سوچ کر ہم نے ارادہ بدلا اور اس طرف مڑ گئے۔ دیکھا تو وہ ٹرک گیٹ کے سامنے رکا ہوا تھا۔ اور اس میں سے کرسیاں، میزیں اتاری جارہی تھیں۔ میرے ذہن نے قلابازی کھائی اور میں نے اول خیر سے کہا۔ ”آؤ، ادھر ہی سے اندر چلتے ہیں۔“

”او خیر...... سمجھ گیا۔“ اول خیر ہولے سے بڑبڑایا۔

عمارت کے اندر سے ایک موٹا آدمی برآمد ہوا اور اس کے ساتھ ایک جوان شخص بھی تھا، موٹا پختہ العمر تھا۔ یہ فرنیچر کا سرسری جائزہ لے رہے تھے، ہم دونوں قریب آگئے، دونوں نے ہم پر اچٹتی سی نظر ڈالی تھی، میں نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ دونوں ٹرک کے کسی منشی ٹائپ آدمی سے باتیں کرنے میں محو تھے، میں اور اول خیر عام ملاقاتیوں کے انداز میں عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ مجھے یقین تھا، اسٹیشن فور میں وزیر جان نے جس طرح کا بہروپ بدلا ہوا تھا، وہ یہاں کسی قسم کی گرما گرمی کے موڈ

میں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ادارے کی شکل میں یہاں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور دھماچوکڑی اسے یہاں عام مقامی لوگوں کی نگاہ میں مشکوک بنا سکتی تھی۔

بہروپ بازی میں جہاں بہت سے فائدے ہوتے ہیں وہاں ایک اس کمزوری کو مصلحتاً برداشت کرنا پڑتا ہے اور میرے ذہن رسا میں اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا خیال ابھرا تھا۔ یوں میں اور اول خیر ویسی ساختہ بھیس بدلے ہوئے تھے بادی النظر میں ہمیں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا جب تک قریب بیٹھ کر کسی سے محوِ کلام نہ ہوتے۔

اندر داخلی دروازے پر بھی ایک چپراسی ٹائپ شخص ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ ''وزیر صاحب سے ملنا ہے۔''

''اندر آفس سپرنٹنڈنٹ اسلم صاحب سے مل لو پہلے۔'' چپراسی نے کہا اور آگے بڑھ کر جالی دار شٹر کھول دیا۔ میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔ بلاشبہ ہم نے ایک خطرناک جگہ پر قدم رکھ دیا تھا مگر ہم اپنے گردوپیش سے محتاط بھی تھے، کچھ لگتا ایسا ہی تھا کہ یہاں موجود ''اسٹاف'' کے لوگوں میں زیادہ تر عام لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ ان میں دو چار ''خاص'' لوگوں کی موجودگی بھی ممکن ہو سکتی تھی، ہال کمرے میں سات آٹھ افراد اپنی میزوں پر جھکے کام میں مصروف نظر آئے۔ پورا دفتری ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ یہاں میزوں پر کمپیوٹر، پرنٹرز وغیرہ بھی موجود تھے۔ کچھ آپس میں باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ اپنی میز اور کرسی کے غیر معمولی سائز اور الگ تھلگ جگہ پر موجود آفس سپرنٹنڈنٹ اسلم کو پہچاننے میں مجھے چنداں دیر نہ لگی۔ ہم نے اسی کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اس کے برابر میں ایک بڑے سے کمرے کا دروازہ نظر آرہا تھا، جس کی پیشانی پر وزیر جان بریکٹ میں ''سپورٹ آفیسر'' کا نام مجھے نظر آیا تھا۔ اسلم ایک پختہ العمر شخص تھا۔ رنگ گورا تھا۔ پیشانی کی طرف سے بال چٹ تھے، جو باقی تھے وہ بہت پیچھے جاکر کچھ کرلی ہو گئے تھے۔ ہماری طرف اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میں نے وزیر جان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مذکورہ آفس روم کا دروازہ کھلا اور دو افراد برآمد ہوئے۔ دونوں میرے لیے اجنبی تھے۔ اسلم نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہم سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

''آپ کس سلسلے میں صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''اطفال گھر میں موجود ایک بچّے کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔'' اس بار اول خیر نے کہا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسلم نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود کمرے میں چلا گیا۔

''شکار اندر موجود ہے کاکے۔'' اول خیر نے میرے کان کے قریب سرسراتی سرگوشی کی۔ خود جوش اور عجیب و غریب احساسات و کیفیات کے مارے میری حالت دگرگوں سی ہو رہی تھی، وزیر جان نے یا یوں کہا جائے کہ اسپیکٹرم نے بڑا شاندار بہروپ بدلا تھا۔ یہاں موجود سب بظاہر عام سے ملازم ٹائپ لوگ ہی نظر آرہے تھے۔ ممکن تھا ان میں ان کا کوئی گھاگ تربیت یافتہ ایجنٹ بھی موجود ہو جو آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد اسلم برآمد ہوا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی اندر ہی تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سب سے پہلے میں نے اندر قدم رکھا تھا۔ آفس بلاشبہ بڑے شاہانہ طرز کا تھا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے گھومنے والی سیاہ کرسی پر وزیر جان براجمان تھا۔ اول خیر بھی اندر آگیا پھر میں نے وزیر جان کو گمبھیر آواز میں کہتے سنا۔

''اسلم صاحب! آپ باہر جاؤ۔'' وہ باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوگیا۔ اندر کا ماحول مجھے دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔ کچھ خبر نہ تھی، وزیر جان مجھے پہچانا بھی تھا یانہیں...... مگر دوسرے ہی لمحے جیسے میری تھکی ہوئی سماعتوں میں سنسنی گونج گئی جب وزیر جان نے عجیب سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹھ جاؤ شہزی اور اپنے ساتھی کو بھی بٹھادو۔''

اول خیر کو بھی یقیناً اس بات پر جھٹکا لگا تھا کہ وزیر جان ہمیں بہرحال پہچان چکا تھا۔ وزیر جان نے بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بہت مطمئن اور پُرسکون نظر آرہا تھا مگر اس کے عمر رسیدہ سے چہرے پر جیسے بڑی خطرناکی تھی جو میری بھانپتی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ میں نے کچھ زیادہ چونکنے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اس کی بات پر کیونکہ میں اس کی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ کیا ''شے'' ہے۔

''اوہ...... تو تم مجھے پہچان گئے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ اول خیر بھی میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ یہ آرم چیئر تھی۔ جس کی ہتھی پر بازو رکھتے ہی یکلخت ایک کلک کی آواز ابھری اور دوسرے ہی لمحے میرے پورے وجود میں سنسنی

کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اور اول خیر..... بڑے آرام سے کسی چوہے دان میں پھنس گئے ہوں کیونکہ کرسیوں کی دونوں ہتھیوں میں لگے دو خفیہ آہنی کلپس نے ہماری دونوں کلائیوں کو زن سے بند کر دیا تھا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے خونخوار نظروں سے وزیر جان کو گھورا۔ اس نے بڑے آرام سے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کسی کو اندر آنے سے منع کرنے کی ہدایت جاری کی۔ اس کے بعد اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ سارے سسٹم کے بٹن اس کی چیئر یا میز کے نیچے چھپے کسی خفیہ پینل سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دفعتاً ایک جھماکا ہوا اور وزیر جان کی عقبی دیوار جس پر بڑی سی کوئی پینٹنگ نصب تھی، ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ ایک طرف کو سرک گئی اور اب وہاں ایک بڑی سی اسکرین روشن ہو گئی۔ میری اور اول خیر کی نظریں وزیر جان کے چہرے سے ہٹ کر اس کے عقب میں اٹھ گئیں اور مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اسکرین پر میری اور اول خیر کی مانیٹرنگ کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ جب ہم دونوں تھوڑی دیر پہلے اسٹیشن فور کی عمارت کے سامنے سے گزر رہے تھے، پھر دوبارہ عقب میں جا کر لوٹتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ منظر Still ہو گیا۔ ہم دونوں کے چہرے فوکس ہوئے، چھ خانوں کا ایک مربع گراف ہمارے چہروں پر فوکس ہوا، اور اس نے ہمارے اصل چہرے واضح کر دیے۔ وزیر جان کی نظریں ہم دونوں کے چہروں پر جمی رہیں۔ اسکرین آف ہو گئی، پھر اس پر دوبارہ پہلی والی دیوار سرک آئی جس پر عام سی پینٹنگ آویزاں تھی۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے اپنی طاقت اور ہوشیاری کا ایک ٹیکنیکل مظاہرہ کیا تھا۔ گویا وہ آرام سے اسٹیشن فور کی عمارت کے اندر بیٹھا عمارت کے اطراف کی مانیٹرنگ کرتا رہتا تھا۔

''ہاں، اب کہو...... یہاں کیا لینے آئے تھے؟'' اس نے گمبھیر مگر سرسراتے لہجے میں کہا۔ میں نے اپنے غیظ و غضب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اس ماحول میں کیسے گفتگو کی جا سکتی ہے؟'' میرا اشارہ اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کے جکڑ بندوں کی طرف تھا۔ میری بات سن کر وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ اس وقت مجھے اس کا بھاری چربیلا چہرہ بہت مکروہ محسوس ہوا۔ وہ کسی طور بھی ساٹھ سے کم کا نہ تھا مگر عمر رسیدگی میں بھی اس نے اپنی صحت سنبھالے رکھی تھی۔ اس میں یقیناً خوش حال زندگی کی آرام طلبی کا بھی دخل رہا ہوگا جبکہ میں نے اپنے بچپن میں اسے ایک جوان مرد کی شکل میں ہی دیکھا تھا۔ ایک تنگ و تاریک اور عسرت زدہ ماحول میں..... مگر اس کا چہرہ میں بھلا نہیں پایا تھا آج تک اور بھلاتا بھی کیونکر.....

''وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کی بات کرو تو زیادہ بہتر ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں اس پر نظریں جمائے ہوئے بولا.......... ''تم سے اپنی زندگی کا اہم ترین سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ..... تم کون ہو؟ اور میرے کیا لگتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے فوراً سرد مہری سے کہا۔

''اس کا مجھے اندازہ اسی دن ہو چکا ہے جب ہماری پہلی ملاقات ''کنال لاج'' میں ہوئی تھی۔'' میں نے اپنے سینے کے اٹھتے غبار پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم نے میری موت کا پروانہ جاری کیا تھا۔''

''وہ تو میں اب بھی کروں گا۔'' اس نے بڑی سفاکی سے کہا اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں مگر میرے سینے سے اٹھتا ازلی دکھ کا غبار میرے دل و دماغ میں ہی نہیں میرے رگ و پے میں بھی رفتہ رفتہ سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ یہ گھڑیاں یہ لمحات میری زندگی کی اہم ساعتوں میں شمار ہو رہے تھیں۔ میری شناخت کے حوالے سے یہ لمحات میری ذہنی اور نفسیاتی تشخص کے لیے شکست و ریخت کا باعث بھی تھے اور میرے تفاخر کا بھی..... یقیناً اس سے وزیر جان بھی بخوبی واقف تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی سفاکانہ دھمکی کو صرف نظر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''یہ وقت بتائے گا، اسے چھوڑو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ اگر میں تمہارا کچھ نہیں لگتا تھا تو پھر وہ سب کیا تھا؟ وہ عورت کون تھی؟ جو میری سوتیلی ماں اور تمہاری محبوب بیوی کہلاتی تھی اور تم میرے باپ..... تم یقیناً اسی کے کہنے پر ہی مجھے اطفال گھر جیسے ادارے میں میری انگلی پکڑ کر لائے تھے، مجھے یہ بہلاوا دے کر کہ تم مجھے باہر سیر کرانے لے جا رہے ہو۔ پر وہاں مجھے چھوڑ کر تمہارا موٹے موٹے آنسوؤں کے ساتھ رونا...... وہ سب کیا ڈراما تھا۔ اگر تم میرے لیے کچھ حیثیت نہیں رکھتے تو پھر میرے اصل ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟'' یہ سب کہتے ہوئے میرے لہجے میں رقت اترنے لگی۔ لفظوں میں تھرتھراہٹ لرزنے لگی۔ مگر میں اپنی اعصابی قوت کی بھرپور کوشش سے خود کو سنبھالے ہوئے رکھنے کی بھی سعی کر رہا تھا۔ میری بات پر

وزیر جان نے اونچی پشت گاہ والی دبیز چیئر سے اپنی پشت لگادی اور بڑے غور سے میرا چہرہ تکتا رہا پھر بولا۔ ''لڑکے! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اپنی ذات کے بارے میں اس قدر حساس نکلو گے اور نہ ہی مجھے تمہارے سینے کی اس تڑپ کا پتا تھا کہ تم اپنی شناخت کے معاملے میں کتنے ''کچی'' ہو۔''

''ہر خوددار اور باغیرت انسان یہ ضرور جاننا چاہتا ہوگا کہ وہ کس باپ کی اولاد ہے۔ وہ کس نسل سے ہے۔ پھر میرا معاملہ تو ویسے بھی اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے ماں باپ اس دنیا میں بھی ہیں کہ نہیں۔''

میں نے کہا۔ وزیر جان اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوگیا۔ میں نے گردن موڑ کر اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی مجھ سے نظریں چار کیں اور پھر جیسے اس کی نظروں نے میرے چہرے اور میری آنکھوں سے جھلکتی غم و اندوہ اور کرب آمیز جوش جھلاہٹ بھانپ لی۔ اسے ادراک ہوا تھا فوراً کہ میں اس وقت کس قیامت خیز ذہنی ہیجان اور نفسیاتی وجدان کی ملی جلی اور متضاد کیفیات سے گزر رہا ہوں۔

''حوصلہ رکھ کاکا۔'' مجھے اس کی ہولے سے مخصوص آواز سنائی دی اور اسی وقت میں وزیر جان کی آواز پر متوجہ ہوگیا۔

''لڑکے! اس بات کا تو اطمینان رکھ کے تو میرا بیٹا نہیں ہے اور نہ ہی میرا تجھ سے ایسا کوئی نسبی یا خونی رشتہ ہے۔''

''یہ بات میرے لیے بھی باعث طمانیت ہے کہ میں تیرے جیسے انسان کا بیٹا نہیں.... وزیر جان۔'' ایک خوش کن احساس تلے جیسے میرے اندر کا غبار اور لہجے کی رقت پل کے پل صاف ہونے لگی تھی اور میں نے بڑے مستحکم لہجے میں فوراً وزیر جان سے یہ کہا تھا۔ اسے یہ بات بری لگی ہوگی یا نہیں۔ تاہم وہ میری طرف گھوما تو اس کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہاری دلی و ذہنی کیفیات اور کرب کا اچھی طرح اندازہ ہے.... لڑکے اور سب سے اہم بات یہ کہ کئی سال پہلے میں بھی یہی سمجھے ہوئے تھا کہ تم میری اولاد ہو.... جب تم چھوٹے تھے، بہت چھوٹے اور میں نے تمہیں اطفال گھر لے جا کر پھینک دیا تھا، بعد میں اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ تم میری اولاد نہیں ہو اور پھر میں نے اطفال گھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔''

میرے دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ میں نے بھی پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے ظاہر ہوا کہ تم ایک عورت کی خاطر اپنی سگی اولاد کو بھی خود سے دور کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔'' میرے جواب نے اس پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا زہریلا چہرہ جیسے یک دم تڑخ سا گیا۔ ایک تلخ سا رنگ اس کے چہرے اور آنکھوں میں لہرا گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ عجیب پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ میرے ذہن نے تیزی سے موجودہ صورتِ حال پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے دونوں ہاتھ کلائیوں کی طرف سے رسن بستہ تھے۔ میں نے بارہا اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کو جنبش دے کر آہنی کلپس کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی تھی مگر جکڑ بند بہت مضبوط تھے۔

وہ دوبارہ اپنی بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر براجمان ہو گیا پھر میری طرف برمائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''تم کون ہو، کیا ہو، کس کے بیٹے ہو، تمہارا باپ کون ہے اور اس وقت گمنامی کے اندھیروں میں کہاں پڑا سڑ رہا ہے۔ تمہاری ماں کہاں ہے۔ یہ سب جو تمہارے لیے ایک ازلی کرب کا باعث بنے ہوئے ہیں، وہ سب میں اچھی طرح.... بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔''

مجھے اس کی باتوں پر چونکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے تو پہلے ہی یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ یہی وہ واحد شخص ہے جو میرے سینے میں سلگتی چنگاریوں جیسے بھڑکتے سوالوں کے جواب رکھتا ہے مگر اس کی آخری بات پر میں چونکنے پر ضرور مجبور ہوا تھا کہ میرا باپ اس وقت گمنامی کے اندھیروں میں کہاں پڑا سڑ رہا تھا اور ماں کے متعلق بھی اس نے اسی طرح کا اشارہ دیا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

''تو کیا میرے ماں باپ.... دونوں زندہ تھے؟'' ایک اور سوالیہ آنکڑا میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا اور میرے کانوں میں آندھیوں کی شائیں شائیں سی گونجنے لگیں۔ اس کی باتیں سن کر... ایک بار پھر میرا دل و دماغ ازلی کرب تلے گھٹنے لگا تھا۔ تڑپ کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود تفتہ میں سرائیت کر گئی اور پھر جیسے میں ڈھے جانے کی کیفیات سے گزرنے لگا۔

''اگر تم یہ سب جانتے ہو تو مجھ سے چھپانے کا کیا فائدہ؟ میرے ماں باپ اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟''

''کیا یہ تمہاری آخری خواہش ہے؟'' وہ استہزائیہ

اور پُرغرور انداز میں مسکرا کر بولا۔ میں ایسے نازک موقع پر اسے خار دلانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا ہموار لہجے میں بولا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''نہیں۔'' اس نے یک دم ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔''نہیں .... ابھی تمہاری آخری خواہش کے اظہار کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہمیں تم سے بہت کام لینے ہیں۔'' میں اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔

''کیسا کام لینا چاہتے ہو تم مجھ سے؟''

''یہ باتیں یہاں نہیں ہو سکتیں۔'' وہ بولا۔''مجھے افسوس تو اسی بات کا ہے کہ تمہیں ہلاک کرنے کی ابھی میری تمنا تعطل کا ہی شکار رہے گی۔'' اس نے یہ الفاظ آخر میں قدرے دانت پیسنے کے انداز میں کہے تھے۔

''کیا یہ سپیریئر اتھارٹی کا فیصلہ ہے یا ماسٹر اتھارٹیز کا؟'' میں نے طنزیہ کہا۔

''اوہ .... بہت کچھ جانتے ہو تم ہمارے بارے میں۔'' وہ ہونٹ سکیڑ کر بولا۔''یہ سب اس کتیا کا کام ہے۔''

میں چونکا۔ اس نے ''کتیا'' کس کو کہا تھا؟ میں سوچنے لگا اور پھر میرے ذہن کی اسکرین پر ثریا کا نام ابھرا۔

ٹھیک اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میں آن کی آن میں فضا میں معلق ہو گیا ہوں۔ زمین شق ہوئی تھی اور میں اور اول خیر کرسیوں سمیت یک دم جیسے پاتال میں اتر گئے۔ کسی خودکار میکنزم کے تحت پوشیدہ بٹن تک پہلے ہی سے وزیر جان کی رسائی تھی، اس نے اس کا استعمال کیا تھا۔ چند منٹ کی گھٹاٹوپ گہرائی میں اترنے کے بعد ہلکی سی کلک کی آواز سے میری کلائیاں آزاد ہوئیں تب اس کے دوسرے ہی لمحے کرسی نے مجھے الٹ دیا۔ میں منہ کے بل فرش پر آ رہا تھا۔ شکر تھا، فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ بچ گیا مگر اوندھے منہ گرا۔ ہلکی سرسراہٹ ابھری۔ شاید کرسیوں کو دوبارہ اوپر کھینچ لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والا آفس روم کا فرش اب گویا چھت بن گیا تھا اور کرسیاں دوبارہ ایک خودکار میکنزم کے تحت چھت کے شق زدہ روشن ٹکڑے میں غائب ہو گئیں۔ چھت برابر ہو گئی۔

اب ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہ دینے والا معاملہ تھا۔ میرے گرد گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تاریکی کے باعث میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

''اول خیر!'' میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

''او خیر.... کاکے، میں بھی تیرے ساتھ ہوں۔'' اس کی مخصوص آواز ابھری۔ ان حالات میں بھی اس کی جی

داری فزوں تھی۔ مجھے تسلی ہو گئی پھر اچانک ہی روشنی ہو گئی۔ اندھیرے سے یک دم روشنی ہونے پر ایک لمحے کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ جب تک صورتِ دگر دو پیش سمجھ میں آئی، بیک وقت کئی گنیں ہم پر اٹھتی چلی گئیں.... پانچ گن بردار چوکس کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں ہمیں اٹھنے کا حکم دیا۔ یہ تہ خانہ نما آٹھ بائی دس کا کمرا تھا۔ فرنیچر نام کی ہر شے سے عاری۔ میں اور اول خیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے بظاہر سرسری نگاہ سے ان کا جائزہ لیا تھا۔ ان کے انداز و اطوار سے انتہائی مہارت ٹپکتی تھی۔ چوکس ہونے کا انداز بھی ان کی اس قسم کی تربیت کی غمازی کرتا تھا۔ میں اور اول خیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

ہمیں گن پوائنٹ پر وہاں سے ایک دوسرے نسبتاً بڑے ہال کمرے میں لایا گیا۔ یہ آراستہ کمرا تھا۔ فرنیچر بھی بڑا نظر آ رہا تھا۔ دو افراد نے ہمارے ہاتھ پشت کی سمت موڑ کر باندھ دیے۔ انہیں ہمارے سلسلے میں جو حکم ملا تھا وہ یہ پورا کر چکے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان میں سے تین گن بردار ایک دوسرے دروازے سے نکلتے چلے گئے۔ جس نے تحکمانہ درشتی میں ہمیں آگے بڑھنے کا کہا تھا وہ اب اپنے دائیں کان پر ہاتھ لے جا کر مؤدبانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''باس! دونوں روم نمبر تھری میں پہنچا دیے گئے ہیں۔''

میں آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے کان میں چھپاں وہی چپ نما خفیہ ٹرانسمیٹر استعمال کر رہا تھا جو ثریا نے مجھے بھی دیا تھا جو اب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ یقیناً اپنے باس یعنی اسٹیشن چیف وزیر جان سے ہی مخاطب تھا۔ میرے ذہن میں دھکڑ پکڑ جاری تھی۔ وزیر جان سے مجھے کم از کم اتنا تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ میرے ماں باپ زندہ تھے۔ کہاں تھے، یہ وہی جانتا تھا۔ تاہم میرے دل و دماغ کو اس احساس نے جہاں سکون و مسرت بخشی تھی، وہاں یہ خیال مجھے ادھ موا کیے دینے کی حد تک بے چین کیے ہوئے تھا کہ مجھے اپنے ماں باپ کو ہر قیمت پر تلاش کرنا تھا۔ میرا انتقام لوٹنے لگا تھا۔ میری کرچی کرچی شناخت اب دوبارہ مستحکم ہو رہی تھی، دل و دماغ میں شدید تڑپ جاگ پڑی تھی کہ میں اپنے ماں باپ کو تلاش کروں، وہ کہاں تھے، کس حال میں تھے، میں ان کا لختِ جگر تھا۔ یقیناً وہ بھی میری طویل جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ میرے اندر جوش و جذبات کے طوفان امڈنے لگے تھے۔ میں اپنے باپ کے سینے سے لگنا چاہتا تھا پھر اس کی

بوڑھی آنکھوں میں اترتے ایک باپ کے فخر کو دیکھ کر مسرت آگیں گھڑیوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ماں کی گود میں سر رکھنا چاہتا، اس کی میٹھی ممتا کی چھاؤں میں وہ سکون حاصل کرنا چاہتا تھا جس سے میں آج تک محروم تھا۔ ایک پیاس تھی میرے اندر جو اب شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ کئی سوالات میرے اندر کلبلانے لگے تھے، میں اپنے ماں باپ سے کیسے جدا ہوا تھا۔ میری ماں اس مردود شخص وزیر جان کے عقد میں کیسے آئی تھی؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا جب میں چھوٹا تھا تو اپنی سوتیلی ماں کو اپنے باپ (اب نہیں) وزیر جان سے غصے میں یہ کہتے بھی سنا تھا کہ ''شیدے! اسے بتا کیوں نہیں دیتے کہ اس کی ماں مرگئی ہے۔'' وہ سب کیا تھا؟ اور اب .... پھر یہ سب کیا ہے، وزیر جان جو ایک معمولی آدمی تھا۔ شیدے سے وزیر جان کیسے بن گیا۔ ایک معروف صنعت کار دولت مند آسودہ حال آدمی اور اب اسپیکٹرم کا اسٹیشن چیف.... ایک ڈان .... یہ کیا بھید تھا؟ میرے ماضی اور اب حال کے اسرار کی تاریکی میں اور کیا کیا پوشیدہ تھا؟ یہ مجھے جاننا تھا مگر افسوس .... اس نازک موقع پر وزیر جان مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہوچکا تھا اور اب نہ جانے وہ میری اس جذباتی کمزوری کو کس طرح ایک خفیہ اور نامعلوم ڈیل کے نام پر ''کیش'' کرانا چاہتا تھا۔ یہ ابھی مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ ہمیں اس کمرے میں ایک صوفے پر ساتھ ساتھ بٹھا دیا۔ وہ دونوں گن بردار اب بھی چوکس انداز میں کھڑے تھے، وہ مقامی ہی معلوم ہوتے تھے۔

تھوڑی دیر گزری۔ وزیر جان ایک دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس بار اس کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کے صوفے پر براجمان ہوگیا۔ اس کے انداز واطوار سے غرور جھلکتا تھا۔ ضمیر فروشی سے حاصل کردہ اس طاقت کا اسے بڑا گھمنڈ تھا۔

''تم نہیں جانتے لڑکے کہ تم نے چودھری ممتاز خان کی دشمنی میں کن خطرناک لوگوں سے ٹکر لے لی ہے جو تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔'' اس نے موٹے کتھئی رنگ کے سگار کا ایک کش لے کر کھرکھراتے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''مجھے تم لڑکے کے بجائے، شہزی کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو۔'' میں نے اس کے لہجے اور بات کی خطرناکی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے نڈر لہجے میں کہا تو وہ خار کھانے والے انداز میں مجھے گھور کے رہ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

''بہت گھمنڈ ہے خود پر تمہیں نہیں جانتے تم کہ تمہاری جڑیں تک ہمارے قابو میں ہیں جن کی ڈوریاں ہلا کر ہم تمہیں محض ایک کاٹھ کی پتلی بنا سکتے ہیں جو صرف ہمارے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوگی۔''

''یہ وقت بتائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترکی بہ ترکی کہا اور آخر میں اسے یاد دلایا۔

''تم کسی ڈیل شیل کو بات کررہے تھے نا؟''

''یہ ڈیل تم سے سپیریئر اتھارٹی کرے گی۔''

''تو تم صرف ایک مہرے ہو؟''

''یہی سمجھ لو۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ اس بار اس نے اپنے طیش پر حیرت انگیز انداز میں قابو پایا تھا۔

''ڈیل سے پہلے میں اپنے ساتھی اول خیر اور اپنی زندگی کی ضمانت ضرور چاہوں گا۔''

''دیکھا جائے گا۔'' اس نے بے پروانہ انداز میں کہا پھر اپنے صوفے کے عقب میں دائیں بائیں کھڑے حواریوں میں سے ایک کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ اس کے سامنے آکر مؤدبانہ کھڑا ہوگیا۔ وزیر جان اس سے تحکمانہ بولا۔ ''ان دونوں کو روم سیون میں پہنچا دو۔ کڑی نگرانی کرنا، میں زیرو ہاؤس کو مطلع کرچکا ہوں۔ مسٹر آرک خود یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ان دونوں کو ان کے حوالے کر دینا۔''

''یس سر۔'' اس نے مؤدبانہ کہا۔

میں زیرو ہاؤس کے نام پر چونکا۔ یہ نام میرے لیے غیر شناسانہ تھا۔ ثریا کے ذریعے ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ ''زیرو ہاؤس'' درحقیقت ''اسپیکٹرم'' کا ''ہیڈ کوارٹر'' کہلاتا تھا۔ سپیریئر اتھارٹیز اس زیرو ہاؤس میں براجمان تھیں۔ مسٹر آرک کے نام سے بھی مجھے شنوائی تھی۔ ثریا نے مجھ سے مختصر سی ملاقات یا مڈبھیڑ کہہ لیں پر مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا اور میں نے خود بھی اسے مسٹر آرک سے مخاطب ہوتے سنا بھی تھا۔

بہرطور ہمیں وہاں سے ایک تیسرے کمرے میں لایا گیا۔ یہ مختصر ترین اور کسی جیل کی بیرک نما سا کمرا تھا جو میرے اور اول خیر کے سوا ہر شے سے عاری تھا۔

اندر دھکیلنے اور آہنی دروازہ باہر سے لاک کرنے کے بعد.... وہ دونوں گن بردار چلے گئے۔

''او خیر، کاکے! یہاں آکر تو... ایک قصے کا پتا چلا ہے۔'' تنہائی میسر آتے ہی اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''اوئے کاکے! سچ پوچھ تو مجھے بھی یہ جان کر بہت خوشی ہورہی ہے کہ تیرے ماں باپ زندہ ہیں.... کاکے! یقین کر تیرے ماں باپ کا سن کر تو خود میرے اندر بھی عجیب سی

تڑپ جاگ اٹھی ہے۔ شہزی کا کے! ذرا تصور کر جب ہم ان سے ملیں گے اور تو انہیں میرے بارے میں یہ بتائے گا کہ میں تیرا بھائیوں جیسا یار ہوں تو۔۔۔ تو مجھے یقین ہے ماں میرے سر پر بھی ممتا بھرا ہی ہاتھ پھیرے گی اور تیرا باپ۔۔۔۔ مجھے بھی اس طرح ہی محبت اور شفقت سے اپنی چھاتی سے لگالے گا جس طرح تجھے لگائے گا۔ سچی کہتا ہوں کا کے! تیرے ماں پی کا سن کے تو مجھے اپنے ماں پی یاد آگئے۔'' وہ جذبات کی رو میں بولے جارہا تھا اور میں حیرت سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ وہ اس قدر میرے دل کے میرے دماغ کے حتیٰ کہ میری ذات و شخص کے اتنے قریب ہو چکا تھا، اس کا مجھے اب اندازہ ہو رہا تھا۔ خود میری آنکھیں بھی وفورِ جذبات سے آبدیدہ سی ہو گئی تھیں اور میں ہونٹ پر ہونٹ دبائے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرا اور اول خیر کا چہرہ جذبات کی رو سے لرزاں تھا اور پھر اس انداز میں ہی میرے ہونٹوں سے مرتعش سے الفاظ برآمد ہوئے۔

''اول خیر۔۔۔۔ یار، یار تو ٹھیک ہی کہتا مجھ سے کہ او خیر، شہزی کا کے! تیرا میرا واسطہ اور تعلق کچھ وکھرے قسم کا ہو چلا ہے۔ آج مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔''

ہم اگر دونوں رسن بستہ حالت میں نہیں ہوتے تو یقیناً ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو ہی پڑتے۔

''ہاں شہزی کا کے! اللہ کی قسم ہے مجھے۔۔۔۔ تیرے ماں باپ کے زندہ ہونے کا سن کے مجھے بھی پتا نہیں کیوں وہی خوشی ہو رہی ہے جو تیرے سینے میں مچل رہی ہے اس خواہش کے ساتھ کہ ہم ان کا جلد از جلد پتا لگاتے مگر بدقسمتی سے یہ خوشی ملی بھی تو ایسے وقت میں کہ ہم خود دشمن کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔''

''حیرت ہے اول خیر، تو کیا مایوس ہو گیا اتنی جلدی؟'' میں نے کہا۔ ''اللہ پر بھروسا رکھ۔''

وہ ہنسا پھر بولا۔ ''میں جانتا ہوں اچھی طرح۔۔۔ مگر دشمن نہیں جانتے کہ انہوں نے شہزی کو اپنی کچھار میں بلا کر درحقیقت اپنی شامت کو خود آواز دی ہے اور اب وہ سالا گورا کیا نام تھا اس کا شارک۔۔۔۔ شارک مچھلی۔۔۔۔ یا کیا۔۔۔؟''

''آرک۔۔۔۔ مسٹر آرک۔۔۔۔'' میں نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ تصحیح کی۔

''ہاں وہی آرک شاک۔۔۔۔ اب وہ خود ہمیں اپنے بیس کوارٹر یعنی زیرو ہاؤس لے جانے کے لیے یہاں آرہا ہے۔''

''ہاں، آنے دو اسے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سسرے۔۔۔۔ تم سے کس قسم کی خفیہ ڈیلنگ کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ بولا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا یہ تو ان کے آنے اور بتانے پر منحصر تھا۔ لہٰذا میں محض سر ہلا کر رہ گیا وقت گزرتا گیا، گزرتا رہا۔ اور انہی سوچوں، قیاس آرائیوں میں نہ جانے کتنا وقت مزید بیت گیا۔

ہم دونوں مبہوت سے اس تنگ و تاریک کمرے میں دیوار سے پشت لگائے پاؤں پھیلائے بیٹھے رہے۔ اس طرح کچھ مزید اور وقت گزرا تو اچانک دروازے پر کھڑ بڑ کی آواز ابھری۔ وہی دونوں گن بردار نمودار ہوئے اور دروازے پر کھڑے کھڑے ہی تحکمانہ درشتی کے ساتھ باہر آنے کا کہا۔ میں اور اول خیر دیوار سے پشت لگائے اسی طرح سہارا لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے آگے چل دیے۔ ہمیں دوبارہ اسی کشادہ کمرے میں لایا گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وزیر جان نے ہم سے باتیں کی تھیں۔ وہ بھی موجود تھا مگر اب اس کے ساتھ والے صوفے پر ایک چھریرا جسم کا سرخ چہرے والا غیر ملکی بھی براجمان تھا۔ اس نے بہترین تراش کا سفید بے داغ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ میں بہ غور اس کا جائزہ لیتا ہوا اول خیر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ غالباً یہی مسٹر آرک تھا جو اسپیکٹرم میں ہینڈلر ایجنٹ (Handler Agent) کی حیثیت رکھتا تھا۔ کم و بیش اسٹیشن چیف کے مساوی عہدہ تھا یہ۔ (ثریا کی دی ہوئی معلومات کے مطابق) مجھے اس کی ٹانگیں لمبی اور جسم سینے کی طرف سے چھوٹا محسوس ہوا۔ چہرہ لمبوترا تھا۔ بال کریو کٹ تھے، آنکھیں خلائی مخلوق کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ باچھیں پھیلی ہوئی سی اور ہونٹ پتلے اور کھنچے ہوئے تھے۔ مگر شکل و صورت اور آنکھوں سے تیز طراری اور شاطر خیزی ٹپک رہی تھی، اس کے ہمراہ دو اور افراد بھی تھے، ایک مقامی اور ایک غیر ملکی تھا۔ وہ بہ غور اپنی کھنچی کھنچی بھویں سکیڑ کر باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ ہمیں وزیر جان نے میری طرف دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا آرک نے ہولے سے انگریزی میں وزیر جان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''ان میں شہزی کون ہے؟'' اور وزیر جان نے میری جانب اشارہ کر کے اسے بتایا تو آرک اب میری طرف بہ غور ہی نہیں بلکہ برماتی ہوئی نظروں سے گھور گھور کے تکنے لگا تھا پھر وزیر جان نے اسے

اول خیر کے بارے میں بتایا صرف اسی قدر کے وہ میرا جاں نثار ساتھی تھا وغیرہ۔

"ہم صرف.... شہزی کو ساتھ لے کر جائیں گے۔"

آرک نے گمبھیر لہجے میں وزیر جان سے کہا۔ اس کی بھاری اور کھردری آواز اس کی دبلی پتلی شخصیت سے کسی طور بھی ہم آہنگ نہیں تھی۔ میں نے دانت چبا چبا کر براہِ راست آرک کو انگریزی میں مخاطب کر کے کہا۔

"مسٹر آرک! اول خیر کے بغیر میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔ یہ بات تم اچھی طرح اپنے دھیان میں رکھ لو۔"

اطفال گھر جیسے جدید خطوط پر استوار ادارے کی سکھائی ہوئی تعلیم یہاں میرے کام آرہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ میری بات پر آرک کی کھنچی ہوئی بھووں تلے آنکھوں میں ایک لمحے کو سانپ کی سی زہریلی چمک ابھری تھی پھر وہ اسی لہجے میں گویا پھنکارتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "مسٹر شہزی! اپنی اوقات میں رہو۔ مت بھولو کہ تم محکوم ہو ہمارے.... اور تمہاری زندگی موت ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

"سفید سؤر کی اولاد! کتے کے بلے! کان کھول کے سن ـــ میرا نام شہزاد احمد خان عرف شہزی ہے اور میں مسلمان ہوں جو اس ازلی اور حتمی حقیقت پر یقین کامل رکھتا ہے کہ زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہے تو بھی ایک ایک سانس کے لیے اسی قادرالمطلق کا محتاج ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے اور ان جہانوں کا بھی جو ہم گناہ گاروں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں ـــ سمجھا تو۔"

پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا اس خبیث ملعون گورے آرک کی اس پرُغرور بات نے مجھے ایک دم ہی بتھے سے اکھاڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرے گرج دار لہجے نے ماحول پر پل کے پل سکتہ سا طاری کر دیا۔ خود آرک کو یکلخت سانپ سونگھ گیا تھا۔ وزیر جان البتہ تھوڑا پریشان ہوتا نظر آیا تھا۔ وہ ضمیر فروش اس وقت آرک کا میزبان تھا اور اس کی چھت کے نیچے رسن بستہ حالت میں ایک قیدی کا یہ سلوک اسے بوکھلاہٹ میں جتلا کر رہا تھا۔

"او خیر.... جیو کا کے۔" اول خیر نے ہولے سے کہا۔ میری سانسیں چڑھنے لگی تھیں اور آنکھوں کے سامنے جیسے خون کی بارش ہونے لگی تھی، پتا نہیں میں کس جواں مرد کی اولاد تھا۔ جانے کون دلیر سپاہی تھا جس کا خون.... جس کی خو.... اور جس کا جلال میری رگ رگ میں.... میرے خون کے قطرے قطرے میں.... میری سرشت میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا کہ میں موت کو سامنے دیکھنے کے باوجود.... رسن بستہ اور قیدی ہونے کے باوصف.... خود پر غالب مدمقابل کو پچھاڑ کھانے والے انداز میں للکارنے سے بھی باز نہیں آتا تھا۔

آرک کے دم بہ خود چہرے پہ چند ثانیوں بعد زہریلے پن کی سرخی کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھوں سے نفرت و غیظ کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اس گورے سؤر سے بالکل خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ اس نے بکواس ہی ایسی کی تھی، کتنے پرغرور لہجے میں اس نے مجھے جتانے کی کوشش چاہی تھی کہ.... میری زندگی اور موت کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا اور میں نے بلاخوف اس کی آنکھوں میں ڈال کر اسے اس کا خاطر خواہ جواب دے دیا تھا۔ آرک کو قہر و غضب میں جلتا بلکتا دیکھ کر وزیر جان نے فوراً مداخلت کی اور آرک سے مخاطب ہو کے بولا۔ "مسٹر آرک.... تم اس گیدڑ بھبکیوں کی پروا نہ کرو جیسا تم بہتر سمجھو.... وہ کرو.... میں اسے جانتا ہوں، یہ دیوانہ اور پاگل ہے۔" وزیر جان کے بولنے پر آرک کے چہرے کا خارش زدہ خروش کچھ کم ہوا اور وہ وزیر جان سے مخاطب ہو کے گمبھیر آواز میں بولا۔

"دیوانے اور پاگل ہی ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ بنتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ اپنے ساتھی کی موجودگی کے بغیر ہماری کوئی بات سنے گا بھی نہیں۔ ڈیل میں ہمیں بھی مجبوراً تھوڑی لچک کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ ان دونوں کو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے آرک میری طرف کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ تاہم مجھے ان کی خفیہ ڈیل سے متعلق اس کی اہمیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ معاملہ یقیناً مجھ سے زیادہ ان کے لیے اہم تھا مگر مجھے اس بات کا بھی ادراک تھا کہ ان کی کوئی بھی ڈیل میرے لیے ہرگز قابلِ قبول نہ ہو گی تاہم میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ اس ڈیل کے پس منظر میں انہیں کس طرح "ڈاج" دینے کی کوشش کر سکتا ہوں؟

باہر ایک لمبی سی کار کھڑی تھی۔ ہمیں عقبی سیٹ پر بٹھا دیا گیا تھا اور اول خیر کی طرف آرک کا ایک ساتھی براجمان ہو گیا جبکہ دوسرے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آرک اس کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ کار روانہ ہو گئی اور تھوڑی دور ہائی وے پر آنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ کار اب فراٹے بھر رہی تھی۔ میرے ذہن

رسائی تیزی کے ساتھ ان اندھے راستوں کی ''کیلکولیشن'' شروع کر دی۔ کار ہائی وے پر آ کر دائیں جانب گھومی تھی۔ گویا ملتان روڈ پر ساہیوال سے آگے کی طرف گامزن تھی۔ میں بظاہر خاموش بیٹھا تھا لگ بھگ کوئی دس پندرہ منٹ کی تیز رفتاری کے بعد میرے محتاط اندازے کے مطابق انہوں نے کوئی بیس پچیس کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا اس کے بعد کار کی رفتار دھیمی ہوگئی تھی، میں نے اپنے جسم کو دانستہ ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ کار نے جب ایک موڑ کاٹا تو میرا جسم دائیں جانب جھکا تھا جس کا مطلب تھا کار نے بائیں جانب موڑ کاٹا تھا۔ اب کار ہچکولے کھانے لگی تھی۔ یہاں بھی دو موڑ بائیں جانب اور آخری تیسرا موڑ دائیں جانب کاٹا اس کے کوئی پانچ منٹ بعد کار رک گئی۔ میرے ذہن نے اسٹیشن فور سے یہاں تک راستوں کی ساری ''کتربیونت'' کرڈالی تھی اور ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوا ہوگا کہ میں کافی حد تک ان کے ''بیس کوارٹر'' تک کے راستے کا ایک محتاط ''اندازہ'' قائم کر چکا تھا۔ کار سے اترنے تک بھی ہماری آنکھوں سے پٹیاں نہیں اتاری گئی تھیں۔ البتہ کسی بڑے گیٹ کے کھلنے اور ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز مجھے ضرور سنائی دی تھی، گویا ہم اس وقت اسپیکٹرم کے بیس کوارٹر میں موجود تھے، باہر کا محل وقوع کیا تھا، مجھے اس کا بالکل علم نہ ہو سکا تھا نہ ہی اندازہ۔ اندر مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد ہمیں ایک کمرے میں آرم چیئر پر بٹھا دیا گیا اور پھر ہماری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ چند ثانیے آنکھوں کے سامنے کالے دھبے ناچتے رہے۔ اس کے بعد جب میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو، میرے سامنے جو منظر تھا، اسے دیکھتے ہی میرے جیسا مضبوط اعصاب کا مالک.... بھی سر سے پاؤں تک کئی ثانیے تک تھرا اٹھا تھا۔ نام کو تو یہ کمرا تھا مگر اس پر ''سلاٹر روم'' کا گمان ہوتا تھا۔ یا دانستہ اس کمرے کا ماحول ایسا بنایا گیا تھا کہ جس کی دیواروں سے رنگ و روغن تو کیا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، مخصوص سی سیلن چپکی ہوئی تھی، ایک دہشت زدہ کرنے والا ماحول تھا چھت پر بجلی تار کے ساتھ گلوب نما بلب روشن تھا۔ مگر مجھے اس کے ماحول نے لرزنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ بات کچھ اور تھی، اس سے بھی زیادہ ہولناک اور عبرت انگیز ....

☆☆☆

کمرے کے زنگ آلودہ آہنی کنڈے سے ایک چرخی کے ذریعے رسی کے ساتھ ایک مادر زاد برہنہ جوان لڑکی کو الٹا لٹکایا ہوا تھا اور جانے کب سے اس حرماں نصیب کو اس حالت میں .... اس طرح الٹا لٹکایا گیا ہوگا مگر اس کے ننگے جسم پر جا بجا انسانیت سوز تشدد کے نشانات کالے اور سرخ دھبوں کی صورت میں نظر آرہے تھے، چہرے کی حالت اس سے زیادہ ہولناک تھی۔ ایک آنکھ کی جگہ خلا تھا اور وہاں سے خون قطرہ قطرہ ٹپک ہی رہا تھا مگر کسی باریک خون آلود نس کے سہارے آنکھ کا ڈیلا ابھی تک نیچے جھول رہا تھا۔ نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ ایک کان کی بھی یہی حالت تھی، غرضیکہ اس پر ظلم و بربریت کی جتنی انتہا کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک لرزہ خیز قیامت کی صورت اس بدنصیب جوان عورت پر توڑی جا چکی تھی، اس کے داغ دار اور جگہ جگہ سے جلے ہوئے سینے کے زیر و بم سے اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس جان کنی میں جتنی سانسیں لے رہی تھی وہ مستعار ہی تھیں۔

ایک ہولناک اور تھرا دینے والا کرب انگیز خیال میرے ذہن میں ثریا کے حوالے سے ابھرا تھا اور اس پر ٹھہر گیا تھا کیونکہ سر دست میں اس بدنصیب لڑکی کے چہرے کو پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا۔

سلاٹر روم میں صرف تین افراد موجود تھے، دو گن بردار اور تیسرا آرک .... جو میری طرف .... اس طرح مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ میری کیفیات سے حظ اٹھاتی نظروں سے دیکھ رہا تھا .... کہ وہ یہ منظر دکھا کر مجھ پر اپنا خوف طاری کرنا چاہتا ہو۔

''اللہ کی لعنت ہو ان پر۔'' میں نے اول خیر کو ہولے سے یہ کہتے سنا۔

''پہچان سکتے ہو اسے مسٹر شہزی! کون ہے یہ؟'' معاً سلاٹر روم کے دم بہ خود ماحول میں صفت ابلیس آرک کی آواز ابھری۔

''شاید نہیں .... کون ہے یہ؟'' میں نے حتی الامکان اپنی آواز اور لہجے کو کسی کرب انگیز بوجھل پن سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

''یہ ثریا ہے۔'' آرک کی مکروہ آواز ابھری۔ میں ذہنی طور پر اس بری خبر پر خود کو تیار کر چکا تھا، تاہم تصدیق ہو جانے پر میری روح تک کو غشی کی کا ایک زبردست جھٹکا لگا تھا مگر میں اسے ایسا کوئی تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کہ میرا ثریا کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نمایاں ہو جس کی بنا پر ثریا پر مزید عرصۂ اذیت و حیات تنگ کیا جاتا اور آرک جیسے مکار آدمی کا مجھے یہ اچانک سے ہولناک منظر دکھانے کا بھی یقینا یہی مقصد ہوگا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے جب مجھے یہ بتایا کہ ''یہ ثریا ہے'' تو اس نے فوراً بھانپتی ہوئی نظروں سے میری

طرف دیکھا تھا۔ وہ مکار سؤر..... یقیناً میرے تاثرات و میری اندرونی کیفیات سے ثریا کے لیے دکھ و کرب کے آثار کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ یہاں میری غیر معمولی ودیعت کی گئی عقلِ سلیم یعنی کامن سینس کام آئی تھی اور یہ ادراک ہوتے ہی میں نے اپنی کیفیات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل ہی رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''کون ثریا؟'' میں انجان بن گیا۔

''تم میری سوچ سے بھی زیادہ فطین اور عیار ہو مسٹر شہزی۔'' آرک سرسراتے ہوئے مکروہ لہجے میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں تمہاری بات کا مطلب؟'' میں نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اور نہ ہی میری یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ آخر یہ سب مجھے دکھانے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم تو مجھے یہاں کسی ڈیل کے سلسلے میں لائے تھے؟''

میری بات پر اس نے بڑی بے رحمانہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ایک سگار سلگا لیا۔ دو تین کش لیے اس کے بعد چند قدم چلتا ہوا الٹا جھولتی ہوئی ثریا کے قریب آکے رکا۔ سگار کا سلگتا ہوا سرا اس نے ثریا کے گال پر رکھ دیا۔ اس کے بے سدھ جسم نے ہولے سے جھٹکا لیا۔ سلاٹر روم میں ہلکی سی گوشت جلنے کی چراند سی اٹھی۔

''چچ..... چچ..... بے چاری پر اس قدر تشدد ہوا ہے کہ اب تو اس کی اذیت ناک تکلیفیں بتانے والی حسیات ہی مردہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ ورنہ یہ بری طرح تڑپ رہی ہوتی۔'' آرک بڑی بے رحمی سے یہ کہتا ہوا دوبارہ سگار کو اپنے بدہیئت ہونٹوں میں دبائے میری طرف بڑھا پھر میرے ذرا قریب آکر رک کے بولا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، ڈیل قیدیوں سے نہیں کی جاتی، قیدیوں اور غلاموں سے حکم دے کر کام کروایا جاتا ہے۔ ہمارا اصول بھی یہی ہے کہ جو غداری کرتا ہے ہم اس کے ہاتھ میں پستول تھما دیتے ہیں جس کے چیمبر میں صرف ایک گولی ہوتی ہے جو وہ یعنی غدار اپنی کنپٹی میں اتار لیتا ہے۔'' اس کا لہجہ تھرا دینے والا تھا پھر وہ ذرا اور میرے قریب آیا۔ بغیر آرم کی اسٹول نما کرسی پر مجھے اور اول خیر کو ساتھ ساتھ بٹھایا ہوا تھا۔ آرک میرے بالکل نزدیک پہنچ کر مجھ پر جھک گیا۔ اس قدر کہ اس کی ناک کی پھننگ میری ناک کے بالکل قریب ہوگئی۔ ایسے میں مجھے اس کا چہرہ بہت مکروہ محسوس ہونے لگا۔ اس رذیل صفت اور سفاک آدمی کے بھیانک چہرے کو اپنی جلتی سلگتی آنکھوں کے قریب پا کر مجھے اپنے اندر کی آتشِ خوں رنگ کیفیات پر قابو پانا دوبھر محسوس ہونے لگا۔ جی چاہا میرا اس کا دانتوں تلے چہرہ بگاڑ ڈالوں۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ جانے کے ڈر سے میں نے اپنے دانت اور ہونٹ دونوں ہی بھینچ رکھے تھے۔

''مسٹر شہزاد احمد خان المعروف شہزی! تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہارے بارے میں سب جانتا ہوں اور نہ صرف تمہارے بارے میں بلکہ تمہارے قریبی ساتھیوں اور بہی خواہوں کے علاوہ تمہاری ایک اور کمزوری سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں جو ایک مجبوری کے تحت تم سے ہزاروں میل دور سہی لیکن ہم جانتے ہیں وہ تمہارے دل کے کس قدر قریب ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر سیدھا ہو کے کھڑا ہوگیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ عابدہ کے حوالے سے اس طرح کے اشارے مجھے پہلے بھی چند لوگوں سے ملتے رہے تھے اور اب اس نسلِ خنزیر..... آرک کے منہ سے بھی یہ سن کر میری رگوں میں دوڑتے خون کی گردش مثلِ لاوا کے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے غیظ و غضب پر قابو پا رکھا تھا۔ آرک سیدھا ہو کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا پھر پلٹ کر ایک ساتھی سے تحکمانہ بولا۔ ''اس لڑکی کو ہوش میں لاؤ۔''

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں ربڑ کا پائپ تھا۔ جس کا ایک سرا دیوار میں نصب شاید کسی پانی کے کنکشن سے منسلک ہوگا۔ دوسرا سرا جس پر پلاسٹک کی نوزل تھی، تھام کر وہ ثریا کے قریب آیا اور وال کھول دیا۔ پانی کی تیز دھار ثریا کے چہرے پر پڑنے لگی اور اس وقت تک پڑتی رہی جب تک کہ اس نے غوطے لگنے کے انداز میں کھانسنا شروع کر دیا۔ وہ ہوش میں آنے لگی تھی اور اب اس کے حلق سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد چرخی کی مدد سے ثریا کے الٹے جھولتے وجود کو فرش پر چھوڑ دیا گیا۔ تاہم رسی اب تک اس کے دونوں پیروں میں بندھی رہنے دی تھی۔ تاہم اس کو اوپر سے اتنا جھول دے کر ڈھیلا چھوڑ دیا گیا تھا کہ ثریا اگر چاہتی تو اٹھ کر بیٹھ بھی سکتی تھی اور چند قدم چل بھی لیتی اگرچہ اس بے چاری کے اندر اتنی سکت نہ تھی۔

ثریا کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے کچھ عرصہ پہلے آسیہ کا اس سے ملتا جلتا ہولناک منظر یاد آنے لگا جس کا درد ابھی تک میرے دل و دماغ میں تازہ تھا۔ آسیہ کے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ شرمناک اور سفاکانہ سلوک کیا گیا تھا۔ جس کے تلے اس بے چاری نے بڑی جاں کنی کے عالم میں بالآخر دم توڑا تھا۔ اور میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ مگر پھر میں

نے آسیہ پر ستم توڑنے والے چودھری ممتاز خان کے زرخرید کتوں کو بھی بھیانک عبرت ناک انجام سے دوچار کیا تھا جبکہ آسیہ کا ابھی انتقام میرے سینے میں باقی تھا۔ وہ میں ممتاز خان کو جہنم واصل کر کے پورا کرنا چاہتا تھا۔

کم و بیش یہی کچھ اس وقت ثریا کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ ثریا کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ کیونکہ وہ ان کی آلۂ کار رہ چکی تھی۔ اسے بھی اس کے ضمیر نے جھنجوڑا یا پھر بقول ثریا کے ہی اسپیکٹرم والوں کی اصلیت اور ان کے مذموم مقاصد جان لینے کے بعد وہ ان کے خلاف ہوگئی تھی مگر ان کی آلۂ کار اور ''رازداں'' کی حیثیت سے رہتے ہوئے وہ ان کی جڑوں کو کاٹنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں ثریا سے میری اچانک اور حادثاتی ملاقات میں اس نے مجھے آگاہ کیا تھا مگر اسے پوری حقیقت مجھے بتانے کا موقع اور وقت نہ مل سکا تھا اگرچہ اس نے اس بات کا بھی اظہار کیا تھا کہ وہ خود بھی اس گمبھیر اور خطرناک معاملے میں مجھ سے مدد لینے کی خواہش مند تھی وغیرہ۔ ایک جھماکا میرے ذہن میں یہ رہا تھا کہ ثریا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اسپیکٹرم میں اس کے ہم خیال ساتھی اور بھی تھے، اگرچہ ان کی تعداد بہ آسانی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر وہ کہاں تھے؟ یا ان لوگوں نے ثریا کے منہ سے ان کے بارے میں بھی اگلوا لیا تھا اور انہیں اذیت ناک موت سے دوچار کر دیا تھا؟

کچھ ذرا ہوش میں آتے ہی ثریا کے برہنہ جسم اور چہرے کی حالتِ زار زخموں سے درد کی ٹیسیں پھوٹ پڑیں اور وہ مارے درد و کرب سے گھٹی گھٹی چیخیں مارنے لگی۔ بے چاری کے اندر تو درد کی اذیت ناک کیفیات کو دبانے کے لیے چیخنے اور سسکنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ آرک نے دوسرے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے ایک دیوار کے کونے میں رکھی میز کی دراز سے ایک اسپرے نما بوتل نکالی اور آگے بڑھ کر وہ ثریا کے رستے زخموں پر اسپرے کرنے لگا۔ اس اسپرے سے ثریا کے زخموں پر شاید ٹھنڈک اتر آئی تھی عارضی طور پر کہ وہ اب ہولے ہولے سسکنے لگی۔ آہیں بھرنے لگی۔ اس کے بعد آرک نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ کی ایک مٹھی میں ثریا کے کھچڑی زدہ جٹاؤں بالوں کو جکڑ کر اٹھا کے بٹھا دیا اور اسی طرح ہی اس کے بال مٹھی میں جکڑے۔ اس نے ثریا کا چہرہ میری جانب اٹھا دیا اور زہر آلود لہجے میں بولا۔

''ہو.. ئج...... (Whore Bitch) دیکھو اپنے ساتھی کی طرف...... یہ شہزی ہے جس کے ساتھ مل کر تم نے ہمارے خلاف جانے کیا کیا منصوبے بنا رکھے تھے، پہچانو اسے اچھی طرح... اور ہماری طاقت کو بھی......''

اس کے منہ سے ثریا کے لیے Whore Bitch کے الفاظ نے میرے اندر آگ سی لگا دی تھی۔ ثریا اپنے مسخ زدہ یک چشم چہرے سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا ہولناک چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ سے مردنی ٹپک رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس قدر زخمی ہو کے وحشیانہ ہو رہا تھا کہ میں اس کے چہرے کے تاثرات بھی جاننے سے قاصر تھا کہ آیا وہ مجھے پہچان بھی سکی تھی یا نہیں۔ تاہم اس کے حلق سے سسکاری ضرور برآمد ہوئی تھی اور اس نے ہسٹریائی انداز میں آرک سے گھٹی گھٹی التجا کی۔ ''مم...... مجھے مار ڈالو...... خ خدا کے لیے مجھے اس عذاب سے نجات دلا دو...... مسٹر آرک...... پلیز۔''

ثریا سے ٹھیک طرح بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہ سارے الفاظ اس نے ٹوٹے پھوٹے لب و لہجے اور آواز میں بمشکل ہی ادا کیے تھے۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' آرک غیظ آلودہ لہجے میں اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے غرایا۔ ''مجھے بتاؤ تم اس شخص کو پہچانتی ہو یا نہیں؟''

''ہاں، میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ذلیل، کتے! بھی انسان ...... تیری موت ہے۔ تو بھی پہچان لے اس کو...... اپنی موت کو...... مردود آدمی...... آہ۔'' پتا نہیں کس طرح اپنے زخموں سے چور وجود کی طاقت سمیٹ کر ثریا نے یہ الفاظ آرک سے کہہ ڈالے تھے۔ جسے سن کر آرک کا چہرہ مسخ ہو کے رہ گیا۔ اس نے اسی طرح اس کے بالوں کو مٹھی سے پکڑے ایک طرف گھسیٹا مگر چھوڑا نہیں۔ پھر ایک ہاتھ اپنے سفید کوٹ کے اندر ڈالا، نکالا تو اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا خوفناک پستول تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے پستول کی نال ثریا کے زخم خوردہ منہ کے اندر گھسیڑ دی اور ٹریگر دبا دیا۔ سلاٹر روم کے سیلن زدہ وحشت ناک ماحول میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ ثریا کے چہرے پر خون کی سرخ لکیروں کا جال سا بُن گیا۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے سے بھیجے کے لوتھڑوں کو اگلتی ہوئی پار ہوگئی۔

ظلم و بربریت کے اس قہرناک شیطانی کھیل نے ماحول تک کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

میرے دل و دماغ کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی، ایک خوابیدہ آتش فشاں تھا جو قہر و غضب کا لاوا اگلنے کو بے چین تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی میرے ہاتھوں

کے جگر بند کھول ڈالے اور میں اس سفاک و سنگدل انسان جو انسان کہلانے کا مستحق نہ تھا بلکہ جانور کہنا بھی اسے جانور کی توہین ہوتی۔ یہ تو سراپا شیطان تھا ابن شیطان تھا۔

''لے جاؤ اس کتیا کی لاش...... میرے لیے یہ جاننا ہی کافی تھا کہ کتیا نے مسٹر شہزی کو پہچان لیا۔'' آرک نے تحکمانہ کہا اور مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ثریا نے کیا دانستہ ایسا کیا تھا یا جوش میں آکر آرک کو میری طرف سے تہدید کی تھی؟ اپنی موت آسان کرنے کے لیے؟ اس اذیت ناک تشدد سے بچنے کے لیے؟ کہ میں آرک کی موت تھا۔

بدنصیب ثریا کی لاش اٹھالی گئی۔ اول خیر کا چہرہ بھی اس کھلی بربریت پر سکتہ زدہ سا رہ گیا تھا۔

''مسٹر شہزی! اب تو تمہارے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش نہیں باقی بچی ہوگی کہ ثریا تمہارے ساتھ مل کر ہماری جڑیں کاٹنا چاہتی تھی کیونکہ وہ آخری وقت میں تمہیں پہچان چکی تھی۔'' آرک نے مکارانہ سفاکی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، اس کے گورے مکروہ چہرے پر بڑی خبیثانہ مسکراہٹ تھی۔

''یہ صرف میری بچپن کی دوست تھی جس ادارے میں......''

''بس، ہمیں سب پتا ہے۔ چھوڑو اس بات کو اب۔'' آرک نے ہاتھ اٹھا کر میری بات درمیان سے کاٹ دی۔ میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔ وہ آگے بولا۔ ''اس کے ساتھ تین غدار اور بھی تھے، دو ہم نے مار ڈالے...... مگر بدقسمتی سے ایک بچ کر بھاگ نکلا۔ اسے جلد تلاش کرلیا جائے گا۔''

میں جواباً خاموش رہا۔ آرک چند ثانیے کھڑا میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔ ''مسٹر شہزی! اب تم کیا کہتے ہو؟ ہمارے حکم پر عمل کرو گے یا اپنے ساتھی سمیت اس سلاٹر روم کو اپنی اذیت ناک چیخوں سے رونق بخشو گے؟''

میں نے اندر ہی اندر اس خبیث پر لعنت بھیجی پھر بظاہر بے پروانہ لہجے میں بولا۔

''میں نے تو ابھی تک تمہاری بات سنی ہی نہیں۔''

''تمہیں ہمارا ایک معمولی سا کام کرنا ہوگا۔''

''کام معمولی ہے تو مجھ سے کروانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تمہیں؟ اپنے آدمیوں کی تمہارے پاس کوئی کمی تو نہیں؟'' میں اس کی بربریت اور چنگیزیت کے نظارے دیکھنے اور دھمکیوں سے مرعوب ہوئے بغیر اس کے ساتھ ترکی بہ ترکی لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

''تمہارے لیے معمولی کام ہے وہ...... ہمارے لیے نہیں۔'' اس نے سپاٹ سنجیدگی سے کہا۔

''کام کیا ہے؟'' میں نے برماتی نظروں سے اس کی طرف گھورا۔

''تمہیں کچھ عرصے ہمارے لیے کام کرنا ہوگا...... ایک مشن پر...... پی ایس ایس کا خاتمہ اور میجر ریاض باجوہ کا قتل۔'' اس نے کہا اور میرے پورے وجود میں جیسے لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس مردود و ملعون کے خطرناک عزائم جان کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے حتی الامکان خود کو پھر نارمل رکھتے ہوئے بلا تصدیق و تامل پوچھا۔ ''اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''ہمیں معلوم ہے تمہارے میجر ریاض باجوہ سے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پاور سیکرٹ سروس کو کن مقاصد کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ ہم تمہیں آزاد چھوڑ دیں گے مگر ہماری تیسری آنکھ تم پر مرکوز رہے گی، جہاں تم نے ہمیں ڈاج دینے یا کوئی چالاکی چلنے کی کوشش کی تو...... سب سے پہلے تمہیں اپنے اس ساتھی کی اذیت ناک موت کا یقینی تصور کرلینا ہوگا۔ اس کے بعد تمہاری معشوقہ عابدہ کی باری آئے گی جو امریکا کے ایک اسپتال میں مقیم ہے۔ سمجھ گئے تم۔''

آرک کی بات نے مجھے اندر سے سرتاپا جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اول خیر اور عابدہ کا میں بال بیکا بھی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ عابدہ کے بارے میں آرک کو یقیناً اس رذیل ممتاز خان نے ہی گائیڈ لائن دی ہوگی کیونکہ میرے ازلی دشمنوں میں ایک وہی تھا جو میری بعض جذباتی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے بظاہر آرک کی اس تہدید کو کوئی اہمیت نہ دی اور بولا۔

''دیکھو مسٹر آرک! یہ پی ایس ایس کیا بلا ہے مجھے اس کا علم نہیں۔ ہاں یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ میجر ریاض باجوہ سے میرے صرف دوستانہ مراسم ہیں اور اس کی وجہ محض اتنی ہے کہ اتفاق سے ایک پرائیویٹ میڈیکل سینٹر میں میرا اپنے پرانے دشمنوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا اور سوئے اتفاق میجر ریاض باجوہ کی بیگم اور بچہ وہاں ایڈمٹ تھے، دشمنوں نے بھاگ نکلنے کے لیے ان کے بچے کو یرغمال بنا کر ڈھال بنا لیا تھا۔ عین وقت پر میں نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پالیا تھا اور میجر صاحب کے بچے کی بھی جان بچ گئی تھی، فقط

یہی حقیقت ہے میری ان سے تعلق داری کی، اس کی تفصیلی خبر مختلف نجی ٹی وی چینلز پر بھی آچکی ہیں۔"

آرک نے پہلی بار میری بات بظاہر بڑے غور اور دھیان سے سنی تھی۔ وہ بحث و مباحثہ کرنا نہیں جانتا تھا اور دوٹوک لہجے میں بات کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا بڑی مکاری سے بولا۔

"او کے...... او کے...... اٹس او کے...... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں مگر تمہیں کرنا وہی ہوگا جو میں کہہ رہا ہوں تم سے۔" وہ ذرا رکا پھر چند قدم اٹھاتا ہوا دوبارہ میرے قریب آکر مزید بولا۔ "تمہیں مرحلہ وار ہمارا یہ مشن انجام دینا ہوگا۔ پہلے مرحلے میں تمہیں پاور والوں کے ہیڈکوارٹر اور ان کے خفیہ تربیتی مرکز کا پتا چلانا ہوگا اور ہمیں اپ ڈیٹ کرنا ہوگا، تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہوگی اس کام کے لیے۔ چوتھے روز تمہیں میجر باجوہ کے سر میں گولی اتارنی ہوگی، سمجھ گئے تم؟ مجھے یقین ہے تمہارے لیے یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں۔"

"یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے مسٹر آرک۔" میں نے کہا۔ "میجر باجوہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ وہ رینجرز فورس کا سربراہ ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس سے بھی تعلق رکھتا ہے جبکہ میں ایک عام اور غیر اہم سا سویلین...... میں ان سے کیسے یہ سب اگلوا سکتا ہوں؟ انہیں مجھ پر شبہ ہوجائے گا۔"

"شبہ تو ہمیں بھی تم پر اس بات کا ہوگا کہ تم یہاں سے جانے کے بعد...... میجر باجوہ سے پہلی فرصت میں یہ ساری حقیقت بیان کرڈالو گے اور ان سے خفیہ گٹھ جوڑ بلکہ مدد بھی لینے کی کوشش کرو گے۔" یہ کہتے ہوئے آرک نے قدرے جھک کر ایک بار پھر اپنا مکروہ چہرہ میرے چہرے کے بالکل سامنے کردیا اور بات جاری رکھی۔ "مگر یاد رکھو شہزی! تم لوگ ہماری گرد بھی نہیں پاسکو گے، کیونکہ ہمارے ساتھ چودھری ممتاز خان اور وزیر جیسے آدمی موجود ہیں جو عوامی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں کی میڈیا کو بھی ہم نے خرید رکھا ہے۔ ہم ان اداروں کو انہی کے ملک میں بدنام کرکے رکھ دیں گے مگر افسوس ہمارے پاس سردست ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ یہ ہم تم سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے دل و دماغ سے ہر قسم کی چالاکی اور عیاری نکال پھینکو...... بولو اب کیا کہتے ہو؟"

میں اس سفید گورے سور کی بات پر بے اختیار ایک گہری ہمکاری بھر کے رہ گیا پھر بولا۔ "میں تنہا یہ کام نہیں کرسکتا.... میرے ساتھ اول خیر کو بھی میرے ساتھ کرنا ہوگا۔"

"شٹ اپ۔" آرک کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ سیدھے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری کوئی فضول بکواس نہیں سنوں گا نہ ہی تم مجھے اس حقیقت سے بھٹکا سکتے ہو کہ تمہارا پاور سے کوئی تعلق نہیں...... ہمارے آدمیوں سے دو بار پی ایس ایس کا ٹکراؤ ہوچکا ہے اور تم بھی ان میں شامل رہ چکے ہو، سمجھے تم...... اب ایسی کوئی فضول بکواس نہیں چلے گی۔" وہ بپھر گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہاں آرک کے بلکہ اسپیکٹرم کے ہاتھ مضبوط کرنے والے دو ہی افراد تھے۔ ایک چودھری ممتاز خان اور دوسرا وزیر جان...... یہ دونوں ہی میرے ماضی اور حال سے ہی نہیں بلکہ میری بعض جذباتی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ میرے ذہن میں تو یہی منصوبہ پل رہا تھا کہ میں ایک بار ان کے چنگل سے نکل کر آزاد ہوجاؤں اور بعد میں انہیں "بلف" کرنے اور "ٹریپ" کرنے کی کوشش کروں مگر کیا یہ سب اتنا آسان تھا؟ مگر اور کوئی صورت بھی نہ تھی، سردست تو میرے لیے یہی غنیمت تھا کہ میں صرف ایک بار یہاں سے آزاد ہوجاؤں پھر دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے میری یار آور تقدیر مجھے یہ موقع دے رہی ہو۔

میں نے کہا۔ "میں اپنی زندگی اور ساتھی کی زندگی کی ضمانت چاہوں گا کیونکہ یہ بات تم بھی جانتے ہوگے کہ میری دشمنی صرف ممتاز خان سے ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہارا ساتھی ہے۔ اس گھن چکر میں تو میں خوامخواہ ہی پھنس گیا ہوں۔" خود سے طاقت ور دشمن اور کبھی جوش کی جگہ ہوش سے کام لینے کا گر میں نے سرمد بابا سے ہی سیکھا تھا اور بہت کچھ حالات سے...... لہٰذا میں نے مکارانہ چال چلنے کی روش اختیار کرلی تھی۔

"شاید تمہاری یہ بات ٹھیک ہو۔" آرک اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔ "لیکن مجھے پتا ہے کہ تم ہمارے بارے میں بھی اب تک بہت کچھ جان چکے ہو۔ اس میں ثریا نے بھی ہم سے غداری کرکے نمایاں کردار ادا کیا۔ افسوس یہاں چند لوگوں کے انتخاب میں ہم سے کچھ فاش غلطیاں ہوگئی تھیں۔ بہرحال رہی بات تمہاری اور تمہارے ساتھی اول خیر کی اس سلسلے میں تم بے فکر رہو۔ یہ ادھر ہی رہے گا۔ ایک اہم قیدی کی حیثیت سے اور اس کی زندگی کی ضمانت تمہارے کام سے مشروط ہوگی اور تمہاری بھی جبکہ تمہاری اور ممتاز خان کی ذاتی دشمنی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اسی سبب ہم نے اسے تمہارے معاملے سے دور رکھا ہے۔"

وہ بھی میرے ساتھ چالاکی چل رہا تھا۔ گویا میرے اور آرک کے درمیان ایک بساط بچھ چکی تھی، اس کے پاس مہروں کی کمی نہ تھی جبکہ میرے پاس تو ایک چلا ہوا کارتوس تک نہ تھا۔ یہ دماغی کھیل تھا جس کی چال کامیاب ہوتی، جیت اس کا مقدر بنتی۔ میں نے حامی بھر لی تو آرک نے کسی مسرت کا اظہار نہ کیا اور بولا۔

''او کے، سب ٹھیک ہے۔ ہمارے مشن پر روانہ ہونے سے پہلے تمہیں ایک مائنر آپریشن سے گزرنا ہوگا۔''

''آپریشن؟ کیسا آپریشن؟'' میں بُری طرح چونکا۔

اس کے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی مکروہ اور سنگدلانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''ہم اپنے تحفظات کے سلسلے میں مکمل طور پر تسلی چاہتے ہیں یہ ایک معمولی سا سرجیکل آپریشن ہوگا۔ تمہیں جنرل اینستھیسیا کے ذریعے تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کیا جائے گا پھر تمہارے جسم کے کسی مقام پر خفیہ طور پر ایک ڈیوائس چپ لگا دی جائے گی، جو تمہاری تمام کارکردگی کی رپورٹ ہمیں یہاں بیٹھے ہائی ٹیک سپر کمپیوٹر پر منتقل کرتی رہے گی، اس میں تمہاری کسی چالاکی، کسی عیاری کے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی نہ ہی تمہیں ہم سے رابطہ کر کے کسی قسم کی رپورٹ دینے کی زحمت گوارا کرنا پڑے گی۔ تمہارے جسم میں موجود مائیکرو الیکٹرک ڈیوائس خود بخود تمہاری ایک ایک حرکات وسکنات کی ہمیں آگاہی دیتی رہے گی۔'' اس خبیث کی بات سن کر میرے دماغ کی کیا پورے وجود کی نسیں پھول گئیں۔ نہ جانے یہ مردود میرا ایسا کون سا سرجیکل آپریشن کرنے والے تھے، جو مجھے قطعاً قابلِ قبول نہ تھا بلکہ سچی بات تو یہ تھی مجھے اس آپریشن کے نام سے ہی ہول آنے لگا تھا۔ سب سے اہم بات میرے نزدیک یہ تھی کہ اس ملعون خبیث آرک کے بقول اس میں کسی شبہے یا چالاکی کرنے کی بال برابر بھی گنجائش نہ تھی، تو پھر یہ آپریشن ویسے بھی میرے لیے خطرناک تھا۔

''یہ مائیکرو الیکٹرک ڈیوائس تمہیں ہمارا بے دام غلام بنا کے رکھے گی۔'' آرک نے آخری تیر چلایا جو سیدھا میرے دل میں کھبا تھا۔

''اوئے کاکے! یہ چٹا سور...... انگریزی میں تیرے ساتھ کیا گٹ پٹ کیے جا رہا ہے۔ تیری تو حالت ہی غیر ہو رہی ہے۔''

اول خیر نے ہولے سے اپنا منہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ اول خیر اتنا پڑھا لکھا نہ تھا مگر آرک کی مکارانہ اور سنگدلانہ تاثرات، گفتگو اور میرے ردعمل نے اسے کچھ ایسا سمجھا دیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ بالکل قابلِ قبول نہ تھا۔ میں نے اول خیر کی بات کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے دل و دماغ میں پہلی بار تشویش کی لہر پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوئی تھی، میں اگر اول خیر کو اس ''چٹے سور'' کے خطرناک عزائم کے بارے میں آگاہ کر دیتا تو یقیناً اول خیر آپے سے باہر ہو جاتا۔

ہم قیدی تھے یہاں..... مجبور اور بے بس بھی۔ میرے ذہن نے عیاری کی جو بساط آرک کے آگے بچھانے کی کوشش چاہی تھی، اسے پہلی ہی چال میں ''شہ مات'' ہو گئی تھی اور مجھے یہ بساط سمیٹتے ہی بنی تھی۔

میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ سردست مفر کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں۔ اب اللہ کا ہی آسرا تھا کہ جتنا بڑا نام اتنا بڑا آسرا۔

آرک نے ہولے سے اپنے آدمی سے کچھ کہا تھا۔ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر وہاں سے لے جایا جانے لگا۔ اول خیر بھی اٹھ کر کھڑا ہوا مگر اسے دبوچ کے سلاٹر روم میں ہی مقید کر دیا گیا وہ چیخنے چلانے لگا۔ میں خود بھی اب آپے سے باہر ہو گیا تھا اور آرک کو گالیوں سے بُری طرح لتاڑنے لگا۔ وہ آگے جا چکا تھا۔ میری آنکھوں میں دوبارہ پٹی چڑھا دی گئی تھی، یہ بہت محتاط تھے۔ مجھے اپنے بیس کوارٹر یعنی زیرو ہاؤس کے اندرونی محل وقوع سے بھی آشنا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ سرجیکل آپریشن کے نام سے ہی میرے اندر ہولناکیاں جنم لے رہی تھیں کیونکہ اس آپریشن کا مطلب تھا کہ میں ان کا بے دام غلام بن جاتا۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر مجھے خبردار کر رہی تھی۔ ''شہزی! یہ شیطانی آپریشن نہیں ہونا چاہیے۔ ہرگز نہیں۔'' میں نے اپنی حالت پر قابو پانا شروع کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک یہ خدشہ ابھرا تھا کہ کہیں میرے اس طرح واویلا کرنے سے یہ مجھے وقت سے پہلے ہی بے ہوش نہ کر ڈالیں مگر ہوش میں رہتے ہوئے بھی میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور میں ان کے شیطانی گڑھ میں موجود تھا۔ جہاں نہ جانے ان کے اور کتنے ساتھی جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے اور میں مکمل طور پہ بے بس اور ان کے رحم و کرم پر تھا۔ پھر مجھے مختلف راہداریوں سے گزار کر جس کمرے میں لایا گیا وہاں میرے نتھنوں سے کچھ ایسی بو ٹکرائی تھی جس نے میرے اندر

کے ہولناک خدشات کو مزید سوا کر ڈالا تھا۔ یہ ایسی ہی... مخصوص دوائیوں کی بو تھی جیسی کسی اسپتال کے آپریشن روم میں ہوتی ہے۔ دفعتاً مجھے اپنی گردن پہ چبھن کا احساس ہوا۔ یکلخت میری آنکھیں پھیل گئیں اور میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ ہی میں نے دل میں اللہ کی مدد کو ضرور پکارا تھا۔

☆☆☆

مجھے جب ہوش آیا تو یکلخت میرا دل اچھل کر حلق میں آن ٹپکا۔ کیونکہ آنکھ کھلنے پر میں نے خود کو ایک آپریشن ٹیبل پر پڑے پایا تھا۔ میرے اوپر بڑا سا کنٹوپ تھا جس پر کئی گلوب روشن تھے، میرے دائیں جانب ایک بڑی سی ٹرالی رکھی ہوئی تھی جس پر اسٹین لیس اسٹیل کے سرجیکل انسٹرومنٹ رکھے تھے۔ بائیں جانب قدرے عقب میں ایک مشین سی تھی، جس پر دو چھوٹے مانیٹر اور ایک آکسیجن پمپ نظر آتا تھا۔ مانیٹر میں دل کی دھڑکنیں اور نبض کی رفتار کے گراف تھرک رہے تھے۔

میں آپریشن ٹیبل پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں پر چرمی بیلٹ بندھے ہوئے تھے۔ یہی حالت دونوں پیروں کی تھی۔ سفید کوٹ (ایپرن) میں وہاں چار افراد موجود تھے، پانچواں آرک تھا۔ دو جوان سے مرد تھے، مجھے ان کی حیثیت جیلر جیسی معلوم ہوتی تھی، ایک بوڑھا سا شخص تھا۔ سر کے بال سفید، چہرہ بھاری اور ٹماٹر کی طرح سرخ تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور گول...... مجھے اس کے چہرے سے نامعلوم سی منحوسیت ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایسی ہی مسکراہٹ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ثبت سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے ساٹھ سے اوپر ہی لگایا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا ایک پختہ العمر آدمی تھا۔ یہ مقامی لگتا تھا، چہرے پہ داڑھی مونچھیں تھیں۔

آرک نے پہلے بڈھے گورے کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''یہ ڈاکٹر گلمٹ ہیں۔ معروف سرجن...... اپنے کام کے ماہر۔ ہمارے پرانے خیر خواہ......'' پھر آرک نے قریب کھڑے مذکورہ پختہ العمر مقامی شخص کا کاندھا تھپتھپا کر بولا۔ ''یہ حامد ہیں کمپیوٹر ماسٹر...... مجھے یقین ہے مسٹر شہزی!'' وہ مردود آخر میں مجھ سے مخاطب ہو کے زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ ''ان دونوں ماہرین کی موجودگی میں تمہیں بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔''

اس کے بعد آرک آپریشن تھیٹر نما اس منحوس کمرے سے چلا گیا۔ گلمٹ نے چہرے پر سفید ماسک چڑھا لیا۔ ٹرالی کے قریب ایک ہیلپر کھڑا ہوا۔ دوسرا اشین کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک انجکشن بھرنے لگا۔ میں اسٹریچر نما ٹیبل پر لیٹا یہ سب بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ یہ سب مجھے انسان کم اور قصائی زیادہ معلوم ہونے لگے۔ ڈاکٹر گلمٹ کا چہرہ اب سپاٹ نظر آ رہا تھا اور وہ میرے جسم کا جگہ جگہ سے ہاتھ پھیر کر کچھ جائزہ اور معائنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ شاید بے ہوشی کے عالم میں میرا لباس بھی تبدیل کر دیا گیا تھا اور آپریشن کرانے والے مریضوں کا سا ''چولا'' ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ ایک ڈرپ کی سوئی میری نس میں اس ہیلپر نے گھونپ دی تھی اور انجکشن بھر کے پہلے ڈرپ کے اندر دوا انجیکٹ کی پھر دوسرا وائل اٹھا کے اس سے سرنج بھری اور ڈرپ ٹیوب میں جس کی سوئی میرے بازو کی نس میں پیوست تھی، کے اندر بہت دھیرے دھیرے انجیکٹ کرنے لگا۔ آج میں پہلی بار زندگی میں خود کو اس قدر بے بس، مجبور اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔

شیطان صفت سرجن ڈاکٹر گلمٹ...... نے سرجیکل ٹرالی کے قریب کھڑے دوسرے ہیلپر سے کچھ کہا۔ وہ آگے بڑھا تو اس کی ہلکی سی ٹھوکر سے ٹرالی سرک کے میرے آپریشن ٹیبل کے ساتھ آن لگی اور پھر دفعتاً ہی میرے دائیں جانب بندھے ہاتھ کی انگلی سے کوئی آہنی شے ٹکرائی، میری انگلیاں بہر حال آزاد تھیں۔ میں نے وہ شے محض انگلیوں کی مدد سے دبوچ لی اور پھر وہ جیسے اس شے کو انگلیوں کے لمس سے محسوس کرتے ہی میرے ذہن کے اندھیروں میں یکلخت امید کی جوت جاگ پڑی۔ وہ سرجیکل نائف تھا۔ ادھر وہ خبیث ہیلپر مجھے جانے کون سا انجکشن لگا چکا تھا۔ اس سے میرا ذہن رفتہ رفتہ نیم غنودہ ہو رہا تھا۔ ایک چیخ تھی جو میرے سینہ سوزاں سے برآمد ہونے کو بے چین تھی کہ کاش بے ہوشی کے یہ لمحات کچھ طویل ہو جائیں اور میں اس سے پہلے اپنا کام انجام دے ڈالوں...... کاش ایک حسرت زدہ آہ تھی، جس نے مجھے پاگل ہونے کی حد تک بے چین کر ڈالا تھا۔ میں نائف سے غیر محسوس انداز میں اپنی کلائی کی بیلٹ کاٹنے لگا۔ شکر تھا کہ پہلے والا ہیلپر دوبارہ اپنی جگہ پر نہیں لوٹا تھا ابھی تک...... ورنہ وہ اپنی ''غفلت'' اور میری مخفی حرکت دیکھ لیتا۔ دوسرا منحوس ہیلپر ڈرپ ٹیوب میں مجھے انجکشن دے چکا تھا پھر مؤدبانہ اور ہولے سے ڈاکٹر گلمٹ سے بولا۔ ''سر! میں نے سنگل ڈوز دے دی۔ آخری ڈوز دینا پڑے گا۔'' ڈاکٹر گلمٹ اس وقت میرا پیٹ برہنہ کیے کے لیے اس کے چہرے پر ماؤتھ گیگ........

کچھ جائزے میں مصروف تھا اور ساتھ ہی کمپوڈر ماسٹر حامد کو کچھ بتا رہا تھا۔ دوسرے ہیلپر کی بات پر سیدھا ہو کے بولا۔

''یس! ماؤتھ گیگ لگا کر آخری ڈوز دے دو۔ ہم نے مارک کرلیا ہے۔''

میں چونکا گویا ابھی سنگل ڈوز دی گئی تھی، آخری ڈوز دینے کا مطلب تھا میں مکمل طور پر بے ہوش ہو کے ان کے رحم و کرم پر ہو جاتا مگر سنگل ڈوز سے ہی میری حالت نیم غنودہ سی ہوتی جارہی تھی لیکن میں اپنی قوتِ ارادی اور مضبوط اعصاب کے سہارے اپنے ''کام'' میں مگن تھا اور ساتھ ہی دل ہی دل میں اللہ سے اپنی کامیابی کی دعائیں بھی مانگتا جارہا تھا کہ بے ہوشی کی آخری ڈوز سے پہلے میرا کم ازکم ایک ہاتھ تو آزاد ہو جائے۔

پہلے والے ہیلپر کو ڈاکٹر گھمٹ نے کسی کیبنٹ کی جانب مصروف کردیا تھا۔ وہاں وہ کچھ تلاش کررہا تھا۔

دوسرا منحوس ہیلپر میرے چہرے کا بہ غور جائزہ لیتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا دیکھنا چاہ رہا تھا لہٰذا میں نے نیم غنودہ ہونے کی ایکٹنگ شروع کردی۔ تاکہ اس شیطانی ٹولے کو مجھ پر یا میری مخفی حرکت پر کسی قسم کا شبہ نہ ہوسکے۔

ٹھیک اسی وقت میرا دایاں ہاتھ آزاد ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ کے آزاد ہوتے ہی جیسے میری رگ رگ سے قہر و غضب کا کالا طوفان امڈ پڑا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے حلق سے شیر جیسی غرغراہٹ برآمد ہوئی اور دوسرے ہی لمحے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا جس میں وہی نشتر دبا ہوا تھا۔ پہلا نشانہ میرا یہ شیطان ڈاکٹر گھمٹ بنا تھا۔ میں نے اس کی موٹی سفید چربیلی گردن چیر ڈالی۔ اس کی شہ رگ کٹ گئی تھی شاید کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابل کر اس کے ساتھ کھڑے حامد کے چہرے پر پڑا اور سرخ ہوگیا۔ دوسرا وار بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میں نے حامد کے پیٹ پر کیا۔ سرجیکل نشتر بہت تیز دھار تھا اور صرف گویا اشارے کا منتظر تھا۔ حامد کے پیٹ پر چرکا لگنے کی دیر تھی کہ اس کا پیٹ کھل گیا۔ اور انتڑیوں کا لجلجاتا ہوا ڈھیر باہر کو آن پڑا جسے حامد پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی انتڑیوں کے گچھے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ڈاکٹر گھمٹ کے ساتھ وہ بھی کربناک خرخراتی چیخیں مارتا ہوا زمین پر آرہا۔ مجھ پر تو جیسے آتش جنوں خیزی طاری ہو چکی تھی۔ دوا دینے والا ہیلپر تو پہلے ایک لمحے کو خوف زدہ ہوا پھر دہشت زدہ ہو کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس کی خوف زدہ کیفیات سے فائدہ اٹھایا اور جلدی جلدی اپنے دوسرے بازو کی بیلٹ کاٹ ڈالی تب دونوں ہیلپروں کے ہوش ٹھکانے آئے اور وہ جارحانہ انداز میں مجھے قابو کرنے کی غرض سے میری طرف لپکے۔ یہی تو میں چاہتا تھا، پہلے والے ہیلپر نے کچھ زیادہ ہی بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر آپریشن ٹیبل کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا پاؤں آپریشن تھیٹر کے چکنے فرش پر پھیلے ہوئے خون و دیگر آلائش میں پڑ کر پھسلا اور منہ کے بل وہ میری طرف آرہا۔ میں نے اس کے چہرے پر بائیں ہاتھ کا گھونسا رسید کردیا۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز خارج کر کے زمین پر آرہا۔

دوسرے ہیلپر کو میں نے نشتر سے نشانہ بنانا چاہا مگر نشتر کا وار اس کے سینے یا پیٹ پر پڑنے کے بجائے اس کے بازو پر پڑا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ وہ اب اوٹی سے باہر بھاگنے کے چکروں میں تھا کہ میں نے بلاخیز پھرتی کے ساتھ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے دونوں پیروں کے بیلٹ بھی کاٹ ڈالے۔ آزاد ہوتے ہی پھر تو میں جیسے بپھرا ہوا ایک زخمی شیر بن گیا تھا۔ ڈاکٹر گھمٹ اور کمپوڈر ماسٹر حامد تڑپ تڑپ کر ختم ہو چکے تھے۔ ان کے خون اور آلائشوں کے باعث چکنے فرش پر کافی خطرناک حد تک پھسلن پیدا ہو گئی تھی' مجھے خود کو بار بار سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ انجکشن کی فرسٹ ڈوز بھی اپنا غلبہ میرے دماغ میں جمارہی تھی اور خود کو میں نیم غنودہ سی حالت میں محسوس کررہا تھا۔ یہ تو میرے اندر کی آتش جنوں خیزی تھی کہ غیظ جوش تلے میں اپنے مضبوط اعصاب اور خود اعتمادی کو بروئے کار لارہا تھا۔ گھونسا کھا کے اور پھسل کر گرنے والے ہیلپر نے بدحواسی میں اٹھ کر بھاگنے کی کوشش چاہی تھی کہ پھر گر پڑا۔ اس کا سفید کوٹ بھی فرش پر خون کے تالاب میں لتھڑ کر سرخ ہورہا تھا۔ دوسرا ہیلپر جو دروازے کی طرف دوڑا تھا، وہ بھی پھسل کر گرا تھا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے خود میں بھی پھسلتے پھسلتے بچا تھا۔ دونوں نے بے بسی اور خوف کے عالم میں چیخنا چلانا اور ''ہیلپ..... ہیلپ'' پکارنا شروع کردیا تھا میں ابھی تک خطرے میں ہی گھرا ہوا تھا۔ اس لیے جوش کے ساتھ ہوش سے کام لینا بھی ضروری تھا۔ میں ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر دروازے کی طرف بڑھا مجھے کچھ اندازہ تھا کہ آپریشن تھیٹر ساؤنڈ پروف ہوتا ہے۔ میں نے دروازے سے باہر راہداری میں جھانکا..... جہاں روشنی تھی۔ دو افراد چست لباس میں ملبوس آپس میں باتیں کرتے گزرتے نظر آئے۔ وہ ایک دوسرے کاریڈور سے اس طرف گھومے تھے اور اب سامنے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کی میری جانب پشت

تھی۔ مجھے ان کی بیلٹوں میں پستولیں اڑسے ہوئے دکھائی دیے۔ بے شک یہ اسپیکٹرم کے تربیت یافتہ ایجنٹ ہو سکتے تھے اور خود میں کیا تھا۔ اس پر مستزاد مجھ پر نیم غنودگی کا بھی غلبہ سوار تھا مگر بقا کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پاؤں ہلانے ہی تھے، ورنہ تو میرے ساتھ...... اول خیر کی بھی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی، سردست تو میرے لیے یہی بہت تھا کہ میں اس منحوس سرجیکل آپریشن سے بچ گیا تھا۔ اور ان دونوں شیطانوں...... ڈاکٹر گلمٹ اور حامد کو ختم کر چکا تھا یقیناً یہ میرا اسپیکٹرم جیسی تنظیم کو پہنچایا ہوا خاصا بڑا نقصان تھا نہ جانے اس ہشت پا تنظیم کے کتنے شعبے یہاں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل میں مصروفِ کار تھے؟

بہت دھیرے سے دروازہ کھول کے میں باہر نکلا۔ پھر چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ میں پشت کی جانب سے ان دونوں پر پل پڑا۔ میری حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ انہیں خود سے دوبدو مار اماری کا موقع نہ دوں اور کم سے کم وقت میں ان پر قابو پانے کی کوشش کروں کیونکہ جانتا تھا میں کہ میں اس وقت خونی بھیڑیوں کی کچھار میں تھا جبکہ اول خیر بھی ان کے قبضے میں تھا، ابھی تھوڑی دیر میں آرگ تک خبر پہنچنے والی تھی کہ میں اس کے بیس کوارٹر میں کیا گل کھلا چکا ہوں۔ اس کے غرور اور طاقت کے گھمنڈ کی دھجیاں بکھرنے والی تھیں۔ یہ اطلاع پہنچتے ہی بیس کوارٹر کے در و دیوار تک مجھ پر اور اول خیر پر تنگ کر دیے جائیں گے۔

وہ دونوں گویا ''اپنے ہی گھر'' میں اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے، سو مار کھا گئے، دونوں ہی کوریڈور کے فرش پر گرے تھے اور میں نے ان میں سے ایک کو اپنا ہدف بناتے ہوئے اپنے ہاتھ میں دبے نشتر سے اس کی گردن چیر ڈالی اور اس کے پستول پر ہاتھ مارا، یہ امریکن ساختہ جدید آٹو میٹک ''لوگر'' تھا۔ دوسرے نے گرتے ہی اور صورتِ حال کی خطرناکی کو پل کے پل بھانپتے ہی بڑی بلاخیز پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال کر لیٹے لیٹے ہی اس کی خوفناک نال کا رخ میری طرف کر دیا۔ گولی چلانے کا دھماکا ہوا اور اس کی پستول کی نال سے گولی نکلنے کی حسرت ہی رہ گئی گو کہ اس سے پہلے ہی میرے لوگر نے آتشی قہقہہ اگل دیا تھا۔ گولی اس کی پیشانی پھاڑتی ہوئی بھیجے میں اتر گئی تھی۔

میں نے اس کا لوگر بھی اٹھالیا اور دونوں ہاتھوں میں جدید ساختہ ہتھیار سماتے ہی میری ہمت سوا ہو گئی۔ میں اٹھ کر اندازے سے ایک طرف کو دوڑا تو اچانک مجھے چکر سا آ گیا اور میری آنکھوں میں تاریکی چھانے لگی، میرے قدم لڑکھڑا گئے اور میں شاید کوریڈور کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ ایک لوگر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور پھر میں بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چکنے فرش پر گرا۔ میری سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں جانے کدھر سے مجھے دوڑتے ہوئے بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی، یہ میرے لیے انتہائی جاں گسل اور خطرناک لمحات تھے۔

''نہیں، شہزی نہیں، اب گرا تو کبھی نہیں اٹھ پائے گا۔ اٹھ، سنبھال خود کو۔'' میرے اندر جیسے کوئی دھاڑ مار کر چیخا۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ کچھ ہوش و خرد کا یارا ہوا، ایک لوگر ہنوز میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ دوسرا مجھ سے تھوڑے فاصلے سے فرش پر پڑا تھا۔ میں نے بمشکل آگے کی جانب خود کو گھسیٹا اور دوسرے لوگر کو بائیں ہاتھ میں دبوچتے ہی دوڑتے قدموں کی دھمک کی آوازوں کا اندازہ کرتے ہی میں پشت کے بل لیٹے لیٹے اپنے سر کو تھوڑا سا اٹھایا اور میرے لوگر والے دونوں ہاتھ بھی بلند ہوئے، مجھے اپنی ٹانگوں کے رخ پر سامنے سے تین چار مسلح افراد اپنی طرف دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیے اور پھر یہی وہ لمحہ تھا شاید جب مجھے ان سے پہلے ان پر فائر کا موقع ملا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں کے لوگر کے ٹریگر پر میری انگلیاں جیسے بجلی کی طرح تھرتھراتی چلی گئیں اور لوگرز کی نالیں شعلے اگلنے لگیں۔ پے در پے کئی کربہ انگیز چیخیں لوگر کے دھماکوں کی آتشیں خرمستیوں میں ابھریں اور وہ سب ایک دوسرے کے اوپر گولیوں سے چھلنی ہو کر گرنے لگے۔ میری آنکھوں میں چھانے والی دھندلاہٹ ابھی پوری طرح سے چھٹی نہیں تھی۔ تاہم میں نے ایک پھر مضبوط قوتِ ارادی اور چٹخے اعصاب کی بے قاعدگی پر مکمل دسترس قائم رکھتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اب جو بھی کرنا تھا، وہ فوری اور جلد کرنے کا متقاضی تھا۔ پل کے پل میں نے اندازہ لگایا کہ وہ منحوس سلاٹر روم کدھر ہو سکتا تھا مگر عبث مجھے علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ درمیان میں مجھے گردن پر سرنج کی سوئی چبھو کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اول خیر کی طرف سے تشویش کی ابھرتی لہر نے مجھے بولا کر رکھ دیا۔ میں کچھ دیر پہلے آرگ کی ثریا کے ساتھ درندگی اور چنگیزیت کا مظاہرہ ہوتے دیکھ چکا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ آرگ، اول خیر کو گن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے بہ آسانی قابو میں آنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

میں ایک اندازے سے اللہ کا نام لے کر آگے دوڑتا چلا گیا۔ دائیں جانب مجھے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا نظر آیا۔ پھر آگے پیچھے متعدد دوڑتے قدموں کی آہٹ ابھری

جب تک کوئی اس طویل کوریڈور میں نمودار ہوتا' میں غڑاپ سے مذکورہ کھلے دروازے والے کمرے میں گھس گیا۔ کمرا روشن تھا مگر خالی۔ ٹھیک اسی وقت مجھے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

کان دھرنے پر پتا چلا کہ یہ مردود چنگیز نسل...... آرک تھا جو غیظ و غضب کے مارے تقریباً پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پاگل جنونیوں کی طرح چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں احکامات صادر کر رہا تھا۔ یہ آواز مجھے ایک کونے کے قریب سے زیادہ محسوس ہوئی۔ میں نے اس جانب دیکھا وہاں مجھے درز نظر آئی۔ قریب آیا تو عقدہ کھلا وہ ایک فکسڈ دروازہ تھا۔ میں نے اس کی جھری سے آنکھ چپکا دی۔ آرک کا منحوس چہرہ اور ناپاک وجود نظر آ گیا۔ مارے طیش اور جوش غیظ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ وہاں قریب آٹھ دس مسلح ساتھی موجود تھے۔

"وہ کہاں غلطی ہوئی ہے ہم سے...... کس جگہ ہم نے چوٹ کھائی؟ اور کیسے؟ میں نے تو آخری وقت تک اسے بالکل بے بس اور بندھا ہوا آپریشن ٹیبل پر پڑے پایا تھا۔ کیا وہ جن تھا، وچ تھا، یا چھلاوا؟"

"باس! وہ واقعی چھلاوا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیسے خود کو عین اس وقت چھڑا لیا تھا جب اسے بے ہوش کیا جا رہا تھا۔" ایک ساتھی ایجنٹ نے آرک کو بتایا تو وہ اس پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے دہاڑا۔

"جاؤ اب میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اسے ڈھونڈو...... وہ کسی خوفناک عفریت کی طرح ادھر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔" وہ سب الٹے پیروں لوٹ گئے۔ میں تے آرک کو دیکھتے دروازے کو ہولے سے اندر کی طرف تھوڑا دھکیلنا چاہا مگر ندارد۔ وہ بند تھا۔ ایک ساتھی کو اس نے اپنے پاس موجود رہنے دیا تھا۔ اس سے پوچھا۔

"کیا ڈاکٹر گلمٹ اور حامد دونوں ختم ہو چکے ہیں؟"

"یس باس، دونوں پر شہزی نے بہت کاری وار کیا تھا۔"

"شٹ...... شٹ...... اس بدبخت شہزی نے میرا کتنا بڑا نقصان کر ڈالا۔ مم...... میں...... میں ماسٹر لولووش کو کیا جواب دوں گا۔ ایک ایک عام سا لڑکا...... زیرو ہاؤس میں ہمارے بیس کوارٹر میں اتنے تربیت یافتہ لوگوں کی موجودگی میں ... اتنی بڑی تباہی پھیلا کر کسی پُراسرار مخلوق کی طرح غائب ہو گیا۔ تو...... تو...... نیور...... ماسٹر لولووش...... میری کھال ادھیڑ دے گا اور تم سب کی بھی......" آرک کی حالت دیدنی حد تک بڑی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اسے یوں اپنی ہی غیظ و غضب کی آگ میں جلتا سلگتا دیکھ کر میرے انتقامی جذبے کی بھی تسکین ہو رہی تھی۔ میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس وقت اس کے ہرکارے نے کہا۔ "باس! اس کا ساتھی ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم اسے گن پوائنٹ میں لے کر شہزی کو قابو کر سکتے ہیں۔" اس کی بات پر یکلخت میرے کان کھڑے ہو گئے، آرک نے کہا۔ "میں آخر میں یہی کروں گا مگر ابھی نہیں، اسے ڈھونڈو، تم بھی دفع ہو جاؤ میری نظروں سے......" اس کی غصیلی دہاڑ پر وہ بھی الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

میں نے اس مختصر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ خالی کمرا تھا مگر اچانک مجھے اس کے دوسرے کونے والی سمت پر ایک چبوترا نما تھڑا سا ابھرا ہوا دکھائی دیا۔ یہ باکس نما تھڑا کم و بیش پانچ فٹ کا تھا اور فرش سے ایک ڈیڑھ فٹ اوپر بھی تھا۔ میں لپک کر اس کی جانب بڑھا تو عقدہ کھلا یہ ایک مختصر سا زمین دوز زینہ تھا۔ میں لپک کر جیسے ہی اس کے اندر داخل ہوا مجھے اس کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلتا سنائی دیا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ مجھے تھوڑی سی بھی دیر ہو جاتی تو صورتِ حال سنگین تر ہو سکتی تھی، میں تیزی کے ساتھ مگر بے آواز قدموں سے نیچے اترتا چلا گیا۔ پھر ایک مقام پر رک گیا۔ ابھی میں زینے میں تھا۔ نہ جانے اور نیچے کتنی گہرائی تک یہ تہ خانہ جاتا ہوگا مگر چند ثانیوں تک وہیں دبکا رہا اور اوپر دیکھنے لگا۔ دفعتاً میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ کئی چہرے مجھے اوپر سے نیچے تاریک خلا میں جھکے دکھائی دیے۔ یقیناً وہ مجھے دیکھنے سے عاری ہوں گے مگر دفعتاً ان میں سے ایک آواز سن کر میں پریشان ہو گیا۔

"نیچے روشنی پھینکو...... ممکن ہے...... وہ بیسمنٹ میں اُتر گیا ہو۔"

ان شیطانی ہرکاروں کو اگر میری ایک ذرا بھی جھلک نظر آ جاتی تو وہ ادھر ہی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے جبکہ میں نیچے مزید نہیں اترنا چاہتا تھا۔ میری پہلی کوشش اول خیر کو مردود چنگیز صفت آرک کے چنگل سے چھڑانا تھا۔ میری آنکھوں کے گرد ابھی تک ثریا کی اس کے ہاتھوں عبرت ناک اور تھرا دینے والی موت کا منظر تازہ تھا۔ آرک جیسے خبیث اور جلاد آدمی سے کچھ بھی متوقع تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں آرک کو دیکھتے ہی اس پر قابو پانے کی سوچ رہا تھا کہ اس

کمرے کی اچانک ریکی ہوگئی، بہرطور میں روشنی پھینکنے والی بات سن کر تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگا تو اسی وقت اوپر سے کسی ٹارچ کی مدد سے نیچے روشنی پھینکی گئی، اب میرا مزید حرکت پذیر رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نیچے نہ جانے اور کتنا طویل زینہ تھا یا فرش کہاں تک تھا؟ مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ البتہ روشنی پڑتے ہی میں نے خود کو پشت کے ذریعے زینے کی دیوار سے چپکا لیا۔

''ہمیں نیچے اترنا پڑے گا۔ وہ یقیناً ادھر ہی گیا ہو گا۔'' دوسرے نے کہا۔ مجھے پھر پریشانی نے آگھیرا۔ کیونکہ میں کم از کم یہاں ان سے مقابلہ کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ یہ تہ خانہ میرے لیے چوہے دان بن سکتا تھا۔ آرک نے گویا میرے سلسلے میں ایک طرح سے ''ڈیتھ وارنٹ'' جاری کر دیا تھا۔ یہاں مقابلہ کرنے کا مطلب تھا، اپنی قبر آپ کھودنا کیونکہ سب کا پھر ادھر ہی رخ ہو جاتا۔ ابھی تو ان کی ''افرادی قوت'' میری تلاش میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھی۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ جابر اور رابرٹ...... دوسرے زینے سے کم از کم دس پندرہ ساتھیوں کے ساتھ نیچے اتر چکے ہیں۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں جعفر کو فالو کرنا ہوگا۔ اس طرف اب تک کوئی نہیں گیا۔ وہ وہاں اکیلا ہے۔''

ایک دوسری آواز نے گویا میرے اندر تسکین کی بے پایاں لہر دوڑا دی۔ ورنہ تو میں ان کی زبانی یہ سن کر مزید متوحش سا ہو گیا تھا کہ نیچے بھی مسلح دشمنوں کا جتھا موجود تھا۔ گویا یہاں دیکھ لیے جانے کی صورت میں دونوں طرف سے سینڈوچ بن کر رہ جاتا اور یہ تہ خانہ ہی میری قبر بنتا۔

وہ سارے پلٹ گئے۔ میں نے حرکت کی، اوپر آیا۔ ذرا جھانک کر دیکھا۔ وہ جا چکے تھے۔ کمرا خالی تھا۔ میرا مزید اس کمرے میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دونوں جدید ساختہ لوگرز میرے دونوں ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح دبکے ہوئے تھے، دروازے کی جھری سے میں نے جھانکا تو جیسے یکلخت میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ برابر والا کمرا وہی تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں آرک اور اس کے مسلح ساتھیوں کو دیکھ چکا تھا۔ میرے چونکنے کی وجہ وہ دو افراد تھے جو اول خیر کو رسن بستہ حالت میں اسی کمرے کی طرف لا رہے تھے، میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن نے پل کے پل فیصلہ کر ڈالا۔ ''اب نہیں تو کبھی نہیں'' ایک دھڑاکے سے میں نے دروازہ کھولا۔ میرے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب بلند ہوئے اول خیر مجھے فائرنگ پوزیشن میں دیکھ کر بروقت عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً نیچے کو تھوڑا جھکا۔ اسے دائیں بائیں بازو سے دبوچے ہوئے ہرکاروں کو سنبھلنے کا موقع تو دور کی بات تھی، انہیں ایک ذرا جنبش کا بھی موقع دیے بغیر میں نے یک بیک اپنے دونوں پستولوں کے ٹریگر دبا دیے۔ دونوں کو جھٹکا لگا اور زمین بوس ہوتے چلے گئے۔

آگے بڑھ کر میں نے انتہائی پھرتی کے ساتھ اول خیر کے دونوں ہاتھوں کی رسیاں کھول ڈالیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونقیں اور زندگی کی مسرتیں دوڑ گئی تھیں۔ ایک لوگر اسے تھماتے ہی میں نے دروازے کو لات رسید کر دی۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور اندر کوئی اس سے ٹکرا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ وہ آرک تھا جو فائر کی آواز سنتے ہی پستول ہاتھ میں لیے، دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ باہر کی پچویشن کا اسے کچھ اندازہ نہیں ہو پایا تھا اس نے سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی۔ میرے لوگر نے شعلہ اگلا، گولی اس کے پستول والے ہاتھ کی پوری ہتھیلی ہی اڑا چکی تھی، وہ کریہہ انداز میں چیخا، پھر میں نے کسی زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹا مارا اور گردن سے دبوچ لیا پھر خوفناک لہجے میں غرایا۔

''بس! اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا کتے۔''

''تم...... تم...... یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔'' وہ کراہتے ہوئے غیظ آلود لہجے میں بولا۔ اس کا دایاں ہاتھ کلائی سے اڑ جانے کے بعد خون اگل رہا تھا۔ میں نے زہرخند غراہٹ سے اور گویا اس کی حالتِ زار سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ ہمارا دردِ سر ہے۔''

''ماسٹر لولوڈش سے دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ نہیں جانتے تم اس کو، وہ سیکڑوں میل دور بیٹھے بھی تمہیں کسی چڑیا کی طرح بے بس کر سکتا ہے۔'' آرک دھمکیاں دینے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

''تمہارے ماسٹر لولوڈش سے میں بھی دو دو ہاتھ کرنے کو بے چین ہوں۔ اس سے بھی نمٹ لوں گا میں، تم اپنی جہنم میں خیر مناؤ اب۔''

''میں ماسٹر کا خاص آدمی ہوں۔ وہ میری موت کبھی برداشت نہیں کرے گا۔''

''اسے برداشت کرنا پڑے گا...... بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا اور اسے آگے دھکیلا۔

''اول خیر! محتاط رہنا اس سور کی اولاد کو ہم گن پوائنٹ پر ڈھال بناتے ہوئے یہاں سے نکلیں گے۔''

''او خیر...... کاکا، میں تیار ہوں۔ شکر ہے تجھے صحیح

سلامت دیکھ لیا۔ ورنہ تو میری جان ہی سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔" وہ بولا۔

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے آرک کی گردن کے گرد اپنا بازو کا شکنجہ جکڑ رکھا تھا اور لوگر کی نال اس کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی ٹھیک اسی وقت کھلے دروازے پر کئی مسلح افراد امڈ پڑے مگر آرک کی ہیئت کذائی دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

میں نے انہیں خبردار کر دیا اور آرک کو جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ اول خیر میرے ساتھ تھا۔ وہ سب تذبذب میں مبتلا تھے۔ میں نے پھر آرک کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھا کر کہا۔ "اپنے کتوں سے بولو، ہمارا راستہ صاف کریں ورنہ ہم نے اپنے سر پر کفن تو باندھ ہی رکھا ہے۔"

آرک کو اب تک میری خوں ناکی کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا مگر شاطرانہ لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد میری زندگی کی ضمانت کیا ہوگی؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرت آمیز الجھن چمکی۔ میں نے اس سمیت قدم بڑھائے۔ اول خیر بھی میری طرح اپنے "چوطرفہ" سے پوری طرح محتاط تھا کہ آرک کا کوئی ساتھی کسی جگہ سے اچانک ہم پر وار کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ ہم بہرحال دشمن پر کامل سبقت نہیں رکھے ہوئے تھے۔ کوئی بھی چالاکی چل سکتا تھا، آرک نے پھر میرے ساتھ تہدیدی کارروائی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شہزی! اب بھی وقت ہے تم دونوں خود کو ہمارے حوالے کر دو، میں ڈاکٹر گلمٹ اور حامد کی موت کو فراموش کردوں گا اور تمہارے ساتھ اس بار دوستانہ ڈیل کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ خبیث بڑی زبردست مکاری چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا، عیار اور خنزیر صفت آرک کو میں نے جو کاری زخم لگایا تھا اس کے باعث وہ اندر سے کس قدر بپھرا ہوا تھا۔ وہ ایک مکار، سنگ دل اور بے رحم آدمی تھا جس طرح اس نے ثریا کا حال کیا تھا، وہ تھرا دینے والا منظر میری آنکھوں سے نہیں ہٹ پا رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے بھی مکاری دکھائی۔ "مگر اس وقت...... تم نہیں میں تم سے ڈیل کروں گا۔ اپنے ساتھیوں سے کہو ہتھیار زمین پر رکھ کر الٹے پاؤں دوڑ جائیں۔"

"یہ نہیں جائیں گے۔" جواباً آرک غرایا۔ میں نے دانت بھینچ کر اپنے بازو کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد مزید تنگ کر ڈالا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے کراہ خارج ہوگئی۔ "میں تیری گردن توڑ ڈالوں گا خبیث کتے، اور تیری لاش کو بھی ڈھال بنا کر ان پر گولیوں کی بارش کر کے نکل...... جاؤں گا۔ بول ان کو یہ دفع ہو جائیں۔" میری خوں ناک لہجے کے اٹل پن پر ایک لمحے کو آرک کی کھنچی ہوئی بھووں والی آنکھوں میں خوف کی چمک لہرائی، دشمن خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو مگر موت یقینی موت کو سامنے پا کر اس کے اوسان خطا ضرور ہو جاتے ہیں۔ یہی حال آرک کا تھا۔ گردن پر میرے بازو کا شکنجہ تنگ پڑتے ہی اس نے محض ہاتھ کے اشارے سے اپنے مسلح ساتھیوں کو تحکمانہ اشارہ دیا۔ اپنے باس کا اشارہ اور اس کی ہیئت کذائی بھانپ کر انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ اپنے ہتھیار کوریڈور کے فرش پر رکھ کر وہ سب پلٹ گئے۔ میری عقابی نظروں نے ہتھیاروں کا جائزہ لیا۔ وہ جدید ساختہ سب مشین گنیں تھیں۔ میں نے اول خیر کو اشارہ کیا وہ فوراً آگے بڑھا اور دو گنز اٹھالیں جبکہ لوگر اس نے اپنے نیفے میں اڑس لیا۔

"آرک! اب میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا اگر تو نے اب بلا چون و چرا میرے احکامات پر عمل نہ کیا۔" میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔ "نکاسی کا راستہ بتاؤ۔"

"اس طرف......" اس نے آنکھوں کے ڈھیلے گھما کر اور ایک ہاتھ کے اشارے سے سامنے دائیں جانب مڑتی راہداری کی طرف رہنمائی کی' ہم وہاں پہنچے...... بائیں جانب بھی ایک راہداری تھی۔ میں دانستہ آرک کی ہدایت کے بجائے دائیں مڑنے کے بائیں جانب مڑ گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور کنپٹیوں میں فرطِ جوش سے سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

"ادھر نہیں...... ادھر......" آرک پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ میں نے اس پر توجہ نہ دی۔ نہ ہی میں اس پر بھروسا کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ کسی وقت بھی مجھے پھانس سکتا تھا۔ اس طرف...... مجھے ایک دروازہ دکھائی دیا اور میں نے اول خیر کو مخصوص اشارہ کیا۔ جسے بھانپتے ہی اس نے دروازے پر جدید ساختہ سب مشین گن سے برسٹ مارا۔ دروازہ تو اکھڑ گیا۔ مگر ساتھ ہی کئی کریہہ انگیز انسانی چیخیں بھی سنائی دیں۔ معلوم ہوا وہاں بھی اس کے ساتھی گھات لگائے بیٹھے تھے، گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ نے انہیں بری طرح رگید ڈالا تھا کچھ مسلح ساتھی بچ کر دائیں بائیں گھات

لگانے کی کوشش میں مصروفِ کار ہوئے تو اسی وقت آرک کو چالاکی چلنے کا موقع مل گیا کچھ وجہ میری لمحہ بھر کو اس کی طرف سے توجہ ہٹنے کی بھی تھی کیونکہ اس کے مسلح ساتھیوں کا دوسرا ٹولہ اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ آرک نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دائیں بازو کی کہنی میرے پیٹ پر رسید کر دی۔ میں اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجتاً میرے بازو کی گرفت کمزور پڑی جبکہ میرے منہ سے تکلیف کے مارے برآمد ہونے والی ہلکی آواز نے اول خیر کو میری طرف متوجہ کیا تھا۔ آرک بلاشبہ ایک تربیت یافتہ ہی باس تھا اور کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں رہا تھا۔ اس کی ٹانگ نے بھی حرکت دکھائی جو اول خیر کے سینے پر پڑی اس کے لیے بھی یہ اچانک حملہ تھا۔ لات کھا کر وہ پیچھے کو لڑکھڑایا اور کوریڈور کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ادھر مجھے بھی سنبھلنے میں دیر لگی مگر آرک اس مختصر سے دورانیے میں ہی کافی کامیابی حاصل کرنے لگا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکلا اور ساتھ ہی میرے گن والے ہاتھ پر جھپٹا مارنا چاہا کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوا کیونکہ میرے ہاتھ میں تھما ہوا لوگر ہاتھ سے گرا۔ اور اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے پہلو میں کہیں اڑسا ہوا پستول نکالنے کی کوشش چاہی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس پر قابو پانے کے بعد مجھے اس کی جامہ تلاشی لینی چاہیے تھی مگر اب یہ سب سوچنے کا وقت نہ رہا تھا۔ میں نے ایک عقل مندی کی کہ بجائے اپنا لوگر اچکنے پر وقت ضائع کرنے کے میں نے لات چلا دی۔ پستول آرک کے ہاتھ میں آچکا تھا مگر میری بروقت حاضر۔۔۔دماغی اور لات رسید کرنے پر آرک چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا مگر میری یہ کوشش بھی زیادہ دیر خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکی تھی کیونکہ لات کھا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑانے کے باوجود بھی آرک نے حیرت انگیز طریقے سے اپنے حواسوں پر قابو پائے رکھا تھا اور سنبھلتے ہی اس خبیث نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ میری جانب کیے ہی رکھا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اپنی یقینی موت...... خود سے محض چند قدموں کے فاصلے پر محسوس ہوئی تھی اور ایسے نازک ترین لمحات میں اچھے اچھوں کے حواس لمحہ بھر کو مختل ہو جاتے ہیں۔ آرک پہلے ہی مجھ پر زخم۔۔۔کھائے ہوئے تھا۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور آرک کا پورا چہرہ ہی چھلنی ہو گیا۔ اول خیر نے سنبھلتے ہی بروقت اس پر اپنی سب مشین گن سے فائر کر ڈالا تھا۔

''کاکے! ادھر پلٹ آ...... جلدی۔'' وہ چلایا۔ آرک کو بڑے بھیانک طریقے سے جہنم واصل کرنے کے بعد اول خیر نے مجھے پکارا۔ شاید میری طرح اسے بھی اندازہ تھا کہ آرک کے ختم ہوتے ہی اس کے مسلح ساتھی ہم پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں گے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنا لوگر اٹھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اول خیر کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور اس کے عقب میں دوڑتا ہوا پلٹا۔ ہم جیسے ہی مڑے تھے اور ہمارے عقب میں بیک وقت کئی گنز گرج اٹھیں...... میں نہتا تھا اس لیے اول خیر نے اپنا لوگر میرے حوالے کر دیا تھا۔

زیرو ہاؤس کی اس عمارت میں نہ جانے کتنی منحوس بھول بھلیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ نہ ہی ہمیں اس کے محل وقوع کا کچھ اندازہ تھا مگر ہمیں جہاں راستہ سوجھ رہا تھا ہم اندازے سے اسی طرف کا رخ کر لیتے مگر جانتے تھے کہ زیادہ دیر تک ہم اس ''چھپن چھپائی'' کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے ہماری ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ ہم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔

ایک زینے کے دائیں جانب ہمیں بغیر دروازے کا ہال کمرا سا دکھائی دیا۔ ہم دونوں اس کے اندر جا گھسے۔ یہاں الا بلا اشیا کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ ہم دوڑ پڑنے کی روش پر گامزن ہال سے گزرنے لگے۔ ہال کے دوسری طرف دو کھلے پٹ والے دروازے ہلتے دکھائی دیے۔ ہم اسے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے آگے بڑھے تو اچانک ٹھٹک کر رک گئے اور دوسرے ہی لمحے ہمارے بشروں پر بیک وقت مسرت چمکی۔ سامنے ایک طویل و عریض میدان تھا وہاں شام کے سائے اترے ہوئے تھے اور آسمان دور تک نظر آ رہا تھا۔ سرخی اور تاریکی کے امتزاج میں عجیب سا منظر پیش کر رہا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے الیکٹرک پول پر بلب روشن تھے۔ باہر آئے تو دنگ رہ گئے۔ میدان کے تین اطراف تقریباً آٹھ نو فٹ اونچی دیواریں تھیں جن کے اوپر تین رویہ خاردار آہنی باڑیں تین تین فٹ کے فاصلے پر نصب خم دار فولادی بریکٹوں کے ساتھ جال کی صورت میں منسلک تھیں۔ اور یہ سلسلہ تین اطراف تک چلا جاتا تھا۔ سامنے بڑا سا دیوہیکل آہنی گیٹ تھا جبکہ دائیں بائیں طویل القامت آہنی ڈھانچے نصب تھے جن پر بڑے بڑے لوہے کے ڈرم اور بوائلر نصب تھے۔ ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ چوتھی سمت اس عمارت کا رقبہ تھا۔

''او خیر...... کاکے، ان خبیثوں نے اپنے زیرو ہاؤس

کو ایک ''مل'' کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔'' اول خیر پُرتحیر لہجے میں بولا۔ ''مجھے سالونٹ پلانٹ دکھائی دیتا ہے۔''

اس کی یہ بات درست تھی کیونکہ عقب میں مڑ کر میں نے عمارت کی پیشانی پر ''سن ریز سالونٹ پلانٹ'' پڑھا تھا۔ کچھ گاڑیاں اور باربردار ٹرک کھڑے تھے، ایک جانب ہلکی گڑگڑاہٹ سی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ پاور پلانٹ تھا گویا عمارت کو بجلی پہنچانے کا الگ سے اسٹینڈ بائی بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک جارحانہ خیال ابھرا۔ میں نے فوراً اول خیر کے ہاتھوں سے سب مشین گن جھپٹ لی اور اس کا رخ اس سینٹرل پاور پلانٹ کی طرف کر کے برسٹ کھینچ مارا، دھماکوں کی گونج سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چقماق سی روشنیاں ابھریں اور پوری عمارت کی بجلی چلی گئی جبکہ پاور پلانٹ روم میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

''اوخیر......'' اول خیر کے حلق سے ہولے سے برآمد ہوا۔ میں نے دیوہیکل آہنی گیٹ کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے چیخ کر اول خیر کو پکارا۔ اس نے بھی فوراً میری تقلید کی۔

ہم چشم زدن میں گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے، بغلی دروازہ تلاشنے میں مجھے مطلق دیر نہ لگی۔ اسے کھول کر ہم باہر آگئے۔ سامنے کیکر اور سرس کا جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔ دفعتاً ہمارے عقب میں گولیوں کی بوچھاڑ ابھری۔ ٹن...... ٹن...... تڑ تڑاہٹ کی سمع خراش آوازیں ہماری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی تھیں مگر ہم باہر نکل چکے تھے اور جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم نے جو گل کھلانا تھا، وہ کھلا چکے تھے۔ ہماری مہم اگرچہ ایک طرف ناکام بھی ثابت ہوئی تھی تو دوسری طرف کامیاب بھی تھی۔ ثریا ہمیں کچھ بتانے کی حسرت لیے دنیا سے چلی گئی تھی مگر ہم نے آرک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ نیز ڈاکٹر کمٹ اور کمپیوٹر ماسٹر حامد کو بھی جہنم واصل کر کے بنیادی طور پر اسپیکٹرم کو کاری ضرب لگائی تھی۔ اسپیکٹرم کے تین عہدیداروں میں سے ایک آرک، اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا تھا جو لولووش کا خاص الخاص آدمی کہلاتا تھا۔ وزیر جان اور چودھری ممتاز ابھی زندہ تھے۔ اسپیکٹرم کے کیا مذموم مقاصد تھے، ان میں سے کچھ ظاہر ہو چکے تھے باقی تاریکی کے پردے میں تھے۔ وزیر جان میرا اگلا ٹارگٹ تھا۔

ہم زیرو ہاؤس میں تباہی مچا کر نکل بھاگے تھے، آرک کے باقی ماندہ ساتھی ہمارے تعاقب میں آسکتے تھے یا پھر وہ زیرو ہاؤس کے پاور پلانٹ کی آتش زدگی پر قابو


سرگزشت جولائی 2015ء کی جھلکیاں

ماہنامہ سرگزشت

بلند اقبال

عظیم شاعر کا زندگی نامہ

لباس

لباس کے ارتقا کی داستان

سلطنت انکا

ایک ترقی یافتہ تہذیب' جو دنیا سے ختم ہوگئی

عہد بہ عہد

تاریخ عالم قبل از تاریخ

اس کے علاوہ

خون کی روانی تیز کر دینے والی طویل کہانی ''سراب''، فلمی دنیا کی بھولی بسری ہیروئن روز ینہ کا احوال زیست، سفرنامہ، شکار کتھا اور بھی بہت سے سچے قصے، سچ بیانیاں، دلچسپ واقعات

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ مختص کرالیں

پانے میں مصروفِ کار تھے، تاہم میں اور اول خیر بغیر رکے تاریک جنگل میں دوڑتے رہے۔ جنگل مختصر ثابت ہوا تھا کیونکہ اس کے بعد ایک ہائی وے کی طرف سے روشنیاں سی متحرک نظر آنے لگی تھیں۔ ہم نے وہیں پہنچ کر دم لیا تھا اور ایک جگہ تاریکی میں ٹھہر کر اپنی بے ترتیب اور پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔

''اب کیا ارادے ہیں شہزی کاکے؟'' اول خیر نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ جب تک میں بھی اپنی سانسیں درست کر چکا تھا، بولا۔ ''پہلے والے نامکمل رہ جانے والے مشن کو مکمل کرنا ہے۔''

''تمہارا مطلب...... اسٹیشن فور پر چڑھائی؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہو گیا ہے اول خیر! مگر اسے دنیا سے رخصت کرنے سے پہلے...... مجھے بہت کچھ بتانا ہوگا۔ ابھی اس کی زندگی میرے لیے بہت اہم ہے۔ ورنہ اس کی بے وقت موت مجھے زندہ درگور کر ڈالے گی۔''

''او خیر...... کاکے، میں سمجھ رہا ہوں تیری بات۔'' وہ بولا۔ ''اس پر بھی ہم قابو پالیں گے، آرک جیسے شاطر گورے کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا، یہ کم بات نہیں۔ پتا نہیں یہ رذیل شیطان کیسے کیسے بھیانک مقاصد لے کر یہاں آن وارد ہوا تھا۔ مجھے تو اس وقت تیری طرف سے تشویش ہی نے مار ڈالا تھا جب یہ خبیث گورا تجھے نہ جانے کدھر لے گیا تھا۔''

میں اس کی بات پر مسکرایا۔ پھر جب اسے اصل حقیقت کا پتا چلا تو اول خیر خوف زدہ سا ہو گیا اس کے لیے یہ سب نیا تھا جو ڈاکٹر گلکسٹ اور حامد میرے ساتھ آرک کے حکم پر اس منحوس آپریشن تھیٹر میں کرنے والے تھے۔

ٹھیک اسی وقت ہمیں اپنے عقب میں روشنیاں دکھائی دیں۔

''او خیر...... کاکے، لگتا ہے دشمن تعاقب میں آ رہا ہے۔'' میرے چہرے پر بھی تشویش کے آثار امڈ پڑے۔ ہتھیار ابھی ہم نے پھینکے نہیں تھے۔ ہائی وے دور تک ویران اور چمکتی نظر آ رہی تھی۔ شام گہری ہو کے تاریکی میں بدل چکی تھی۔

☆☆☆

دشمنوں کی ''باقیات'' ہمارے لیے اس وقت بھی کئی مشکلات کھڑی کر سکتی تھیں۔ کوئی بعید نہ تھا کہ آرک وغیرہ کی موت اور زیرو ہاؤس میں ہونے والی خون ریزی کی خبروں نے دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دی ہوگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

''سڑک کے پار دوڑ چلو، کاکا۔'' دفعتاً اول خیر نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں آئے ہیں۔''

میں نے اس کی بات پر صاد کیا اور بہ سرعت...... سڑک پار کر کے دوسری جانب کے کچے میں آ گئے اور پھر تیزی کے ساتھ قدرے نشیبی ڈھلان میں اترتے چلے گئے۔ یہاں بھربھری مٹی کی سوندھی سوندھی بو خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جسے محسوس کر کے اول خیر نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ ساہیوال کا انڈسٹریل ایریا معلوم ہوتا ہے یہاں جابجا کاٹن، فلورمل اور سالونٹ پلانٹ قائم تھے۔ اسپیکٹرم نے اپنے وسیع تر مفادات کے لیے اس علاقے کو اپنا بیس کوارٹر بنایا تھا تو کچھ سوچ کر ہی بنایا تھا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ مجھے امید نہ تھی کہ اتنی جلدی دشمن ہمارے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔ ورنہ تو ابھی تک انہیں اپنے زخم چاٹتے رہنا چاہیے تھا ممکن تھا۔ آرک کی موت کے بعد سیکنڈ کمانڈ ممتاز خان یا وزیر جان کے سپرد ہو چکی ہو اور انہوں نے فون پر ہدایات جاری کر دی ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے اب تک زیرو ہاؤس کی ہنگامی یا تباہی وغیرہ کی صورتِ حال اسٹیشن چیف اور کیملا ایجنٹ تک پہنچا دی گئی ہو۔ بہر طور، میں اور اول خیر رکے نہیں اور تاریکی کا حصہ بنے آگے بڑھتے رہے۔ ہائی وے کے بعد یقیناً دشمن بھٹک سکتے تھے۔ مجھے امید تھی آرک کے واصل جہنم ہو جانے کے بعد ان کے حوصلے اور امیدیں پست ہو چکی ہوں گی اور وہ محض تلاشِ غنیم میں ایک فارمیلٹی پوری کرنے ہی نکلے ہوں۔

کافی آگے جا کر ہم نے عقب میں دیکھا بھی تھا، ہمیں کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ صاف ظاہر تھا، وہ بھٹک گئے تھے۔ میں اللہ کے حضور صد شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے ایک منحوس اور قاتل گھڑی سے بال بال بچایا تھا۔ ورنہ تو میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اب بس اس بھیانک گھڑی کا تصور کرتے ہوئے بے اختیار مجھے سرتاپا جھرجھری سی آ جاتی تھی کہ اگر وہ مردود آرک اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور اس سرجیکل آپریشن میں وہ مائیکرو الیکٹرانک ڈیوائس میرے جسم کے کسی حصے میں نصب کر دی جاتی تو میں بڑی مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔

خودرو جھاڑیوں اور ٹیلے ٹبوں کا سلسلہ ختم ہوا تو کسی

کچی آبادی کے آثار اور کچھ کھیتوں کے سلسلے دکھائی دیے۔ جدھر سے آوارہ جانوروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ہم ایک جگہ رک گئے۔

''اوخیر، کاکا! بڑا پالا مارا ہے۔'' اول خیر بولا۔ اس کے لہجے سے تشویش ہویدا تھی۔ کامیابی کا جوش بھی تھا۔ ''پر شہزی کاکا! لگتا ہے اب کچھ ایسا ہی ہے اس گورے سؤر...... آرک کی ہلاکت کے بعد ہم نے کچھ ولایتی قسم کے دوکھرے ہی لوگوں سے دشمنی مول لے لی ہے۔''

''یہ دشمنی مجھ پر زبردستی جبر کی صورت مسلط کی گئی ہے، اول خیر۔'' میں نے کہا۔

''چودھری ممتاز نے اپنے کہاں تک ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے تھے۔ یہ تو اب ہمیں معلوم ہوا ہے۔ پر یار! پتا نہیں میرے دل کو ایک عجیب اور نامعلوم سی بے چینی اور تشویش سی محسوس ہونے لگی ہے۔''

''اوخیر، کاکے! اب کیسی بے چینی...... کیوں پریشان ہوتا ہے تو؟ ٹھیک ہے جو راہ میں آئے گا اسے منہ توڑ جواب دیں گے اور پھر شہزی کاکے! تیری تو اپنی پہنچ بھی بہت اونچی ہو گئی ہے۔ میجر ریاض باجوہ صاحب سے تیری اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی ہے۔ ہمیں یہ ساری کارروائی ان کے علم میں بھی لانی چاہیے اور انہیں آگاہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اسپیکٹرم والے اس کی ٹارگٹ کلنگ کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔''

اول خیر! اب بھی میری اصل تشویش کی وجہ نہیں جان سکا تھا میں درحقیقت عابدہ کی طرف سے نامعلوم سی تشویش آمیز بے چینی کا شکار تھا کیونکہ اب تک میرا جن بڑے دشمنوں سے (بشمول آرک) سامنا ہوا تھا انہوں نے مجھے اشارۃً عابدہ کی طرف سے بھی مجھے وقتاً فوقتاً دھمکایا تھا۔ پہلے میں ان کی بکواس کو گیدڑ بھبکی سمجھتا تھا مگر اب اسپیکٹرم سے ٹکراؤ ہونے کی صورت میں مجھے کچھ لگتا تھا کہ یہ دھمکیاں ایک بڑے خطرے کی طرف اشارہ کرتی تھیں اور دشمن مجھ پر باور کراتے آ رہے تھے کہ وہ عابدہ کی صورت میں ایک ترپ کا پتا ان کے ہاتھ میں تھا جو اسے کسی بھی وقت ایک ٹرمپ کارڈ کی صورت میں میرے خلاف آزما سکتے تھے، عابدہ کو امریکا بھیج کر میں اب تک مطمئن تھا کہ وہ سردست دشمنوں کی پہنچ سے دور تھی مگر اب اسپیکٹرم اور لولوش جیسے بین الاقوامی بااثر گینگسٹرز کی شمولیت سے مجھے خود بھی اب یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ عابدہ مجھ سے سیکڑوں میل دوری پر...... ایک ان دیکھے خطرے میں تو نہیں گھری ہوئی، جبکہ خود عابدہ نے بھی فون پر بارہا مجھ سے کسی انجانے خطرات کا اظہار بھی کیا تھا۔

''اوئے کاکے، کیا بات ہے، تو بہت پریشان ہو گیا ہے؟'' مجھے خاموش اور سوچتا پا کر اول خیر نے مجھے ہولے سے ٹہوکا دیا تو میں چونک کر خیالات کے بھنور سے نکلتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں یار...... بس اب یہاں سے نکلنے کی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں آبادی کی طرف رخ کرنے کے بجائے دوبارہ سڑک کی طرف رخ کرنا چاہیے دشمن جا چکے ہیں۔''

اول خیر نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ہم دوبارہ پلٹے اور ہائی وے پر آ گئے۔ یہاں ہمیں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا غالباً دشمن یہ تسلی کرنے لگے ہوں گے کہ ہم دونوں زیرو ہاؤس کے گرد و جوار سے نکل چکے تھے یا ابھی مزید کہیں چھپ کر دوبارہ شب خون مارنے کو گھات لگائے بیٹھے تھے۔

''میرا ارادہ اس علاقے کی طرف روانگی کا تھا جدھر اسٹیشن فور تھا۔ وہیں ہماری کار بھی ایک آٹو مکینک گیراج میں ٹیوننگ وغیرہ کے لیے موجود تھی۔ یقیناً گیراج والا بھی حیران ہوگا کہ ہم کار چھوڑ کر اچانک کدھر غائب ہو گئے تھے۔ اب ظاہر ہے رات کافی ہو گئی تھی، گیراج بند ہی ہوگا۔ تاہم شہر پہنچ کر ہمارا ارادہ کسی چھوٹے موٹے اقامتی ہوٹل میں رات گزارنے کا تھا۔

جلد ہی شہر کی طرف جاتی ہوئی ایک مسافر نائٹ کوچ مل گئی اور ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

شہر پہنچ کر ہم اترے۔ رات ایک ہوٹل میں گزاری۔ اگلے دن سویرے جاگے اور ہوٹل چھوڑ دیا۔ سب سے پہلے ہم نے ٹیکسی کر کے مذکورہ گیراج پہنچ کر اپنی کار حاصل کی اس کے بعد دوبارہ اسٹیشن فور کی جانب روانہ ہوئے جس کی عمارت وہاں سے محض چند فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

شب بسری کے بعد ہم دوبارہ تازہ دم ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی تھی اور اول خیر میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں کار کو درمیانی رفتار سے دوڑاتا ہوا اسٹیشن فور کی عمارت کے قریب پہنچا تو میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہونے لگی۔ وزیر جان نے میرے گمشدہ ماں باپ کے بارے میں جو تذکرہ کیا تھا اس کے بعد میں وزیر جان کی گردن ناپنے کے لیے سخت بے چین تھا۔ زیرو ہاؤس سے حاصل کردہ ایک سب مشین گن اور دو لوگرز ابھی تک ہمارے قبضے میں تھے، اول خیر نے

میرے چہرے کے پُرجوش تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے ایک بات کی طرف اشارہ دیتے ہوئے اتنا ضرور کہا کہ اسٹیشن فور کی عمارت ایک ادارے کے زیردست ہے لہٰذا یہاں میری ایسی کوئی دورانہ وار حرکت ہمیں قانون کی نظروں میں مجرم بنا سکتی تھی، اس پر مستزاد ہمارے پاس غیر قانونی ہتھیار بھی تھے۔ مجھے نہ جانے کیوں کبھی کبھی اول خیر کی ایسی باتوں سے سخت اختلاف ہوتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ اسٹیشن فور کی عمارت کے قریب پہنچ کر میں نے کار روک دی۔ سب مشین گن ہم نے کار کی سیٹ کے نیچے چھپا دی جبکہ لوگر ہمارے قمیضوں کے اندر اڑسے ہوئے تھے مگر اسٹیشن فور کی عمارت کے گیٹ پر بڑا سا تالا دیکھ کر میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہاں ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔" اول خیر نے گویا ایک پُرسکون ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔

"وزیر جان کو اب تک تیری کامیاب مہم جوئی کا پتا چل چکا ہوگا اور اس بات کا اندازہ بھی اسے ہوگیا ہوگا کہ ہم کسی بھی وقت دوبارہ یہاں کا رخ کر سکتے ہیں۔"

"یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی......" میں نے دانت بھینچ کر کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ اندر ہی ہو۔"

"اگر وہ اندر ہوگا بھی تو دوبارہ ہمارے لیے پھندا تیار کیے بیٹھا ہوگا شہزی کاکا! مگر میرا نہیں خیال کہ ان حالات میں وہ یہاں موجود ہو۔" اول خیر نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو مجھے اس کی بات پر صاد کرنا پڑا تاہم بولا۔

"لیکن یار! وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔"

"میں تیری بے چینی سمجھتا ہوں کاکا، مگر ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ میرا خیال ہے پھر...... ہمیں اس کی شہر والی کوٹھی کنال لاج کا رخ کرنا چاہیے۔" اس نے کہا اور میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کی بات درست تھی۔ اسٹیشن فور پر سناٹا طاری دیکھ کر مجھے بھی مایوسی ہوئی تھی۔ وزیر جان یا اس کے "بڑے" اب زیرو ہاؤس کے کریش ہونے کے بعد یقیناً کوئی اور لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتے ہوں گے شاید اس لیے انہوں نے یہاں سے فی الحال اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا ہوگا۔

اگلے چند منٹوں میں ہماری کار فراٹے بھرتی ہوئی شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہر پہنچ کر ہم نے سیدھا کنال لاج کا رخ کیا تھا۔ دن کافی نکل چکا تھا۔ لوگوں کی چہل پہل دیکھنے میں آرہی تھی۔ اول خیر کو زیادہ تشویش ہمارے پاس موجود ان غیر قانونی ہتھیاروں کی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ ہم بہت جلد ان سے چھٹکارا پالیں گے۔

کنال لاج پر بھی بظاہر سناٹا طاری محسوس ہوا۔ البتہ چوکیدار موجود تھا۔ دفعتاً گیٹ کھلا اور اندر سے ایک لمبی سی چمچماتی کار نمودار ہوئی، میں چونکا اور بہ غور بھویں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ کار کے اندر فقط ایک ماڈرن ٹائپ کی خاتون براجمان تھی، اور خود ہی کار ڈرائیو کر رہی تھی، گیٹ سے نکلتے ہی اس نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور ہماری کار کے بالکل قریب سے زناٹے کے ساتھ گزر گئی۔ مگر میرے چونکنے سے پہلے ہی عقابی نظریں عورت کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اسی لیے مجھے اس عورت پر شناسائی کا شائبہ ابھرا تھا اور میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں اس عورت کو پہچان چکا تھا اگرچہ کئی ماہ و سال بیت چکے تھے۔ مگر اس عورت کو اس چہرے کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ بے شک گزرتے وقت کی گرد پرانے نقوش اپنی تہ میں دبا ضرور لیتی ہے مگر کچھ ایسے نقوش واضح ضرور تھے جو کسی دوسرے کے لاشعور میں نقش ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ میری سوتیلی ماں ہی تھی اب پتا نہیں تھی بھی یا نہیں مگر بہرحال عورت یہ وہی تھی جو وزیر جان کی چہیتی بیوی کہلاتی تھی۔ اس حیرت سے قطع نظر کہ ان دونوں غریب میاں بیوی کی معاشی کایا پلٹ کسی کی رہینِ منت ہوگی، مجھے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اس بظاہر جاہل اور مردمار عورت نے بھی خود کو نئے اور ماڈرن ماحول میں ڈھال لیا تھا۔

میں نے فوراً کار اس کی کار کے تعاقب میں لگا دی۔

"او خیر...... کاکا! کیا تو اس زنانی پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔" مجھے اس کے تعاقب میں روانہ ہوتے پاکر اول خیر نے کہا تو میں اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت اور نظریں سامنے ونڈ اسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"ہاں اول خیر، کیونکہ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

www.paksociety.com

**خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ**

وہ بہت دنوں سے زندگی کی بساط پر سرور و نشاط کی بازی کھیل رہا تھا... تمام مُہرے اس کی جنبشِ نظر کے مطابق حرکت کررہے تھے مگر اچانک اسے ایک روز محسوس ہوا... ان دغاباز ساعتوں کی کہانی... جب محبت کے رشتوں نے اپنا اعتبار کھو دیا...

**بے وفائی کر کے وفا کی امید رکھنا عین حماقت ہے...**

**ایک دیرینہ ہمدم کی یکدم اجنبی ہوجانے کی تلخ نوائی...**

# رنگِ وفا

امجد رئیس

"میرا کیا قصور ہے؟ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوگئی... اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ بس یہ ہوگیا۔" کارلا نے کہا۔ وہ بستر پر اوندھی لیٹی اسے تک رہی تھی۔ کہنی تکیے پر تھی اور ٹھوڑی ہتھیلی کے پیالے میں۔

"میں واقعی نہیں چاہتی تھی... پتا نہیں یہ سب کیسے ہو گیا؟"

وہ مسکرایا اور کارلا کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ "تم کیوں خود کو پریشان کررہی ہو؟ کیوں

اُداس ہو؟''

کارلا نے آہ بھری اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ''میں اداس نہیں ہوں لیکن خوش بھی نہیں ہوں۔''

''کم آن بے بی... تم دراصل خوف زدہ ہو اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے کارلا کو تسلی دی۔

''کبھی کبھی جب میں ٹام کو دیکھتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''تو مجھے انجانا سا ڈر لگتا ہے۔ جیسے وہ ہم دونوں کے بارے میں جان چکا ہے۔''

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اسے کیونکر پتا چل سکتا ہے؟''

کارلا کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔ ''مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے۔ کیسے پتا چل سکتا ہے... میں نہیں جانتی۔''

''ہم نے اب تک بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔'' اس نے پھر کارلا کو دلاسا دیا۔

''ہاں، احتیاط، حماقت اور خود غرضی...''

''تمہیں وہم ہو گیا ہے۔''

کارلا نے ہوٹل کے کمرے میں نظر دوڑائی۔ ''مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی شناسا کار میں مجھے یہاں آتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ مجھے ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے ہیں... کبھی ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''مجھے لگتا ہے کہ اب تم سوتے میں بولنا نہ شروع کر دو۔'' وہ کارلا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے مسکرایا۔

''اوہ لارڈ! ایلن، تم مجھے اور ڈرا رہے ہو... کیا تمہیں دھڑکا نہیں لگا رہتا کہ اگر لزا کو پتا چل جائے تو؟''

ایلن ہنس پڑا۔ اس کا سرتنی میں ہل رہا تھا۔ ''لزا کو اگر پتا چل جائے تو وہ مجھے شوٹ کر دے گی۔ میں اس کے بارے میں سوچ کر پریشان نہیں ہونا چاہتا۔ یہ ایک چانس ہے، بس۔ میرا نظریہ ہے کہ انسان کو جگہ جگہ چانس لینا پڑتا ہے۔ زندگی بذاتِ خود ایک چانس ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہر وقت پریشان ہوتے رہیں کہ اب کیا ہوگا۔ اس طرح ہم لمحۂ موجود اور اپنی ملاقاتوں کے لطف کو بھی غارت کر بیٹھیں گے۔'' ایلن نے فلسفہ جھاڑا۔

''ہاں، شاید۔'' اس کی آواز میں غیر یقینی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ ''مجھے تاخیر نہ ہو جائے۔ میں شاور لے کر روانہ ہوتی ہوں۔ ڈنر بھی تیار کرنا ہے۔'' کارلا نے گھڑی دیکھی۔

''او کے، سویٹ ہارٹ۔'' ایلن اٹھ بیٹھا۔

☆☆☆

واش روم کا دروازہ کارلا نے کھولا۔ اسی وقت عقب سے دبوچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے والا ایلن تھا۔ کارلا کی چیخ بروقت گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ہمیشہ کے لیے وہ خوفناک منظر اس کی یادداشت میں محفوظ ہو گیا۔

بے نور آنکھوں والی لاش ٹب کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ پیشانی پر گولی کا سوراخ تھا۔ سیاہ پتلون اور قمیص گہرے رنگ کی تھی۔ کارلا کا سر گھومنے لگا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ایلن نے دروازہ بند کیا اور کب اسے گھسیٹ کر واپس بیڈ تک لایا۔ کارلا پر ہسٹریائی کیفیت طاری تھی۔

ایلن بھی بدحواس تھا۔

''پلیز... پلیز... خود پر قابو پاؤ، کوئی سن لے گا۔ خاموش رہو۔'' وہ گڑگڑایا۔ اس نے کارلا کے دونوں بازو پکڑے ہوئے تھے۔ وہ چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا گویا راہِ فرار تلاش کر رہا ہو۔

''اوہ گاڈ۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

کارلا کا بدن لرز رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

''اٹھو، کپڑے بدلو۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

ایلن نے اسے چھوڑ دیا۔ کارلا نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

''وہ... وہ... وہ... آدمی...'' وہ پھر کانپنے لگی۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے۔

''ایلن... میں... مجھے لگ رہا ہے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔''

''سنو۔'' ایلن نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''ہوش میں رہو۔ یہ ہوش میں رہنے کا وقت ہے۔ ورنہ دونوں مارے جائیں گے۔ بیٹھو ادھر۔ میں پانی لاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے خالی خالی نظروں سے ایلن کو دیکھا۔ ''لل... لیکن کیا ہمیں پولیس کو نہیں بتانا چاہیے؟''

''پولیس؟ پاگل ہو گئی ہو کیا؟''

''ہم نے تو اسے نہیں مارا۔'' وہ بولی۔

''اوہ گاڈ۔'' ایلن نے سر اٹھا کر چھت کو گھورا۔ ''بات پھیل جائے گی۔ پولیس کو کیا جواب دیں گے۔ ٹام اور لزا کو بھی خبر مل جائے گی۔ یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' ایلن چپ

ہو گیا اور واش روم کے بند دروازے کو گھورنے لگا۔

''بدحواسی میں سب کام بگڑ جائے گا۔'' اس نے خود کلامی کی... ایک منٹ ہمیں سوچنا چاہیے۔''

''بعد میں سوچیں گے۔'' کارلا نے اپنا حلیہ درست کرنا شروع کیا۔ ''پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

ایلن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ ہم پیچھے ایک لاش چھوڑ کر ٹہلتے ہوئے نکل جائیں۔''

کارلا نے تھوک نگلنے کی کوشش کی۔ ''ہم پکڑے جائیں گے۔ ایلن! منیجر پولیس کو بتادے گا کہ ہم کب آئے اور کب گئے۔ وہ یہ بھی بتادے گا کہ ہم یہاں آتے رہتے ہیں۔ پولیس ہمارے پیچھے آئے گی۔ ٹام کو پتا چل جائے گا... اور...''

''اپنا منہ بند رکھو۔ مجھے سوچنے دو۔ تم بولتی رہو گی تو میرا ذہن کام نہیں کرے گا۔'' ایلن نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''لیکن میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میں اس مرڈر کیس میں ملوث نہیں ہو سکتی۔ اگر ٹام...'' وہ رونے لگی۔

''اور میرا کیا ہوگا؟ تم خود کو مصیبت میں خیال کر رہی ہو۔ صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو۔'' ایلن نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں کیا کروں؟ اگر گھر پہنچنے میں مجھے تاخیر ہو گئی...'' وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔

ایلن پُرتفکر انداز میں خاموش رہا۔

''ایلن! ہم سے پہلے جو یہاں ٹھہرا تھا، قتل یقیناً اسی نے کیا ہے۔ اگر ہم منیجر کو بتا دیں کہ ہمیں یہاں لاش ملی ہے...'' کارلا نے تجویز دی۔

''ویری گڈ۔'' ایلن کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ''اور منیجر یقین کر لے گا۔ ظاہر ہے پولیس تک خبر پہنچے گی۔ اگر ہم سے پہلے اس کمرے میں آنے والے نے جعلی نام استعمال کیا ہے، پھر کیا ہوگا۔ میں نے بھی یہاں اصل نام ظاہر نہیں کیا ہے۔''

''میں جا رہی ہوں۔ ایلن مجھے جانا پڑے گا۔''

کارلا کے چہرے سے دہشت ٹپک رہی تھی۔

ایلن کے چہرے پر درشتگی ظاہر ہوئی۔ ''موج کرنے کے لیے تم میرے ساتھ تھیں۔ مصیبت میں اکیلا بھگتوں گا۔ بُرے وقت میں بھی ہم دونوں ساتھ ہوں گے۔'' وہ تڑخ اٹھا۔

کارلا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ''لیکن... لیکن... میں کیسے رک سکتی ہوں؟'' اس کی آواز میں بے بسی تھی۔ آنکھوں میں التجا۔

''آواز دھیمی رکھو۔''

کارلا نے چاروں طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی قید خانے میں بند ہے پھر اس نے ایلن کو دیکھا جو پنجرے میں پھنسے جانور کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہا تھا۔

''ہم اس منحوس جگہ پر پھنس گئے ہیں۔'' وہ کراہ اٹھی۔

''اپنا منہ بند رکھو۔'' ایلن نے بمشکل آواز دبائی۔ وہ غصے میں تھا۔ ''میرا دماغ ٹھنڈا رہے گا تو میں ہر زاویے سے غور کر سکوں گا۔''

''کیا... کیا مطلب؟''

ایلن کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ رک کر اس نے کارلا کو گھورا۔ ''سوچو... ذرا سوچو۔ فرض کرو تمہارے خدشات ٹھیک تھے۔ ٹام کو علم تھا۔ تم یہاں کسی سے ملتی ہو۔ وہ یہاں آیا اور میری جگہ کسی اجنبی کو ختم کر کے چلا گیا۔''

''نن... نہیں... نہیں۔'' کارلا نے تیزی سے سر دائیں بائیں ہلایا۔

ایلن پھر کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ معاً وہ رکا اور واش روم کی جانب گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا۔ ''یہ پاگل پن ہے۔ دیوانگی ہے۔ درندگی ہے۔'' اس نے ایک ہاتھ کی مُٹھی دوسرے ہاتھ پر ماری۔

سکوت کا ایک طویل کربناک وقفہ آیا۔ ایلن نے گہرا سانس لیا۔ ''ایک چانس ہے۔''

''نکل جائیں۔ اپنی اپنی گاڑی میں خاموشی سے چلے جائیں۔'' کارلا جھٹ سے بول اٹھی۔

''تم کب سے اتنی احمق رہی ہو؟'' ایلن بولا۔ ''ہم بارہا یہاں آچکے ہیں۔ منیجر خوب جانتا ہے۔''

''لیکن اسے تمہارا اصل نام نہیں معلوم۔''

''اوہ گاڈ! میں اپنا چہرہ کہاں لے جاؤں؟'' ایلن نے اپنے رخسار پر انگلی رکھی۔ ''وہ اس شکل کو پہچانتا ہے۔ تمہاری صورت بھی۔ وہ ہماری گاڑیوں کی بھی نشاندہی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس گاڑیوں کی لائسنس پلیٹ کے نمبر بھی ہوں۔''

وہ پھر کانپنے لگی۔ ''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ کبھی دوبارہ یہاں نہ آؤں۔''

ایلن کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں گویا ہوا۔ ''ہاں، یہی ایک راستہ ہے۔ رات کی تاریکی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس میں اگرچہ خطرہ ہے لیکن اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ اندھیرے میں، میں اس مصیبت کو گاڑی کے ٹرنک میں رکھ کر لے جاؤں گا۔ کسی مناسب جگہ پر اسے پھینک دوں گا۔''

کارلا کی جان میں جان آئی۔ ''ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک... تم یہ کر سکتے ہو۔ مجھے جانا چاہیے۔''

ایلن نے گہری نظر سے کارلا کو دیکھا۔

''ایسے مت دیکھو، پلیز میری مجبوری سمجھو۔'' کارلا منت سماجت پر اُتر آئی۔

''ویری فنی۔'' ایلن نے کہا۔ ''یوں معلوم ہوتا ہے کہ ڈوبتے جہاز سے کودنے کی تیاری ہے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟ میں ٹام کو کیسے قائل کروں گی؟'' وہ بُری طرح روہانسی ہو گئی۔

''میں کچھ نہیں چاہتا۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کی طرف گیا۔ ونڈو بلائنڈ میں رخنہ کر کے باہر جھانکا۔

''سرما میں سورج جلدی غروب ہو جاتا ہے۔'' کارلا پُر امید انداز میں بولی۔

''ہاں، مجھے پتا ہے۔'' ایلن پلٹا۔

''تم لاش کو کہاں پھینکو گے؟'' کارلا نے بھنچی آواز میں سوال کیا۔

''تمہارے گھر کے سامنے۔ وہی بہتر جگہ ہے۔'' ایلن زہرخند سے بولا۔

''اوہ پلیز، تم مجھے مجرم کیوں سمجھ رہے ہو۔ میں اپنی تاخیر کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتی جبکہ تم لزا کو فون کر کے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایلن نے انگلی اٹھائی۔ ''دیکھو اگر میں لاش کو ٹھکانے لگاتے وقت پکڑا گیا تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''کک... کیا مطلب؟''

''تمہیں گواہی دینی پڑے گی کہ میں بے قصور ہوں۔'' کارلا کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ ایلن کی بات کا مفہوم سمجھ گئی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیا یہ سب واقعی میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ اوہ... تو۔ ایلن تم تو میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ تمہیں میرا نام اس معاملے سے الگ رکھنا چاہیے... تمہیں پتا ہے میری مجبوریوں کا...'' وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ امید تھی۔

فضا بوجھل ہو گئی۔

''کارلا! تم نے محبت کے بارے میں کیسے سوچ لیا؟''

''ایلن!'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کے چہرے پر غم و غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''ہم اس وقت مصیبت میں ہیں۔ ایک ساتھ۔ تم اور میں۔'' ایلن نے کہا۔

''تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی؟''

''اُف ف... اس وقت ہم آفت کا شکار ہیں۔ تم محبت کو لے کر بیٹھی ہو۔''

کارلا دھیمے انداز میں اٹھی۔ اس کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔ غصے کی سرخی۔ اس کی آواز بلند ہو گئی۔

''میں جا رہی ہوں۔ جہنم میں جاؤ۔ جو کرنا ہے کرو۔ مجھے آئندہ کال مت کرنا۔ نہ کسی بھی طرح ملنے کی کوشش کرنا۔ میں واقعی احمق تھی۔ نہ میں کوئی گواہی دوں گی۔ چاہے تم لاش میرے گھر کے سامنے ہی پھینک دو۔'' وہ یک دم آگ بگولہ ہو چکی تھی۔ کارلا پیر پٹختے ہوئے چلی گئی۔

اس کے جاتے کے بعد ایلن بند دروازے کو گھورتا رہ گیا۔ باہر کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی پھر وہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔

ایلن بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ خاموشی اور احتیاط سے باہر نکلا۔ اپنی گاڑی سے ایک رین کوٹ نکالا اور ٹرنک کا لاک کھلا چھوڑ دیا۔ اطراف کا جائزہ لیتا ہوا وہ واپس آیا۔

وہ سیدھا کمرے میں واش روم کی طرف گیا۔ دروازہ کھولا۔ اس کے لبوں پر ایک کامیاب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایلن نے مصنوعی لاش کو رین کوٹ میں لپیٹا اور بولا۔

''شکریہ، بابا جارج۔ تم اس مرتبہ بھی خوب کام آئے۔ چلو تمہیں اسٹور تک پہنچا دوں۔ فی الحال کئی مہینے آرام کرو۔''

**VV**

# تلاش

سکندر عسلیم

احساسات کی لرزشوں اور اپنے دل کی جُنبشوں کے ہاتھوں ہم ایسے نقصان اٹھاتے ہیں... جس کا کبھی کوئی مداوا نہیں ہوتا... وہ کٹھن کام جن کا ہمیں کوئی صلہ نہیں ملتا... وہ کبھی کبھی ضرور جگمگاتے ہیں اور اپنی عظمت کا اعلان کرتے ہیں... اور جو صعوبتیں جھیلتے ہوں... وہ ہمارے سروں پر سرفرازی کا تاج بن کے چمکیں گی... ایک ایسے ہی سلسلے کی کڑی... اس کا ہر قدم آنے والے دنوں کے لیے خوشگواری اور انصاف کا پیام بر تھا...

**وقت اور حالات کے تحت جرم کا شکار ہونے والے ایک شکاری کی بپتا...**

میں ایک شوقیہ سراغ رساں ہوں اور اپنی یادداشت اور چرب زبانی کی بدولت میرا کاروبار خوب چل رہا ہے اس لیے میرے لیے اس فون کال کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ ویسے بھی اس فون کا تعلق جرسی سے تھا جہاں سے

میری کئی یادیں وابستہ تھیں۔ میں کسی زمانے میں جرسی کے ساحل سے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہا کرتا تھا لیکن حالات نے مجھے دوبارہ خشکی کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا لہٰذا جب اوشین سٹی سے فون آیا اور کال کرنے والی نے بتایا کہ وہ میری ایک پرانی ساتھی ہے تو میرے دل میں پرانی یادیں سر اٹھانے لگیں۔ اس کا خیال تھا کہ صرف میں ہی یہ معاملہ حل کر سکتا ہوں۔

اوشین سٹی، اٹلانٹک سٹی کے جنوب میں ایک جزیرے کے کنارے واقع ہے۔ کئی سال پہلے میں وہاں رہ چکا تھا۔ وہاں لوگوں نے سیاحوں کے لیے مکانات بنا رکھے تھے جو سیزن کے دنوں میں پوری طرح آباد رہتے۔ جزیرے کے شمالی سرے سے اٹلانٹک سٹی کی روشنیاں واضح طور پر نظر آتی تھیں۔ شہر کے جنوبی علاقے میں چوڑی چوڑی سڑکیں تھیں۔ جن کے دونوں جانب دو منزلہ مکان بنے ہوئے تھے اور۔ ان کی بالکونیاں فرانسیسی طرز کی تھیں۔

مجھے شہر کا بھی نقشہ یاد تھا لیکن جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ زیادہ تر ایک منزلہ مکانات مسمار ہو چکے تھے اور ان کی جگہ جدید طرز کی عمارتوں نے لے لی تھی ۔ ان کا نقشہ وکٹورین طرز کا تھا اور کلر اسکیم بھی مختلف تھی۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں شوخ رنگ استعمال کیے جاتے تھے لیکن اب ان میں سادگی کا پہلو نمایاں تھا۔ جس معاملے کو سلجھانے کے لیے میں یہاں آیا تھا، اس میں بھی رنگ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ جیسا کہ بعد میں مجھے ریٹا روزیٹی نے بتایا، وہ ان دنوں اسٹار رئیل اسٹیٹ ایجنسی میں کام کر رہی تھی۔ میں جب اس کے دفتر پہنچا تو اس نے ماضی کے تعلق کو دہرانا مناسب سمجھا اور کہنے لگی۔

”یقین نہیں آ رہا کہ اوین کین میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہم ’پوسٹ‘ میں ایک ساتھ کام کیا کرتے تھے؟“

روزیٹی سنہرے بالوں والی ایک پرکشش عورت تھی۔ وہ چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن دیکھنے میں کم عمر نظر آتی تھی۔ وہ مجھے بالکل یاد نہیں تھی اور جس اخبار کا اس نے نام لیا، وہاں میں بارہ سال پہلے کاپی ایڈیٹر کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے اس سے کہا۔ ”تم نے وہ اخبار کیوں چھوڑ دیا؟“

”ہر آدمی خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ میں بھی مرنے سے پہلے ایک نئی کار خریدنا چاہ رہی تھی۔ ویسے بھی اخبار کے حالات کچھ اچھے نہ تھے اس لیے میں نے صحیح وقت پر فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ تم نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔“

اسے کیا بتاتا کہ مجھے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ میں 1990ء سے اب تک کیا کرتا رہا، میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ”تم نے مجھے کیسے تلاش کیا؟“

”ایک رپورٹر کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں اور اس کے ہوتے ہوئے۔“ اس نے میز پر رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”آج کے دور میں کسی کے بارے میں جاننا بہت آسان ہے۔“

ایجنسی کا دفتر ایک مکان میں بنایا گیا تھا۔ سامنے والے بڑے کمرے میں جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے، نصف درجن میزیں مع کمپیوٹر رکھی ہوئی تھیں۔ روزیٹی کے علاوہ وہاں صرف ایک سیاہ بالوں والا شخص بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل فون پر باتیں کر رہا تھا۔ عقبی دیوار بڑے منفرد انداز میں سجی ہوئی تھی۔ وہاں چار ضرب آٹھ کی پلائی ووڈ شیٹس لگی ہوئی تھیں اور ان پر قطار در قطار مکانوں کی چابیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ جن کے ساتھ سبز رنگ کے ٹیگ لگے ہوئے تھے۔

ان چابیوں کو دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ یہ ایجنسی جائداد کی خرید و فروخت کے علاوہ کرائے کے مکانوں کی دیکھ بھال اور ان کا انتظام بھی کرتی ہے۔ گرمی کے دنوں میں ہر ہفتے یہاں کرائے داروں کا ہجوم ہوتا ہوگا۔

”میری اب بھی کبھی کبھار کیٹ ولسن سے بات ہوتی ہے۔“ روزیٹی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ کیٹ ولسن بھی رپورٹر تھی اور اسی کیس میں ملوث تھی جس کی وجہ سے مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ روزیٹی میرے اور اس کے تعلقات سے بھی باخبر تھی۔

”وہ تمہارا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتی ہے کہ کس طرح تم نے قتل کے پیچیدہ کیس حل کیے۔ وہ تمہیں شرلاک ہومز یا کسی بھی بڑے سراغ رساں سے کم نہیں سمجھتی لہٰذا جب باس نے مجھ سے نقب زنی کی وارداتوں کا کھوج لگانے کے لیے کہا تو مجھے تمہارا ہی خیال آیا۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے اس کی بات غور سے سننے کی کوشش کی، وہ کہہ رہی تھی۔ ”یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ سلسلہ کئی ہفتوں سے چل رہا ہے۔ سب سے پہلے جون ولکوف نامی عورت نے اس کی نشاندہی کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس نے ویلنٹائن ڈے پر مکان کھولا تو

محسوس ہوا کہ وہاں کوئی آیا تھا۔ اسی مکان میں اس سے پہلے وہ نیو ایئر نائٹ منا چکے تھے اور اب ویلنٹائن منانے واپس آئے تھے۔ جیسا کہ میں تمہیں فون پر بتا چکی ہوں کہ نقب زن کوئی چیز لے کر نہیں گیا، اس لیے اسے چور نہیں کہا جا سکتا۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور آہستہ سے بولی۔ "وہ ایک پیغام اور صلیب ضرور چھوڑ گیا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ "آؤ، میں تمہیں جائے واردات پر لے چلتی ہوں۔"

جس نئی کار کے لیے روزیٹی نے اپنا جرنلزم کا کیریئر ترک کیا، وہ نئے ماڈل کی ہنڈا اکارڈ تھی لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے مشرق کی طرف جانے کے بجائے مغرب کی جانب گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

"شاید تم نے بتایا تھا کہ مسز وینکوف کا مکان سینٹرل کے علاقے میں ہے۔"

"ہاں لیکن اس دیوار پر دوبارہ رنگ ہو گیا ہے جہاں نقب زن نے پیغام لکھا تھا۔ ہمارے پاس ایک کاریگر ہے جو آف سیزن میں مکانات کی دیکھ بھال کرتا ہے گو کہ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اسے کسی گھر کے اندر جا کے بے ڈھنگی تحریر صاف کرنا پڑی۔ ہم دوسرے مکان دیکھ لیتے ہیں۔"

"اس طرح کے کتنے مکان ہیں؟"

"اب تک تین مکانوں میں نقب زنی ہو چکی ہے جن کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا ہے۔ ان میں سے دو کی شکایت گاہکوں نے کی جب وہ ویلنٹائن کے موقع پر آئے۔ اگر وینکوف اور نیویارک سے آیا ہوا جوڑا، ویک اینڈ پر نہ آتے تو ہمیں اس کی خبر بھی نہ ہوتی،، ہم کرائے کے مکانوں کے نگہبان نہیں صرف ایجنٹ ہیں اور ہر گھر کو چیک نہیں کرتے سوائے اس کے کہ کوئی بڑا طوفان نہ آجائے لیکن جب ہم نے دوسری نقب زنی کے بارے میں سنا تو خالی مکانوں کو دیکھنے کے لیے ڈپلیکیٹ چابیاں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے دفتر سے نزدیک مکان دیکھے۔ یہ ایک طویل عمل ہے کیونکہ ہم اس جزیرے کے آدھے مالکان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکو گے۔"

"اگر ڈپلیکیٹ چابیاں تمہارے پاس ہیں تو ہر گھر مکان میں کیسے داخل ہوا؟"

"شکر ہے کہ اس کے ہاتھ ڈپلیکیٹ چابی نہیں لگی ورنہ ہم مزید مصیبت میں پھنس جاتے۔ اس بھوت نے اندر جانے کے لیے دو مرتبہ کھڑکی توڑ دی۔ میرا خیال ہے کہ مکان کے مالکان اندر سے کھڑکی کی چٹخنی لگانا بھول گئے اور اس طرح وہ بھوت کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"الارم کو ناکارہ بنائے بغیر؟"

"بہت سارے مکانوں میں ایسے الارم نہیں ہیں کیونکہ ہر ہفتے اجنبی لوگوں کو مکان کرائے پر دینا ہوتے ہیں اس لیے ان الارم کا درست استعمال مشکل ہے۔ البتہ ہماری ایجنسی میں الارم لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے ہماری ڈپلیکیٹ چابیاں محفوظ ہیں۔"

اس وقت تک ہم ویسٹ ایونیو پہنچ چکے تھے۔ روزیٹی نے ایک خالی جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی اور بولی۔ "گرمیوں میں یہاں پارکنگ ملنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ گاڑی سے باہر آتے ہوئے مزید بولی۔ "آف سیزن میں یہاں کی تین چوتھائی آبادی کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے بھوت کے لیے آسانی ہو جاتی ہے۔"

وہ مجھے ایک مکان میں لے گئی جو نسبتاً نیا اور بڑا تھا۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "پہلی منزل پر صرف گیراج اور اسٹور ہے اور اس کے اوپر پہلا رہائشی یونٹ بنا ہوا ہے۔"

وہ مکان ایک بڑے کمرے، کھانے کے کمرے اور کچن پر مشتمل تھا اور اس کے سامنے ایک وسیع پورچ بنا ہوا تھا جہاں سے خلیج کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مکان کے عقبی حصے میں چار بیڈروم تھے۔ پورے مکان کو قالین، پردوں اور دیگر آرائشی اشیا سے آراستہ کیا گیا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی میری نظریں سب سے پہلے سامنے والی سفید دیوار پر گئیں جس پر سیاہ مارکر سے لکھا ہوا تھا۔ "انجیل 0515 ڈیول بوائے کی تلاش میں" اور اس کے نیچے ایک کراس کا نشان بنا ہوا تھا۔

میں نے اس تحریر کو دوبارہ پڑھا اور کہا۔ "یہ تو کوئی ذاتی اشتہار لگتا ہے؟"

"یہ ایک نیا انداز ہے۔" روزیٹی نے جواب دیا۔ "بجائے اس کے کہ آپ اخبارات کے ذریعے اپنا پیغام دیں۔ آپ اجنبی لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی دیواریں خراب کر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔"

گو کہ یہ پیغام بڑے کیپٹل حروف میں لکھا گیا تھا لیکن یہ ایک زنانہ تحریر معلوم ہو رہی تھی اور لگتا تھا کہ لکھنے والے کا قد بہت چھوٹا ہے کیونکہ سب سے اوپر لکھے ہوئے حروف بمشکل میرے سینے تک پہنچ رہے تھے۔

"پولیس کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی نوجوان کسی دوسرے نوجوان کو ڈھونڈ رہا ہے بظاہر یہی سوچا جاسکتا ہے۔"

"اس جزیرے پر اور کتنی ایجنسیاں ہیں جو کرائے پر مکانات دیتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایسی تین ایجنسیاں اور ہیں لیکن کوئی بھی ہم سے بڑی نہیں۔ میں نے سب کو فون کر کے معلوم کیا لیکن ان کے مکانوں میں ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ بھوت صرف انہی مکانوں میں داخل ہو رہا ہے جن پر ہماری کمپنی کا نشان لگا ہوا ہے۔ دوسرا اہم عنصر رنگ بھی ہو سکتا ہے۔ ویکوف اور طر کے مکان اور یہ تینوں نیلے رنگ کے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی کوئی راز پوشیدہ ہو؟"

اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ میری حوصلہ افزائی کر رہی ہو۔ مجھے لگا جیسے میں نے ابھی تک اسے مایوس ہی کیا ہے۔ شاید کیٹ ولسن نے ضرورت سے زیادہ میری تعریف کر دی تھی۔ میں روزیٹی کو بتانا چاہ رہا تھا کہ تمام حقائق جانے بغیر میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ سبھی اچھے سراغ رساں ایسا ہی کرتے ہیں لیکن اس کے بجائے میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے لنچ کے لیے کسی اچھی جگہ کا پتا بتائے۔

میں نے اس کے بتائے ہوئے مرکزِ شہر کے ایک چھوٹے سے ریستوران کا انتخاب کیا۔ وہ بہت جلدی میں تھی، اسے یاد آگیا کہ کسی گاہک کو مکان دکھانا ہے۔ اس نے بمشکل تمام مجھے ان مکانوں کی فہرست اور چابیوں کا لفافہ دیا جنہیں ابھی چیک کرنا تھا۔

جس میز پر میں کھانا کھا رہا تھا، وہاں اوشین سٹی کا ایک پرانا ہفتہ وار اخبار بھی رکھا ہوا تھا۔ اس میں لوٹ مار، نقب زنی یا دیگر جرائم کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس میں چھ عدد ذاتی اشتہارات بھی تھے لیکن کسی میں ڈیول بوائے کا ذکر نہیں تھا۔ مجھے ایک ہفت روزہ اخبار میں اتنے کم اشتہار دیکھ کر کوئی حیرت نہ ہوئی اس کی وجہ روزیٹی مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ آف سیزن میں جزیرے کی آبادی بہت کم ہو جاتی ہے جس کا اثر دوسرے کاروبار کے ساتھ اخبارات پر بھی پڑتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس وجہ سے نقب زن کا کام آسان ہو گیا تھا۔ زیادہ تر مکان خالی پڑے ہوئے تھے اور انہیں دیکھنے والے بہت کم تھے۔

یہی حال اس ریستوران کا بھی تھا جہاں اس وقت صرف ایک نوجوان لڑکی ہڈ والا سویٹر پہنے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور دوسری جانب متوجہ ہو گئی۔

مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میری عمر کا شخص اس لڑکی سے یہی توقع کر سکتا تھا۔ ویٹرس میرے لیے کافی لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اسمائل 0515 یا ڈیول بوائے کو جانتی ہے۔

"یہ نام تو مجھے فلم اسٹارز جیسے لگتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "یا اس طرح کے نام انٹرنیٹ چیٹنگ میں استعمال کیے جاتے ہیں۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ روزیٹی جیسی عورت جو کمپیوٹر سے واقف ہے اور اس کے ذریعے مجھے تلاش کر سکتی ہے، اس نے ان ناموں سے متعلق جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ اگر یہ فلم اسٹارز کے نام ہیں تو کمپیوٹر سے پتا لگایا جاسکتا تھا۔ شاید اس نے یہی مناسب سمجھا ہو گا کہ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے مجھ جیسے سراغ رساں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

میں ویٹرس سے چیٹ روم کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن وہ فون سننے چلی گئی پھر میں نے سوچا کہ اس لڑکی سے پوچھ لوں جو ہڈ والا سویٹر پہنے ہوئے تھی لیکن وہ بھی جا چکی تھی۔ میں واپس اسٹار ایجنسی کی طرف آیا اور مکانات دیکھنا شروع کر دیے۔ انہی دنوں نائن الیون کا واقعہ پیش آیا تھا اور حفاظتی اقدامات بہت سخت تھے لیکن اوشین سٹی میں ایسی بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ روزیٹی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کوئی بھی شخص میری جانب دوسری بار دیکھنے کی زحمت نہیں کرے گا اور وہ یہی سمجھے گا کہ میں ایک ایسا گاہک ہوں جو اپنے لیے مکان تلاش کر رہا ہے اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اس دوران میں پانچ مکان چیک کیے اور مجھے ان میں غارت گری کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد میں نے ایک وقفہ لیا اور ساحل کی طرف چل دیا۔

میں نے ساحل کی ٹھنڈی ریت پر چہل قدمی شروع کر دی اور اس کیس میں اب تک جو بھی معلومات ملی تھیں، ان کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک عورت تھی اور اس سے ذرا پیچھے ایک چھوٹے قد کی لڑکی ہڈ والا سویٹر پہنے چل رہی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے ریستوران میں دیکھا تھا گو کہ ہم وہاں سے پچاس بلاک کے فاصلے پر تھے۔ میں نے اس تک پہنچنے کے لیے اپنی رفتار تیز کر دی پھر سوچا کہ اس سے کیا کہوں گا گو کہ ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اس سے بات نہ کروں لیکن میں خود نقب زن کے بارے میں کیا جانتا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے اور میری ہی طرح کسی ایسے شخص کی تلاش میں

ہے جس کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتی۔ مثلاً اس کا اصل نام، ورنہ وہ اس کے لیے فرضی نام کیوں استعمال کرتی اور نہ ہی اسے مطلوبہ شخص کا پتا معلوم تھا۔ البتہ وہ اس کے مکان کے بارے میں غیر واضح باتیں جانتی تھی۔ مثلاً اس کا رنگ اور اس پر لگا ہوا ایجنسی کا نشان جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مکان کرائے کے لیے دستیاب ہے۔

روزیٹی نے مجھے نئے سال کے موقع پر ہونے والی پارٹی کے بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت تک وکوف کے مکان میں نقب زنی نہیں ہوئی تھی اور یہ واقعہ اس کے کچھ عرصے بعد پیش آیا اس لیے یہ ممکن تھا کہ ایکل بھی اس پارٹی میں شریک ہوئی ہو اور اسے وہاں گزارے ہوئے لمحات یاد آرہے ہوں اور اب وہ اس شخص سے تجدیدِ تعلق کے لیے بے چین ہو۔ اس کے علاوہ مجھے ایک بات اور پریشان کررہی تھی اگر نقب زن کو صرف پیغام ہی چھوڑنا تھا تو اس کے لیے اسے گھر میں داخل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ مکان کی بیرونی دیوار پر بھی پیغام لکھ سکتا تھا اس طرح وہ اپنے آپ کو بڑی مشکل سے بچا سکتا تھا اور اس کا پیغام بھی زیادہ موثر انداز میں مطلوبہ شخص تک پہنچ جاتا۔

روزیٹی نے مجھے اپنی قیام گاہ پر سونے کی پیشکش کی لیکن میں نے ایک موٹیل میں ٹھہرنا پسند کیا کیونکہ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہاں سے میں نے کالج اسٹوڈنٹ امینڈا اولسین کو فون کیا۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''تم سے لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی۔''

''ہاں، کہو کیا بات ہے؟'' وہ چلّاتے ہوئے بولی۔ عقب سے موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے اسے بتایا کہ انٹرنیٹ چیٹ روم کے بارے میں کچھ جاننا چاہ رہا ہوں۔

''کیا تم کسی سے ملنے کی کوشش کررہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''کیا وہاں لوگ اسی لیے جاتے ہیں۔ کسی سے ملنے کے لیے؟''

''اس کے لیے وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ تم کہیں بھی کسی سے مل سکتے ہو۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ملاقات محفوظ ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس میں ایک قباحت ہے۔'' وہ بولی۔ ''لوگ اپنے آپ کو کچھ بھی ظاہر کرسکتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ پندرہ سال کی لڑکی بعد میں چالیس سال کی عورت نکلی۔''

''لیکن کوئی کس طرح ایک لڑکی کو حاصل کرسکتا ہے جو کسی دوسری ریاست یا ملک میں رہتی ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ تم کرمنالوجی کے طالب علم رہے ہو۔ کیا اخبار نہیں پڑھتے یا تمہارے پاس ٹیلی فون نہیں ہے۔''

''میرے پاس بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہے۔'' میں نے معصومیت سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ کوئی سخت بات کہے گی لیکن اس نے بڑی نرمی سے کہا۔

''لوگ بہلا پھسلا کر لڑکیوں کو پارٹیوں میں لے جاتے ہیں اور انہیں نشہ آور مشروب پلا کر ان کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور پھر وہ لڑکی ان کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہتی ہے۔''

امینڈا کی باتوں نے مجھے ایک راستہ دکھا دیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے فون بند کیا اور دوبارہ اوشین سٹی کی جانب چل دیا۔ میں نے گاڑی ایک جگہ پارک کی اور اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں نقشہ دیکھنے لگا جو روزیٹی نے مجھے دیا تھا۔ میں نے اس نقشے کا فہرست سے موازنہ کیا تو معلوم ہوا کہ دو مکان ایجنسی سے بہت قریب ہیں۔ ان میں سے ایک ایس بری اور دوسرا اسینٹرل پر تھا۔ میں نے نگرانی کے لیے ایس بری کو منتخب کیا۔ اس مکان کا رنگ بھی نیلا تھا اور یہ اس مکان سے مشابہت رکھتا تھا جو روزیٹی نے مجھے پہلے دکھایا تھا۔ اس میں گراؤنڈ فلور کے اوپر دو رہائشی یونٹ تھے۔ اب مجھے وہیں رک کر انتظار کرنا تھا۔ اس طرح دو گھنٹے گزر گئے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور سڑک کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے سامنے والی سیڑھیوں پر کچھ نقل و حرکت نظر آئی۔ یہ کسی چیز کا سایہ بھی ہوسکتا تھا یا پھر کوئی سیڑھیوں کی ریلنگ پر پھسل رہا تھا۔

میں نے کار کے ڈیش بورڈ سے ٹارچ نکالی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ایک جگہ رک کر میں نے توقف کیا پھر شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے دو سیڑھیاں چڑھ کر ٹارچ روشن کی لیکن فرانسیسی دروازوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''میں مکان تلاش کرنے میں تمہاری مدد کروں گا اگر تم اپنے آنے کی وجہ بتا دو میرے پاس چابیاں ہیں اس لیے تمہیں مزید کچھ توڑنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے اپنی دائیں جانب ایک چرچراہٹ کی آواز سنی۔ میں نے مزید دو سیڑھیاں

چڑھ کر ٹارچ کی روشنی اس طرف پھینکی۔ مجھے سیاہ لباس میں ایک سایہ پورچ کی طرف جاتا نظر آیا۔ میں نے اس جانب دوڑ لگائی تو سامنے کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ میں نے پورچ کی ریلنگ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن لمبے کوٹ کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی اور میں زمین پر گر گیا۔ وہاں لیٹے لیٹے میں نے مکان کے عقبی حصے میں کسی کے قدموں کی آواز سنی پھر ایک پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

میں مکان کی عقبی گلی میں پہنچا۔ اسی وقت پولیس کی گاڑی اگلے چوک سے گزری۔ میں جنوب کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک وہ شخص وہاں سے جا چکا تھا۔ میں نے گلی کے دونوں طرف مکانوں کے درمیان اسے تلاش کیا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ اسی تلاش کے دوران ایک ایمبولینس اور پولیس کی گاڑی وہاں پہنچی۔ ان کو دیکھ کر کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے۔ ایک عورت مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''ایک نوجوان لڑکی پر حملہ ہوا ہے۔''

اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا جس پر نیلا رنگ تھا۔ میں نے اس مکان کو پہچان لیا۔ کیونکہ میں اسی کی نگرانی کر رہا تھا لیکن غلطی سے میں سینٹرل پر مکان نمبر ستاون پر پہنچ گیا۔

اگلی صبح میں ایک میٹنگ میں شریک تھا جو اوشین سٹی پولیس اسٹیشن میں ہوئی۔ ریٹا روزیٹی بھی وہاں موجود تھی اور اس طرح علی الصباح بلائے جانے پر خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ اسے یہ جان کر بھی زیادہ خوشی نہیں ہوئی جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی ایجنسی کو ایک اور مکان میں کھڑکی کا شیشہ لگانا پڑے گا اور کسی کو اس کا الزام نہیں دیا جاسکتا۔

اس میٹنگ میں پولیس چیف ڈان ڈائیکوس اور گشت پر مامور سپاہی جان ڈائیکوس نے بھی شرکت کی۔ وہ بہت کم عمر تھا لیکن اپنی حرکتوں سے ایک ذمے دار پولیس افسر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو اس نے اپنا چشمہ صاف کیا اور بولا۔ ''مس روزیٹی! ہم نے تمہیں اس لیے یہاں بلایا ہے کیونکہ تمہارے دوست مسٹر کین نے ہمیں کچھ باتیں بتائی ہیں۔ پہلے تو مسٹر کین! میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟''

''میں کرمنالوجی کا طالب علم ہوں۔'' میں نے امینڈا کے کہے ہوئے الفاظ دہرا دیے۔

ڈائیکوس نے زوردار قہقہہ لگایا اور روزیٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر کین کا اصرار ہے کہ گزشتہ شب ہونے والے حملے کا تعلق کسی نہ کسی طرح ان واقعات سے ہے جن کی رپورٹ تم پہلے درج کروا چکی ہو۔ جو کچھ اس نے جان اور پھر جان نے مجھے بتایا، اگر وہ سچ ہے تو میں تم سمیت سب لوگوں سے معافی چاہتا ہوں کہ ہم نے نقب زنی کی ان وارداتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ شاید مسٹر کین نے تمہیں گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں بتا دیا ہو لیکن میں ریکارڈ پر لانے کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ لیزا ...... اپنے والدین کے گھر میں داخل ہو رہی تھی کہ کسی نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ اسی وقت اس کا بوائے فرینڈ سامان کے تھیلے پکڑے ہوئے آگیا۔ حملہ آور نے اسے دھکا دے کر زمین پر گرایا اور فرار ہو گیا لیکن لڑکی کے بوائے فرینڈ فلپ کاسترو نے پورچ لائٹ کی روشنی میں اس کی جھلک دیکھ لی۔''

''لیزا اب کیسی ہے؟'' روزیٹی نے پوچھا۔

''اب وہ بہتر ہے۔ اس کے والدین نیویارک سے روانہ ہو چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں یہاں آنے والے ہیں۔ انہیں لیزا اور کاسترو کے تعلقات کا علم نہیں۔ میں ساری تفصیلات جمع کر رہا ہوں تاکہ ان کے پہنچنے پر انہیں بتا سکوں۔ مسٹر کین! تمہارا کہنا ہے کہ گزشتہ شب کا واقعہ بھی نقب زنی کی وارداتوں کا حصہ ہے لیکن میرے حساب سے یہ اس زمرے میں نہیں آتا۔ ہمیں کسی شخص کے اندر داخل ہونے کے آثار نظر نہیں آئے اور نہ ہی ہم نے دیوار پر کوئی تحریر دیکھی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ لیزا نے وہاں پہنچ کر پیغام لکھنے والی ایمل 0515 کے کام میں مداخلت کی۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ میرا خیال ہے کہ حملہ آور لیزا کو ایمل سمجھ بیٹھا۔''

وہ سب حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے سب سے پہلے پس منظر بیان کیا اور انہیں بتایا۔ ''میرے نظریے کے مطابق وہ پیغام جنسی زیادتی کا نشانہ بننے والی لڑکی کی جانب سے تھا۔ اس لڑکی کو انٹرنیٹ کے ذریعے ورغلا کر اوشین سٹی بلایا گیا اور نشہ آور مشروب پلا کر اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی۔ وہ اب جزیرے پر واپس آگئی ہے اور اس مکان کو تلاش کر رہی ہے جہاں اس کی عصمت دری کی گئی تھی۔ اس کی تلاش کی بنیاد چند مبہم باتوں پر ہے۔ اس کے یہ پیغامات حملہ آور کے لیے ایک انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں یا پھر اس نے اپنے آپ سے کوئی عہد کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حملہ آور گزشتہ شب اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ لیزا وہاں پہنچ گئی۔ اس نے اندر داخل ہونے کے لیے کھڑکی نہیں توڑی لیکن ایمل بھی ہمیشہ ایسا نہیں کرتی تھی بلکہ اس نے ایک دفعہ تالا

بھی کھول لیا تھا جس کا علم شاید ڈیول بوائے کو بھی تھا۔"
ڈائیکوس بولا۔ "یہ خیال اسے کیسے آیا کہ گزشتہ شب نقب زن اسی مکان کو منتخب کرے گا؟"
اس سوال کا جواب بہت آسان تھا۔ میں نے اسے ایک منٹ دیا تاکہ وہ خود اپنے طور پر سوچ سکے لیکن اس سے پہلے جان بیچ میں کود پڑا۔ "یہ یقیناً وہی مکان ہوگا جہاں اس نے لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہوگی اور وہ امید کر رہا تھا کہ لڑکی کو جلد یا بدیر وہ مکان یاد آجائے گا۔"
"یا پھر اسے موقع مل گیا۔" میں نے کہا۔ "شاید وہ ہر رات وہاں اس لڑکی کا انتظار کرتا تھا جب سے نقب زنی کے واقعات شروع ہوئے تھے۔"
"لیکن وہ مکان میں کیسے داخل ہوا؟" ڈائیکوس نے پوچھا۔ "وہ اس رات اس مکان میں کیسے آیا تھا جب اس نے مبینہ طور پر اینجل کے ساتھ جنسی زیادتی کی تھی؟"
میں نے روز یٹی کی طرف دیکھا۔ ڈائیکوس اور جان کی نظریں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں۔ روز یٹی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا بات ہے؟"
"میرا خیال ہے کہ اس نے تمہاری چابیاں استعمال کیں۔ گزشتہ شب سے پہلے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ ڈیول بوائے کا یہاں اپنا مکان ہوگا اور اینجل اسی مفروضے پر اسے اور اس کے مکان کو تلاش کر رہی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے عارضی طور پر یہ مکان لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آف سیزن میں یہ خالی ہوگا۔"
"ہماری چابیاں کوئی نہیں حاصل کر سکتا اور میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ہمارے دفتر میں ایک الارم لگا ہوا ہے۔"
میں نے اس سے پوچھا۔ "اس نقب زنی کے بارے میں کس کس کو معلوم تھا؟"
"وکوف، ملر اور پولیس کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ ہم نے اس کی پبلسٹی نہیں ہونے دی۔"
"ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟"
"اسٹار ایجنسی۔" روز یٹی نے فخریہ انداز میں کہا۔
"ہم جانتے ہیں کہ ڈیول بوائے کو اس نقب زنی کا پہلے سے علم ہوگا ورنہ وہ گزشتہ شب وہاں انتظار نہ کر رہا ہوتا۔ اس نے ایجنسی کے لوگوں سے ہی سنا ہوگا یا پھر وہ پولیس کا کوئی آدمی ہے۔"
"وہ ہمارا کوئی آدمی نہیں ہو سکتا۔" ڈائیکوس جلدی سے بولا۔ "میں نے گزشتہ شب اپنے سب آدمیوں کو یہ معاملہ ہینڈل کرنے کے لیے بلایا تھا اور ہمارے چھ کے چھ آدمی وہاں موجود تھے۔"
میں نے اگلا سوال جان سے کیا۔ "گزشتہ روز جب میں وہاں بے ڈھنگے انداز سے چل رہا تھا تو تم نے کاسترو سے مجھے شناخت کرنے کے لیے نہیں کہا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں حملہ آور نہیں ہوں؟"
گشت کرنے والے سپاہی نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔ "تم اس حلیے پر پورے نہیں اترتے تھے۔ کاسترو نے بتایا تھا کہ وہ سیاہ بالوں والا سفید فام شخص ہے جبکہ تمہارے بال سرمئی ہیں۔"
ڈائیکوس نے ریٹا سے پوچھا۔ "کیا تمہارے دفتر میں کوئی سیاہ بالوں والا شخص ہے؟"
"ہاں، ایک ہے۔ اس دن جب تم کل آئے تھے تو وہ دفتر میں موجود تھا۔ اس کا نام مارک ریڈنگ ہے۔"
جان نے پیشکش کی کہ وہ ابھی جا کر ریڈنگ کو پکڑ لیتا ہے لیکن ڈائیکوس نے جلد بازی مناسب نہ سمجھی۔ ریٹا اسے بتا چکی تھی کہ اسٹار ایجنسی کا دفتر ایک گھنٹے بعد کھل جائے گا اور ریڈنگ معمول کے مطابق کام پر آئے گا لہٰذا اس نے جان سے کہا کہ پہلے وہ موقع کے چشم دید گواہ فلپ کاسترو کو بلا کر لائے۔
جان نے خدشہ ظاہر کیا۔ "ریڈنگ غائب ہو سکتا ہے۔"
"اگر اسے بھاگنا ہوتا تو اب تک کہیں جا چکا ہوتا۔" ڈائیکوس نے جواب دیا۔ "اگر وہ بھاگ بھی گیا تو ہم اسے تلاش کر لیں گے۔"
ہم ایجنسی کا دفتر کھلنے سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ ڈائیکوس، روز یٹی، کاسترو اور میں اندر داخل ہوئے جبکہ جان باہر کھڑا رہا۔ "اطمینان رکھو۔" ڈائیکوس نے روز یٹی سے کہا۔ "ہم تمہارے آدمی کو پریشان نہیں کریں گے۔ اس پر یہی ظاہر کیا جائے گا کہ ہم یہاں نقب زنی کی وارداتوں کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔"
"تمہیں یہی کہنا چاہیے۔" روز یٹی نے کہا۔
اس کے بعد ڈائیکوس نے کاسترو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم اسے دیکھ کر صرف ہاں یا نہ میں جواب دو گے۔ اگر وہ ہمارا مطلوبہ شخص نہ ہوا تو ہم تمہیں واپس لیزا کے پاس بھیج دیں گے۔"
تھوڑی دیر بعد ہی ریڈنگ بھی آگیا۔ اس نے روز یٹی کو دیکھ کر کہا۔ "تم جلدی کیسے آگئیں؟"
"ہاں، ایک گاہک آنے والا ہے۔" روز یٹی نے جواب دیا۔
ہم نے کاسترو کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلاتے

ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

ڈائیکوس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے روزیٹی کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی اور ایک دبلا پتلا لمبا شخص ہاتھوں میں اوزاروں کا بیگ لیے اندر داخل ہوا۔ سردی کے باوجود اس نے کوئی کوٹ یا جیکٹ نہیں پہن رکھی تھی۔ البتہ اس کے جسم پر ڈانگری نظر آرہی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی جس میں سے سیاہ بال جھلک رہے تھے۔

وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''کسی نے مجھے فون پر ایک اور کھڑکی ٹوٹنے کی اطلاع دی ہے۔''

''میں نے تمہیں فون کیا تھا۔'' روزیٹی نے کہا پھر ڈائیکوس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''جب ہم یہاں آرہے تھے...''

ابھی اس کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ کاسترو اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ''یہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہی وہ شخص ہے۔''

ایک لمحے کے لیے ہم سب اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے اور یہ سکوت اس وقت ٹوٹا جب اوزاروں کا تھیلا فرش پر گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈائیکوس اس کے پیچھے گیا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ وہ شخص ایک سرخ رنگ کی پک اپ میں بیٹھ کر مغرب کی جانب جارہا تھا۔ ایک سیکنڈ بعد جان بھی اپنی پولیس کار میں اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

میں واپس دفتر نہیں گیا‘ جانتا تھا کہ روزیٹی کیا وضاحت پیش کرے گی۔ وہ یہی کہے گی کہ اس کاریگر کی چابیوں تک رسائی تھی تاکہ وہ دفتری اوقات کے بعد بھی متاثرہ مکانات میں جاکر کام کرسکے اور اس نے اسی سہولت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ مجھے اس سلسلے میں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حملہ آور کی نشاندہی ہوچکی تھی اور اب پولیس خود ہی اس سے سب کچھ معلوم کرلے گی۔

اس وقت میری توجہ کا مرکز وہی لڑکی تھی جس نے ہڈ والا سویٹر پہن رکھا تھا۔ وہ اس وقت سینٹرل ایونیو پر کھڑی تھی جہاں سے وہ یہ تعاقب نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس نے پولیس کار کو ڈیول بوائے کے پیچھے جاتے ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ وہاں کیسے پہنچی، اس بارے میں اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا، وہ اندازوں پر ہی مبنی تھا۔ پہلے میرا اندازہ تھا لیکن اب یقین ہوگیا کہ وہی امجل 0515 ہے اور پولیس سائرن کی آواز سن کر اسے بھی اطمینان ہوگیا ہوگا کہ اس کی تلاش ختم ہوئی۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ڈائیکوس اس سے بات کرنا چاہے گا۔ میں نے اس کی جانب ایک قدم بڑھایا تو وہ مخالف سمت میں دو قدم آگے بڑھ گئی۔ میں رک گیا تو وہ بھی رک گئی۔ گزشتہ شب اس کا پیچھا کرنے میں میری پنڈلی میں جو چوٹ آئی تھی، اس میں اب بھی تکلیف محسوس ہورہی تھی۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پولیس خود ہی اسے تلاش کرلے گی۔ وہ میرے مقابلے میں زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے۔ لہٰذا میں نے صرف اسے ہاتھ ہلانے پر اکتفا کیا اور مسکرادیا گوکہ وہ مجھ سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھی۔ جواب میں اس نے بھی سویٹر کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا اور ہوا میں لہرادیا۔ اس کے بعد وہ اچانک مڑی اور ساحل کی طرف چل دی۔

ایک ہفتے بعد میں اپنے گھر میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے ریٹا روزیٹی بول رہی تھی۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔ ''اوون! تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ پولیس نے بالآخر امجل کا پتا لگالیا۔ وہ برسٹل کی رہنے والی پندرہ سالہ لڑکی تھی۔ اس نے خودکشی کرلی۔''

''کب؟'' میرا سانس سینے میں اٹک کر رہ گیا۔

''تین ہفتے قبل۔ اس وقت تک نقب زنی کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی اور تم جانتے ہو کہ دیواروں پر جو کراس بنایا گیا تھا، وہ بالکل ویسا ہی تھا جو وہ پہنتی تھی۔ اسے اسی کراس کے ساتھ دفن کیا گیا۔ میں ہمیشہ اسے بھوت کہتی رہی لیکن اس سے میری مراد یہی تھی کہ وہ شخص جسے کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔''

''بھوت کھڑکیاں نہیں توڑا کرتے۔'' میں نے کہا۔ ''امجل کی کوئی بہن یا سہیلی جانتی ہوگی کہ اس پر کیا گزری یا امجل نے اسے بتایا ہوگا چنانچہ وہ اس کا انتقام لینے کے لیے ایسا کررہی تھی اور اس کا مقصد صرف اس شخص کو دہشت زدہ کرنا تھا جس نے امجل کی زندگی برباد کی اور وہ اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہ رہی تھی۔''

''شاید ایسا ہی ہو۔'' روزیٹی نے جواب دیا۔

میں نے کمرے کی لائٹ بند کردی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ اس امید پر کہ ہڈ والی لڑکی نظر آجائے اور میں اسے دیکھ کر دوبارہ ہاتھ ہلاسکوں لیکن تاریک سڑک بالکل خالی تھی۔

۵۵

**جاگیرداری نظام کی دیمک جو معاشرے کو ہر طرح سے کھوکھلا بنارہی ہے**

ہر شخص اچھے خواب دیکھتا ہے... لیکن اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے وہ اپنے ضمیر کو گروی نہیں رکھتا... کٹھن سے کٹھن حالات میں اس کا ضمیر زندہ رہتا ہے... نیکی و بدی... لالچ و ہوس کی دلدل میں دھنسے کرداروں کی ایسی ہی کشمکش...

**اس نوجوان کا المیہ جو ایک خاموش دیوار کی طرح ساکت تھا...**

# بے ضمیر

جمال دستی

''اڑے فیضو...'' سکندر شاہ نے مجھ سے کہا۔ ''بابا آج رات کام ہے۔''

''حاضر سائیں۔'' میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ اب کیا کہے گا۔ اسے معلوم تھا کہ میری رات کی ڈیوٹی ہے اور اب وہ اس کا فائدہ اٹھائے گا۔ میں اس کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ ایک تو وہ میرا افسر تھا۔ اسی نے مجھے اس نوکری پر لگوایا تھا۔ مگر میری اصل مجبوری یہ تھی کہ وہ میرے گاؤں کے وڈیرے مقدر شاہ

کا بیٹا تھا۔ اس کی بات نہ ماننے کا خمیازہ صرف مجھے نہیں میرے پورے خاندان کو بھگتنا پڑ سکتا تھا اس لیے اسے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سکندر شاہ تقریباً بتیس سال کا صاف رنگ کا تنومند شخص تھا۔ اگرچہ وہ دیکھنے میں خوب صورت لگتا تھا مگر ساتھ ہی اس کے نقوش میں ایک قسم کا مکروہ پن تھا۔ شاید یہ صرف مجھے محسوس ہوتا تھا کیونکہ میں اس کے کردار سے اچھی طرح واقف تھا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو گاؤں میں سکندر شاہ کی بدکرداری کے قصے عام ہو چکے تھے حالانکہ وہ اس وقت اٹھارہ سال کا بھی نہیں تھا۔ مگر بچپن سے عیاشی میں زندگی گزارنے والے سکندر شاہ کی بڑھوتری خاصی تیز تھی اور وہ سترہ سال کی عمر میں پورا مرد لگنے لگا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں اس سے محفوظ نہیں تھیں۔ کتنوں کو اس نے محبت کا جھانسا دے کر برباد کیا تھا۔ مقدر شاہ بھی وڈیرا ذہنیت کا آدمی تھا مگر وہ بدکردار نہیں تھا اور اس کے دو بڑے بیٹے بھی بس شادیوں اور پیشہ ور عورتوں سے دل بہلانے کے لیے بدنام تھے۔ مگر سکندر شاہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔ وہ صرف پندرہ سال کا تھا جب اس نے حویلی میں کام کرنے والی ایک عورت پر ہاتھ ڈالا اور بے آبرو ہونے کے بعد اس عورت نے خودکشی کر لی تھی۔ مقدر شاہ نے یہ کیس کسی نہ کسی طرح دبا دیا اور سکندر شاہ کو پڑھنے کے بہانے اس کے چچا کے پاس شہر بھیج دیا۔

مگر شہر میں بھی اس نے وہ گل کھلائے کہ دو سال بعد ہی اس کے چچا نے اسے واپس بھیج دیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ سانڈ ہو کر واپس آیا تھا۔ یہاں بھی اس نے مارا ماری جاری رکھی اور بالآخر اس کے باپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ لوگوں کی اسے کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ غلام ذہنیت کے مارے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ وڈیرا خاندان کچھ بھی کرتا وہ اسے اپنا مقدر سمجھ کر خاموش رہتے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ مقدر شاہ کا حلقۂ انتخاب ایک بڑے قصبے میں لگتا تھا اور وہاں رہنے والے اس کے غلام نہیں تھے۔ مقدر شاہ کے سیاسی حریفوں نے سکندر شاہ کے کرتوت استعمال کر کے پچھلے الیکشن میں کامیابی حاصل کی تھی۔ مقدر شاہ کو اپنی یہ ناکامی دل پر لگی تھی اور اس نے سکندر شاہ کو صوبے کے سب سے بڑے شہر بھیج دیا کہ وہاں پڑھے یا جو چاہے کرے لیکن اب گاؤں کا رخ نہ کرے۔ مقدر شاہ نے اسے ایک یونیورسٹی میں داخل کرا دیا اور وہ ہاسٹل میں رہتا تھا۔

مقدر شاہ کی شہر میں اپنی کوٹھی بھی تھی مگر اسے معلوم تھا کہ سکندر ہاسٹل میں ذرا قابو میں رہے گا، اگر اسے کوٹھی میں چھوڑ دیا تو اسے بھی عیاشی کا اڈا بنا دے گا۔ جس علاقے میں مقدر شاہ کی کوٹھی تھی وہاں لوگوں میں اس کی عزت تھی، اگر سکندر وہاں رہتا تو یہ عزت خاک میں مل جاتی۔ دوسرے اسے امید تھی کہ ہاسٹل میں رہے گا تو کسی نہ کسی طرح پڑھ جائے گا۔ سکندر شاہ نے ایک کالج سے کسی نہ کسی طرح بی کام کر لیا تھا اور اب وہ ایم بی اے کر رہا تھا۔ کالج وہ ایک دن نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس نے کتابوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ اس کی جگہ پرچے بھی کسی اور نے دیے تھے اور ڈگری اسے مل گئی تھی۔ مگر یہاں اسے یہ سہولت نہیں تھی۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح کام چلاتا رہا اور چھ کے بجائے نو سمسٹر میں اس نے ایم بی اے کر لیا اور کوشش کر کے ڈویژن بھی اچھی حاصل کر لی تھی۔

اس دوران میں اس کی شادی ہو چکی تھی اور یہ بیوی خاندان سے تھی جس سے سکندر شاہ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شادی کے بعد مقدر شاہ نے چاہا کہ وہ بیوی کو لے جا کر شہر والی کوٹھی میں رکھے مگر سکندر شاہ نے خود کوٹھی میں رہائش اختیار کر لی اور بیوی کو حویلی میں ہی رکھا تھا۔ اسے مصروف رکھنے کے لیے مقدر شاہ نے اپنے تعلقات استعمال کیے اور اسے بندرگاہ پر ملازمت دلوا دی۔ اگرچہ اسے ڈھنگ سے ایک سطر بھی لکھنی نہیں آتی تھی مگر اسے اچھے گریڈ میں افسر کی نوکری مل گئی تھی۔ نوکری بھی شاہانہ قسم کی تھی۔ وہ صبح گیارہ بارہ بجے دفتر جاتا اور ایک دو گھنٹے بیٹھ کر لنچ کے بہانے نکل جاتا۔ اس کے بعد مرضی ہوتی تو چلا جاتا ورنہ گھر چلا جاتا۔ اس کے ماتحت اس کی ساری ذمے داریاں پوری کرتے تھے اور اگر کسی وجہ سے اس کا دفتر میں ہونا ضروری ہوتا تو اسے پہلے ہی خبردار کر دیتے تھے۔ اس کے بدلے سکندر شاہ نے انہیں کھانے پینے کی مکمل آزادی دی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اس سیٹ سے دونوں ہاتھوں سے کما رہا تھا۔

میرا تعلق ایک غریب ہاری گھرانے سے ہے۔ بابا اور میرا بڑا بھائی مقدر شاہ کی زمین پر کام کرتے ہیں اور انہیں بس اتنا ملتا ہے کہ ہم کھینچ تان کر گزارا کر لیں۔ ہمارا کچا گھر بھی وڈیرے کی زمین پر ہے اور وہ جب چاہے ہمیں بے دخل کر سکتا ہے۔ میرا بڑا بھائی ایاز اَن پڑھ ہے، اس نے مشکل سے دو سال اسکول میں گزارے جہاں اس نے ایک لفظ سیکھ کر نہیں دیا۔ اسے شوق ہی نہیں تھا اس لیے بابا نے اسے اسکول سے اٹھا کر بکریاں چرانے پر لگا دیا۔ یہ واحد کام تھا جو ہمارا ذاتی تھا۔ اگرچہ اس میں سے بھی مقدر

شاہ کو ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ سال میں دو بار اس کی طرف سے بکرے کی فرمائش آتی تھی اور وہ پوری کرنا پڑتی تھی۔

ایاز کے برعکس مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ خاص طور سے اس لیے بھی کہ میں سات آٹھ سال کی عمر میں بکریوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہتا تھا۔ میں نے ضد کی تو مجھے اسکول میں داخل کرا دیا گیا اگرچہ بابا کا موڈ نہیں تھا۔ ان کے خیال میں، میں بھی ایاز کی طرح ایک دو سال ضائع کر کے بکریاں چرانے پر آجاؤں گا۔

مگر میں مارے باندھے پڑھتا رہا۔ سچی بات ہے مجھے کوئی بہت شوق نہیں تھا مگر کام سے بچنے کے لیے پڑھنے کا ناٹک کرتا تھا اور اسی ناٹک میں کچھ نہ کچھ پڑھ ہی جاتا۔ اس لیے بھی کسی کلاس میں فیل نہیں ہوا۔ گاؤں کا اسکول مڈل تک تھا۔ اس کے بعد میں میٹرک کے لیے قصبے کے اسکول میں داخل ہوا اور میرا داخلہ سراسر مقدر شاہ کی مہربانی سے ہوا تھا۔ ورنہ بابا نے تو مڈل کو کافی قرار دے کر مجھے جانور چرانے پر لگا دیا تھا۔ ایاز اب زمین پر کام کرتا تھا اس لیے بکریاں ماں سنبھالتی تھی اور بابا نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھر کے ساتھ ساتھ یہ ذمے داری بھی پوری کرے۔ مقدر شاہ نے حسبِ معمول بابا سے ایک اچھا بکرا بھیجنے کی فرمائش کی تھی اور بابا نے مجھے گلے کا سب سے اچھا بکرا لے جانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور بکرا لے کر مقدر شاہ کی حویلی پہنچا، اس نے مجھے بکرے سمیت طلب کر لیا۔ وہ بکرا دیکھ کر خوش ہوا اور پھر مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میں نے مڈل کیا ہے۔ اس نے آگے پڑھنے کا پوچھا تو میں نے بتایا کہ مجھے شوق ہے مگر بابا نے بکریاں چرانے پر لگا دیا ہے۔

''بابا بکریاں تو ایاز بھی چرا سکتا ہے جب تو پڑھ رہا ہے تو آگے بھی پڑھ، میں تیرے باپ سے بات کرتا ہوں۔''

وڈیرے کا بات کرنا بھی حکم کے مترادف تھا اور بابا نے گالیاں دے کر مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ مگر یہ مجھے گاؤں سے دور پڑتا تھا اور مجھے بس میں آنا جانا پڑتا تھا۔ دو سال بعد میں نے یہاں سے میٹرک کیا تو یہی اسکول اب انٹر تک ہوگیا تھا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے یہیں سے انٹر بھی کر لیا۔ بابا بے چارہ سمجھ رہا تھا کہ میٹرک چار سال میں ہوتا ہے۔ مگر اب میرے پاس کوئی اور بہانہ نہیں تھا اس لیے پھر سے بکریاں چرانے لگا۔ میری خواہش تھی کہ کسی طرح میں شہر چلا جاؤں اور وہاں نوکری کر لوں مگر کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان ہی دنوں سکندر شاہ کی شادی تھی اور وہ گاؤں آیا ہوا تھا۔ اس کی شادی میں پورے گاؤں نے حصہ ڈالا تھا۔ سب نے کچھ نہ کچھ دیا تھا تاکہ سارا بوجھ اکیلے وڈیرے پر نہ پڑے۔ بابا نے دو بکرے دیے تھے۔ اسی طرح گاؤں میں کسی غریب کی شادی ہوتی تو وڈیرا سب سے زیادہ کرتا تھا۔ اتفاق کی بات ہے جب میں بکرے لے کر حویلی پہنچا تو مقدر شاہ کے ساتھ سکندر شاہ بھی تھا۔ مقدر شاہ نے میرا تعارف کرایا اور پھر اچانک بولا۔

''سکندر، یہ اچھا چھورا ہے۔ اس کے لیے کوئی ملازمت نکال۔ ابھی اس نے انٹر کیا ہے۔''

سکندر شاہ نے میرا حلیہ دیکھا اور حقارت سے بولا۔ ''بابا اس نے تو اسکول کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔''

''اڑے نہیں بچہ، اسے خود میں نے اسکول بھیجا ہے۔''

''سائیں میرا تو رزلٹ بھی آگیا ہے۔'' میں نے کہا تو سکندر شاہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔

''میں کوشش کروں گا۔''

''کوشش کو چھوڑ۔'' مقدر شاہ نے حاکمانہ انداز میں کہا۔ ''ابھی جاتے ہوئے تو اسے اپنے ساتھ لے جا اور وہاں اپنے محکمے میں اسے کوئی نوکری دلوا دے۔ ہم اپنے لوگوں کا خیال نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا اور بابا ادھر بے روزگاری بہت ہوگئی ہے، زمین کتنے لوگوں کو روزگار دے سکتی ہے۔''

سکندر شاہ کتنا ہی منہ زور سہی لیکن باپ کے حکم کے آگے وہ چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے بابا میں لے جاؤں گا۔''

میری خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ میری خواہش یوں از خود پوری ہو جائے گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس خوشی میں، میں نے سکندر شاہ کی شادی میں بھرپور حصہ لیا اور بنا تنخواہ کے خادم بنا رہا۔ اس کا صلہ مجھے ملا اور شادی کے بعد سکندر شاہ اپنی بیوی کے بجائے مجھے لے کر شہر روانہ ہوگیا۔ اس کی شاندار گاڑی میرے لیے اڑن کھٹولے سے کم نہیں تھی جو مجھے اڑا کر پریوں کے دیس لے جا رہی تھی۔ پھر شہر کے سب سے پوش علاقے میں مقدر شاہ کی شاندار کوٹھی جس کا سرونٹ کوارٹر ہمارے گاؤں کے کچے مکان کے مقابلے میں کسی محل سے کم نہیں تھا۔ سکندر شاہ یہاں صرف ایک ملازم کریم کے ساتھ رہتا تھا، وہی اس کے لیے کھانا بناتا، اس کے کپڑے دھوتا، استری کرتا، دھوتا اور گھر کی صفائی اور سودا

لانے سے لے کر ان کی دیکھ بھال تک سارے کام اسی کے ذمے تھے۔ میں آیا تو اس نے بہت سے کام میرے ذمے ڈال دیے اور میں خوشی خوشی یہ کام کرنے لگا۔

دو مہینے تو ایسے ہی گزرے تھے۔ مگر اس کے بعد مجھے مفت کی یہ بیگار کھلنے لگی۔ سکندر شاہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے بنا تنخواہ کے ایک نوکر اور مل گیا ہے اور اس کا ارادہ اگر مجھے نوکری دلانے کا تھا بھی تو اب بدل گیا تھا۔ دو مہینے بعد میں نے اس سے دبے لفظوں میں نوکری کا کہنا شروع کر دیا تھا مگر وہ مجھے بس تسلیاں دیتا رہا۔ ان دو مہینوں میں، میں نے سکندر شاہ کے اصل رنگ ڈھنگ اچھی طرح دیکھ لیے تھے۔ اس کی کوئی رات مشکل سے ہی اکیلے گزرتی تھی۔ ہر روز ایک نئی عورت یا لڑکی آ رہی ہوتی تھی۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ سکندر شاہ صرف زر سے نہیں بلکہ زور سے اور اپنے عہدے سے بھی ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ اپنے دفتر میں کام کرنے والی مجبور لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ اس طرح بعض ان لوگوں کی عورتیں ہوتی تھیں جن کے کام سکندر شاہ سے اٹکے ہوتے تھے اور وہ اس طرح سے کام نکلواتے تھے۔ بعض کو سکندر نے دوستی اور محبت کا جھانسا دے کر پھانس رکھا تھا اور وہی سب سے زیادہ یہاں آتی تھیں۔ سکندر شاہ کا نوکر کریم مجھے ماضی کے سنسنی خیز قصے بھی سناتا تھا کہ اس نے کن کن مواقع پر سکندر شاہ اور اس کے ساتھ آنے والی عورتوں کو نشے میں دھت ہو کر جامے اور انسانیت سے باہر ہوتے دیکھا تھا۔ اب شاید سکندر شاہ احتیاط کرنے لگا تھا کیونکہ میں نے ایسا کوئی منظر نہیں دیکھا۔ جب وہ کسی عورت یا لڑکی کو لے کر آتا تو کوٹھی کے دروازے اندر سے بند ہو جاتے تھے اور پھر ہمیں وہاں آنے یا مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

جب میں نے محسوس کیا کہ سکندر شاہ ایسے کام کرنے والا نہیں ہے تو میں نے اس سے صاف بات کی۔ ”سائیں آپ مجھے نوکری دلانے کے لیے لائے تھے مگر اب تین مہینے ہونے والے ہیں۔ میں فارغ بیٹھا ہوں اگر نوکری نہیں ہے تو مجھے اجازت دو، میں واپس چلا جاؤں۔ ادھر کوئی کام کر لوں گا۔“

میری اس بات کا اس پر اثر ہوا کیونکہ میں واپس جاتا تو لازمی وڈیرے کو علم ہو جاتا اور وہ پھر اسے پکڑتا۔ اس لیے اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد مجھے نوکری دلا دے گا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا جب میں نوکری کی بات کرتا وہ یہی کہتا کہ کوشش کر رہا ہے اور سرکاری ملازمت اتنی آسانی سے نہیں ملتی ہے۔ شاید اسی ٹالنے میں وہ نہ جانے کتنا عرصہ گزار دیتا لیکن ایک دن اچانک مقدر شاہ سکندر کی بیوی کو لے کر وہاں آ گیا۔ اس کی آمد سکندر شاہ کے لیے بھی غیر متوقع تھی اور جس وقت مقدر شاہ کی شاندار گاڑی اور اس کے گارڈز کی جیپ اندر آئی تو سکندر شاہ کسی عورت کے ساتھ اندر تھا اور صبح بارہ بجے بھی وہ سو رہے تھے۔ دروازہ بجانے پر سکندر شاہ نے باہر جھانکا اور اپنے باپ کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے اس نے عجلت میں لڑکی کو عقبی راستے سے نکالا اور پھر دروازہ کھولا۔

اس کا باپ سمجھ گیا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک زمانے میں ان راہوں پر چلا تھا مگر اس نے سکندر کو کچھ کہا نہیں۔ لڑکی کو کریم نے کمال ہوشیاری سے کوٹھی سے باہر پہنچا دیا۔ مقدر شاہ اپنی بہو کو یہاں لے کر آیا تھا جو اس کی بھتیجی بھی تھی۔ وہ دونوں اس پر ناخوش تھے کہ سکندر شاہ بیوی کو ساتھ کیوں نہیں رکھ رہا۔ اس وقت تو سکندر شاہ دب گیا کیونکہ اس کے دل میں چور تھا مگر باپ کے جاتے ہی اس نے بیوی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور اسے اس قدر زچ کیا کہ اس نے واپس حویلی جانے کا مطالبہ کر دیا۔ وہ مشکل سے دو مہینے یہاں رہی تھی۔ بہرحال مقدر شاہ کے آنے سے میرا کام ہو گیا جب اسے پتا چلا کہ ابھی تک میری نوکری نہیں لگی ہے تو اس نے وڈیرانہ لہجے میں سکندر شاہ کو حکم دیا۔ ”میرے واپس جانے سے پہلے اس کی نوکری لگ جانی چاہیے۔ مجھے ادھر اس کے باپ کو منہ دکھانا ہے۔ وہ کیا سوچے گا کہ وڈیرا اس کے بیٹے کو نوکری نہیں دلا سکتا ہے۔“

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہفتے بعد میرے ہاتھ میں نوکری کا پروانہ تھا۔ اگرچہ یہ چوکیدار کی نوکری تھی مگر تنخواہ اور دوسری سہولیات اچھی تھیں۔ سکندر شاہ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے ہوشیاری دکھائی تو اتنا کما لوں گا کہ اس شہر میں ایک سال میں اپنا گھر بنا لوں گا۔ مگر مجھے ایسی ہوشیاری بھی نہیں آئی۔ میں بندرگاہ کے کنٹینرز والے شعبے میں چوکیدار تھا۔ ڈیوٹی تین شفٹوں میں ہوتی تھی اور ہر ہفتے بعد شفٹ بدل جاتی تھی۔ نوکری کنٹریکٹ پر لیکن سرکاری تھی۔ امید تھی کہ میں بھی پکا ہو جاؤں گا۔ سکندر شاہ بھی اسی شعبے میں تھا۔ مگر اس کا دفتر ذرا فاصلے پر تھا اور وہ کنٹینرز والی جگہ پر کم آتا بلکہ صرف مطلب اور کام سے آتا تھا۔ اس کا پتا مجھے کچھ عرصے بعد ہی چل گیا تھا۔ میں حیران ہوا تھا۔ رشوت تو اب یوں لی جاتی تھی جیسے اپنا حق لیا جا رہا ہو اور یہ بھی کم نہیں تھی۔

اپنی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ وہ اوپر سے کماتا تھا۔ پھر جدی پشتی رئیس تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس حد تک گر جائے گا یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔

اب تک میں سکندر شاہ کے ساتھ رہتا آیا تھا مگر جب نوکری لگ گئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا بندوبست کرلوں۔ اب وہ مجھے مفت میں روٹی کھلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خود بھی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ساری آمدنی حرام تھی اور میں بھی اسی میں سے کھاتا تھا۔ اس لیے میں خوشی سے الگ ہو گیا۔ مجھے بندرگاہ کے نزدیک ہی ایک جگہ مل گئی تھی۔ محکمے کے چار پانچ افراد مل کر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ میں بھی حصہ دے کر ان کے ساتھ رہنے لگا۔ یہاں رہنے میں یہ فائدہ بھی تھا کہ میں پیدل ہی بندرگاہ چلا جاتا تھا اور میرا اکنوینس کا خرچ بچتا تھا۔ پھر بندرگاہ پر کینٹین سے کھانا اچھا اور بہت سستا پڑتا تھا۔ یوں میرا کھانے پر بھی کم خرچ ہوتا تھا۔ میں گزارے لائق رقم رکھ کر باقی بابا کو بجوا دیتا تھا۔ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی تھی اور کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے میں نے آگے پڑھنے کے لیے ایک نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور دو سال میں یہاں سے گریجویشن کرلیا۔

دو سال میں بابا نے میری بھیجی رقم میں سے اتنا جوڑ لیا کہ اس نے میری شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے ہاں شادی صرف برادری میں ہوتی تھی اور وہ بھی بچپن میں طے کردی جاتی تھی۔ ایاز کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی، اس کی بیوی میری خالہ کی بیٹی تھی، اس کی چھوٹی بہن شبانہ سے میری منگنی ہوئی تھی۔ میں گاؤں آیا اور شبانہ کو رخصت کر کے گھر لے آیا۔ شبانہ شکل و صورت کی بہت پیاری تھی۔ پھر ہنسنے بولنے اور بھاگ کر کام کرنے والی تھی اس لیے جلد پورے گھر کو اپنا بنالیا اور میں تو پہلے دن سے اس کا ہو گیا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں آنا چاہتا تھا مگر اسے شہر میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا، اس صورت میں گھر رقم نہیں بجوا سکتا تھا اس لیے دل پر پتھر رکھ کر میں اسے گاؤں میں چھوڑ آیا اور مہینے میں ایک چکر گاؤں کا لگا لیتا تھا۔

بندرگاہ پر ملازمت کے چند ہفتوں بعد میں سمجھ گیا تھا کہ کمانے کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہے اور سب سے زیادہ کمائی دو نمبر کاموں میں تھی۔ یہاں منشیات اور ہر قسم کے سامان ضرورت اور تعیش سے لے کر معمولی سا ٹھیلا تک بہت نفع بخش تھا۔ سب کماتے تھے اور سب ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ معمول چپراسی اور سپاہی بھی شام کو جاتے ہوئے ہزاروں روپے لے کر جاتا تھا۔ یہاں چوری کا سامان ملتا تھا۔ چوری کے سامان کی سب سے بڑی مارکیٹ بھی تھی۔ آنے جانے والے جہازوں کے ملاح چیزیں اسمگل کر کے یہاں فروخت کرتے تھے۔ بندرگاہ کے باہر پچاس روپے میں ملنے والی چرس یہاں دو سو روپے میں ملتی تھی۔ مگر بندرگاہ کے باہر ہزار روپے میں ملنے والا کوئی الیکٹرانک کا آئٹم اندر دو سو روپے کا بھی مل جاتا تھا۔ اگرچہ بظاہر آنے جانے والوں کی مکمل تلاشی لی جاتی تھی اور سامان باہر لے جانے یا اندر لانے پر پابندی تھی مگر لوگ جانتے تھے کہ مال کیسے لانا یا نکالنا ہے۔

گوداموں میں کھلے مال سے چوری عام تھی۔ سب اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے تھے۔ مگر جلد مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بند کنٹینرز سے بھی مال چرایا جاتا ہے۔ حالانکہ کنٹینر سیل اور لاک ہوتا ہے۔ مگر کرنے والے اپنا کام کر جاتے تھے۔ جس طرح میں دوسروں کو جان گیا تھا اس طرح دوسرے بھی کچھ عرصے میں مجھے جان گئے تھے اور مجھے پتھر قرار دے دیا گیا تھا جس میں جونک نہیں لگتی ہے۔ اس لیے سب حرام کام مجھ سے چھپا کر اور مجھے دور رکھ کے جاتے لگے۔ میں جس حصے میں چوکیدار تھا وہاں کوئی نہیں پھٹکتا تھا۔ کیونکہ میں نے ان کاموں میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کرنے والے میرے ہی بھائی بند چوکیدار ہوتے تھے۔ اس لیے وہ مجھ پر دھونس بھی نہیں جما سکتے تھے۔ یہ کام سکندر شاہ نے کیا۔ ایک دن اس نے مجھے ڈیوٹی کے بعد اپنے دفتر بلا لیا۔ اس نے مجھے سامنے کرسی پر بٹھایا اور بے تکلفی سے بولا۔

''بابا فیضو اب تک کچھ کمایا بھی ہے یا بس ایسے ہی گزارا کر رہے ہو؟''

''سائیں تنخواہ سے اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔ اب میں اس کے منہ پر حرام کو برا نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک اس میں ڈوبا ہوا تھا۔

''لگتا ہے تجھے ابھی زمانے کی ہوا نہیں لگی ہے۔ چل تجھے ہوا لگاتا ہوں، یہ بتا تیری ڈیوٹی کل رات کی ہے نا؟''

''جی سائیں۔'' میں نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

''رات بارہ سے صبح نو بجے والی نا؟''

''جی سائیں۔''

''بس تو میرا انتظار کرنا، میں آؤں گا۔''

''وہ کیوں سائیں؟''

میرے سوال پر اس کے تیور بدل گئے۔ ''بابا تُو تو سوال کرنے لگا ہے، کل کا چھورا جو آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا۔''

میں سہم گیا، جلدی سے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''سائیں منہ سے نکل گیا ورنہ مجال ہے کہ تم سے سوال کروں۔''

اس کے تیور نرم پڑ گئے۔ ''بابا بے شک تو سرکاری ملازم ہے مگر مت بھول اصل نوکر ہمارا ہے۔''

''سائیں غلطی ہوگئی۔'' میں نے مزید عاجزی سے کہا۔

''بس دفع ہو جا اور انتظار کرنا، کہیں غائب مت ہو جانا۔''

''بالکل سائیں، میں اپنی ڈیوٹی پوری کرتا ہوں ایک منٹ کو بھی کہیں نہیں جاتا۔''

میں جانتا تھا کہ سکندر شاہ نے آنے کی بات کی ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ کوئی مطلب ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کوئی غلط کام کرے گا تو میں کیا کروں؟ میں اسے روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف وڈیرا ہی نہیں میرا افسر بھی تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ شامل ہوا تو یہ ضمیر کے خلاف ہوگا۔ میں آدمی بے شک چھوٹا تھا لیکن بے ضمیر نہیں تھا۔ اسی کشمکش میں اگلی رات ڈیوٹی پر پہنچا۔ اب تک میری ایوننگ تھی اور اس رات سے نائٹ ہوگئی تھی۔ یہاں ہر سیکشن کے الگ الگ چوکیدار ہوتے ہیں۔ ہر سیکشن خاصا بڑا ہوتا ہے اور اس میں ایک وقت میں ہزاروں کنٹینرز موجود ہوتے ہیں۔ چوکیدار کی حیثیت سے میری ذمے داری تھی کہ میں سیکشن کے مختلف حصوں کے بارے میں جانتا ہوں تاکہ اگر کسی کو مخصوص کنٹینر تک جانا ہو تو میں اس کی رہنمائی کر سکوں۔ بندرگاہ پر چوبیس گھنٹے کام ہوتا ہے اس لیے کسی بھی شفٹ میں کنٹینرز آتے اور جاتے رہتے تھے۔

اس رات بھی جب میں پہنچا تو کنٹینرز کی آمد و رفت جاری تھی۔ انہیں جہازوں سے اتار کر یہاں رکھا جا رہا تھا اور جن کی روانگی تھی انہیں بحری جہازوں پر بار کیا جا رہا تھا۔ کنٹینرز ہینڈل کرنے والے سپروائزر منٹ منٹ پر مجھے پکار رہے تھے۔ حالانکہ یہ براہِ راست میرا کام نہیں تھا مگر وہ اپنا کام بھی مجھ سے لیتے تھے۔ صبح پانچ بجے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ اس کے بعد ذرا سکون ہوا تھا۔ سکندر شاہ یقیناً اسی سکون کے انتظار میں تھا کیونکہ جیسے ہی آخری کنٹینر کرین نے یارڈ میں رکھا وہ ایک طرف سے نمودار ہوا تھا۔ سپروائزر پہلے ہی جا چکے تھے۔ سکندر شاہ کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ اس کے پاس بڑا سا بیگ تھا۔ سکندر شاہ نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''ہمارے ساتھ آؤ۔''

''سائیں میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا، ابھی کوئی کنٹینر آنے جانے کا ہوا تو مسئلہ ہو جائے گا۔''

''اب یہاں کوئی کام نہیں ہوگا۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میرے ساتھ چلو اور بی سیون سیکشن کا بتاؤ۔''

بی سیون سیکشن خاصا اندر کو تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ بی سیون میں باہر جانے والے کنٹینرز رکھے ہوئے تھے۔ سکندر شاہ اور اس کے ساتھ آنے والے کو معلوم تھا کہ انہیں کس کنٹینر تک جانا ہے، وہ ٹارچ کی روشنی میں ان کے نمبر دیکھ رہے تھے۔ بالآخر انہیں وہ کنٹینر مل گیا۔ یہ گراؤنڈ پر تھا اور اس کا دروازے والا حصہ ایک چھوٹی سی راہداری میں تھا۔ سکندر شاہ کے ساتھی نے اسے تلاش کیا تھا، اس نے آواز دی۔ ''شاہ جی یہ رہا۔''

سکندر شاہ اس تک آیا اور اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ہاں یہی ہے۔''

اتنے عرصے کی ملازمت کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کون سا کنٹینر کہاں سے تعلق رکھتا تھا اور اس میں کیا ہو سکتا تھا۔ یہ کنٹینر ایک پڑوسی ملک سے آیا تھا اور اب باہر جا رہا تھا۔ سکندر شاہ نے اپنے ساتھ آنے والے سے کہا۔ ''دیکھ کیا رہے ہو، کھولو اسے۔''

''سائیں یہ کیا کر رہے ہیں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں مارا جاؤں گا۔''

''تم فکر مت کرو، اول تو کسی کو پتا نہیں چلے گا اور چل بھی گیا تو یہاں تین شفٹیں ہوتی ہیں، کسی کو کیا معلوم کہ کس شفٹ میں یہ کام ہوا ہے۔'' اس نے مجھے تسلی دی اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے مجھے تیز روشنی والی ٹارچ پکڑا دی۔

''مجھے روشنی دکھاؤ۔''

میں روشنی دکھانے لگا اور اس نے اپنے بیگ سے لاک کھولنے والے اوزار نکالے اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ سکندر شاہ آس پاس سے چوکنا تھا۔ میں نے دبے لہجے میں پوچھا۔ ''سائیں اس میں کیا ہے؟''

''ابھی کھلے گا تو دیکھ لوگے۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔ کنٹینر کا لاک کھلنے میں دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس کی سیل اتار دی تھی اور پھر سلاخیں ہٹا کر اس کا دروازہ کھولا۔ نہ جانے کب سے بند دروازہ بہت مشکل اور آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ مگر یہاں سننے والا کون تھا؟ راہداری میں زیادہ جگہ نہیں تھی مگر پورا دروازہ کھولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سکندر شاہ اپنی ٹارچ روشن

کرتے ہوئے اندر داخل ہوا اور اس کے ساتھی نے مجھ سے ٹارچ لے کر بند کر دی۔ اب وہاں معمولی سی روشنی تھی۔ چند منٹ بعد سکندر شاہ نے مجھے بلایا۔ ''فیضو ادھر آؤ۔''

میں چھوٹے سے خلا سے اندر داخل ہوا تو کنٹینر میں چھوٹے غالیچے نما قالین بھرے پائے۔ یہ اعلیٰ درجے کے ہاتھ سے بنے ہوئے قالین تھے جو بیرونِ ملک بہت زیادہ قیمت پر بکتے ہیں اور لوگ اپنے گھروں کی دیواروں اور نشست گاہوں میں بہ طور سجاوٹ استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یہ سب سکندر شاہ نے بتایا۔ کیونکہ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے صرف قالینوں کے لیے اسے کھولا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''فیضو یار یہ صرف قالین نہیں ہیں، یہ بہت قیمتی والے قالین ہیں۔ چھوٹے سے قالین کی قیمت بھی تیس ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔''

وہ ٹارچ کی روشنی ڈال کر رول کیے ہوئے قالین دیکھ رہا تھا اور اس میں سے اپنے مطلب کے چھانٹ رہا تھا۔ وہ جس پر ہاتھ رکھتا میں اس کی ہدایت کے مطابق اسے اٹھا کر باہر لے جاتا۔ سکندر شاہ نے کوئی ایک درجن قالین چن کر نکلوائے اور پھر کنٹینر کو ویسے ہی بند کر دیا جیسے یہ پہلے بند تھا۔ ان کے پاس سیل بھی تھی جو اس پر لگا دی۔ اب کوئی خاص طور سے سیل کا نمبر چیک کرتا تو اسے پتا چلتا کہ سیل جعلی ہے اور ایسا عام طور سے کوئی کرتا نہیں تھا بلکہ صرف کنٹینر نمبر ہی دیکھا جاتا تھا۔ قالین جو پلاسٹک شیٹوں میں لپٹے ہوئے تھے، راہداری میں ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ انہیں یہاں سے کیسے نکالا جائے گا کہ سکندر شاہ نے موبائل پر کسی کو کال کی اور چند منٹ بعد ہی وہاں حلیے اور شکل و صورت سے ماہی گیر نظر آنے والے تین نوجوان آئے۔ ان کے پاس سے مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ سکندر شاہ نے ان میں سے ایک سے کہا۔

''رحیم تجھے معلوم ہے نا مال کہاں پہنچانا ہے؟''

''صاحب آپ فکر مت کرو۔'' رحیم نے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''رحیم بخش پہلی بار یہ کام نہیں کر رہا ہے۔''

''ادھر کوئی نہیں روکے گا، روکے تو میرا نام لے دینا۔ آگے تم لوگوں کی ذمے داری ہے۔''

ان تینوں نے یہ سارے قالین اٹھائے اور وہاں سے چلے گئے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ قالین لے کر کہاں جا رہے تھے مگر سکندر شاہ ساتھ تھا اس کے ہوتے ہوئے میں ان کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا اور شاید اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور چند منٹ تک غیر ضروری باتیں کرتا رہا جو اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ اس نے اچانک پوچھا۔ ''فیضو تیری شادی ہو گئی ہے تو آج تک بیوی کو یہاں گھمانے پھرانے نہیں لایا۔''

''سائیں ادھر رکھنے کا مسئلہ ہے۔ میں جہاں رہتا ہوں وہاں سارے چھڑے چھانٹ ہیں۔''

''کوئی گھر دیکھ لے۔ اب کیوں اکیلا رہ رہا ہے۔''

سکندر شاہ نے کہا اور کچھ رقم نکال کر زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا اور یوں اس چوری میں شامل ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ قالینوں سے بھرے اس کنٹینر سے سکندر شاہ نے جو قالین نکلوائے تھے ان کی مالیت چار لاکھ روپے تک تھی۔ کنٹینر میں سیکڑوں کی تعداد میں قالین تھے اور اگر کوئی کھول کر دیکھتا تب بھی اسے پتا نہیں چلتا کہ کچھ قالین غائب ہیں۔ سکندر شاہ خالی ہونے والی جگہوں کو دوسرے قالین کھسکا کر اس طرح بھر رہا تھا کہ کنٹینر میں خلا باقی نہیں رہا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کے آدمی یہاں سے جا چکے ہوں گے تو وہ بھی رخصت ہو گیا۔ اس کا طریقہ میں سمجھ گیا تھا۔ اس نے چوری کا مال نکالنے کا آسان طریقہ سوچا تھا۔ گیٹ سے نکالنے میں بات کھل جاتی اور دس لوگوں کو کھلانا یا کسی بھی طریقے سے ان کا منہ بند کرنا پڑتا۔

جو لوگ قالین لے گئے تھے، ان پر بندرگاہ میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ کشتی لے کر نکلتے تو اس وقت کوئی چیک نہیں کرتا تھا ہاں جب وہ سمندر سے آتے تو ان کی کشتیاں چیک کی جاتی تھیں۔ وہ قالین اپنی کشتی میں ڈال کر کسی بھی عام ساحل پر جہاں سکندر شاہ نے کہا ہو گا پہنچا دیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ لاکھوں کی چوری کے بدلے سکندر شاہ نے مجھے صرف پانچ سو روپے دیے تھے۔ اگر گڑبڑ ہوتی تو وہ افسر اور وڈیرے خاندان سے ہونے کی وجہ سے صاف بچ جاتا اور میں مارا جاتا۔ سچی بات ہے مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا اور تیسرے دن جب وہ کنٹینر جا چکا تھا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے بعد سکندر شاہ نے مجھ سے کئی ہفتے تک رابطہ نہیں کیا۔ دراصل وہ موقع کے انتظار میں تھا اور جیسے ہی اس کے مطلب کا کنٹینر آیا اس نے مجھے موبائل پر کال کی۔

''فیض کدھر ہے بابا؟''

''سائیں ادھر ہی ہوں، آپ کے راج میں بیٹھا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بابا ہمارے راج میں بیٹھا ہے تو ہمارا کام بھی کر کے دے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ میرا دم خشک

ہو گیا اور میں نے مرے مرے انداز میں کہا۔
''حکم سائیں۔''
''بابا تیری پھر نائٹ ہے نا؟''
''جی سائیں کل آخری نائٹ ہے۔''
''بس تو کل ہی کام ہوگا۔'' وہ بولا۔
''سائیں یہ بہت خطرے والا کام ہے، بات کھلی تو آپ بچ جاؤ گے، میں غریب آدمی ہوں مارا جاؤں گا۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔
''کچھ نہیں ہوتا بابا، یہ ہمارا ملک ہے یہاں سب بچ جاتے ہیں۔ کھاؤ بابا کھاؤ اور موج کرو بس یہی زندگی ہے۔''
مگر میرے نزدیک ایک زندگی اور بھی ہے جب آدمی کو مرنے کے بعد اس زندگی میں دنیا کی زندگی کا حساب دینا پڑے گا اور وہ بہت سخت ہوگا مگر سکندر شاہ جیسے لوگ اسی زندگی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ میں نے پہلی چوری کے بعد بھی اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگی تھی کہ وہ جانتا ہے اس کا بندہ مجبور ہے۔ میں ایک بار پھر مجبور تھا۔ حسبِ معمول سکندر شاہ رات کے آخری پہر آیا اور اس کے ساتھ وہی آدمی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی بندرگاہ پر ہی کام کرتا تھا یا پھر سکندر شاہ اسے باہر سے لایا تھا۔ کوئی غیر متعلقہ شخص یہاں نہیں گھس سکتا تھا۔ اس بار سکندر شاہ نے جس کنٹینر کا انتخاب کیا تھا وہ باہر سے آیا تھا اور کلیرنس کے لیے یہاں پڑا ہوا تھا۔ سی ٹو سیکشن میں یہ کنٹینر فرسٹ پر تھا یعنی اس کے نیچے ایک کنٹینر اور رکھا ہوا تھا۔ مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں سیڑھی تھی۔ سکندر شاہ کا آدمی سیڑھی لگا کر اوپر چڑھا اور اس بار اس نے دو منٹ میں تالا کھول لیا۔
''فیض میرے ساتھ آؤ۔'' سکندر شاہ نے کہا اور سیڑھی پر چڑھ گیا۔ اس کنٹینر کے چاروں طرف کئی کئی منزل تک کنٹینرز رکھے تھے، اس لیے کسی کے دیکھ لینے کا امکان صرف اسی وقت ہوتا جب وہ خود یہاں تک چلا آتا۔ میں سیڑھی سے چڑھ کر کنٹینر میں آیا۔ یہ تو دروازے تک مختلف سائز کے گتے کے ڈبوں سے بھرا ہوا تھا اور ان ڈبوں میں الیکٹرانکس کا مال تھا۔ سکندر شاہ چن چن کر ایل سی ڈی ٹی وی نکالنے لگا۔ اس بار وہ یہ کام خود کر رہا تھا میرا کام اس کے نکالے ڈبوں کو نیچے کھڑے سکندر شاہ کے آدمی کو تھمانا تھا۔ اس نے کوئی نصف درجن ایل سی ڈی ٹی وی نکالے۔ اس کے بعد گاڑیوں میں لگنے والے اعلیٰ درجے کے اسپیکروں کے ڈبے نکالنے لگا۔ آخر میں اس نے ایک بڑا ڈبا نکالا جو سادہ تھا یعنی اس میں کیا تھا اس کی وضاحت نہیں تھی۔ پھر اس نے مجھے اترنے کو کہا اور خود بھی نیچے آ کر اپنے آدمی سے کنٹینر بند کرنے کو کہا۔ جب تک آدمی کنٹینر بند کرتا رہا اس نے کال کر کے ان ہی لوگوں کو بلوا لیا جو پہلے بھی قالین لے کر گئے تھے۔ اس نے رحیم بخش کو خبردار کیا۔
''احتیاط کرنا اس میں الیکٹرانکس کا سامان ہے، ذرا سا پانی لگا تو سب برباد ہو جائے گا۔''
''صاحب کوئی پہلی بار ایسا مال لے جا رہے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''ہم تو ادھر طوفانی سمندر میں جہاز سے مال اتار کر لاتا ہے۔ مجال ہے جو ایک پیس بھی خراب ہو۔''
رحیم بخش اس بار تین بندے لایا تھا کیونکہ قالین کے مقابلے میں ڈبے اٹھانا ذرا مشکل اور احتیاط والا کام تھا۔ انہیں سارا سامان لے جانے کے لیے دو چکر لگانا پڑے۔ جب وہ دوسرے چکر میں سب سامان اٹھا کر رخصت ہوئے تو سکندر شاہ نے سکون کا سانس لیا۔ اس بار اس نے مجھے کچھ دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں مجبوراً یہ کام کر رہا ہوں۔ اس کے عیار دماغ نے اسے سمجھایا کہ جو کام مفت میں ہو رہا ہو اس کے لیے دس روپے بھی خرچ کرنا حماقت ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے مجھے اس بار کچھ نہیں دیا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ جو پانچ سو روپے اس نے مجھے پہلے دیے تھے وہ میں نے گھر جاتے ہوئے راستے میں ملنے والے فقیروں میں تقسیم کر دیے تھے۔ جب تک وہ میرے پاس سے چلے نہیں گئے مجھے بے چینی رہی تھی۔
اس دوسرے ٹرپ کے بعد میں دو دن کی چھٹی پر تھا اور گھر چلا گیا۔ اماں بابا اور شبانہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ شبانہ یہاں بھی خوش تھی کہ سب اس کا خیال رکھتے تھے مگر شوہر کی کمی تو کوئی پوری نہیں کر سکتا اس لیے اس نے تنہائی پاتے ہی مجھ سے فرمائش کی۔ ''فیض مجھے شہر لے جا۔''
''مشکل ہے اگر تجھے وہاں رکھا تو پھر خرچ پورا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ادھر شہر میں بہت مہنگائی ہے۔''
''میں کب ہمیشہ کے لیے چلنے کو کہہ رہی ہوں۔ بس کچھ دن کے لیے لے چل، مجھے شہر دکھا، اپنے ساتھ رکھ۔''
میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا کیونکہ میں خود اسی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ نئی نئی شادی کے بعد میاں بیوی دور ہوں تو ان دونوں کے لیے بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ شبانہ نے کچھ دن کا کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ سچی بات ہے میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے شہر ضرور لے جاؤں گا۔ مگر ابھی میری تنخواہ اتنی نہیں تھی۔ بی اے کر کے میں چاہتا تھا کہ محکمے میں ہی کوئی اچھی جگہ مل جائے تب میری تنخواہ اتنی ہو کہ میں گھر لے کر شبانہ کو رکھ سکوں۔ مگر تھوڑے عرصے کے لیے تو

میں اسے لے جاسکتا تھا۔ پر مسئلہ اسے رکھنے کا تھا۔ فلیٹ میں تو اسے کسی صورت نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایک بار مجھے سکندر شاہ کا خیال آیا تھا کہ اس کی کوٹھی میں جگہ تھی مگر وہاں بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ شبانہ کو اکیلے رہنا پڑتا جب میں ڈیوٹی پر ہوتا اور میں اسے سکندر شاہ جیسے آدمی کے ساتھ اکیلا ہرگز نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے شبانہ سے کہا۔

''میں کوشش کروں گا کہ چند دن کے لیے کوئی جگہ مل جائے جہاں تو رہ سکے اور میں بھی چھٹی لے لوں تاکہ پورا وقت تیرے ساتھ ہی گزرے۔''

شبانہ خوش ہوگئی۔ میں دو دن بعد واپس جانے لگا تو وہ ایسی تڑپ کر روئی کہ میرا واپس جانے کا ارادہ بدلنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ نوکری پر لعنت بھیجوں اور یہاں آکر بکریاں چرانا شروع کردوں۔ مگر اس میں میرا اور میری ہونے والی اولاد کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر شہر چلا آیا۔ یہاں نوکری کے ساتھ سکندر شاہ کی غلامی بھی جاری تھی۔ مہینے میں ایک بار وہ میری ڈیوٹی کے دوران اپنا کام کرجاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے آدمی بدل لیا اور اب وہ کسی اور کو لاتا تھا۔ سامان نکالنے کے لیے رحیم بخش اینڈ پارٹی تھی۔ وہ بھی اس کے بے دام کے غلام تھے کہ وہ ان کی نہ جانے کون سی رگ دباتا تھا۔ میں جانتا تھا اکثر ماہی گیر غلط سلط دھندوں سے دور رہتے ہیں مگر ان میں کچھ ہوتے ہیں جو پیسے کے لیے ہر الٹا سیدھا کام کرتے ہیں۔ رحیم بخش بھی ایسے ہی ماہی گیروں میں سے تھا۔

رحیم بخش اور اس کا بھائی اللہ بخش دونوں منشیات کا دھندا کرنے کے لیے مشہور تھے۔ وہ خود بھی چرس پیتے تھے اور یہاں بندرگاہ کے علاقے میں فروخت بھی کرتے تھے۔ شاید سکندر شاہ نے ان کو اجازت دلوائی تھی کیونکہ انہیں کوئی نہیں روکتا تھا۔ صرف یہ دونوں نہیں یہاں ایسے بہت سارے تھے جو قانون کے تعاون سے غیر قانونی کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ اگر کوئی اور منشیات فروشی یا کوئی غلط کام کرنے کی کوشش کرتا تو قانون فوراً حرکت میں آجاتا تھا۔ سکندر شاہ اکیلا نہیں تھا یہاں اس جیسے لوگوں کی ایک پوری مافیا تھی جو دو نمبری کاموں سے کماتے تھے اور ایک دوسرے کے دھندوں کو تحفظ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کبھی پکڑے نہیں جاتے تھے۔ حد یہ کہ ان کی طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ان کی مثال کوئلے کی کان میں سیاہ لباس پہننے والوں کی سی تھی، ہاں اگر کوئی سفید پوش آجاتا تو وہ فوراً نظروں میں آجاتا۔

شروع میں، میں سمجھتا تھا کہ سکندر شاہ ہی یہ کام کرتا ہے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس میں اور بھی بہت سے بڑے لوگ ملوث تھے اور ایسے گروہ بھی تھے جو کنٹینرز سے چیزیں چرانے کے بجائے پورا کنٹینر ہی غائب کردیتے تھے۔ ایسے کئی واقعات میرے سامنے ہوئے۔ جب کنٹینر غلط طریقے سے باہر نکالے گئے اور غائب ہوگئے، اس کے بعد کسٹم اور دوسری ایجنسیاں تفتیش کے لیے آجاتی تھیں۔ پکڑ دھکڑ ہوتی جس میں ہمیشہ نچلے درجے کے اہلکار یا نجی کمپنی والے پکڑے جاتے تھے مگر کچھ عرصے بعد وہ بھی چھوٹ جاتے۔ جس پارٹی کا کنٹینر غائب ہوا ہوتا وہ بھی رو دھو کر دوبارہ کاروبار میں لگ جاتی اور اپنا ہونے والا نقصان پورا کرنے کی کوشش کرتی۔ یہ میں وہ دھندے بتا رہا ہوں جو سراسر غیر قانونی ہیں یہاں ایسے دھندوں کی بھی کمی نہیں ہے جو قانون کے زیرِ سایہ ہوتے ہیں اور ان سے حکومت کو ٹیکس اور ڈیوٹی میں نقصان ہوتا ہے۔

یہاں ایسے گروہ بھی ہیں جو اتنے طاقتور ہیں کہ وہ بندرگاہ سے بالا بالا ہی بحری جہازوں سے سامان یا کنٹینر اتار کر شہر میں کہیں بھی پہنچا سکتے ہیں بس ان کو ان کی منہ مانگی رقم دے دو۔ یہ بھی مجھے سکندر شاہ نے بتایا۔ وہ جب مجھ سے کام لیتا اس کی پوری کوشش ہوتی کہ میں بھی ان دھندوں میں شامل ہوجاؤں۔ شاید اسے خوف تھا کہ کبھی بھانڈا پھوٹا تو میں اس کے خلاف گواہی نہ دے دوں۔ حالانکہ اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے دل کے چور کی تسلی کے لیے میرے منہ کو بھی حرام لگانا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے دفتر بلایا تو میں سمجھا کہ شاید پھر کوئی کنٹینر کھولا جائے گا۔ مگر اس نے مجھے ایک بند سوٹ کیس تھمایا اور بولا۔

''یہ میرے بنگلے پر پہنچا دے۔''

''اس میں کیا ہے سائیں؟''

''میرا سامان ہے، تجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا، ابھی میرا آدمی تجھے گیٹ سے نکلوا دے گا۔''

''پر سائیں، میں ڈیوٹی پر ہوں۔''

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس نے گالی دے کر کہا۔

''اڑے... تو میری ڈیوٹی پر ہے، سرکاری ڈیوٹی کو بھول جا۔ ادھر کوئی تجھ سے نہیں پوچھے گا۔''

میری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ ہوجاتا یا پھر کوئی بڑا افسر آجاتا اور مجھے غیر حاضر پاتا تو میرے لیے مشکل ہوجاتی اس لیے میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے سائیں، کوئی گڑبڑ ہوئی تو تم ہی دیکھنا۔''

"فکر نہ کر، ادھر اپنی بادشاہت ہے۔" وہ غرور سے بولا۔

اس کے آدمی نے مجھے سوٹ کیس سمیت گیٹ سے نکلوا دیا اور کسی نے نہیں پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ ورنہ عام ملازمین کی تو جامہ تلاشی بھی ہوتی ہے۔ میں سکندر شاہ کی کوٹھی پہنچا۔ وہاں کریم موجود تھا۔ وہ بہت عرصے بعد مجھے دیکھ کر خوش ہوا اور اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ وہ شادی شدہ آدمی تھا مگر پہلے اس کی بیوی ساتھ نہیں رہتی تھی اب وہ اسے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے مجھے چائے پلائی۔ تب میں نے اس کی بیوی کو دیکھا۔ وہ عام سی صورت والی لیکن جوان عورت تھی۔ اسے سکندر شاہ سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ ہمیشہ خوب صورت عورتوں کے چکر میں رہتا تھا۔ میں نے کبھی یہاں کسی معمولی صورت والی لڑکی یا عورت کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

"سائیں نے تمہیں اجازت دے دی بیوی کو رکھنے کی؟"

"ہاں اسی نے تو کہا تھا ادھر کام کرنے والی عورت کی ضرورت ہے۔ اب یہ بنگلے میں کام کرتی ہے۔" کریم خوشی سے بولا۔ اس کی خوشی کی وجہ ظاہر تھی۔ بیوی بھی اس کے پاس تھی اور اسے اس کی تنخواہ بھی مل رہی تھی۔ کھانا وہی بناتی تھی اس لیے اب تینوں وقت کا کھانا بنگلے کے کچن سے آتا تھا اس لحاظ سے کریم کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ اس نے میری بیوی کے بارے میں پوچھا۔ "تو اسے یہاں کیوں نہیں لے آتا ہے۔"

"ہمیشہ کے لیے تو مشکل ہے پر میں سوچ رہا ہوں کہ اسے کچھ عرصے کے لیے لے آؤں، اسے شہر بھی دکھاؤں گا۔ پر ایک مسئلہ ہے کہ اسے رکھوں گا کہاں؟"

"ادھر لے آ۔" کریم نے فراخ دلی سے کہا۔ "دوسرا کوارٹر خالی ہے، شاہ جی سے پوچھ لے۔ کچھ سامان لے آ اور جب تک بیوی ہو اس کے ساتھ یہاں رہ۔ ضرورت کی چیزیں مجھ سے لے لینا۔ یہاں سب ہے۔"

کریم کی پیشکش نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پہلے میں نے یہ خیال اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ شبانہ کو اکیلے یہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا مگر اب یہاں کریم کی بیوی سمیرا تھی۔ شبانہ اس کے ساتھ رہتی۔ پھر میں کوشش کرتا کہ مجھے چھٹیاں مل جائیں اور میں ڈیوٹی پر جانے کے بجائے شبانہ کو گھماؤں پھراؤں۔ میں نے سکندر شاہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا، وہ مجھے جگہ بھی دے سکتا تھا اور چھٹی بھی دلوا سکتا تھا۔ میں واپس جانے کے بجائے کوٹھی میں رک کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ کریم بھی خوش تھا کہ اسے کوئی گپ شپ کرنے والا ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے روک لیا کہ رات وہیں رک جاؤں۔ برآمدے میں چارپائی پر سو جانا۔ سکندر شاہ رات بہت دیر سے آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا، اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کے سامنے آؤں۔ اگلی صبح ڈیوٹی پر جانے سے پہلے میں اس سے ملا۔ وہ حیرت سے بولا۔

"بابا تو اتنی صبح؟"

"سائیں میں توکل سے یہاں ہوں، آپ سے ایک بات کرنی تھی پر آپ رات دیر سے آئے۔"

"بولو بابا۔" اس نے کہا۔ وہ اس وقت تازہ دم لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی گزارش اس کے سامنے پیش کی۔ وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا اس نے فوراً ہی دونوں باتیں مان لیں۔ "بابا تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ بیوی کو یہاں لے آ۔ چل اب لے آ، یہاں رہے جب تک مرضی ہو اور چھٹی میں دلوا دوں گا۔ پر دس دن سے زیادہ کی نہیں ملے گی۔"

"بہت ہے سائیں۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"بس تو جا کے لے آ۔"

مگر میں نے سوچا تھا جب چھٹیاں منظور ہو جائیں گی تب جاؤں گا۔ اس دوران میں، میں نے دوسرے سرونٹ کوارٹر میں کچھ سامان لا کر ڈال دیا جو ضروری تھا۔ کھانے کا بھی سکندر شاہ نے کہہ دیا تھا کہ اس کے کچن سے ہوگا۔ اب صرف ہم اور ہمارا ذاتی سامان آنا تھا۔ جیسے ہی چھٹیاں منظور ہوئیں، میں روانہ ہو گیا۔ میں ہفتے کی شام گاؤں کے لیے روانہ ہوا اور رات گئے وہاں پہنچا۔ شبانہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں اسے دس دن کے لیے شہر لے جا رہا ہوں تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اس نے رات میں ساری تیاری کر لی اور اگلے روز میں اسے لے کر شہر روانہ ہو گیا۔ ہم رات کے قریب سکندر شاہ کے بنگلے پہنچے۔ کریم گیٹ پر موجود تھا، اس نے ہمیں کوارٹر پہنچایا اور سمیرا کو اٹھایا۔ اگرچہ میں نے اور شبانہ نے منع کیا تھا مگر اس نے سمیرا سے کھانا گرم کرا کے بھجوایا اور پھر اس نے چائے بھی بنائی تھی۔ شبانہ بہت متاثر ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"ادی تو بہت اچھی ہے۔"

"بس جب میں نہیں ہوں گا تو تم اس کے ساتھ وقت گزارنا۔" میں نے کہا۔ ہم تھکے ہوئے تھے کھا پی کر سو گئے۔ اگلی صبح دیر سے اٹھے اور ناشتے کے بعد میں شبانہ کو سیر کرانے کے لیے نکلا۔ پہلے ہم سمندر پر گئے۔ سارا دن

وہاں رہے۔ کھاتے پیتے رہے پھر شام کو واپس آئے۔
رات تک شبانہ سمیرا کے ساتھ لگی رہی۔ دونوں میں پہلے ہی دن دوستی ہوگئی تھی۔ رات شبانہ نے مجھ سے کہا۔
”کاش ہم ادھر رہ سکتے، کتنا اچھا ہے یہ کوارٹر، ادی سمیرا نے تو اپنا کوارٹر بہت سجا رکھا ہے۔“
میں نے اسے سمجھایا۔ ”کریم یہاں ملازم ہے، میں نہیں ہوں۔ میں تو سرکاری ملازم ہوں۔“
”پھر بھی تو سائیں سے بات تو کرسکتا ہے یہ جگہ خالی پڑی ہے ہمیں دے دے۔“ وہ مچل کر بولی۔ ”بھلے کرایہ لے لے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں سکندر شاہ کے لیے چوری جیسے کام میں تعاون کرتا تھا تو کیا وہ مجھے اپنی کوٹھی کا کوارٹر نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی خالی پڑا ہوا تھا۔ مگر مجھے ڈر لگتا تھا۔ ڈر شبانہ کی خوب صورتی اور سکندر شاہ کی اوباش فطرت سے لگتا تھا۔ اگر ہم یہاں مستقل رہتے تو سکندر شاہ کو شبانہ کا خیال آسکتا تھا اور میں ایسا کوئی موقع آنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے شبانہ کو منع کیا ہوا تھا کہ جب سکندر شاہ کوٹھی میں ہو تو وہ کوٹھی میں نہ جائے۔ اس کا اب تک موقع تو نہیں آیا تھا کیونکہ تقریباً ہر روز ہم سیر و تفریح کے لیے صبح کے وقت نکلتے تھے جب سکندر شاہ سو رہا ہوتا تھا اور پھر وہ رات گئے واپس آتا جب تک ہم سو چکے ہوتے یا کوارٹر میں جا چکے ہوتے تھے۔ شبانہ کی یہاں آمد کے پانچویں دن سکندر شاہ اور ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں ناشتے کے دوران طلب کیا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔
”فیضو خوش ہے اپنی عورت کے ساتھ۔“
”جی سائیں، آپ کی مہربانی ہے۔“
اس نے سرسری سے انداز میں شبانہ کو دیکھا۔ ”میری کہاں اللہ سائیں کی مہربانی ہے جو تجھے اتنی پیاری بیوی دی ہے۔ اسے خوب گھما پھرا اور اچھی طرح کھلا۔“
”ایسا ہی کر رہا ہوں سائیں۔“ میں نے جواب دیا۔
”پیسے کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا۔“
ہم کوٹھی سے نکلے تو شبانہ بہت خوش تھی اس نے کہا۔
”سائیں تو اچھا ہے۔“
”ہاں پر عورتوں کے معاملے میں نہیں۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”کیا تو نے گاؤں میں اس کے قصے نہیں سنے؟“
شبانہ ڈر گئی۔ ”ہاں تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“
”اسی وجہ سے تجھے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ سکندر شاہ

## معالج

بنیا ڈاکٹر تو بن گیا لیکن اسے سرکاری نوکری نہیں مل سکی۔ آدمی کاہل مگر چالاک تھا۔ مطب کھول کر بیٹھا تو وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ آخر اس نے ایک تجویز سوچی اور مطب کے باہر بورڈ آویزاں کر دیا۔ علاج کی فیس بیس ڈالر، افاقہ نہ ہو تو سو ڈالر واپس۔
گپتا جی وکیل تھے... برائے نام وکالت چلتی تھی۔ انہوں نے اپنے زعم میں سو ڈالر جیتنے کا ارادہ کیا اور مطب میں جا پہنچے۔
”میری زبان کا ذائقہ ختم ہوگیا ہے۔“ انہوں نے مطب میں چالاکی سے ایسا مرض بتایا جس میں افاقہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ وہ خود ہی کرتے۔
بنیے نے آواز لگائی۔ ”شیشی نمبر 22 میں سے چار چمچ گلاس میں ڈال کر گپتا جی کو پلاؤ... ان کا ذائقہ بگڑا ہوا ہے۔“
معاون نے وہ سیال گپتا کو دیا تو گلاس سے منہ لگاتے ہی انہیں ابکائی آگئی۔ ”یہ... یہ تو مٹی کا تیل ہے۔“ انہوں نے تھوکتے ہوئے احتجاج کیا۔
”مبارک ہو۔“ بنیا خوشی سے بولا۔ ”تمہارا ذائقہ لوٹ آیا۔ نکالو بیس ڈالر۔“
گپتا جی اسے قہر آلود نظروں سے گھور کر رہ گئے مگر انہیں فیس دینا پڑی۔
اس مکار پر تاؤ کھاتے، انہوں نے کچھ دنوں بعد دوسرا وار کرنے کا فیصلہ کیا اور اس بار اپنی یادداشت ختم ہوجانے کا مرض پیش کیا۔
بنیے نے پھر وہی 22 نمبر والی آواز لگائی۔
گپتا جی تڑپ کر بولے۔ ”وہ تو مٹی کا تیل ہے... تم نے پچھلی بار مجھے وہی پلایا تھا۔“
”مبارک... سلامت! تمہاری یادداشت لوٹ آئی۔ لاؤ بیس ڈالر۔“
چالیس ڈالر کے خسارے میں جانے کے بعد گپتا کا غصہ بڑھ گیا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد وہ پھر مطب پہنچے، اس بار بینائی جانے کا مرض بتایا۔
بنیے کا منہ لٹک گیا۔ وہ اداسی سے بولا۔ ”افسوس کہ میرے پاس اس بیماری کا کوئی علاج نہیں ہے۔“
گپتا جی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ آخر کار وہ جیت ہی گئے تھے۔
”اب تم سو ڈالر نکالو۔“ انہوں نے بنیے سے مطالبہ کیا۔
”بالکل... یہ تمہارا حق ہے۔“ بنیے نے جیب سے گڈی نکال کر ایک نوٹ ان کی طرف بڑھا دیا۔
”یہ کیا؟“ گپتا جی نے بے ساختہ کہا۔ ”تمہارا دعویٰ سو ڈالر لوٹانے کا تھا... یہ تو بیس ڈالر کا نوٹ ہے۔“
”مبارک ہو۔“ بنیے نے اسے زبردستی گلے لگا لیا۔ ”تمہاری بینائی بھی لوٹ آئی... لاؤ بیس ڈالر دو۔“ اپنا نوٹ اس نے واپس جیب میں اڑس لیا۔

کینیڈا سے آفتاب احمد کی شوخی

اچھا آدمی نہیں ہے۔ ورنہ میں اس سے کہوں تو شاید وہ کوارٹر دے دے۔''

اب تک شبانہ نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا اور اب سوچا تو وہ مجھ سے متفق ہو گئی۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''بس دعا کر میرا عہدہ اور تنخواہ بڑھ جائے اور میں تجھے یہاں رکھنے کے قابل ہو جاؤں۔''

''میں تو بہت دعا کرتی ہوں۔'' اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''تو نہیں جانتا، تجھ سے دوری مجھے اندر سے کیسے کاٹتی ہے۔''

اب شبانہ کی واپسی میں چند دن رہ گئے تھے۔ اتوار کو میں اس کی فرمائش پر پھر اسے سمندر پر لے گیا۔ ہم سارا دن وہاں رہے۔ مجھے جمعرات سے ڈیوٹی پر جانا تھا اور میں اسے منگل کو واپس چھوڑنے جاتا۔ جب ہم واپس آئے تو شبانہ کی طبیعت گری گری سی تھی۔ وہ جلدی سو گئی اور میں نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ صبح بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دس بجے مجھے سکندر شاہ نے طلب کیا۔ ''فیض میرے ساتھ چل، کچھ دیر کا کام ہے۔''

''دفتر کا سائیں؟''

''دفتر سے تو چھٹی ہے، میرا کام ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے شبانہ کو بتایا کہ میں سائیں کے ساتھ کام پر جا رہا ہوں اور وہ آرام کرے۔ میں سکندر شاہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں نکلا اور ہم بندرگاہ کے علاقے میں آئے۔ سکندر شاہ مجھے لے کر مچھیروں والے حصے میں آیا اور اس نے کال کر کے رحیم بخش کو بلایا۔ اسے ایک طرف لے جا کر کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''اس کے ساتھ جا اور یہ جو کہے کرنا ہے، میں یہاں موجود ہوں۔''

میں رحیم بخش کے ساتھ اس کی کشتی میں روانہ ہوا۔ کچھ دیر بعد ہم کھلے سمندر میں تھے۔ رحیم بخش انجن سے کشتی چلا رہا تھا اس لیے اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایک گھنٹے میں ہم ماہی گیروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچے اور وہاں کشتی کنارے روک کر رحیم بخش میرے ساتھ ایک مکان تک آیا، یہ سمندر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دروازہ بجانے پر اندر سے ایک بوڑھا آدمی نکلا۔ اس نے تپاک سے ہم سے ہاتھ ملایا اور ہمیں اندر لے گیا۔ اس نے ہمیں کولڈ ڈرنک پلائی اور رحیم بخش کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا۔ مجھے بے چینی تھی کہ ہم واپس جائیں۔ کولڈ ڈرنک کے بعد بوڑھا کھیر لے آیا اور ہم نے کھیر کھائی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اندر سے کئی بڑے بڑے بنڈل لایا جو مصنوعی ریشے کی بوریوں میں بند تھے اور ان پر پولی تھین چڑھی ہوئی تھی تاکہ اندر جو ہے وہ پانی سے محفوظ رہے۔

میں نے اٹھا کر دیکھا تو مجھے لگا کہ اس میں کپڑا یا اس جیسی کوئی چیز بھری ہے۔ بوڑھے نے مدد کی اور بنڈل اٹھا کر کشتی تک لایا۔ ان کی تعداد نصف درجن تھی۔ رحیم بخش نے ان پر ماہی گیری کا جال ڈال دیا کہ کسی کو نظر نہ آئیں۔ پھر ہم واپس روانہ ہوئے۔ عین بندرگاہ کے پاس انجن بند ہو گیا۔ اس کا تیل ختم ہو گیا تھا اور باقی فاصلہ ہم نے چپوؤں کی مدد سے طے کیا۔ واپسی میں ڈیڑھ گھنٹے کا وقت لگا تھا۔ سکندر شاہ بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ وہ رحیم بخش پر برس پڑا اور اسے دیر سے آنے پر سنائیں۔ وہ اس سے معذرت کرتا رہا پھر اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے یہ بنڈل سکندر شاہ کی گاڑی تک پہنچائے۔ رحیم بخش خود بھی گاڑی تک آیا تھا۔ جب سکندر شاہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اس نے آہستہ سے کہا۔

''صاحب تم سے اللہ بخش کا کہا تھا، پولیس اسے نہیں چھوڑ رہی ہے۔ ایف آئی آر کٹ گئی تو پھر بہت مشکل ہو جائے گی۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں جتنے وہ مانگ رہی ہے۔''

''دیکھتا ہوں۔'' سکندر شاہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے شبانہ کی فکر تھی، اس کی طبیعت خراب تھی۔ اگرچہ وہاں سمیرا تھی مگر مجھے پھر بھی فکر تھی۔ ہم واپس آئے تو شبانہ بے سدھ پڑی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی طبیعت اور خراب ہو گئی ہے۔ سمیرا کوٹھی میں کام کر رہی تھی۔ میں اسے ٹیکسی میں ڈال کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے شبانہ کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''اسے کمزوری ہے اور تھکن بھی ہے مگر خطرے کی بات نہیں ہے۔''

اس نے شبانہ کو ڈرپ لگائی اور کچھ دوائیاں دیں تو چند گھنٹے میں اس کی حالت سنبھل گئی۔ مگر جب میں اسے واپس کوٹھی لایا تو اس کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ اس نے کہا۔ ''فیض مجھے گاؤں لے چل، اب مجھے یہاں وحشت ہو رہی ہے۔''

''ہم کل چلیں گے۔''

''نہیں ابھی لے چل۔'' وہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ میں نے بہ مشکل اسے بہلایا۔ سمیرا مصروف تھی ورنہ وہ آجاتی تو شبانہ اس کے ساتھ بہل جاتی۔ مگر وہ سارا دن نہیں آئی بس کریم کے ہاتھ کھانا اور چائے وغیرہ بھجواتی

رہی۔ رات کو میں نے شبانہ کی حالت دیکھ کر اسے زبردستی نیند کی گولی دے دی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی اور بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اس کے پاس رہوں۔ اس کی یہ کیفیت میری سمجھ سے باہر تھی۔ وہ سوئی تو میں بھی سو گیا۔ اگلے دن اٹھ کر ہم نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ میں افسردہ تھا اور شبانہ بے چین تھی۔ جب ہم سکندر شاہ کی کوٹھی سے نکلے تو اس نے مجھ سے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''فیض اب مجھے کبھی یہاں مت بلانا۔ کبھی بھی نہیں۔''

''شبانہ کیا ہو گیا ہے تجھے، ابھی پرسوں تک اتنی خوش تھی۔''

''بس مجھے کچھ ہو گیا ہے۔'' اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ شاید طبیعت کی خرابی نے اس پر اثر ڈالا تھا اور وہ بددل ہو گئی تھی۔ ہم بس میں روانہ ہوئے تو میرے خیال کے برعکس راستے میں اس کی طبیعت ٹھیک رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا ایک ساتھ رکھ لی تھی۔ مگر ان کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ شبانہ راستے بھر خاموش رہی اور اس نے مجھ سے بہت کم بات کی تھی۔ ہم گاؤں پہنچ گئے۔ میں ایک رات وہاں رہا اور اگلے دن واپس روانہ ہو گیا۔ پہلے میں جانے لگتا تو شبانہ کی تڑپ دیکھنے والی ہوتی تھی مگر اس بار وہ کھوئی سی رہی اور میں اس کی وجہ اس کی طبیعت کی خرابی سمجھا تھا۔ اتنے دن شبانہ کے ساتھ گزار کر اب اس سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ دل میں میں نے ارادہ پختہ کر لیا کہ اب بھلے ایک کمرے کا مکان ملے اور اگر وہ دارے میں آ رہا ہوا تو اسے لے کر شبانہ کو بلا لوں گا۔

اس عرصے میں بابا نے میری اور ایاز کی شادی پر جو قرض لیا تھا وہ اترنے والا تھا اور اب ایاز بکریاں چراتا تھا۔ اس نے گلہ خاصا بڑا کر لیا تھا۔ بابا زمین پر کام کرتا تھا مگر وڈیرے مقدر شاہ نے اسے ایک طرح سے سپروائزر بنا دیا تھا اور بابا کو محنت والے کام نہیں کرنا پڑتے تھے۔ اگر میں گاؤں رقم نہ بھیجتا یا کم بھیجتا تب بھی گزارا چل سکتا تھا۔ اب میں شبانہ سے مزید دور نہیں رہ سکتا تھا۔ میں واپس آیا اور اگلے دن سے اپنی ڈیوٹی پر آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب سکندر شاہ نے مجھ سے کام کا کہا تو میں اپنی ترقی کی بات کروں گا۔ مگر اس بار سکندر شاہ نے مجھ سے کام کا کہا ہی نہیں۔ ایک مہینا گزر گیا اور میں نے سوچا کہ اب خود جا کر اس سے بات کروں۔ ہو سکتا ہے کنٹینرز سے مال چوری کے معاملے میں اب سختی ہو رہی ہو اور اس وجہ سے سکندر شاہ کو موقع نہیں مل رہا ہو۔ ایک اتوار کو میں خود کوٹھی پہنچ گیا۔ کریم

بخش گرم جوشی سے ملا۔

''بیوی کے جانے کے بعد تو نے صورت ہی نہیں دکھائی۔''

''بس یار اسے چھوڑ کر آیا تو ڈیوٹی پہ لگ گیا۔ ان دنوں اوور ٹائم بھی چل رہا ہے اس لیے آنے کا موقع نہیں ملا۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لیے آ گیا۔ سائیں سے بھی ایک کام تھا۔''

کریم مجھے اپنے کوارٹر کے برآمدے میں لے آیا۔ یہ ایک کمرے والے کوارٹر تھے جن میں باتھ روم اور چھوٹا سا کچن ساتھ ہی تھے اور کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ کریم بخش نے وہیں چارپائی ڈال رکھی تھی۔ سمیرا کوٹھی میں تھی۔ میں کریم سے گپ شپ کرتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب سمیرا آئی۔ وہ میرے اور کریم کے لیے ناشتا لائی تھی۔ ہم نے ناشتا کیا اس کے بعد سمیرا نے کریم کو ایک لسٹ پکڑائی۔ ''یہ سامان لے آ، مجھے جلدی چاہیے۔''

''چل فیض۔'' کریم نے مجھ سے کہا۔

''ادا کو چھوڑ دے، میں نے صاحب کو بتا دیا ہے کبھی بھی اسے بلوا لے گا۔'' سمیرا بولی تو کریم مجھے چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ اسے واپس آنے میں دیر لگی اور میں اس سے پہلے ہی سکندر شاہ سے مل کر واپس چلا گیا۔ اس شام میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں کئی دن بخار میں بھگتتا رہا۔ ڈیوٹی پر بھی نہیں جا سکا، ایک ساتھی کے توسط سے بیماری کی چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی۔ تین دن بعد طبیعت بہتر ہوئی تو میں ڈیوٹی پر گیا تھا۔ ڈیوٹی کے بعد پیاس بجھانے کے لیے باہر کیبن کے علاقے کے ساتھ لگی گنے کی مشین پر۔ میں ابھی رس پی رہا تھا کہ میری نظر رحیم بخش پر پڑی، میں نے اسے آواز دی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر میری طرف آیا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ ملایا اور اتنی ہی بے دلی سے بولا۔

''کیا حال ہے فیض محمد؟''

''ٹھیک ہے تم سناؤ، تیرا بھائی چھوٹا؟''

''کہاں؟'' وہ تلخی سے بولا۔ ''اسے چرس کے کیس میں پھنسایا اور دو لاکھ روپے مانگ رہے ہیں، ادھر چرس بیچنے والا دو لاکھ کہاں سے دے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ یہاں مختلف لوگوں کا اتنا حصہ ہوتا تھا کہ سب دے دلا کر آدمی کے پاس بہ مشکل گزارے لائق بچتا تھا۔ میں نے ہمدردی سے کہا۔ ''یہ تو ظلم ہے، ان لوگوں سے بات کرو جو حصہ لیتے ہیں۔''

''سب سے کر لیا ہے پر کوئی ساتھ نہیں دے رہا۔''

''تم نے اس دن سکندر شاہ سے بات کی تھی۔''
سکندر شاہ کے حوالے پر اس نے نظریں چرائیں۔
''وہ بھی کچھ نہیں کر رہا ہے۔''
''تم اس سے ملو اور بار بار کہو۔'' میں نے مشورہ دیا۔
''میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''اس نے کال کر کے...'' وہ بولتے بولتے رک گیا جیسے اس نے غلطی سے بات کہہ دی ہو۔ پھر اس نے جلدی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گیا۔ میں رس پی چکا تھا، گلاس رکھ کر میں بھی روانہ ہوا مگر میرا رخ گیٹ کے بجائے دفاتر کی طرف تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو رحیم بخش عمارت میں داخل ہو رہا تھا، میں اس کے پیچھے رہا۔ شام کے وقت اکثر اسٹاف چھٹی کر کے جا چکا تھا اس لیے عمارت تقریباً خالی تھی۔ اگر سکندر شاہ اس وقت یہاں موجود تھا تو اس کی یقیناً کوئی خاص وجہ ہوگی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس نے رحیم بخش کو کیوں بلایا تھا۔ رحیم بخش اس کے کمرے میں داخل ہوا تو میں لپک کر دروازے کے پاس پہنچا اور اس سے پہلے کہ دروازہ پورا بند ہوتا میں نے اسے روک لیا۔ اب وہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور مجھے اندر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
رحیم بخش نے کہا۔ ''صاحب آپ نے بلایا؟''
''ہاں، تم نے کیا سوچا؟''
''صاحب اللہ بخش کی بیوی نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے، میں عزت دار عورت ہوں۔''
''تب میرے پاس کیا لینے آئی تھی۔'' سکندر شاہ کا لہجہ بگڑ گیا۔ ''اسے بولو تھانے جائے اور وہاں پانچ دس کو خوش کرے گی تو اس کا شوہر چھوٹ کر آجائے گا۔''
معاملہ واضح تھا۔ اللہ بخش کی بیوی اس کی رہائی کے لیے سکندر شاہ کی منت سماجت کرنے گئی تھی اور اس کا عورت پر دل آگیا۔ اس نے رہائی کے لیے شرط رکھ دی مگر عورت نہیں مان رہی تھی۔ رحیم بخش خاموش تھا۔ سکندر شاہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اسے بولو بس دو دن ہیں پھر پولیس اس پر مقدمہ کر دے گی اور وہ کم سے کم پانچ سال کے لیے جیل جائے گا۔ اگر وہ راضی ہو تو کل رات اسے میرے بنگلے پر لے آنا۔''
رحیم بخش نے بے غیرتی سے کہا۔ ''میں بات کرتا ہوں اس سے۔''
''بات مت کرو، اسے راضی کرو۔ ورنہ تمہارا بھائی جیل چلا گیا تو یہ دھندا بھی تمہارے ہاتھ سے جائے گا۔'' سکندر شاہ نے اس پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔
''میں کرتا ہوں صاحب۔'' رحیم بخش نے کہا۔ ''پر وہ بہت ضدی عورت ہے۔''
''ایک بار میرے پاس آجائے اس کی ساری ضد نکل جائے گی۔'' سکندر شاہ نے واہیات لہجے میں کہا۔ ''آج رات تیار رہنا مال نکالنا ہے۔ تین بجے کے بعد کسی وقت کال کروں گا۔''
''میں تیار رہوں گا صاحب۔'' رحیم بخش نے کہا۔ ''پر فیض محمد تو آج صبح کی ڈیوٹی پر تھا۔''
''اسے چھوڑو، رات والے کو میں ہٹا دوں گا۔'' سکندر شاہ نے کہا۔ ''بس ایک مشکل ہے۔ ظفر بیمار ہے، آج مجھے خود کام کرنا پڑے گا مگر اتنا مشکل نہیں ہے۔''
''ٹھیک ہے صاحب، میں چلتا ہوں۔''
اس کے باہر آنے سے پہلے میں اس جگہ سے ہٹ کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے اسے باہر جاتے دیکھ سکوں۔ وہ نکل کر چلا گیا تو میں بھی وہاں سے نکل آیا اور ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ آج میری مارننگ شفٹ تھی جو چار بجے ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت چھ بج رہے تھے اور دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے شام ڈھل چکی تھی۔ کچھ دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سات بجے کھانا کھایا اور ہوٹل سے اٹھ آیا کیونکہ وہاں بیٹھے رہنے کی صورت میں بہت سے لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے دیکھے اور یاد رکھے کہ میں اس وقت بھی پورٹ پر تھا۔ ایک جگہ کچھ خالی کنٹینرز عرصے سے بے کار کھڑے تھے اس میں یہاں پورٹر کا کام کرنے والے آرام کرتے تھے۔ وہ کسی بحری جہاز کی آمد کی صورت میں دو دو دن بھی کام کرتے تھے اور دس بارہ گھنٹے کام کر کے وہ دو تین گھنٹے آرام کر کے پھر سے کام میں لگ جاتے تھے۔ آرام کرنے کے لیے یہ کنٹینرز استعمال کرتے تھے۔
میں ایسے ہی ایک کنٹینر کی چھت پر آ گیا۔ یہاں پرانے فوم اور کشن پڑے تھے جن سے بدبو اٹھ رہی تھی مگر محنت کشوں کے لیے اس بو کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس وقت بھی یہاں تین چار محنت کش بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک طرف لیٹ گیا اور آسمان پر نظر آنے والے تارے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ بعض انسان دوسروں کے لیے کس قدر باعث آزار بن جاتے ہیں۔ وقت گزرتا رہا۔ بارہ بج گئے۔ اس دوران میں سونے والے محنت کش اٹھ کر چلے گئے اور ان کی جگہ دوسرے آگئے۔ کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ سکندر شاہ اور

رحیم بخش کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ جو کارروائی ہوئی تھی وہ میری ڈیوٹی والے سیکشن میں ہوئی تھی۔ میں دو بجے کے بعد اٹھ کر نیچے آیا۔ ایک نلکے سے منہ ہاتھ دھویا اور پھر ایک کباڑ خانے سے اپنے مطلب کی چیز نکال کر میں کنٹینرز یارڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔

آج وہاں سناٹا تھا یعنی کوئی سرگرمی نہیں تھی۔ رات کا چوکیدار بھی نظر نہیں آرہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ سکندر شاہ نے اسے یہاں سے ہٹا دیا تھا۔ میں ایک ایسی جگہ آگیا جہاں سے میں ہر طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ پونے تین بجے کے قریب سکندر شاہ وہاں پہنچا۔ آج اوزاروں والا تھیلا اس نے اٹھایا ہوا تھا۔ اس کا آدمی ظفر بیمار تھا مگر اس نے اتنے عرصے میں سارے کام خود سیکھ لیے تھے اور وہ بھی کنٹینر کھول سکتا تھا۔ جب وہ ایک سیکشن میں گھسا تو میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ اتنے عرصے میں اسے بھی معلوم ہوگیا تھا کہ کون سا سیکشن کہاں ہے؟ وہ سی تھری میں آیا۔ یہ بھی خاصا اندر گھسا ہوا سیکشن تھا اور یہاں سارے ہی باہر جانے والے کنٹینرز تھے۔ سکندر شاہ ایک کنٹینر کے سامنے رکا، اس نے پہلے اوزاروں سے تالا کھولا اور اس کے بعد سیل اتار کر کنٹینر کے دروازے کھولے۔ جیسے ہی وہ اندر گیا، میں بھی دبے قدموں اس کے پیچھے چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد میں نے کنٹینر کو بند کر کے لاک کیا اور سیل لگا دی جو سکندر شاہ ساتھ لایا تھا، میں بھی اتنے عرصے میں دیکھ کر ان کاموں کو جان گیا تھا۔ پھر سارا سامان بیگ میں بھرا اور اسے لے کر جیٹی کے کنارے تک آیا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور بیگ پانی میں پھینک دیا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے وہ فوراً ہی ڈوب گیا۔ یہاں پانی کی گہرائی کم سے کم پچاس میٹرز تھی اس لیے بیگ کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں واپس آرہا تھا کہ ایک طرف سے دو افراد نمودار ہوئے، میں جلدی سے ایک ڈرم کی آڑ میں ہوگیا۔ آنے والا رحیم بخش تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت تھی جو اللہ بخش کی بیوی تھی۔ اس کا پتا مجھے ان دونوں کی گفتگو سے چلا۔ رحیم بخش کہہ رہا تھا۔ ”ایک رات کی تو بات ہے پھر اللہ بخش چھوٹ کر آجائے گا۔ تو چاہے تو اسے بھی پتا نہیں چلے گا۔ آج تو سکندر شاہ کے ساتھ جائے گی اور کل صبح اللہ بخش گھر آجائے گا۔“

میں نے ملگجی روشنی میں دیکھا، عورت چاند کی طرح چمک رہی تھی اور اسی وجہ سے سکندر شاہ اس کے لیے پاگل ہورہا تھا۔ سکندر شاہ نے کل بلوایا تھا مگر رحیم بخش اسے آج ہی جانے کو کہہ رہا تھا۔ مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ سکندر شاہ اب اسے یا کسی بھی عورت کو کبھی اپنے بنگلے پر نہیں بلوا سکے گا۔ وہ کچھ دیر وہاں رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ رحیم بخش یقیناً سکندر شاہ کی کال کا انتظار کررہا تھا جو کبھی آنے والی نہیں تھی۔ کیونکہ سکندر شاہ اس وقت کنٹینر میں اس حالت میں بند تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اتنی مضبوطی سے باندھا تھا اور سامان میں اتنا اندر ٹھونس دیا تھا کہ وہ کسی صورت خود کو آزاد نہیں کراسکتا تھا اور نہ ہی وہ کسی کو مدد کے لیے متوجہ کرسکتا تھا۔ لوہے کے پائپ کی ایک ضرب نے اسے لمحے میں بے ہوش کردیا تھا۔ اس کے بعد کا کام بہت آسان ثابت ہوا تھا۔

جب شبانہ میرے ساتھ واپس گاؤں گئی اور اس کی کیفیت عجیب سی تھی تب میں اسے طبیعت خرابی سمجھا تھا مگر اصل حقیقت مجھے سمیرا نے بتائی تھی۔ وہ عورت تھی اور اسی وجہ سے اس سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی۔ سکندر شاہ نے مکاری سے کام لیا۔ مجھے لے کر بندرگاہ آیا اور رحیم بخش کے ساتھ بھیج دیا۔ اس کے فوراً بعد وہ واپس آیا۔ کریم بھی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے سمیرا کو حکم دیا کہ وہ اپنے کوارٹر میں رہے اور جب تک وہ نہ بلائے وہ باہر نہ آئے۔ یہ حکم دے کر سکندر شاہ ہمارے کوارٹر میں گھس گیا۔ سمیرا اپنے کوارٹر میں رہی اور شبانہ کی گھٹی گھٹی چیخیں سنتی رہی۔ سکندر شاہ ایک گھنٹے سے بھی پہلے واپس چلا گیا اور تب سمیرا گئی اور اس نے شبانہ کی حالت درست کی۔ میں آیا تو مجھے لگا کہ سب ٹھیک ہے۔ شبانہ نے مجھے نہیں بتایا لیکن میں اسے قصوروار نہیں سمجھتا۔ اس واقعے کے نو... ماہ بعد میں باپ بن گیا تب بھی اسے قصوروار نہیں سمجھتا۔

میرا بیٹا جس کے بارے میں، میں نہیں جانتا کہ وہ میرا ہے یا نہیں۔ مگر میں اسے اپنے بیٹے کی طرح پال رہا ہوں۔ اب شبانہ میرے پاس ہے اور پھر امید سے ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ میں کبھی اسے نہیں بتاؤں گا کہ مجھے سب معلوم ہے۔ یہ راز ہمیشہ راز رہے گا۔ جیسے یہ راز شاید ہمیشہ راز رہے کہ سکندر شاہ کہاں گیا۔ وہ پھر نہیں ملا۔ وہ کنٹینر کہاں گیا، میں نہیں جانتا اور یقیناً سکندر شاہ کی لاش برآمد ہوئی ہوگی مگر وہ پھر کہاں گئی یہ بھی ایک راز ہے۔ مجھے امید ہے یہ راز ہی رہے گا۔

# دلدل

جبار توقیر

تیس برس پہلے یہاں موبائل فون تھا نہ کمپیوٹر... انسان اور انسانی رویے بہت سیدھے سادے تھے... زندگی خاصی آسان تھی... آج کے لحاظ سے اُجرتیں بہت کم تھیں... لیکن پھر بھی بچت ہو جاتی تھی کیونکہ معاشرے پر حرص و ہوس کی گرفت رواج نہیں پا سکی تھی... جبار توقیر مرحوم اس دور میں اپنے انداز کے ایک مقبول اور ایوارڈ یافتہ ادیب تھے... ان کی یہ غیر مطبوعہ کہانی معراج رسول کی ایک فائل سے دریافت ہوئی... جس میں غیر مطبوعہ مگر اہم مسودے موجود تھے... قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے منفرد ذائقے والی یہ کہانی توشۂ خاص کے طور پر پیشِ خدمت ہے۔ جس میں جابجا تین عشروں پرانی معاشرت کی جھلکیاں نمایاں طور پر موجود ہیں... حسِ مزاح... جرم اور کردار سازی کے انوکھے رنگ و روپ میں شائستگی کے ساتھ نت نئے موڑ اختیار کرتی تحریر کے نشیب و فراز...

**دولت کے گرد گھومتی تکون کے پارہ پارہ ہوجانے کا خونی ماجرا**

جو کچھ بھی ہوا، میں اسے تقدیر کہہ کر اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا تھا۔ مجھے اس سانپوں کی باسی میں ہاتھ ڈالنا ہی نہیں چاہیے تھا مگر وہ جو آدمی کے اندر ایک ننگ آدمی اتر جاتا ہے، وہ میرے وجود میں بھی خدا جانے کب سے پل رہا تھا۔ میں اس کی گرفت میں آیا تو پھر پیچھے نہ ہٹ سکا۔ میرے بچاؤ کی ساری راہیں مسدود ہوگئیں اور وہ سب کچھ ہوگیا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ شعیب صاحب بھی اس گھر سے ایک دن منہ لٹکائے واپس آگئے اس طرح کہ ان کا وہ رنجیت سنگھ کے زمانے کا تھیلا ان کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ جس میں وہ مختلف قسم کے خلاصے بند کر کے ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔ ان کی وہ بالائی ہونٹ پر جھولتی ہوئی ناک یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ بہت بے آبرو ہو کر لوٹے ہیں۔ ان کی وہ ناک دراصل بہت ہی حساس قسم کا انٹینا تھی۔ جب وہ بہت نیچے جھک آتی تو میں سمجھتا تھا کہ ان پر شدید بیزاری کی کیفیت طاری ہے۔ جب ان کے نتھنے پھڑکتے تھے تو مجھے معلوم ہوجاتا تھا کہ ان پر غم واندوہ کی یورش بڑھ گئی ہے مگر اس روز ان پر دونوں ہی کیفیتیں طاری تھیں اور ظاہر کرتی تھیں کہ ان کے دل ودماغ پر جبرِ غم کے کوئی قصور نازل نہیں ہو رہی ہے۔ ان کے ادراک کی اسکرین تاریک پائی جاتی تھی۔ نتھنے بھی پھڑک رہے تھے جو اس بات کی علامت تھے کہ دنیا سے ان کا جی بیزار ہو چکا ہے۔

''کیا ہوا مولانا آپ تو باقاعدہ رونے پر آمادہ نظر آتے ہیں؟''

وہ تھیلے اپنی جھلنگا سی چارپائی پر پھینک کر کئی قسم کی رنگین عربی فارسی کی گالیاں دیتے ہوئے بولے۔

''اس نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ اس ننگ النسا نے۔''

''اچھا یعنی آپ کو جواب بھی ملتا تھا وہاں سے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ اب تو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگے۔''

''آپ بکواس کرتے ہیں۔ ایک دم مجہول آدمی ہیں آپ، ہماری آج ایسی توہین ہوئی ہے کہ ہم زندگی پر موت کو ترجیح دیتے آئے ہیں۔''

''اچھا یعنی نوبت بہ این جا رسید۔ آخر اس پردہ نشین نے کہا کیا ہے۔ آپ نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر اسے مظلوب نہیں کیا؟''

''خاک مظلوب کرتے۔ وہ سامنے آتی تو ہم اس کو وہیں قتل کر دیتے۔ واللہ ایسی نالائق اور نامعقول خاتون ہے وہ۔''

''مگر ہوا کیا ہے، آپ خود شکست تسلیم کرنے والے آدمی تو نہیں ہیں؟''

''وہ... وہ... اس نے کہا کہ بچی کی تعلیمی ترقی میں ہم معاون ثابت نہیں ہو رہے۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ انگریزی، حساب، فارسی، عربی اور تاریخ جغرافیہ کے علاوہ دیگر علوم میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں مولانا۔''

''لعنت بھیجیں ہاشمی صاحب! وہ... دراصل آدم بیزار خاتون ہے۔ ہم نے بچی کو پرسوں یہ سمجھایا تھا کہ ضلع اٹک صوبہ سرحد میں واقع ہے... جب ہم نے دسویں پاس کی تو اس وقت وہ صوبہ سرحد کا ہی حصہ تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے بعد میں اگر ردوبدل ہوگیا تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ بچی نے کہیں اندر جا کر خاتون کو بتا دیا۔ بس اسی بات پر وہ بھڑک اٹھی اور ہمیں ڈھائی سو روپے دے کر آج سے برخاست کر دیا۔''

''آپ نقصان میں تو نہیں رہے، پڑھایا تو آپ نے پندرہ ہی دن ہے۔''

''وہ دربان زادی خبیث نجم بی بی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ مگر یہ کوئی شرافت ہے ہاشمی صاحب! ہم... ہم ایم اے، ایم او ایل ہیں۔ کیا قدر کی اس حرافہ نے ہماری۔ بچی تو پانچویں میں ہی پڑھ رہی ہے نا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی میٹرک بھی پاس نہیں کر سکے گی۔ ایک دم کند ذہن ہے وہ بچی۔ وہ میمنہ...''

''کیا نام بتایا ہے آپ نے اس کا... میمنہ! یہ کیا بات ہوئی؟''

''میمونہ ہے نام اس کا مگر ہے وہ میمنے ایسی۔ ایک دم واہیات کند ذہن نالائق بھی۔'' شعیب صاحب کی ناک کے نتھنے کچھ اور پھڑکنے لگے تھے۔

''یہ تو بہت برا ہوا شعیب صاحب! پہلے وہ مولانا عبدالباری بھی بہت ذلیل ہو کر نکلے تھے وہاں سے۔ ان پر بھی نالائقی کا ہی الزام تھا۔''

''وہ کچھ اور چاہتی ہے ہاشمی صاحب! کچھ اور جو میں اسے نہیں دے سکتا۔ کوئی بھی نہیں دے سکتا۔''

''نہیں ہاشمی صاحب! آپ نے ابھی بتایا تھا کہ وہ ہمیشہ پردے میں رہتی ہے اس کا ناخن تک کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر وہ...''

''یہی تو میں حیران ہوں جناب! اب دیکھیں نا، جو کچھ بھی پڑھتی ہے اس کا روزانہ وہ امتحان لیتی ہے۔ وہ پری وش!''

''یہ اس کا نام ہے۔ اس خاتون کا؟''

''ہاں اس کا یہی نام ہے اور تخلص بھی کرتی ہے۔ کوئی شعر شعور کہہ لیتی ہوگی۔''

''نام تو بہت خوب صورت ہے اس کا۔''

''خدا جانے کیا چیز ہے وہ۔ مجھے تو وہ پاگل معلوم ہوتی ہے اس کا سارا انتظام دربان زادی نجمہ شاہانی ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

'آپ اگر تیزی نہ دکھاتے تو میں قسمت آزمائی کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس بچی کو آپ سے بہتر پڑھا سکتا تھا۔''

''آپ بھی قسمت آزمالیں۔ ذلیل ہونا ہے تو وہاں ضرور جائیے۔ میں اور باری تو خوار ہو ہی چکے ہیں۔''

''مگر میں... میں اب وہاں کیسے جاسکتا ہوں؟''

''اس نجمہ نٹنی نے کہا تھا کہ اگر کوئی اور اچھا استاد ملے تو میں اس کو بھیج دوں۔''

''اچھا یہ بھی کہا ہے اس نے یعنی آپ کے منہ پر ہی کہہ دیا کہ آپ تو جائیں چھٹی کریں اور کسی اور کو بھیج دیں؟''

''اور نہیں تو کیا؟ یہی تو رونا ہے میرے وہ سامنے ہوتی نا وہ بیگم پری وش مخفی تو میں اس کو چاقو مار دیتا۔''

''اللہ اللہ! یہ کیسے نیک ارادے ہیں آپ کے۔ مگر میرا خیال ہے مولانا کہ آپ کی ناکامی میں آپ کی شیروانی کا بھی بڑا دخل ہے۔ اس موسم سرما میں تو اسے غسل کروا لیں۔''

''چپ رہیں جی آپ! یہ شرفا کا لباس ہے اور ایک استاد کے لیے نہایت ہی موزوں بھی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ نے اٹک ضلع صوبہ سرحد کے کھاتے میں کیوں ڈال دیا۔ یہ بھی تو زیادتی ہے۔ آپ سے پہلے حافظ نے بھی یہی غلطی کی تھی کہ اس نے بخال ہندوش بخشتم سمرقند و بخارا... کا اعلان کیا تو اس کی شامت آگئی تھی۔''

''میں کیا کرتا جناب! پہلے تو میانوالی بھی صوبہ سرحد میں تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ دونوں ضلع کس نے پنجاب میں ڈال دیے۔ بھئی اس کا اعلان ہونا چاہیے تھا نا باقاعدہ مجھے کوئی الہام تو نہیں ہوسکتا تھا۔''

''آپ دراصل اخبار نہیں پڑھتے۔''

''میں اخبار نہیں پڑھتا تو اس کی معقول وجہ ہے۔ اس میں فحش تصویریں چھپتی ہیں۔ گندی گندی جرائم کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ میں اپنا دین، ایمان خراب نہیں کر سکتا۔ ایسے چیتھڑا اخبار پڑھ کر۔''

''ہاں آدمی کو اپنا ایمان تو ہر حالت میں درست رکھنا چاہیے۔ کیا پتا کب آدمی کو گاڑی سے باہر پھینک دیا جائے۔ موت کا تو کوئی وقت متعین نہیں ہے نا۔'' میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

مولانا نے اپنے بوٹ اتار لیے۔ ان کی جرابوں کی بُو کمرے میں پھیلنے لگی تو میں اٹھ کر کوارٹر سے صحن میں نکل گیا۔ شعیب ہاشمی صاحب کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ وہ نہ اپنی جرابیں دھوتے تھے نہ پیر، اور وہ بوٹوں کے اندر پسینے میں بھیگ بھیگ کر ایسی بدبودار ہو جاتی تھیں کہ وہ جب پیر کھولتے تھے تو چاروں اطراف کی ہوا آلودہ ہو جاتی تھی۔

اس وقت شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے، سورج غروب ہونے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں صحن میں نکلا تو ٹھنڈی ہوا نے مجھے یہ احساس دلایا کہ سرما اپنا رنگ دکھانے لگا ہے۔ باہر تار پر لٹکتا کمبل اوڑھ کر میں چھوٹے سے برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اس پری وش مخفی کے طرزِ عمل نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ عبدالباری بھی وہاں سے ناکام لوٹ آیا تھا۔ اب شعیب صاحب بھی بھنائے ہوئے واپس آئے تھے۔ وہ پریوش کسی کو خاطر میں ہی نہ لاتی تھی۔ ان دونوں نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ وہ خاتون جس کی وہ ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے تھے، ایک وسیع و عریض کوٹھی میں رہائش پذیر تھی۔ اس کا باپ نبی احمد اورنگ چالیس لاکھ روپیا نقد بینک میں اپنی بیٹی کے لیے ترکے میں چھوڑ کر انتقال کر گیا تھا اور اب وہ پری وش مخفی اتنی بڑی دولت کی تنہا مالک تھی۔ کوٹھی بھی اپنی مالیت کے اعتبار سے 90 لاکھ روپے سے کم کی نہیں تھی۔ اورنگ صاحب محکمۂ تعمیرات کے ٹھیکے دار تھے اور اتنے کامیاب کہ کسی بھی سودے میں انہیں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

مخفی کی طرف سے کئی ماہ پہلے اخبار میں اشتہار چھپا تھا کہ انہیں ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے جو پانچویں جماعت کی انگلش میڈیم میں پڑھنے والی لڑکی کو پڑھا سکے۔ عبدالباری سے پہلے مخفی نے دو آدمیوں کو آزما کر برطرف کر دیا تھا۔ پھر باری بھی اپنی قابلیت کا لوہا نہ منوا سکا اور وہ بھی مخفی کے معتوبین میں شمار ہو گیا۔ اس کا نیا ہدف مولانا محمد شعیب

ہے۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ڈھائی سو روپے ماہوار کا یہ سودا کوئی ایسا سستا نہیں ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے۔ باری اور شعیب بھی میری طرح سرکاری ملازم تھے۔ باری صوبائی سیکریٹریٹ میں اسسٹنٹ تھا اور شعیب صاحب ان دنوں اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ محدود آمدنی کے باعث دونوں کو اپنے بال بچوں کی پرورش کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔ دونوں نے لاہور میں مکانوں کے ہوشربا کرایوں سے بچنے کے لیے بیوی بچوں کو اپنے گاؤں میں چھوڑ رکھا تھا۔ میرا حال بھی اس سے کوئی ایسا مختلف نہیں تھا۔ مجھے ان دنوں ایک بینک میں جگہ ملی ہوئی تھی مگر تنخواہ میری صرف ایک سو اکیاون روپے تھی حالانکہ میں بھی ایم اے کر چکا تھا اور وہ بھی ایم اے فارسی۔ مگر مجھے کوئی معقول ملازمت نہیں مل سکی تھی۔ یہی حال باری اور شعیب کا تھا۔ وہ دونوں بھی ایم اے تھے۔ باری نے اردو میں اور شعیب نے اسلامیات میں ماسٹرز کی ڈگریاں لے رکھی تھیں مگر ہم سب زمانے کی ناقدر شناسی کا شکار تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ ہم بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ مغلی کے ہاں سے بچی کو ٹیوشن پڑھانے سے اگر ڈھائی سو مل سکتے ہیں تو وہ ضرور لینے چاہئیں۔

میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اس بچی میمونہ کی ٹیوشن کے لیے میں ضرور قسمت آزمائی کروں گا۔ کیونکہ ڈھائی سو روپے کی رقم معمولی رقم نہیں تھی۔ صرف ایک دو گھنٹے روزانہ کی سرکھپائی سے اگر یہ روپے مل سکتے تھے تو وہ چھوڑ دینا کسی طرح بھی عقلمندی نہیں تھی۔

رات کا کھانا جب مولانا شعیب پکا کر میز پر لگا چکے تو باری نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر سالن میں لقمہ ڈبو دیا۔ یہ مولانا شعیب کا احسان تھا کہ وہ صبح شام ہمارے لیے کھانا پکا دیتے تھے کہ یہ فنِ لطیف صرف انہی کو آتا تھا۔ ہم ان کی صرف اتنی مدد کرتے تھے کہ صبح کے برتن باری دھو دیتا تھا اور شام کے جھوٹے برتن مجھے دھونے پڑتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا میری محنت سے زیادہ مطمئن تھے کیونکہ میں برتن زیادہ صفائی سے دھو دیتا تھا۔ کوارٹر جس کا کرایہ ہم مل کر پینتالیس روپے ادا کرتے تھے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں جھاڑو مولانا شعیب دے دیتے تھے اور ہمارے کپڑے دھوبی کے ہاں سے دھل کر آجاتے تھے اور یوں وہ کشتم پشتم زندگی ہم کسی نہ کسی طرح گزار رہے تھے۔

لقمہ باری نے منہ میں ڈالا تو بولا ''سبحان اللہ مولانا۔ ایسی دال تو بہادر شاہ ظفر کا باورچی بھی نہ پکاتا ہوگا۔ واللہ کیا عمدہ تڑکا لگایا ہے آپ نے۔'' وہ مولانا شعیب کی امورِ خانہ داری میں بے مثال مہارت کی داد بہت کھل کر دیتا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی اگر وہ اس تعریف میں بخل کرتا تو ہم پکے پکائے گرما گرم کھانے کی نعمت سے یکسر محروم رہ جاتے۔ مولانا کی کمزوری یہی تھی کہ وہ تعریف و توصیف کے بھوکے تھے اور ہمیں اپنی بھوک کی فکر پریشان رکھتی تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں باری صاحب! مولانا کے بنائے ہوئے کھانے کے مقابلے میں تو من و سلویٰ بھی ہیچ ہے۔''

''استغفر اللہ! ایسا نہ کہیے ہاشمی صاحب! مجھے اتنا اونچا نہ اٹھائیں۔''

''ہاں! آپ کا دل تو آج ویسے ہی رو رہا ہوگا مگر اب میں اپنی قسمت آزماؤں گا۔ کل اس پری وش مغلی کے ہاں میں جا رہا ہوں۔''

''ارے ہاشمی صاحب! آپ بھی ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔'' باری نے مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی ہو جائے۔ میں آپ دونوں کی یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ کل میرا اس سے ٹیسٹ میچ شروع ہو جائے گا۔''

''خدا آپ کی وکٹیں سلامت رکھے۔ ہم آپ کے لیے دعا کریں گے۔'' باری نے ماش اور چنے کی دال پر زیادہ تیزی سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا پھر لقمے کو شاید وہ سالم ہی نگلتے ہوئے بولا۔

''ویسے مجھے مولانا کی اس بے وقت رحلت پر بہت دکھ ہوا ہے۔ وہ.....'' باری نے زبردست قسم کی گالی دیتے ہوئے کہا۔

''اس کی دولت نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔'' شعیب نے کہا۔

''بہرحال، ہاشمی صاحب! ادھر سوچ سمجھ کر جائیں، وہاں آپ کی بھی دال نہیں گل سکے گی۔ وہاں ٹیوشن پڑھانا آسان کام نہیں ہے۔''

''میں سمجھ لوں گا اس سے باری صاحب!'' میں اٹک ضلع کا محل وقوع اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ مولانا شعیب کٹ کر رہ گئے۔

اگلے دن میں دفتر سے دو بجے گھر پہنچا اور اپنے بہترین قسم کے ولایتی سوٹ پر استری کرنے بیٹھ گیا۔ اسے میں بس کبھی کبھار ہی پہنتا تھا۔ سفید براق لٹھے کی قمیص پر

جب میں ٹائی لگا چکا تو مجھے محسوس ہوا کہ عمدہ قسم کی نئی دھلی ہوئی صاف ستھری قمیص پہنتے ہی آدمی کے وجود کی رت بدل جاتی ہے۔ اپنی ساری تنخواہ میں ان دنوں خالص ململ آور عمدہ کپڑوں کی خریداری پر صرف کردیتا تھا۔ وہ بھلے دن تھے۔ بہترین قسم کا بوٹ بیس روپے میں مل جاتا تھا اور اچھی قمیص پر آٹھ روپے سے زیادہ لاگت نہیں آتی تھی۔ جانفزا خوشبو بھی بارہ تیرہ روپے میں مل جاتی تھی۔

میں نے گڑھی شاہو کے چوک میں پہنچتے ہی ٹیکسی لی اور بڑے کروفر سے اس میں بیٹھ کر سیدھا گلبرگ جا پہنچا۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز سننے پر ایک معمر آدمی نے گیٹ کھول دیا۔

''بڑے میاں! میں مس صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا نام انور ہاشمی ہے۔ انہیں اطلاع کردو، کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی... میرا نام علی جو ہے۔ میں کیا کہوں بیگم صاحبہ سے؟''

''کہو کہ ہم بچی کی ٹیوشن کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''جی بہت اچھا۔ میں انہیں بتاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ عمارت کے سامنے بنے تیس فٹ عرض کے لان کے کنارے کنارے پختہ روش پر چلتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں نے گیٹ اپنے پیچھے بند کیا اور اس کے پیچھے بڑے اطمینان سے چلتا ہوا برآمدے میں جا ٹھہرا۔ وہاں بید کی میز کرسیاں پڑی تھیں اور ان کی ترتیب میں قرینہ جھلکتا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد برآمدے کا وسطی دروازہ کھلا اور ایک عورت جو سر سے پاؤں تک چادر میں ملبوس تھی۔ کانگنجا پردہ کرتی ہوئی باہر آگئی اور بولی۔

''آپ بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتے ہیں؟'' اس کی آواز اس کے حلیے کی نفی کرتی تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے یقین اور ایمان سے بھی زیادہ جوان ہے۔ اس کا رنگ شہابی تھا اور ہونٹ پھول کی پتیوں ایسے نازک نازک۔ ان کی سرخی کسی تازہ زخم کا منظر پیش کرتی تھی جس میں سے لہو رس رہا ہو۔ آنکھیں سیاہ موتیوں کی سی چمک لیے ہوئے تھیں مگر ان آنکھوں میں عجب سی دہشت ناک بے مہری تھی۔ جب وہ انہیں جھپکاتی تھی تو مجھے شجر حجر سجدہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پلکیں جھالر ایسی صورت میں ان آنکھوں پر یوں گرتی تھیں کہ کلک ایسی آواز مجھے سنائی دیتی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت ہی حسین عورت تھی مگر بڑی محتاط بڑی ہی ڈھکی چھپی اور بند۔ عمر اس کی یہی کوئی پچیس سال ہوگی مگر اس نے اپنے بدن کی حشر سامانیوں پر ایک ملگجی سی ماتمی چادر ڈال رکھی تھی۔ یوں جیسے وہ اپنے فتنہ گر حسن سے خوف زدہ ہو اور اسے دھول میں چھپا دینا چاہتی ہو مگر اس کے باوجود اس کے نشیب و فراز اپنی بے کل موجودگی کا اعلان کرتے رہے تھے۔ میں نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری آنکھوں میں ابھرتا تحیر اس نے دیکھا تو ذرا بلند آواز میں بولی۔

''کیا کام ہے آپ کو بیگم صاحبہ سے؟''

''میں بچی کی ٹیوشن کے سلسلے میں ان سے بات کروں گا۔''

''ہوں۔ اندر آجائیے۔ وہ پردے میں بیٹھ کر آپ سے بات کرلیں گی، آیئے۔''

یہ کہہ کر وہ دروازے سے داخل ہوئی تو میں بھی اندر چلا گیا۔ اس دروازے میں قدم دھرتے ہی مجھے محل کے شہنشاہی ساز و سامان نے میری کم مائیگی کا احساس دلا دیا۔ بیش قیمت قالین سامنے راہداری میں بچھا تھا۔

''آپ کا نام نجمہ ہے نا؟'' میں نے اس کے قریب ہو کر دبی آواز میں کہا۔ وہ ٹھٹک سی گئی اور رک کر اس نے کچھ ایسی نظر سے مجھے دیکھا کہ میں سمجھا کہ میرے منہ سے اپنا نام سننا اسے اچھا نہیں لگا مگر پھر اس کے شہد آگیں ہونٹ یوں کھلے جیسے کلی کھلنے کے مرحلے سے گزرتی ہے۔

''میرا نام آپ کو کس نے بتایا ہے؟'' اس نے سرگوشی کے انداز سے کہا۔

''میرا اندازہ تھا کہ آپ کا نام نون سے شروع ہوتا ہے یا آپ نوربھری ہیں یا نجمہ ہیں یا نازیہ یا... ناوک۔''

''کچھ اور بھی تو ہوسکتا ہے۔ علی جو نے بتایا ہے میرا نام آپ کو؟'' اس کے لہجے میں سرزنش بھی تھی اور ہلکی سی ستائش بھی۔

''نہیں تو... میں تھوڑا بہت علم نجوم بھی جانتا ہوں۔''

''آپ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہے ہیں۔ ناوک کے معنی بھی آتے ہیں آپ کو؟''

''تیر کو ناوک کہتے ہیں۔ یہی کہتے ہیں نا؟ اور آپ کو میں نے صرف ناوک نہیں بلکہ نازک انداز کہنا چاہیے۔''

میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ یوں جیسے وہ سمجھ رہی ہو کہ میں اسے بانہوں میں لے لوں گا۔ راہداری کوئی تیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی تھی۔ اور اتنی تنہا پُراسرار اور اشتعال انگیز کہ میں

خود اس لمحے کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ جو ہمیں اپنے حلقے میں لیے ٹھہر سا گیا تھا۔

وہ حیرت زدہ سی ہو کر میرا منہ تک رہی تھی، بولی۔

''بڑے بے باک ہیں آپ؟ مگر براہِ کرم یہ بات یاد رکھیں کہ یہ مس پریوش تختی کا گھر ہے اور میں ان کی ادنیٰ ملازم ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس ملازمت کے حصول میں میری مدد کریں۔''

وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی اور تیزی سے بولی۔

''آپ ان سے اسی اعتماد، بے باک اور کھرے لہجے میں بات کریں۔ انہیں ضرورت ہے اور وہ ناقابلِ تسخیر بھی نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور راہداری کے وسط میں پہنچ کر ایک دروازہ بے آواز کھول کر اندر چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آئی اور بولی۔

''آئیے۔'' اس نے اپنی برقع نما چادر میں سے اپنا ہاتھ نکال کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دہلیز کے اندر قدم رکھ دیا۔ سامنے ایک وسیع و عریض کمرا تھا جس کے وسط میں ایک شیشے کی دیوار بنی تھی۔ میرے بینک کے جنرل منیجر کے کمرے میں بھی ایسی ہی ایک دیوار تنی رہتی تھی۔ کمرے میں دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک ہاتھ پر صوفہ بچھا تھا جس کے سامنے شیشے کی دو میزیں دھری تھیں۔ ویسا ہی صوفہ دوسری دیوار کے ساتھ بچھا تھا۔

''آپ یہاں بیٹھیں۔ بیگم صاحبہ آپ سے ابھی بات کریں گی۔'' اس نے یہ کہہ کر مجھے صوفے پر بٹھایا اور پھر تیزی سے دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ میں چند لمحوں تک اس کمرے میں پھیلی گلاب کے عطر کی دھیمی دھیمی خوشبو کو اپنی سانسوں میں جذب کرتا رہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں سگریٹ سلگا لوں مگر پھر مس پری وش کے مزاج سے ناآشنا ہونے کے سبب میں نے اپنی اس خواہش کو سختی سے دبا دیا۔

چند ہی لمحوں بعد مجھے دوسری طرف ہلکی سی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔

''آپ کیسے تشریف لائے ہیں جناب؟''

ایک عجیب سی آواز میری سماعت میں اتری۔ وہ آواز بہت ہی کھردری اور نیم مردانہ سی لگی جیسے پردے میں کوئی خواجہ سرا بیٹھا ہو۔

''جناب میں بیگم پری وش تختی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''تختی ہی آپ سے مخاطب ہیں اور اس شیشے میں سے ہم آپ کو بہ خوبی دیکھ رہے ہیں۔'' میں ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ شیشہ عکاس آئینہ تھا اور میں اس میں سے اسے پوری طرح نظر آرہا تھا۔

''میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے باریابی کی اجازت دی۔ دراصل میں آپ کی بچی کی ٹیوشن کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''وہ ہماری بچی نہیں بلکہ ہماری مرحومہ پھوپی زاد بہن کی بیٹی ہے۔ ان کے شوہر بھی انتقال کر چکے ہیں۔ آپ کو کس نے ہمارے پاس بھیجا ہے؟'' اس کے لہجے میں اضطراب ابھر آیا تھا۔

''مجھے شعیب صاحب نے بتایا ہے کہ آپ نے انہیں برطرف کر دیا۔ میں نے سوچا کہ میں شاید یہ خدمت بہتر طور پر سرانجام دے سکوں۔''

''اوہ! شعیب صاحب؟ ہاں میں نے کل انہیں جواب دے دیا تھا۔ بچی کی تعلیم ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ آپ کی تعلیم؟''

''میں نے ایم اے کر رکھا ہے فارسی میں۔ ویسے بی اے تک میرے مضامین ایسے تھے کہ میں دسویں تک کے بچوں کو حساب، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ بہ خوبی پڑھا سکتا ہوں۔''

''آئی سی۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

''میرا نام انور ہاشمی ہے۔''

''کہاں کام کرتے ہیں آپ؟''

''میں بینک میں ملازم ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے بینک کا نام بھی بتا دیا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ مالی امور میں بھی ہمیں کچھ اچھے مشورے دے سکیں گے۔''

''میں کوشش کروں گا۔ بینک کے سلسلے میں واقعی آپ کو ہر قدم پر راہنمائی کی ضرورت ہو گی۔''

''ہم دراصل شیئرز میں انٹرسٹڈ ہیں۔ اگر آپ ان امور کو سمجھتے ہوں تو ہمیں خوشی ہو گی۔''

''میرا خیال ہے کہ میں اس معاملے میں آپ کو مناسب راستہ دکھا سکتا ہوں۔''

''آئی سی! ٹھیک ہے ہم آپ کو مونی کی ٹیوشن کے لیے تین سو روپے دے سکتے ہیں۔ اگر منظور ہو تو آج ہی سے کام شروع کر دیں۔ کوئی حوالہ تو ہو گا آپ کے پاس اپنی شناخت کا؟''

یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ میرے پاس جو بینک کا شناختی

کارڈ تھا اس پر صاف لکھا تھا کہ میں وہاں کلرک کی حیثیت سے کام کررہا ہوں اور وہ کوئی فخر و انبساط کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے کہا۔

"جی ہاں؟ یہ رہا میرا شناختی کارڈ۔" یہ کہہ کر میں نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ تو عین اس وقت میرے سامنے شیشے کی دیوار میں خلا سا پیدا ہوگیا۔ وہاں ایک دروازہ تھا جو کسی برقی نظام سے کھل جاتا تھا۔ اس میں سے ایک سیاہ رنگ کی ریشمی چادر میں لپٹا ہوا ہاتھ باہر آیا۔ میں نے کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دروازہ ابھی کھلا ہی تھا کہ وہ ہاتھ پیچھے ہٹا اور پھر چند لمحوں بعد پری وش نے وہ کارڈ اپنے مستور ہاتھ میں پکڑ کر مجھے واپس دے دیا، بولی۔

"آئی سی، آپ وہاں کلرک ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں... آپ کی ضرورتوں کا ہم خیال رکھیں گے بشرطیکہ آپ نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے نبھایا۔"

"میں اپنے طور پر پوری کوشش کروں گا۔"

"ہمیں حریص آدمی سے نفرت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ہماری دولت کی وجہ سے دوڑے چلے آتے ہیں لیکن ہمیں امید ہے کہ آپ صرف اپنے کام سے غرض رکھیں گے کیونکہ اپنے معاملات میں کسی کی بے جا دخل اندازی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔" اچانک اس کے لہجے میں نخوت ابھر آئی۔ ایسی نخوت جو مخاطب کو کچوکے لگاتی تھی۔ اس میں تحکم بھی تھا اور تکبر بھی۔ نسائیت کا شائبہ بھی تھا مگر آواز کا بھاری بھرکم تاثر مجھے بار بار یہ احساس دلاتا تھا کہ میں کسی مرد نما عورت سے مخاطب ہوں۔ کوئی اور جگہ ہوتی کسی اور صورتِ حال میں وہ آواز مجھے سننی پڑتی تو میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر وہاں سے ہٹ جاتا۔ مگر وہاں مجھے تین سو روپے کی پیشکش مل چکی تھی۔ میں اپنی تمام تر تلملاہٹ کے باوجود اس آواز میں نغمگی ڈھونڈتا رہا مگر وہ عنصر تو سرے سے ہی وہاں ناپید تھا۔ پھر بھی میں طوعاً و کرہاً اسے برداشت کرگیا۔ چاہنے کے باوجود وہاں سے اٹھ کر نکل جانے کی ہمت نہیں پارہا تھا۔ میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے انور ہاشمی تو اس دروازے میں داخل ہوتے ہی دل سے نکلی دعا کی طرح شرفِ قبولیت پاچکا ہے۔ یہاں سے تیری خالی ہاتھ واپسی تجھے زیب نہیں دے گی۔ مولانا شعیب اور اس باری سے تو تو بہرحال بہتر ہے کہ تجھے پہلے ہی مرحلے میں اس مخلی کی بارگاہ سے تین سو روپے کی نوید مل گئی ہے۔ اس نے جب بے جا دخل اندازی کے بارے میں اپنا نکتہ نظر ظاہر کیا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ مجھے میری حیثیت کا احساس دلا رہی ہے کہ انور ہاشمی اپنی کھال میں رہنا۔ ورنہ شعیب اور باری کی طرح دوسرے ہی دن برطرف کردیے جاؤ گے۔ مجھے بہرحال اپنی عزتِ نفس پر برستے کوڑے کو سہتے ہی بنی۔ میں نے اس کے فقرے کی تمام تر تلخی کو پیتے ہوئے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا آنسہ پری وش مخلی صاحبہ مجھے کسی کے نجی معاملات میں دخل دینے کا مالیخولیا کبھی نہیں رہا۔" جانے یہ بات میں نے کیسے کہہ دی میرا لہجہ واقعی زخمی تھا۔ مجھے وہ لفظ نہیں کہنے چاہیے تھے مگر وہ میرے منہ سے نکل ہی گئے۔ میرے یہ الفاظ سنتے ہی اس نے گھنٹی بجادی۔ نجمہ شاید راہداری میں دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ فوراً ہی اندر آگئی۔ اسے سامنے دیکھ کر مخلی نے بے حد تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

"ان سے کہو نجمہ کہ یہ کل چار بجے آجائیں۔" اس کی آواز اور زیادہ روکھی بلکہ ترش ہوگئی تھی۔ یہ بات وہ براہ راست بھی مجھ سے کہہ سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ نجمہ کے ذریعے مجھے اپنی قوت کا احساس دلا رہی تھی۔

"چلیے صاحب میں آپ کو دروازے تک پہنچا دوں۔" اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے بھی طیش آگیا۔ میں نے ترش لہجے میں کہا۔

"میں خود چلا جاتا ہوں۔ کل ٹھیک چار بجے میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ بچی مجھے پڑھائی کے لیے تیار ملنی چاہیے۔ میں روزانہ صرف ایک گھنٹا دے سکوں گا۔ مجھے انہوں نے تین سو روپے کی پیشکش کی ہے مگر میں صرف ڈھائی سو لوں گا۔ وہی رقم جو یہ دوسروں کو دیتی رہی ہیں۔ اپنی مالکن سے یہ بات کہہ دیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نجمہ کی سرد اور اندر اتر جانے والی بے مہر نگاہوں کی پروا کیے بغیر تیزی سے کمرے میں سے نکل کر راہداری میں جا پہنچا۔ دروازہ میں نے جان بوجھ کر اپنے پیچھے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ کمانیوں پر جما تھا ٹھک سے بلند ہوا تو راہداری میں اور اس کے اردگرد منجمد سکوت چھن سے ٹوٹ گیا۔

میں ابھی راہداری عبور نہیں کر پایا تھا کہ نجمہ کو میں نے اپنے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتے دیکھا۔ قالین پر اس کے نئے مگر بدوضع سلیپر گھسٹتے چلے آرہے تھے۔

"بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ آپ کو وقت کی ہر حال میں پابندی کرنی ہوگی۔" اس نے میرے قریب پہنچ کر کہا۔ اس کی آواز میں بھی عجیب طرح کی بے مہری جھلکنے لگی۔

"ایسا ہی ہوگا۔ مجھے اپنے وقت کی قدر و قیمت کا ان

سے زیادہ احساس ہے۔''

اس نے آگے بڑھ کر بڑا سا آبنوسی دروازہ کھول دیا۔

''آپ کا لب و لہجہ بہت تلخ ہے۔ حالانکہ آپ ضرورت مند ہیں۔''

''ضرورت مند تو ہوں مگر میں بے غیرت نہیں ہوں۔ اپنی مالکن سے کہہ دیں کہ وہ خوامخواہ مجھ سے اتنے متکبر لہجے میں پھر کبھی بات نہ کریں۔ ایسے معاملوں میں میں بہت حساس آدمی ہوں۔'' میں نے جان بوجھ کر اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ میں دراصل اس پردہ نشین کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ میں کوئی ایسا گرا پڑا آبرو باختہ آدمی نہیں ہوں اور میری ضرورت مجھے اس کی دریوزہ گری پر مجبور نہیں کر سکے گی۔

نجمہ نے تحیر آمیز انداز سے مجھے دیکھا اور بولی۔

''آپ بہت تیز مزاج آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ اپنے کسی بھی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔''

''میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ کا حصول آپ کو کوئی بڑا مقصد نظر آتا ہے؟''

''چھوٹے سے بیج پر دیوہیکل درخت اگ آتے ہیں۔ کل جب آئیں تو اپنے مزاج کی یہ گرمی ساتھ نہ لائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے صدر دروازہ بند کر لیا اور میں بنگلے کے خوب صورت برآمدے میں مرمریں فرش پر ٹھک ٹھک چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکل آیا۔ گیٹ میرے پیچھے علی جو نے بند کیا۔

میرے سامنے اب دو ہی امکانات ابھر رہے تھے یا تو اگلے روز میرے لیے وہ دروازہ نہیں کھلے گا اور اگر کھل گیا تو وہ امیرزادی مجھ سے کہیں زیادہ محتاط لہجے میں بات کرے گی اور اسے یہ احساس ہمہ وقت خبردار کرتا رہے گا کہ میں کس ڈھب کا آدمی ہوں۔ اپنا لہجہ میں نے جان بوجھ کر تلخ کر لیا تھا۔ میں ان عورتوں کے ساتھ ڈھائی سو روپے کے لوٹ کتے کی طرح زمین پر منہ مار کر نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اس پری وش نخلی کی ضرورت تھی جس کے تحت وہ موتی کے لیے ٹیوٹر ڈھونڈتی تھی۔ میں اپنی ضرورت تلے دبا اپنی خدمات پیش کر رہا تھا مگر وہ مجھے خوامخواہ ہی اپنی بلند و بالا حیثیت کا احساس دلا رہی تھی۔

حیرت مجھے نجمہ کے الفاظ پر تھی۔ وہ مجھے کسی دیوہیکل درخت کی نوید سنا رہی تھی۔ اس کا عندیہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی اور سرد مہری بھی مجھے حیران کرتی تھی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ یوں جیسے وہ خزاں کی زد میں آ کر آرزو کی ہر کونپل سے محروم ہو چکی ہو۔

کوارٹر پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ شعیب اور باری اگلے روز اتوار ہونے کی وجہ سے گاؤں جا چکے ہیں، یہ ان کا معمول تھا۔ دوسرے دن جب میں اپنا بہترین لباس زیبِ تن کر کے نخلی کے دروازے پر پہنچا تو اس وقت شام کے ٹھیک چار بج رہے تھے۔ علی جو نے پہلی ہی گھنٹی پر گیٹ کھول دیا۔ جب میں لان عبور کر کے برآمدے میں پہنچا تو نجمہ مجھے عمارت کے صدر دروازے میں کھڑی مل گئی۔ اس کے بے ڈھب لباس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سلیٹی رنگ کی بڑی سی گرم چادر سے اس نے اپنے آپ کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر پھر بھی اس کے وجود کے وہ سارے جوالا مکھی ایسے نشیب و فراز میرے دل میں اتھل پتھل مچانے لگے۔ اس کو دیکھ کر مجھے پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود سپردگی کی آرزو میں مری جاتی ہے۔ یہ میرا موہوم سا احساس تھا۔ اس کی جھکی جھکی آنکھوں سے مجھے کچھ ایسا ہی تاثر ملتا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ بڑے ہی سرد لہجے میں بولی۔

''آپ نے اچھا کیا۔ آپ ٹھیک وقت پر آ گئے ہیں۔''

''میں نے اپنے ذمے ایک فرض لیا ہے جسے میں اچھے طریقے سے نبھانا چاہتا ہوں۔'' وہ دروازے سے ہٹ گئی تو میں نے راہداری میں قدم رکھ دیا۔ مجھے وہ اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے صوفے پر ایک پتلی دبلی دس سال کی بچی ایک کتاب پر جھکی تھی۔ نجمہ نے میرا اس سے تعارف کروایا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سرخ رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ بال اس کے عمدگی سے سنوارے گئے تھے اور رنگ اس کا کوٹ کے رنگ سے بڑی مشابہت رکھتا تھا۔ بچی مجھے ذہین اور تیز طرار معلوم ہوتی تھی۔ اسے یہ لوگ لاڈ میں موتی کہتے تھے۔ وہ جلد ہی مجھ سے مانوس ہو گئی۔ مولانا شعیب سے اسے بڑی شکایتیں تھیں۔ وہ شاید اسے بہت زیادہ ڈانٹتے رہے تھے۔ مجھے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ بچی پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ ہر بات بہ خوبی سمجھ لیتی تھی اور اسے ذہن نشین بھی کر لیتی تھی۔

میں اسے پڑھانے میں مصروف ہو گیا تو نجمہ دبے پاؤں باہر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ میرے لیے پرتکلف چائے لے آئی۔ اس چائے سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں نے موتی کو حساب کے چند سوال حل کرنے پر لگا دیا اور

خود الگ ہٹ کر چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نجمہ میرے سامنے بیٹھ کر بڑی نفاست سے چائے بنا رہی تھی، بولی۔

’’کل آپ کو ایک دم طیش کیوں آ گیا تھا؟‘‘

’’مس تحلی نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی پراؤڈی ہیں۔‘‘

’’وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں اس لیے میں آپ کے پاس بیٹھ گئی ہوں۔‘‘

’’کہاں گئی ہیں؟‘‘

’’ان کی ایک سہیلی بیمار ہیں ملتان میں، وہ ان کو دیکھنے گئی ہیں۔‘‘

’’معلوم ہوتا ہے وہ پردے کی بہت زیادہ پابند ہیں؟‘‘

’’یہ بات نہیں ہے۔ آپ کو دیکھ کر وہ میرا خیال ہے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ویسے وہ پردے کی بھی سخت پابند ہیں۔ برقع کے بغیر باہر نہیں جاتی ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب؟ ایسی کیا بات دیکھی تھی انہوں نے میرے اندر کہ وہ میرے سامنے نہ آ سکیں؟‘‘

’’نہیں، وہ دراصل... پردہ ہی اس کی وجہ ہو سکتی ہے اس احساس میں مبتلا ہیں کہ وہ بدصورت ہیں کچھ ان کی صورت ایسی ہی ہے۔ چہرے پر چیچک کے داغ ہیں اور اس مرض نے ان کی ایک آنکھ بھی ذرا سی گھما دی ہے۔ ویسے وہ گوری چٹی ہیں اور بڑی خوش لباس بھی۔‘‘ نجمہ نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

’’ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟‘‘

’’کیا؟‘‘ اس نے اپنی بولتی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں۔ کل کی طرح وہ مجھ سے گریز پا نہیں رہی تھی۔

’’آپ... میرا مطلب ہے مس نجمہ کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری رعنائیاں عطا کر رکھی ہیں پھر... پھر آپ اپنے لباس سے کیوں اتنی غافل ہیں۔ یہ کپڑے... آپ میرا مطلب سمجھ رہی ہیں نا؟‘‘

’’آپ بھول رہے ہیں کہ میں مس تحلی کی ملازمہ ہوں۔ مجھے ایسا ہی لباس پہننا چاہیے جس سے میں کسی بھی صورت میں ان سے بہتر نظر نہ آؤں ورنہ وہ مجھے فوراً یہاں سے نکال باہر کریں گی۔‘‘

’’کیا وہ اتنی ہی حاسد طبیعت کی مالک ہیں؟‘‘

’’ہر عورت ہوتی ہے اس لیے مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔‘‘

’’آج وہ کیسے آپ کو تنہا چھوڑ گئی ہیں جبکہ انہیں معلوم تھا کہ میں میمونہ کے لیے آ رہا ہوں۔‘‘

’’انہیں احساس تو تھا مگر ان کو خبر ہی ایسی افراتفری کی ملی کہ وہ رک نہ سکیں۔ ورنہ وہ آج کسی طرح بھی یہاں سے نہ جاتیں۔‘‘

’’آپ کب سے ان کے پاس ہیں؟‘‘

’’پچھلے بیس سال سے... میری والدہ بیوہ ہوئیں تو یہاں آ رہیں... میری پرورش اسی گھر میں ہوئی ہے۔ تحلی کی والدہ میری والدہ کی سہیلی تھیں اور وہ ان کے بہت کام آئیں۔‘‘

’’معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاصی تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کا لہجہ بھی بتاتا ہے۔‘‘

’’ہاں میں ایف اے تک پڑھی ہوں۔ اس وقت میری والدہ زندہ تھیں۔ اور ہم سرونٹ کوارٹر میں الگ رہتے تھے۔‘‘

’’میں نے سنا ہے کہ مس تحلی کے والد ان کے لیے ترکے میں چالیس لاکھ روپے چھوڑ گئے ہیں؟‘‘

’’ہاں یہ سچ ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ شادی کے لیے ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں مگر مس تحلی نے سب کو مایوس کر دیا ہے۔ اب کوئی بھی ادھر نہیں آتا۔‘‘

’’وہ کس طرح؟‘‘

’’وہ اس طرح کہ اب وہ کسی سے ملتی ہی نہیں ہیں؟‘‘

’’ہوں، آپ کو کوئی تنخواہ ملتی ہے یہاں کہ ویسے ہی آپ ان کے روٹی کپڑے پر پڑی ہیں؟‘‘

’’مجھے یہ پانچ سو روپے مہینا دیتی ہیں میرے والد بھی ٹھیکے دار تھے۔ ریلوے کے ٹھیکے دار۔ مگر پھر ہمارا مقدر ہم سے روٹھ گیا۔‘‘

’’مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ایسی بے آسرا زندگی ملی مگر یہ اچھی تنخواہ ہے۔ اتنی تنخواہ تو دفتر میں گزیٹڈ افسر کو بھی نہیں ملتی۔‘‘

’’وہ... وہ دراصل مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔ صرف اس لیے کہ میرے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ میں نے ضد کر کے اپنی تنخواہ میں اضافہ کرایا تھا ورنہ پہلے وہ مجھے صرف دو سو روپے دیتی تھیں۔‘‘ مونی اپنے کام میں مصروف تھی اور زور و شور سے حساب کے سوال حل کر رہی تھی۔

نجمہ نے ایک کپ چائے کا اور میرے سامنے رکھا اور معنی خیز انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

’’کیا آپ شادی شدہ ہو؟‘‘

’’نہیں مگر یہ سوال کیوں پوچھا آپ نے؟‘‘

''آپ کے لیے یہاں چانس ہے۔''
''کیا؟ کیا مطلب؟''
''مس نجمی رات آپ کے بارے میں کہہ رہی تھیں وہ... وہ آپ سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔''
''وہ کس طرح؟ میں نے تو انہیں ایک طرح سے بہت ناراض کرلیا تھا؟''
''مجھے معلوم ہے۔ وہ آپ نے عمداً کیا تھا۔ آپ گریہ کشتن روز اول پر عمل کررہے تھے۔''
''اس سے میرا نقصان بھی ہوسکتا تھا۔ وہ انکار کرسکتی تھیں؟''
''نہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ ایسا رویہ ان پر کیا اثر ڈالے گا۔''
''یہ میرا منشا نہیں تھا بلکہ میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں کوئی ایسا گراپڑا بے غیرت آدمی نہیں ہوں۔''
''ہاں، اور یہ بات وہ سمجھ بھی گئی تھیں۔ وہ آپ کی کیا کہتے ہیں اسے مردانہ وجاہت سے بھی متاثر ہیں۔'' وہ مسکرائی۔
''اور آپ؟ آپ کی میرے بارے میں کیا رائے ہے؟'' میں نے اسے چھوتے ہوئے کہا۔ اس کی باتیں مجھے شہ دے رہی تھیں اور وہ جو میرا احساس تھا کہ وہ خود سپردگی کی آرزو میں مبتلا تھی اس کی مختلف قسم کی حرکات دیکھ کر اور زیادہ گہرا ہوگیا تھا۔
''اپنا ہاتھ تو مجھ سے دور ہی رکھیں جناب ہاشمی صاحب! بہرحال میری رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''
''کیوں نہیں رکھتی؟ میں تو اسے بہت اہمیت دیتا ہوں۔ آپ بے لباس کے بارے میں، میں نے اسی لیے وہ خاص بات کہی تھی۔'' میں نے اب کی بار بیتابی پر دھرے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ شعلوں جیسی تپش تھی اس ہاتھ میں۔ مجھے اپنا سارا وجود آگ کی صورت دہکتا محسوس ہوا۔
''بتایا نہیں آپ نے؟'' میں نے مونی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ سادہ لوح معصوم سی بے زبان لڑکی ابھی تک اپنے کام میں محو تھی۔ اسے گردوپیش کی کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ نجمہ نے چند لمحوں تک اپنا ہاتھ پیچھے نہیں ہٹایا مگر پھر اچانک اس نے ہاتھ کھینچ کر سنبھلتے ہوئے کہا۔
''مجھے اپنے مرتبے کا احساس ہے۔ جہاں میں کھڑی ہوں مجھے وہیں رہنے دیں جناب انور ہاشمی صاحب قبلہ۔''
ہم دونوں میمونہ سے خاصے دور بیٹھے تھے۔
''اگر آپ کے ہاں میرا کوئی چانس ہوتو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا مس نجمہ صاحبہ....''
وہ اب کی بار کھل کر مسکرا دی۔ ''آپ کو میں اچھا مشورہ دے رہی ہوں۔ مس نجمی پر آپ نے ایسا گہرا تاثر چھوڑا ہے کہ اگر آپ نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو یہ آپ کی حماقت ہوگی۔''
''کیا مطلب؟ یعنی کیا کروں میں؟''
''ان سے شادی کرلیں۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ وہ بدصورت ہیں۔''
''اس کے باوجود بھی یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ آپ... آپ اس سے نہیں چالیس لاکھ سے شادی کریں گے۔''
''مگر... مگر... اس سے... میرا مطلب ہے کہ یہ بات آپ کیوں کہتی ہیں مجھ سے، آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟''
''مجھے کسی فائدے کی ضرورت نہیں۔ میں تو محض ایک خادمہ ہوں اور بس...''
''جی نہیں، میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا۔ اگر آپ میری بات پر یقین کریں تو میں آج ہی یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ سے زیادہ خوب صورت اور ذہین لڑکی نہیں دیکھی۔'' اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ یوں جیسے اس نے اپنی شخصیت کے تمام رموز مجھ پر عیاں کردیے ہوں۔''
اچانک ہی وہ تیزی سے اٹھی اور دبیز قالین پر ڈولتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور پھر میمونہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
کوئی ایک گھنٹے تک میں برابر اس لڑکی کو مختلف مضامین پڑھاتا رہا۔ وہ بیچاری ایسی گم صم سی بچی تھی کہ سبق کے سوا اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس پر اسکول کی استانیوں کا خوف طاری رہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اسکول میں اس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔
شام کے پونے چھ بج رہے تھے اور میں ابھی تک اس چھوٹے سے کمرے کی آسودہ اور گرم فضا میں بیٹھا میمونہ سے سر کھپا رہا تھا۔ مجھے ٹھیک سوا پانچ بجے نکل جانا چاہیے تھا مگر میں نجمہ کے انتظار میں خوامخواہ ہی اس نشست کو طول دیتا چلا گیا۔
نجمہ چھ بجے پھر کمرے میں آئی اور بولی۔
''ابھی آپ کا سبق ختم نہیں ہوا ہے مونی؟''
''جی بس ختم ہورہا ہے آنٹی۔ ماسٹر صاحب چاہتے

ہیں کہ میں زیادہ دیر تک پڑھتی رہوں۔''
''بس بہت ہو لیا۔ اب آپ جائیں اور نہالیں۔ میں نے سارا سامان غسل خانے میں رکھ دیا ہے۔''
''جی آنٹی!'' یہ کہہ کر وہ کتابیں سمیٹنے لگی اور اسی وقت باہر نکل گئی۔
''یہ اس وقت اتنی سردی میں بچی کے نہانے کی کیا تک ہے؟''
''مالکن کا یہی حکم ہے۔ ہم سب رات کو نہا کر بستر میں لیٹتے ہیں۔ خواہ سردی ہو یا گرمی۔''
''اوہ، یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ آپ کی اس بے مثال صحت کا راز بھی غالباً اسی غسلِ شب میں پنہاں ہے۔''
''آپ زیادہ فقرے بازی نہ کریں انور ہاشمی صاحب!''
میں اٹھ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ بدک کر پیچھے نہیں ہٹی۔ اور... پھر... میں اپنے جذبوں کے سیلاب میں لیتا ہوا اسے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا۔ وہ تڑپ کر میری بانہوں سے نکلی اور ہنستے ہوئے بولی۔
''مجھ سے دور رہیں مسٹر ہاشمی، پلیز! میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ... آپ مجھے غلط سمجھے ہیں۔''
اس کی آنکھوں میں وحشت ناک سرد مہری اُتر آئی تھی۔ وہ کیفیت ایسی تھی کہ اس کے بارے میں میرے تمام اندازے ملیامیٹ ہو رہے تھے۔ میں شرمندہ سا ہو کر پیچھے ہٹ آیا تو وہ سر جھکا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔
اگلے روز جب میں چار بجے کوٹھی پہنچا تو وہ برآمدے میں میری منتظر تھی، بولی۔
''مس تخلی کا فون آیا ہے۔ وہ خود وہاں بیمار پڑ گئی ہیں اور شاید ایک ہفتے تک واپس نہ آسکیں۔''
''یہ تو اور بھی اچھا ہے جناب! قدرت نے ہمیں نادر موقع فراہم کیا ہے۔'' میں نے دبی آواز میں کہا۔
وہ پلٹ کر صدر دروازے میں داخل ہو گئی۔ علی جو سامنے لان میں کھڑا ایک پودے کا معائنہ کر رہا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی میں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کوٹھی میں ہر طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ چند قدم میرے ساتھ چل کر وہ بولی۔
''موتی اس وقت سو رہی ہے۔ میں نے... اسے ساڑھے تین بجے نیند کی گولی کھلا دی تھی۔ وہ زکام کی شکایت کر رہی تھی۔''
''یہ تو اور بھی اچھا کیا ہے آپ نے۔ اب ڈر کا ہے کا۔'' اسے اٹھا کر میں مس تخلی کی خواب گاہ میں جا گھسا۔ عمارت کا صدر دروازہ اندر سے بند تھا اور علی جو کے اندر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔
''آپ... آپ... کیا چاہتے ہیں آخر؟'' نجمہ نے فوم کے گدے پر گرنے کے فوراً ہی بعد اٹھتے ہوئے کہا۔
''میں... میں تو آپ ہی کو چاہتا ہوں۔''
''مگر... مگر یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے ہاشمی صاحب! میں ایسے بھینے کی آپ کو اجازت نہیں دے سکتی۔''
''پھر... پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں؟''
''بہتر ہے کہ آپ یہ کھیل مس تخلی سے کھیلیں۔ تاکہ آپ کو کچھ حاصل بھی ہو سکے۔'' وہ دیوار کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھ کر برقی ہیٹر سلگاتے ہوئے بولی۔
''فرض کریں کہ میں مس تخلی کو اپنے شیشے میں اتار بھی لیتا ہوں تو اس سے کیا ہوگا، میری منزل تو آپ ہیں مس نجمہ۔''
''کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟''
''ہاں کیوں نہیں؟ میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔ آپ مذاق سمجھتی ہیں اسے؟''
''تو... تو پھر آپ نرے احمق ہیں۔ روپیا میری بھی ضرورت ہے اور آپ کی بھی۔ میں مس تخلی کے دل میں آپ کے لیے راہ دیکھ رہی ہوں۔ اسے میں اور ہموار کر سکتی ہوں۔''
''لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ مجھے تو وہ اپنے سنہری پنجرے میں بند کر کے بے بس کر دیں گی پھر آپ کیا کریں گی؟''
''میں... میں آپ کی پہلی نہیں، دوسری بیوی بن سکتی ہوں۔''
''وہ... وہ کس طرح۔ تخلی اس کی اجازت کیسے دے سکتی ہیں؟''
''ہم ان کو یہ بات بتائے بغیر خاموشی سے شادی کر لیں گے۔''
''یہ... یہ... اچھا تو یہ بات ہے مگر پرنالا تو وہیں رہا۔ مس تخلی تو بہرحال... دیکھیں وہ تو استروں کی مالا بن جائیں گی میرے لیے۔''
''آپ پہلے ایک مرحلہ طے تو کریں۔ پھر... پھر دیکھیں گے ہم کہ آگے کیا کرنا ہے۔ اسے ہم... اپنے راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔'' نجمہ نے بڑے ہی سجے ہوئے

لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی آہنی سرد مہری اور سنگدلی ابھر آئی تھی کہ میں سمجھا وہ میرے لیے میری آسانی اور خوش حالی کے لیے بڑے سے بڑا قدم اٹھا سکتی ہے۔

''آپ کا مطلب ہے کہ میں اس سے شادی کرنے کے بعد اسے اپنے راستے سے ہٹا دوں؟''

''ہاں! یہ کون سا مشکل کام ہے ایک ایسے جواں مرد کے لیے... ہماری زندگی کا رخ بدل سکتا ہے۔''

''مگر وہ کس طرح؟'' میں نے نجمہ کے قریب ہیٹر کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ... وہ اگر آپ کی بیوی بن کر موت کی دلہن بن جائے تو اس کی تمام دولت آپ کی ملکیت ہو گی اور اس دوران میں ہم خود شادی کر چکے ہوں گے۔'' اس کی یہ بات سن کر میں منجمد سا ہو کر رہ گیا۔ اس نے میری اس وارفتگی کو دیکھ کر رات ہی رات میں اپنے مستقبل کے بارے میں ایسی منصوبہ بندی کر لی تھی کہ وہ سب کچھ مجھے ناقابلِ یقین نظر آتا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے بعد اسے ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔'' میں نے پہلی بار اسے تم کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''زندگی میں کبھی کبھی آدمی کو بہت کٹھن مگر بڑے ہی دوررس فیصلے کرنے پڑتے ہیں ہاشمی صاحب۔ جب اس مرحلے سے آدمی گزر جائے تو پھر راوی چین ہی چین لکھتا ہے اور یہ دو چار روپے کی بات نہیں پورے چالیس لاکھ روپے نقد اور اس کے دس لاکھ کے بنگلے کا معاملہ ہے۔''

''مگر پھر... پھر... ہم اس بنگلے میں تو نہیں رہ سکیں گے؟''

''کیا ضروری ہے؟ ایسے گلبرگ سے ہزار درجے بہتر آبادیاں موجود ہیں۔ جنت نظیر آبادیاں۔''

''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم پیچھے نہیں ہٹو گی؟''

''ثبوت؟... آپ کیا ثبوت چاہتے ہیں۔ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے میں خود بھی اپنے بس میں نہیں رہی۔ آپ کی جرأت اور صاف گوئی نے مجھے اور بھی متاثر کیا ہے۔ آپ کے لیے میں اپنی مالکن سے غداری کر رہی ہوں اور کیا چاہتے ہیں آپ؟'' اس نے بڑے ہی دلفریب انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ایک ایمان سوز انگڑائی لے کر اس نے سلیٹی رنگ کی چادر اتار کر الگ پھینک دی۔ اس کے ہوشربا پیکر کے دلآویز خطوط نمایاں ہوئے تو میں سُدھ بُدھ ہی کھو بیٹھا۔ وہ بتی بجھا کر فوم کے بیڈ پر جا لیٹی تھی اور علی جو باہر پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھا۔

اس رات جب میں کوارٹر پہنچا تو میں نجمہ کی لذت آگیں یادوں میں یوں غلطاں تھا جیسے میں نے پی رکھی ہو۔ میرا دل جھوم رہا تھا اور دماغ فلک پر جا پہنچا تھا۔ لاکھوں روپوں کو ہاتھ میں لے کر گننے، انہیں چھونے اور ان پر اپنی ملکیت کا حق حاصل ہو جانے کے خیال نے مجھے مخمور کر دیا تھا۔ نجمہ نے مجھے زندگی کی ایسی راہ سجھا دی تھی کہ اگر میں اس پر چل سکتا تو ہم دنیا میں ہی اپنے لیے بہشت تعمیر کر سکتے تھے، وہ مجھ پر ایسی مہربان تھی۔ وہ بند کلی تھی اور اس نے اپنے سارے خزانے مجھ پر لٹا دیے تھے۔

اگلے پانچ دن یوں گزرے کہ میں سمجھا میں اب تک جو زندگی گزارتا رہا ہوں وہ ساری کی ساری رائگاں گئی ہے۔ جینا تو مجھے اب آیا تھا۔ نجمہ نے میرے وجود میں ایسے تیز گرم چراغ روشن کر دیے تھے کہ میں سراپا نور بنتا جا رہا تھا۔

مخفی چھٹے روز واپس آگئی۔ جب میں اس شام چار بجے مونی کو پڑھانے گیا تو نجمہ مجھے سیدھا مخفی کے کمرے میں لے گئی۔ وہ اس وقت اپنی نشست گاہ میں بیٹھی تھی۔ اس نے بڑا سا خوب صورت سفید گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے نجمہ کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ بلاشبہ وہ بدصورت عورت تھی۔ عمر اس کی کسی بھی طرح تیس سال سے کم نہیں تھی۔ رخسار پچکے ہوئے، ہڈیاں ابھری ہوئیں، چہرہ چیچک کے داغوں نے بدنما بنا رکھا تھا۔ ایک آنکھ سے وہ بلاشبہ بھینگی تھی۔ نجمہ نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اتفاق نہیں تھا۔ تنگ سا ماتھا موٹے موٹے ہونٹ، ٹھوڑی غیر معمولی طور پر باریک اور آگے کو نکلی ہوئی۔ سر پر بال البتہ بہت گھنے تھے۔ قد اس کا پونے چھ فٹ اونچا تو ضرور ہی تھا۔ وہ مجھے دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر میرے استقبال کے لیے اٹھی اور بولی۔

''آیئے ہاشمی صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس روز آپ سے براہِ راست نہ مل سکے۔'' اس کی آواز پر مردانہ آواز کا شائبہ پڑتا تھا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں خانم کہ آپ نے آج یہ عزت مجھے بخش دی۔'' میں نے ایک کرسی کے قریب رکتے ہوئے کہا۔

''تشریف رکھیں۔ ہمیں نجمہ نے بتایا ہے کہ آپ مونی کو بڑی محنت سے پڑھا رہے ہیں۔ ہم نے بھی آج دیکھا ہے مونی آپ سے بہت مطمئن اور مانوس دکھائی دیتی

ہے۔''

''یہ میرا فرض ہے خانم! اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔''

''یہ اچھی بات ہے۔ ہمیں آپ کی یہ فرض شناسی پسند آئی۔ ان کے لیے چائے لاؤ نجمہ۔'' اس کی یہ بات سنتے ہی خادمہ دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ دروازہ وہ اپنے پیچھے بند کر گئی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد تحفی نے اپنا وہ گاؤن اتار کر الگ رکھ دیا اور بولی۔

''کمرا تو گرم ہو رہا ہے۔ ہمیں اس بھاری بھرکم گاؤن سے وحشت ہونے لگی ہے۔''

''ہاں، یہ اچھا کیا آپ نے۔ ویسے بھی آپ ایسی سروقد خاتون کو اتنے بوجھل کپڑے نہیں پہننے چاہئیں۔'' میں نے نجمہ کے بتائے ہوئے حربوں میں سے پہلا حربہ بروئے کار لاتے ہوئے کہا۔ وہ میرے منہ سے اپنے لیے سروقد کا لفظ سن کر کھل اٹھی۔

''آپ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ صاف گو لوگ ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں۔''

اصل میں صاف گوئی کی تو کوئی بات نہیں ہے خانم۔ دراصل آج کل لڑکیاں بالعموم بس ٹھگنے قد کی ہوتی ہیں۔ بالشت بھر۔ آپ کو تو ماشاء اللہ اتنی قدرِ رعنا عطا ہوا ہے۔ آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟''

''ہم نے ایم اے فلاسفی کر رکھا ہے مگر وہ ساری تعلیم بیکار ہی گئی۔ ہم اس سے کوئی بھی کام نہ لے سکے۔''

''علم بذاتِ خود ایک بہت بڑا مقصد ہے خانم! بہرحال آپ سے مل کر آج مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے ورنہ اس روز تو میں بس ڈر ہی گیا تھا۔ آپ کی شخصیت واقعی بہت خوشگوار ہے۔''

''شکریہ ہاشمی صاحب! آپ واقعی دوسروں کو سمجھنے اور ان کو داد دینے میں بڑے شارپ اور جینئس ہیں۔ آپ سے مل کر ہمیں بھی دلی خوشی ہوئی۔ آپ کے پاس وقت ہو تو رات کا کھانا ہمارے ہاں ہی کھا لیا کریں۔ آپ کی کمپنی ہم واقعی بہت انجوائے کر سکیں گے۔ اس روز ہم نے جو کچھ کہا اس کی معذرت۔''

''نہیں نہیں ایسا نہ کہیں۔ آپ نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ میں ہی بلکہ شاید کچھ زیادتی کر گیا تھا۔''

''سو نائس آف یو۔ ذرا پلیز دیکھیں شاید یہ بیک زپ کچھ کھل گئی ہے۔ ہم ان ایزی فیل کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور پشت میری طرف کر کے کھڑی ہو گئی۔ وہ خوشبو میں نہائی ہوئی تھی اور اس کی اسکن ٹائٹ قمیص کی زپ واقعی آدھی کھل گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے عمداً کسی نہ کسی طرح وہ زپ کھول لی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے بائیں کندھے پر ہاتھ رکھ کر زپ اوپر کھینچی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر میرے قریب ہو گئی ہے۔ اس کے گھنے بال جو جوڑے کی صورت میں بندھے تھے میرے سینے پر آ لگے تھے۔ میں نے زپ اوپر چلائی تو وہ لڑکھڑا کر میری طرف جھکی یوں کہ اگر میں اسے سہارا نہ دیتا تو وہ فرش پر چت گر جاتی۔ میں نے اسے سنبھالا تو اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ اس کی سانسیں زیروزبر ہو رہی تھیں۔ وہ بڑا ہی وحشت ناک لمحہ تھا۔ اور مجھے اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے تھا۔ نجمہ کی ہدایت یہی تھی۔ میں نے خود پر وارفتگی طاری کر کے اسے یہ احساس دلا دیا کہ اس کا قرب میرے وجود میں آگ لگا گیا ہے۔ جب میں اسے دوبارہ کرسی پر بٹھا چکا تو اس کا وہ ستا ہوا مردہ سا چہرہ تمتمانے لگا۔

''میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مس تحفی! مگر میں اپنے اختیار میں نہیں تھا۔'' میں نے تصنع آمیز خجالت سے کہا۔

''نہیں... نہیں! یہ... یہ بالکل فطری بات تھی۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ بار بار اس گستاخی کی تمنا کر رہی ہو۔ میں نے اس کا وہ استخوانی ہاتھ پکڑ کر بڑے ہیجان خیز انداز میں دل پر رکھ لیا۔

''یہ دیکھیں۔ اس کی دھڑکن کتنی تیز ہو گئی ہے۔ لگتا ہے یہ بس ٹھہر جائے گا۔ ایک دم شل ہو جائے گا۔ نفسیات تو آپ کا مضمون رہا ہے اس کی کیا توجیہہ کریں گی آپ۔'' یہ کہہ کر میں اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور اس کا سارا بدن جذبات کے طوفان میں لرزنے لگا تھا۔

''ہم... ہم بہت تنہا ہیں ہاشمی صاحب مگر... مگر ہم کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ کاش آپ ہماری ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتے۔''

''میں... میں آپ کی مشکل کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اگر آپ مجھ پر بھروسا کریں تو میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے کے غمگسار ساتھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں بھی تنہا ہوں اور یہ تنہائی مجھے لے ڈوبے گی۔''

وہ اب نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے کھرچے ہوئے رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور نمایاں ہو گئی تھیں۔

"کیا آپ...." اس نے یوں کہا جیسے وہ نیند میں بڑبڑا رہی ہو۔ آنکھیں اب بھی اس کی نیم وا تھیں۔ ان کا عیب چھپانے کے لیے وہ انہیں خال خال ہی کھولتی تھی۔

"ہاں مس مخفی میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔" میں نے سارے تکلفات سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

وہ حیران نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے اسے میری اس تجویز کا لاشعوری طور پر احساس ہو چکا تھا۔ وہ میرے بارے میں مختلف قسم کی باتیں پوچھنے لگی۔ میں کون ہوں؟ میرا خاندان کیا ہے؟ میری پسند ناپسند کیا ہے؟ میں اس کے ہر سوال کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیتا رہا اور ساتھ کے ساتھ یہ بھی سوچتا رہا کہ اس پر غالب آنے کے بعد میں اسے نجمہ کے منصوبے کے مطابق اگر قتل کرنا چاہوں تو کیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ مجھے دراصل نجمہ ایسے مقام پر لے جا چکی تھی اور اس کے لیے میری تشنگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ میں نے اس سارے مرحلے سے گزر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس راہ سے گزر جانے کے بعد میں چالیس لاکھ روپے کا مالک بن سکتا تھا اور وہ بنگلے کی ملکیت بھی میرے حصے میں آسکتی تھی۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں مس مخفی کے اس استخوانی ڈھانچے کو ساری عمر بانہوں میں لیے بیٹھا رہتا۔

ابھی وہ میرے بارے میں کرید کرید کر سوال پوچھ ہی رہی تھی کہ نجمہ چائے لے کر اندر آگئی۔

"اچھا ہاشمی صاحب اس بارے میں ہم آپ کو سوچ کر جواب دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نجمہ نے عمداً مجھ سے آنکھ ملانے سے گریز کیا۔

جب ہم چائے پی چکے تو مس مخفی بولی۔

"میرا خیال ہے اب آپ موتی کو پڑھا دیں۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔" وہ اپنی سوکھی سڑی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

میں فوراً ہی وہاں سے اٹھ گیا۔ میں نے اپنا پہلا تیر چلا دیا تھا اور وہ بڑی حد تک نشانے پر بیٹھا تھا۔

موتی کو اس روز میں ڈیڑھ گھنٹے تک پڑھاتا رہا مگر اس دوران نجمہ ایک بار بھی ادھر نہیں آئی۔ شام کے سات بجے میں موتی کے کمرے سے نکلا تو نجمہ مجھے لان میں مل گئی۔ مس مخفی بھی اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی نجمہ تیزی سے میری طرف لپکی۔ مس مخفی اس دوران دوسری طرف نکل گئی۔

"ہاشمی صاحب! آپ کو مبارک ہو۔ مس مخفی نے ہاں کہہ دی ہے۔" اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

"واقعی؟ کیا کہا ہے انہوں نے؟"

"وہ کہتی ہیں کہ انہیں آپ کی تجویز منظور ہے۔ وہ آپ کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا مس نجمہ ناوک۔ اب تو سارے دلدر ہی دور ہو جائیں گے مگر آپ کب تک میرے حبالۂ نکاح میں آنا چاہتی ہیں؟" میں نے اس سے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

"یہ ایک معرکہ تو پہلے سر کر لیں۔" وہ مسکرائی۔

"نہیں! میں آپ کے بارے میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ یہ پھندا صرف آپ کی وجہ سے میں قبول کروں گا۔ پہلے آپ کو مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔"

"مجھے تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں جانے دیتی۔ پہلے یہ میدان صاف کر لیں پھر ہم اپنے بارے میں سوچیں گے۔" یہ کہہ کر وہ اردگرد بڑی محتاط نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ شادی کی تیاری شروع کر دیں۔ پانچ دس دوستوں کو لے کر آجائیں۔ میرا خیال ہے کہ اگلے بدھ کی تاریخ میں مقرر کرواؤں گی۔ میرے مشورے کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتی ہیں۔ میں نے ہی انہیں اس فیصلے پر آمادہ کیا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"

"اچھا خدا حافظ! مگر یاد رکھیں ہمیں اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق چلنا ہوگا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا انتظام کر لوں گا۔"

"کوئی ایسی تجویز سوچیں جس میں ذرا سا بھی جھول نہ ہو۔"

"اس معاملے میں بھی آپ کو ہی میری راہنمائی کرنی ہوگی۔"

"میں بھی سوچتی ہوں آپ بھی سوچیں۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ عمارت کے صدر دروازے کے شیشوں میں سے شاید مس مخفی ہمیں دیکھ رہی تھی مگر برآمدے میں بلب کی تیز روشنی میں وہ ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔

بدھ کے روز واقعی مس مخفی سے میری شادی ہو گئی۔ اور وہ مرحلہ جسے میں خواب میں بھی طے نہ کر سکتا تھا، یوں بہ خیر و خوبی گزر گیا کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ شادی میں مولانا شعیب بھی شامل تھے اور باری

بھی۔ ان کی حیرت دیدنی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ میں مس مخنی کے ہاں اتنا اونچا مقام حاصل کرلوں گا۔ وہ میری اس کامیابی پر کچھ عین غین قسم کے تبصرے بھی کرتے رہے مگر میں نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ سب سے عمدہ بات یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کسی نے بھی مس مخنی کو نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ اس استخوانی ڈھانچے کی مردنما عورت سے مجھے شادی کرلینے سے ہر قیمت پر روکنے کی کوشش کرتے۔

براتی میں شامل میرے دوست احباب تو واپس چلے گئے اور میں وہیں گھر داماد کی صورت میں مخنی کے ہاں ہی جم کر بیٹھ گیا۔ مگر... وہ میری اذیتوں کا پہلا دن تھا۔ شب عروسی میں نے یوں گزاری جیسے کوئی زبردستی میرے منہ میں کیچڑ ٹھونس رہا ہو۔ مخنی میں نسوانیت کی کوئی بھی بات تو نہیں تھی پھر بھی میں نے جوں توں کرکے وہ رات اس امید پر گزار ہی لی کہ آج نہیں تو کل میں اس چھپکلی سے نجات حاصل کر ہی لوں گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔

یہ بات میرے لیے بے حد حیرت انگیز تھی کہ شادی میں مخنی نے اپنے کسی بھی رشتے دار کو مدعو نہیں کیا تھا مگر اس سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اللہ کے فضل سے اس کا کوئی بھی قریبی عزیز زندہ نہیں تھا۔ ایک صرف موٹی کی دور پار کی پھوپی ہی شادی میں شریک ہوسکی تھی۔

میں زندگی بھر عورتوں کے قرب سے محروم رہا تھا۔ حالات نے اس طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی لیکن جو آگ اس رات حجلۂ عروسی میں پہنچ کر میری حیات میں لگی، اس کا مداوا مخنی کے پاس نہیں تھا۔ وہ مجھے سرما کی برسات میں بھیگی ہوئی بوری نظر آتی تھی۔ مجھے اس کی قربت سے ابکائیاں آتی تھیں مگر پھر بھی مجھے وہ زہر پینا ہی پڑا کہ مخنی نے مجھ سے بے حساب توقعات وابستہ کرلی تھیں۔

رات کے دو بج رہے تھے کہ مخنی کا رنگ اچانک زرد ہونے لگا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بستر سے اتری اور بڑی نحیف ونزار آواز میں بولی۔

''آپ ذرا نجمہ کو جگادیں ہمارے گردے میں شدید درد اٹھ رہا ہے۔ کبھی کبھی یہ درد سر اٹھاتا ہے تو ہمارا بُرا حال ہو جاتا ہے۔''

''یہ تکلیف کب سے ہے آپ کو؟''

''کوئی دو سال ہوگئے۔ ڈاکٹر آپریشن کے لیے کہتے ہیں مگر ہمیں وہ کسی طرح بھی منظور نہیں ہے۔ دوائیں کس لیے ہیں آخر۔ پلیز ذرا نجمہ کو جگا لائیں۔ یہ گھنٹی بجادیں۔ یہ جو دیوار میں لگی ہے۔'' اس کی حالت دم بہ دم خراب ہوتی جارہی تھی۔ میں نے دیوار میں لگا گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اور پھر مخنی کو میں نے دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ اس کا بدن درد کی شدت سے کچلا جارہا تھا۔ اپنی چیخوں کو وہ بڑی مشکل سے دبا رہی تھی۔ یوں جیسے وہ دردِ زہ میں مبتلا ہو۔ تکیے میں سر دے کر بولی۔

''یہ درد اب کی بار پورے ایک ماہ بعد اٹھا ہے اوہ میرے خدایا! اسے آج ہی ابھرنا تھا۔'' وہ بلکنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر میرے لمس میں وہ اجنبیت نمایاں تھی جو مجھے اس سے دور کرتی جارہی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد نجمہ ہمارے کمرے میں آگئی۔ وہ اس وقت بھی سر سے پاؤں تک اس ملگجی سی گرم چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ جاگ ہی رہی تھی۔

مخنی کو تکیے میں سر دے کر روتے دیکھ کر وہ بولی۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟''

''اوہ نجمہ! ہمارے گردے میں پھر درد اٹھنے لگا ہے پلیز ہمیں ٹیکہ لگادو۔ ورنہ ہم مرجائیں گے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ ٹھہریں میں آپ کو درد کی گولی دے دیتی ہوں۔''

''کچھ کرو نجمہ جلدی کرو۔ یہ درد ہمیں مار ڈالے گا۔''

''گرم پانی کی بوتل بھی لے آئیں۔'' میں نے مخنی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ اب بستر پر پچھاڑیں کھا رہی تھی۔

نجمہ نے دوسرے کمرے سے لاکر مخنی کو تین گولیاں کھلادیں اور پھر گرم پانی کی بوتل درد کے مقام پر رکھ کر وہ مخنی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میرے لیے وہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا مگر اس میں بھی مجھے ایک آسودگی کا پہلو نظر آنے لگا۔ میری حسیات کو مخنی نے جس انداز سے جگادیا تھا ان کی پلکوں پر نیند طاری کرنے کے لیے نجمہ میرے سامنے آبیٹھی تھی۔ ان گولیوں نے معجزاتی اثر دکھایا اور مخنی کوئی دس منٹ بعد گہری نیند میں کھوگئی۔ نجمہ ابھی تک اس کے پاس بیٹھی درد کو تسکین دینے کے لیے گرم بوتل لحاف کے اندر مخنی کے پیٹ پر پھیر رہی تھی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ مخنی بے سدھ ہوچکی ہے تو وہ بڑی آہستگی سے پلنگ پر سے اتری۔

''آؤ...'' وہ بڑے ہی سرد لہجے میں بولی۔

''ان کا خیال رکھیں۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے فوراً بلا لیں۔ میں تیسرے کمرے میں سوتی ہوں۔'' اس نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ یہ کہہ کر وہ

تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں چند لمحوں تک احمقوں کی طرح نخلی کو دیکھتا رہا۔ اس درد کی یلغار نے اسے کچھ اور زیادہ بدصورت بنا دیا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور ابھر آئی تھیں اور اس کے گورے رنگ پر پیلاہٹ ابھر آئی تھی۔ سارا تکیہ اس کے لیے گھنیرے بالوں سے اٹا پڑا تھا اور وہی اس کی کل کائنات تھی۔ اگر وہ بال منڈوا دیتی تو کوئی بھی آدمی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عورت ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں اس کو ٹھکانے نہ لگا سکا تو... تو... میں زندگی بھر سر پر ہاتھ رکھ کر روتا رہوں گا۔

پہلی بار اس لمحے میں نے بڑے اطمینان سے برقی آتش دان کے قریب بیٹھ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اتنی ساری اجنبیت کی دھول صاف ہو جانے کے باوجود نخلی نے مجھ سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا جو اس کا باپ اس کے لیے ترکے میں چھوڑ گیا تھا۔ میں تو اس کے بارے میں عمداً کچھ نہیں پوچھ رہا تھا مگر اسے تو مجھ سے اس معاملے پر کوئی بات کرنی ہی چاہیے تھی اور اب... اب میری گردن اس کے شکنجے میں پھنس چکی تھی۔ اس نے مجھ سے ایک لاکھ روپے حق مہر میں لکھوا لیے تھے۔ اس وقت تو میں نے اس میں کوئی برائی نہ دیکھی مگر اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرے گلے میں اس نے وزنی پتھر باندھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اتنی بڑی رقم اسے طلاق کی صورت میں کسی طرح بھی نہیں دے سکتا تھا اور اس نے اسی خطرے کی پیش بندی کر لی تھی۔ وہ مجھے بری طرح جکڑ چکی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے تک میں آتش دان کے سامنے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور پھر نخلی کے بارے میں یہ اطمینان کر کے کہ وہ گہری نیند میں کھو چکی ہے، میں کمرے سے نکلا اور نجمہ کے دروازے پر جا پہنچا۔ میرا دل اس گھڑی بلیوں اچھل رہا تھا۔ مجھے نجمہ کے رویے کے بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ یہ وہی تھی جس نے نخلی کو مجھ سے شادی کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کیا تھا۔ میرے متعلق اس نے خدا جانے اسے کیا کچھ کہا ہوگا۔ میرا راستہ اس نے صاف کیا تھا جب میں نے نجمہ کا دروازہ کھولا تو مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے بڑھ کر بانہوں میں لے لے گی مگر جیسے ہی میں اندر داخل ہوا وہ سنبھل کر بستر سے اٹھی اور سمٹ سکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ برقی آتشدان نے اس کے کمرے کو بھی بہت آسودہ کر رکھا تھا۔ وہ بڑے ہی برفیلے لہجے میں بولی۔

''کیا بات ہے۔ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

پچھلے ہفتے میری ساس نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدی۔ تین دن کے بعد وہ کار ڈیلر کے پاس گئی۔ ''میرا خیال ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہاری دی ہوئی گارنٹی میں ہر قسم کی ٹوٹ پھوٹ شامل ہے؟''

''جی ہاں۔'' ڈیلر نے جواب دیا۔ ''آپ کا خیال درست ہے۔''

''تب تو تمہیں دو عدد سائیکلیں، گھر کا نیا گیٹ۔ درجن گلاب کے پودے اور گیراج کا ایک دروازہ دینا پڑے گا۔''

لودھراں سے محمد انعام کی تحقیق

''ہاں، وہ گہری نیند میں ہے مگر میری طبیعت ہمیشہ کے لیے خراب ہوگئی ہے۔''

''آپ کو ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے وہ جاگ رہی ہوں، آپ انہیں نہیں جانتے ہیں۔''

''نہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ نے انہیں بڑی کاری گولی دی ہے۔ میں باقی رات آپ کے ساتھ گزاروں گا۔''

''نہیں یہ ناممکن ہے ہاشمی صاحب! پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہمیں اپنی حدود کا احساس کرنا ہوگا۔ میں... میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔''

''آپ یہ کیسی بے رخی دکھاتی ہیں نجمہ! ہماری منزل ایک ہے آپ نے ہی مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔ پھر... پھر... یہ آپ کا لہجہ اتنا سرد کیوں ہے؟''

''اس کی وجہ ہے۔ آپ میرے لیے ابھی تک نامحرم ہیں۔''

''اسی لیے تو کہا تھا میں نے آپ سے کہ پہلے میں آپ سے شادی کر لیتا ہوں۔''

''وہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر جھانکنے لگی۔ راہداری تو خالی پڑی تھی، گھر میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر پیچھے ہٹی اور بولی۔

''آپ اتنی جلدی نہ کریں۔ کم از کم ایک مہینا آپ ان کے ساتھ گزاریں اور پھر ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ان کو راستے سے ہٹائیں۔ اس کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔''

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھتی ہوں اگر آپ کا یہی اصرار ہے تو پھر یہی سہی مگر اس کے لیے وقت کیسے ملے گا؟"

"آپ تحفی سے چار چھ دن کی چھٹی لے کر میرے مکان پر قصور جارہی ہیں میں وہاں آکر آپ سے شادی کرلوں گا۔"

"وہ بیمار ہیں۔ مجھے چھٹی کیسے دیں گی؟"

"کوئی بہانہ بنالیں۔ یہ تو بہت ضروری ہے۔ نجمہ میں آپ کے بغیر اس تحفی جیسی گیلی بوری سے گزارہ نہیں کرسکتا ہوں۔ مجھے اس سے گھن آتی ہے۔"

"ٹھیک ہے ہاشمی صاحب! ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو میں کچھ کروں گی۔" وہ بہت ہی لیے دیے انداز میں بات کررہی تھی اور اس کی آنکھوں کی وہ سردمہری مجھے حیران کررہی تھی۔ وہ مجھ سے اتنے اہم مسئلے پر یوں بات کررہی تھی جیسے ہم کسی جانور کی خرید وفروخت پر بحث کررہے ہوں۔ میں سمجھا وہ کردار کی بہت ہی پختہ عورت ہے اور کسی بھی طرح وہ خود کو اپنے مقام سے گرانا پسند نہیں کرتی۔ میرے دل میں اس کی قدر ومنزلت کچھ اور بڑھ گئی، میرے جذبوں کی آنچ کچھ اور تیز ہوگئی۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے صرفِ نظر کرسکتا۔ نسوانیت کا مرقع وہ نجمہ میرے حواس پر بری طرح چھا چکی تھی۔ اس کے اتنے یخ بستہ لہجے سے میں مایوس تو ضرور ہوا مگر یہ سوچ کر اس کے کمرے سے باہر نکل آیا کہ مجھے اس کے پندار کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہیے کہ میرا اس کا عمر بھر کا ساتھ ہوگا۔ ہم جو کچھ طے کرچکے ہیں، اس پر عمل کرکے ہم ایک نئی اور بھرپور زندگی کا آغاز کرسکتے ہیں۔

تحفی کے کمرے میں جب میں واپس گیا تو میں اسے دیکھ کر وحشت زدہ ہوگیا۔ اسے درد نے پھر آدبوچا تھا اور وہ بڑی اذیت سے دوچار تھی۔ اس کے ذہن کو دوا کے اثر نے جکڑ تو رکھا تھا مگر پھر بھی وہ درد اتنا شدید تھا کہ وہ بڑے کرب ناک انداز میں بستر پر کروٹیں لے رہی تھی۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجادی۔ نجمہ دوڑ کر ہمارے کمرے میں آئی تو اس کا رنگ اڑنے لگا، وہ سمجھی کہ تحفی نے مجھے اس کے کمرے میں جاتے دیکھ لیا ہے۔ بڑے ہی سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیا بات ہے، انہیں نیند نہیں آئی؟"

"آئی تو تھی مگر درد نے انہیں پھر نڈھال کردیا ہے۔ دوا کا اثر ختم ہورہا ہے۔"

میری یہ بات سنتے ہی اس نے دائیں ہاتھ کی تپائی پر پڑا فون سنبھالا اور نمبر گھمادیے۔

وہ کسی ڈاکٹر عبرت سے بات کررہی تھی، بولی۔

"ڈاکٹر ہماری مالکن کی حالت بہت خراب ہے.... پلیز آپ ابھی آجائیں ان کے گردے میں درد ہے۔"

"ہاں، آپ تو جانتے ہی ہیں۔ انہیں فوری علاج کی ضرورت ہے یہ درد ایک مہینے بعد اٹھا ہے۔"

"میں آپ کا انتظار کررہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

"مس تحفی! ڈاکٹر ابھی آرہے ہیں۔ پلیز آپ خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ اوہ یہ بوتل بھی ٹھنڈی ہوگئی۔" یہ کہہ کر وہ بوتل کا پانی بدلنے کے لیے باہر کی طرف لپکی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر عبرت وہاں پہنچ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی اس خاندان کا پرانا ہمدرد تھا اور تحفی کے اس مرض کا اسے بہ خوبی علم تھا۔ اسے میں نے شادی کی تقریب میں بھی شامل دیکھا تھا۔ اس نے تحفی کا معائنہ کیا اور بولا۔

"تکلیف کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ انہیں فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے یہ گردے کا نہیں پتے کا درد ہے اور ان کا فوری آپریشن بہت ضروری ہے۔"

"تو پھر جلدی کریں ڈاکٹر! یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ یہ ہماری شب عروسی تھی۔" میں نے بڑے ہی بجھے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"میں سمجھتا ہوں، ہاشمی صاحب! خدا سے دعا کریں، ان کا فوری آپریشن بے حد ضروری ہے۔" اٹھائیں انہیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

اس کے کہنے پر ہم دونوں نے مل کر تحفی کو اٹھایا اور ڈاکٹر کی گاڑی میں پچھلی نشست پر لٹادیا۔ علی جو کو بھی اس عرصے میں نجمہ نے جگادیا تھا۔ وہ گھر پر ہی رہا اور ہم تینوں اسی وقت تحفی کو ساتھ لے کر اسپتال جا پہنچے۔

ڈاکٹرز نے اس کے لیے فوری آپریشن کا مشورہ دیا کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ پتے کے پھٹ جانے کا اندیشہ بے حد قوی تھا۔ وہ اسے خود ہی ہنگامی وارڈ سے نکال کر اسپتال کے اندرونی حصے میں لے گئے۔ اسے وہ آپریشن کے مرحلے سے گزارنے کا فیصلہ کرچکے تھے۔

میں اور نجمہ آپریشن تھیٹر کے سامنے وسیع وعریض برآمدے میں تنہا کھڑے تھے۔ نجمہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ میں نے اپنی ذہنی اذیت سے جھلا کر سگریٹ سلگایا تو وہ بہت ہی دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولی۔ "ہم سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہاشمی صاحب!"

"وہ کیا؟" میں نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا۔
اسپتال گہرے سناٹوں سے لبریز تھا۔
"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ پتے کا درد ہے اور... اور... زہر آلود پتا پھٹ جانے سے آدمی فوراً مر جاتا ہے تو میں ڈاکٹر کو کبھی فون نہ کرتی۔"
"ہاں، واقعی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں نجمہ! ہم نے معاملے کے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا۔ آپ نے بڑی تیزی دکھائی۔"
"دراصل میں اسے گردے کا درد سمجھی تھی۔ حالانکہ یہ پیٹ کے دائیں حصے میں تھا۔ ہم نے ایک قیمتی موقع کھو دیا ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ اب بھی اس کے بچ جانے کے امکانات صفر ہیں۔"
"جی نہیں، اب وہ اسے بچا لیں گے۔ ہم اسے بروقت اسپتال لے آئے ہیں۔"
"اور یہی ہماری سب سے بڑی غلطی ہے۔"
"اب آپ کو کچھ اور سوچنا پڑے گا اور جلدی۔"
"آپ فکر نہ کریں، مگر اب ہماری شادی میں کچھ اور تاخیر ہوتی نظر آتی ہے۔"
"نہیں، میں نے اس بات پر غور کر لیا ہے۔ مس تخی کو کم از کم دس دن تو یہاں ضرور ہی لگ جائیں گے اور اس عرصے میں ہم آسانی سے شادی کر سکتے ہیں۔" وہ بہت پُرعزم دکھائی دیتی تھی۔
"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔"
"مگر شادی ہم آپ کے شہر قصور جا کر کریں گے۔"
"اب اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام یہاں بھی ہو سکتا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔"
"جیسے آپ کی مرضی مگر دو دن بعد آپ دوسری بار دلہا بنیں گے تو کوئی واقفِ حال کیا کہے گا؟"
"یہ شادی ہم بڑی خاموشی سے کر سکتے ہیں۔ ہم شاہدرہ کے ایک مولوی کے پاس جا بیٹھیں گے۔ وہ میرا واقف کار ہے۔"
"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ پہلے یہ معلوم کر لیں کہ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" وہ اس دوران ایک بار بھی نہیں مسکرائی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ بے حد یخ بستہ تھی اور یہی بات مجھے سب سے زیادہ حیران کرتی تھی۔
کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈاکٹر عبرت آپریشن تھیٹر سے باہر آئے، بولے۔
"ہاشمی صاحب مبارک ہو آپ کی بیگم کی جان بچ گئی۔ بروقت آپریشن ہو گیا اگر ذرا دیر ہو جاتی تو وہ جانبر نہ ہو سکتی تھیں۔ ان کے پتے میں زہر بھر چکا تھا۔"
"ہم آپ کے شکر گزار ہیں ڈاکٹر۔"
"یہ میرا فرض تھا۔ میں ان کا پرانا خاندانی معالج ہوں۔ میرا خیال ہے انہیں یہاں کم از کم دس دن تو رہنا ہی پڑے گا۔" پھر وہ میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔
"ایسا تماشا کبھی کسی کے ساتھ نہ ہوا ہوگا۔ یہ آپ کی پہلی رات تھی مگر اسپتال میں گزری۔"
"ان کی جان بچ جائے ڈاکٹر ایسی راتیں تو ہزاروں مل جائیں گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ان کو ہوش آنے میں ابھی دیر لگے گی۔ آپ یہاں سردی میں ٹھہرنے کے بجائے گھر چلے جائیں اور صبح آٹھ بجے واپس آ جائیں۔"
"نہیں ہم ادھر ہی ٹھہریں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر!"
وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر اسی وقت واپس چلا گیا۔
تخی کو ان لوگوں نے کچھ ہی دیر بعد ایک الگ کمرے میں پہنچا دیا۔ ہم بھی اس کے پاس جا بیٹھے۔ وہ کچھ اور زیادہ نحیف و نزار نظر آ رہی تھی۔ رنگ اس کا ہلدی ہو چکا تھا۔ اس میں پہلے ہی زندگی کی اتنی حرارت کہاں تھی جو وہ اس زخم کو بھی برداشت کر سکتی۔ اس کی حالت مجھے بہت ہی ابتر نظر آتی تھی۔
وہ ساڑھے سات بجے ہوش میں آئی تو ہمیں اپنے قریب دیکھ کر بہت خوش ہوئی مگر نقاہت کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ میرا ہاتھ اس نے بڑے ہی اپنائیت بھرے انداز میں پکڑ کر اپنے کھردرے ہوئے رخساروں سے لگایا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جسم میں درد کی ٹیس اسے اب بھی کچوکے لگاتی تھی۔ ابھی اسے ہوش میں آئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے درد میں بے تحاشا اضافہ ہونے لگا۔ نجمہ ڈاکٹر کو بلا لائی اور اس بھلے آدمی نے پھر ایک نیند کا ٹیکہ تخی کی نس میں گھونپ دیا اور وہ ہر شے سے بے نیاز ہو کر بے سدھ ہو گئی۔
میں نے اسی روز دس بجے نجمہ کو شاہدرہ لے جا کر امام مسجد مولوی عبدالغفور کے ہاتھ پر سو روپے رکھے اور نجمہ سے نکاح پڑھوا لیا۔ نکاح نامے میں اس نے اپنا نام انجمن آرا لکھوایا، والد کا نام اس نے الٰہی بخش بتایا تھا۔ امام صاحب نے وہی لکھ دیا۔ انجمن آرا کی وضاحت اس نے یہ کی کہ تخی

نے اسے یونہی نجمہ کہنا شروع کر دیا تھا اور یہی نام اس کے منہ پر چڑھ گیا ورنہ اس کا پیدائشی نام انجمن آرا ہی تھا۔ بات معقول تھی، میں نے تسلیم کرلی۔ مجھے اس میں اعتراض کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ گواہ امام مسجد نے خود بلوا لیے تھے۔ نکاح نامہ اس نے بڑی تفصیل سے تیار کر کے ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس دستاویز کو بڑے غور سے پڑھنے کے بعد نجمہ نے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ وہ بہت مطمئن نظر آتی تھی مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی برابر طاری تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آتی تھی۔ مخفی اسپتال میں تھی اور ہم اس روز گھر پر پہنچ کر نجمہ کے کمرے کو حجلۂ عروسی بنا چکے تھے۔ علی جو کو میں نے ایک ایسے کام پر قصور بھیج دیا تھا کہ وہ شام سے پہلے واپس نہیں آسکتا تھا۔ دراصل میں نے اسے وہاں کے حکیم سے مخفی کے لیے دوا لانے کے لیے کہا تھا۔ اور اسے یہ سمجھایا تھا کہ اس دوا سے مخفی جلدی صحت یاب ہوسکتی ہے۔ سونی ایک بجے اسکول سے واپس آئی تو نجمہ نے اسے کھانا کھلا کر گہری نیند سلا دیا۔ اس کے لیے اس کے پاس ایک گولی موجود رہتی تھی۔ تین بجے تک ہم زندگی کے سارے ہی لذت آگیں مراحل سے گزر چکے تھے، نجمہ میری دوسری بیوی بن گئی تھی۔ چھوٹی بیگم بمگر بشاشت اس کے چہرے پر پھر بھی نہیں ابھر سکی تھی۔ وہ اس وقت بھی مجھے کچھ سوچتی نظر آتی تھی۔

”کیا بات ہے تم کسی گہری سوچ میں گم ہو؟“

”آپ اپنے مقصد کو بھول رہے ہیں۔ رات آپ نے مخفی سے اس رقم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔“

”نہیں، موقع ہی نہیں ملا اور پھر میں کوئی بات کرتا تو وہ خدا جانے کیا سمجھتی۔“

”نرے احمق ہیں آپ۔ اسے شیشے میں نہ اتار سکے۔ بہرحال، اب تو قانونی طور پر آپ ہی اس کے وارث ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

”اب آپ یوں کریں کہ مخفی کو اسی بیماری کے دوران ختم کردیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ میرا دماغ اتنا کام کرتا تو میں پہلے ہی آپ کو بتا چکی ہوتی۔ مگر یہ سب کچھ ایسے طریقے سے کریں کہ آپ پر کوئی حرف نہ آئے۔ ورنہ ہم دونوں تباہ ہوجائیں گے۔“

”یہ تو ہے مگر میری سمجھ میں کوئی طریقہ نہیں آرہا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ اس معاملے میں ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں۔“

”نہیں میں سنجیدہ تو ہوں مگر یہ کوئی آسان کام نہیں ہے نجمہ! قتل کرنا تو شاید مشکل نہیں مگر اسے چھپا لینا ناممکن ہے اور ہم دونوں اس معاملے میں اناڑی ہیں۔“

”اس سے زیادہ سنہری موقع اور کوئی نہ مل سکے گا ہاشمی صاحب! کیا آپ کو ٹیکہ لگانا آتا ہے؟“

”ہاں، میرا خیال ہے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں نے فرسٹ ایڈ کی تربیت لے رکھی ہے۔“

”ہوں، دیکھیں ابھی دو تین دن تک مخفی کو وہ نیند کے ٹیکے لگاتے رہیں گے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ اگر کسی تندرست آدمی کو انسولین کا بڑا ٹیکہ دو تین سی سی کے قریب لگا دیا جائے اور اس کو فوری طبی امداد نہ ملے تو اس کی فوری موت واقع ہوسکتی ہے۔“ نجمہ نے نہایت ہی خوفناک اور پُرعزم لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک ابھر آئی تھی جیسی کسی بلی کی آنکھوں میں شکار کو سامنے دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے؟“

”ہاں، میں آپ کو وہ کتاب بھی دکھا سکتی ہوں جس میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ اس کا مصنف ایک ڈاکٹر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور الماری میں سے ایک کتاب لا کر اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ اس کے متعلقہ صفحے کو جب میں نے پڑھا تو مجھے اس کی بات پر اعتبار آگیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اس صفحے کو غور سے پڑھ چکا تو وہ بولی۔

”آپ آج رات اس کے کمرے میں گزاریں اور جب وہ ٹیکے کے اثر سے نیند میں دھت ہو تو آپ تین سی سی انسولین بھر کر اس کے بازو میں ٹیکہ لگا دیں اور الگ ہو کر بیٹھ جائیں۔ وہ نیند آور ٹیکے کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اپنی اس کیفیت پر بول بھی نہیں سکے گی اور ہمارا مقصد پورا ہوجائے گا۔“

”مگر وہ موت کا سبب معلوم کرلیں گے؟“

”ایسا نہیں ہوگا۔ انسولین جسم میں تحلیل ہوجاتی ہے اور موت کے بعد اس کا کسی بھی طریقے سے سراغ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ وہ آپریشن کی وجہ سے ویسے ہی نیم مردہ جھیل ہے اور انسولین جذب کرنے کے لیے کوئی بھی غذا نہیں ہوگی اور آپ کا کام آسان ہوجائے گا۔“

اف میرے خدایا۔ اس نجمہ نے جس نے ایک

بھرپور زندگی تجمل کے زیرِ سایہ گزار دی تھی اپنی محسنہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے کیسا خوفناک منصوبہ سوچ رکھا تھا۔ یہ احساس مجھے آج ڈس رہا ہے۔ کاش میں اس کے اصل مقاصد کو پہلے بھانپ سکتا مگر میں چالیس لاکھ روپے کی رقم کو مٹھی میں لینے اور نجمہ کے ساتھ ایک نئی زندگی گزارنے کی آرزو میں اتنا مخمور ہو چکا تھا کہ میں نے اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرلیا۔

”ٹھیک ہے نجمہ! میں یہی کرتا ہوں۔“

”بس تو پھر آپ جائیں۔ انسولین سرنج سوئی اور روئی ساتھ لے جائیں۔“

”مگر میں ٹیکہ گرم کیسے کروں گا؟“

”اسے گرم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو مریض کی زندگی لینی ہے بچانی نہیں۔“

”پھر بھی یہ بات بہت ضروری ہے۔ ٹیکے کے بعد جتنی بھی اس کی زندگی باقی ہوگی اس کے دوران ٹھنڈی سوئی سے ورم بھی پیدا ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر اسپرٹ میں سرنج کو نہلا لیں۔ اور پھر پانی سے صاف کرلیں مگر اسپرٹ اس کو انجیکٹ نہ کردیں۔“

”بے فکر رہو۔ یہ سب کام میں باہر سے مکمل کر کے ہی جاؤں گا۔“

”تو پھر بسم اللہ کریں۔ ابھی سے اپنا ضروری سامان لے کر تجمل کے پاس جا بیٹھیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ ایسے ہیجان خیز انداز سے اپنی محبت کا یقین مجھے دلایا کہ میں سمجھا مجھے لہلاتی نشستیں میسر آگئی ہیں۔ وہ میری زندگی کی دوسری عورت تھی۔ تجمل سے سرتاپا مختلف۔ رنگ و نور میں نہلائی ہوئی۔ اس نے مجھے پاگل کردیا تھا۔

میں اسی شام انسولین سرنج، اسپرٹ، سوئی اور روئی لے کر اسپتال جا پہنچا۔ تجمل اس وقت ہوش میں تھی اور ایک نرس اس کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر تجمل نے اپنا وہ سوکھا سڑا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ بڑے ہی نحیف لہجے میں بولی۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے ڈیئر! میں کب سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں؟“

”کب بیدار ہوئی ہیں آپ؟“ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

”میں کوئی تین بجے جاگی تھی۔ مگر یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔“

اس کو مجھ سے مصروفِ گفتگو دیکھ کر نرس باہر نکل گئی۔

”اور اب پانچ بج رہے ہیں۔ دراصل میں آپ کے بارے میں ایک حکیم صاحب سے مشورہ کرنے گیا تھا مگر اس نے کہا کہ آپریشن کے بعد تو اس کی دوا بے معنی ہوگی۔ آپ کی حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ نجمہ بھی بہت پریشان تھی۔“ میں نے یونہی بات بنانے کی کوشش کی اور اس کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے جان بوجھ کر آنکھوں پر زور ڈال کر چند آنسو بہا دیے۔ وہ میری یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

”میں آپ کو خوشی نہ دے سکی مجھے اس کا افسوس ہے ڈیئر! مگر اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اب جلد ہی صحت یاب ہو جاؤں گی۔ پھر ہم ماہِ عسل منانے کے لیے یورپ چلے جائیں گے اور پیرس میں رہیں گے۔“ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

”خدا کرے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں۔ یورپ میں کیا رکھا ہے۔ ہم یہ خوب صورت دن کہیں اور بھی گزار سکتے ہیں۔ مثلاً کوہ مری میں۔ وہاں برف باری بھی دیکھیں گے۔“

”بڑی سردی ہوگی وہاں۔“

”پیرس بھی تو بہت ٹھنڈی جگہ ہے۔“

”مگر وہاں کی بات ہی اور ہے۔ ہر گھر وہاں اندر سے گرم ہوتا ہے۔ ہوٹل بھی سینٹرلی ہیٹڈ ہوتے ہیں۔“

”آپ کے درد کا کیا حال ہے اب؟“

”ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے کبھی کبھی مگر اب میں پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ گردے کا درد نہیں تھا۔“

”ہاں، مجھے بھی یہی فکر تھی۔ پتے کی بات اور ہے۔ وہ نکل بھی جائے تو کوئی بات نہیں بلکہ پتے کے بغیر آدمی زیادہ اچھا ہوتا ہے اسے غصہ نہیں آتا۔“

”آپ آج رات میرے ہی پاس رہیں۔ گھر میں آپ کو بڑی وحشت ہوگی۔ نجمہ ویسے ہی بہت سڑی لڑکی ہے۔ میں نے اس کی تربیت ہی اس طرح کی ہے اور اس نے جس طرح میری خدمت کی ہے، اس کا تو میں صلہ دے ہی نہیں سکتی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ واقعی ایسی خادمہ خال خال ہی ملتی ہے۔“

”میں صحت یاب ہو جاؤں تو پھر میں اس کی شادی کر دوں گی۔ اب آپ مجھے مل گئے ہیں تو میں کسی کی بھی محتاج نہیں رہی۔ ہم کوئی ایسی خادمہ لے آئیں گے جو ہمیں نہ جانتی ہو۔ ایسے نوکر جو گھر کا ہر بھید جانتے ہوں، زیادہ دیر

تک مفید ثابت نہیں ہوتے۔ نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔''

''ایسا کیوں سمجھتی ہیں آپ؟ وہ آپ کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وہ بے چاری نجمہ وہ ویسے بھی مولا ست نظر آتی ہے۔ اتنی سادہ اتنی کم گو۔''

''ہاں، اس کی یہی بات مجھے پسند ہے۔ اس میں عام لڑکیوں جیسی خودنمائی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بڑی حسین ہے۔'' اب وہ خود کو ہم کہہ کر مخاطب نہیں کرتی تھی۔

''خیر ایسا تو نہ کہیں۔ وہ حسینوں میں شمار نہیں ہو سکتی ہے۔ آپ کے سامنے تو وہ بالکل ہیچ ہے۔'' میں نے اسے بہلانا چاہا۔ وہ خوش ہوگئی۔ میرا ہاتھ زیادہ گرم جوشی سے دبا کر بولی۔

''سچ سچ بتائیں میری کون سی چیز آپ کو زیادہ پسند ہے بس ان داغوں نے پریشان کردیا ہے مجھے۔''

''ایسا نہ کہیں۔ یہ بھی آپ کی شخصیت میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ آپ کے یہ بال یہ گورا رنگ یہ صراحی دار گردن یہ چاہِ ذقن یہ صاف شفاف دانت، میرے لیے تو آپ سارے جہان سے زیادہ حسین ہیں۔'' میں نے اس کی انا کی کچھ اور ڈور ہلائی۔ اس کو گہرے کھڈ میں گرانے سے پہلے میں اسے تھوڑا سا خوش کر دینا چاہتا تھا کہ وہ مرے تو مایوس ہو کر نہ مرے۔

وہ اور زیادہ خوش ہوگئی اور بولی۔

''یہ کمرا آرام دہ ہے۔ دوسرا بستر بھی موجود ہے آپ آج رات ادھر ہی سو رہیں۔ میں آپ کو بس دیکھتی رہوں گی۔''

''وہ آپ کو نیند آور ٹیکہ لگا کر ہر شے سے بے نیاز کر دیں گے۔''

''ہاں مگر وہ بھی بہت ضروری ہے ورنہ آپریشن کے بعد کا یہ درد بہت ظالم ثابت ہوتا ہے۔''

میں کتنی ہی دیر تک اس کے پاس بیٹھا اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا مگر میری حیرت اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ اپنے روپے کے بارے میں لب نہیں کھولتی تھی۔ اس کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے بی بی پری وش تخلی! یہ بلی چوہے کا کھیل جلدی ختم ہوجائے گا۔

رات کے دس بجے واقعی نرس نے اسے خواب آور ٹیکہ لگا دیا۔ اور وہ گہری نیند میں کھو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر بھی ادھر آ گیا۔ وہ آخری راؤنڈ پر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی نرس کو وہاں بٹھا دیں کیونکہ میں گھر واپس پہنچنا چاہتا ہوں۔ وہ میری یہ بات سن کر قدرے حیران ہوا، بولا۔

''میرا تو خیال ہے کہ آپ ان کی ضرورتوں کا بہتر خیال رکھ سکتے ہیں۔ آپ ادھر ہی ٹھہر جائیں۔ انہیں کوئی وقت ہو تو مجھے فوراً بلوا لیں۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں یہیں رک جاتا ہوں۔'' میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ میں دراصل اس کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ مجھے گھر کی حفاظت کے خیال سے وہاں ٹھہرنے میں الجھن محسوس ہو رہی ہے۔

اس رات ساڑھے گیارہ بجے میں نے سرنج میں تین سی سی انسولین بھر کر بڑی احتیاط سے خوابیدہ تخلی کا بازو اسپرٹ سے صاف کیا اور تیزی سے انسولین اس کے بدن میں اتار دی۔ اس کے بعد تمام چیزیں ایک پلاسٹک کے لفافے میں بند کر کے میں نے باہر پھینک دیں۔ اس کام کے لیے مجھے لمبی راہداری عبور کر کے کوڑے کے ایک ڈرم تک پہنچنا پڑا تھا۔ جب میں کمرے میں واپس گیا تو انسولین اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ تخلی کا بدن پسینا پسینا ہو رہا تھا اور اس کی نبض کی رفتار طوفاں خیز ہونے لگی تھی۔ .. مگر نیند کا ٹیکہ کچھ اس طرح اسے جکڑے ہوئے تھا کہ اس کا ذہن بیدار نہیں ہو رہا تھا۔ غذا بھی اسے ان لوگوں نے واجبی سی دے رکھی تھی اور یہ دیکھ کر میری اپنی نبضیں چھوٹنے لگیں کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر تخلی کا بدن ساکت ہو چکا تھا۔ میں نے دروازے کی چٹخنی نیچے گرا دی تاکہ کوئی اندر آنا چاہے تو بلا روک ٹوک آسکے۔ کسی ڈاکٹر کو اطلاع دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو صبح ہی صحیح صورتِ حال کا علم ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تخلی کے مردہ جسم پر کمبل کچھ اس طرح لپیٹا جیسے وہ نیند میں کروٹیں لیتی رہی ہے۔ ایک خاص قسم کی بے ترتیبی میں نے اس کمبل میں رہنے دی اور پھر اپنے شدید ذہنی اضطراب پر قابو پانے کے لیے میں سکون آور گولی حلق سے نیچے اتار کر پلنگ پر دراز ہوگیا۔

میں چاہتا تو اس کے آپریشن کے زخم کے ٹانکے اس طرح ادھیڑ سکتا تھا جس سے یہی معلوم ہوتا کہ وہ سوتے میں کروٹ لینے سے کھل گئے ہیں۔ وہ نیند میں تھی اور اس کے بدن سے اسی حالت میں اُدھڑے ہوئے زخم سے اتنا خون بہہ سکتا تھا کہ وہ اس تکلیف سے ہی مر سکتی تھی مگر یہ بات میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔ میں بستر پر لیٹا اس سارے وحشت ناک سلسلے پر غور کرتا رہا۔ کتنے ہی سگریٹ میں نے لیٹے لیٹے پھونک ڈالے۔ مگر ان کے ٹکڑوں کو میں بڑی احتیاط سے الگ رکھتا رہا۔ تاکہ کوئی اگر دیکھنا بھی چاہے تو

اسے یہ معلوم نہ ہو کہ میں ساری رات جاگتا رہا ہوں۔
گھڑی کے اس وقت چار بج رہے تھے جب میں نے باہر راہداری میں کئی قدموں کی چاپ سنی۔ وہ لوگ تیزی سے دائیں طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ ہمارے کمرے کے آگے سے گزرے، میں دروازہ کھول کر ان کی طرف لپکا۔ ایک نرس دو عورتوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی تیرہ نمبر کمرے کی طرف جارہی تھی کہ ان کو متوجہ کیے بغیر میں دوڑتا ہوا ڈاکٹروں کے کمرے میں جا پہنچا۔ رات کی ڈیوٹی پر موجود دو نوجوان ڈاکٹر وہاں بیٹھے ایک چلبلی سی نرس سے گفتگو میں مصروف تھے۔ میں نے جاتے ہی وہاں افراتفری مچادی۔
''ڈاکٹر! جلدی آیئے، میری بیوی کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ بالکل پتھر ہورہی ہے۔''
''ارے، مسز تحفی ہاشمی کی بات کررہے ہیں آپ، کیا ہوا انہیں؟'' دونوں ڈاکٹرز نے اچھل کر اٹھتے ہوئے بہ یک آواز کہا۔
''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے ڈاکٹر! میں ابھی باتھ روم میں جانے کے لیے اٹھا تو دیکھا کہ تحفی بالکل بے ہوش ہیں۔ ان کی تو نبض بھی محسوس نہیں ہورہی۔'' ڈاکٹرز نے تحفی کے کمرے کی طرف دوڑ لگادی۔
جب وہ دونوں تحفی کو دیکھ چکے تو وہ حیرت زدہ ہوکر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر تحیر ابھر آیا تھا۔ پھر وہ دونوں مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ کیا ہوگیا ہے میاں! کیا کردیا ہے تم نے۔ مگر میں نے تحفی کے ماتھے پر لب رکھ دیے تھے اور میری آنکھیں چھلکنے لگیں۔
''یہ۔۔۔ یہ کیا کردیا ہے تم نے ڈاکٹر! انہیں تم نے کیا کردیا ہے۔ یہ میری شادی کی دوسری رات ہے بدبخت اناڑی ڈنگر ڈاکٹر۔'' میں نے پاگلوں کی طرح گریبان سے پکڑ کر ڈاکٹر عارف کو جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے لڑکھڑا کر پلنگ کا سہارا لیا اور بولا۔
''میں۔۔۔ میں خود حیران ہوں جناب! ذرا سسٹر عذرا کو بلائیں ڈاکٹر سلیم! یہ ناقابلِ یقین بات ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے تحفی کے آپریشن پر بندھی پٹی پر نظر ڈالی۔ وہاں سے خون کا ایک قطرہ تک نہیں رس رہا تھا۔ پٹی بالکل صاف ستھری تھی۔ ڈاکٹر سلیم باہر نکلا تو ڈاکٹر عارف نے بے چارگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
''شادی کی پہلی رات سے کیا مراد ہے آپ کی؟''
''پرسوں میری ان سے شادی ہوئی تھی ڈاکٹر! رات کو دو بجے ان کے پیٹ میں درد اٹھا، کل صبح آپ لوگوں نے ان کا آپریشن کردیا اور آج انہیں مار بھی دیا۔ خدا غارت کرے تم لوگوں کو۔ میں تم سب کو جیل میں سڑوادوں گا۔ یہ علاج کرتے ہو تم لوگ۔'' میں نے غصے سے اپنے گلے کی نسیں پھلاتے ہوئے کہا۔ وہ ساری کی ساری اداکاری تھی مگر اس میں مجھے کامیاب ہونا تھا۔ ڈاکٹر خوف زدہ سا ہوکر بولا۔
''مجھے آپ سے ہمدردی ہے ہاشمی صاحب! مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے، آپ کس وقت سوئے تھے؟''
''میں بارہ بجے تک جاگتا رہا پھر میں سوگیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں راہداری میں کسی کے بھاگنے کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ نرسیں کسی مریض کی طرف جارہی تھیں۔ اٹھتے ہی میں نے ان کو دیکھا تو یہ پتھر ہوچکی تھیں۔''
اتنے میں ڈاکٹر سلیم کے ساتھ وہ نرس کمرے میں داخل ہوئی جس نے رات تحفی کو نیند کا ٹیکہ لگایا تھا۔ میں قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بہت ہی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے بھی آتے ہی تحفی کی نبضیں دیکھیں اور پھر خوف زدہ لہجے میں بولی۔
''رات تو میں انہیں اچھی بھلی چھوڑ کر گئی تھی۔ پلز بھی ٹھیک تھی اور بی پی بھی۔''
''تم نے بی پی کب چیک کیا تھا۔ یہ سب تمہاری حماقت کا نتیجہ ہے۔ تم نے ٹیکہ زیادہ بھرلیا ہوگا۔''
''جناب! یہ میرا پہلا دن نہیں ہے ڈیوٹی پر۔ میں آٹھ سال سے یہ کام کررہی ہوں۔ یہ ڈیتھ کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔ آپ کو مجھ سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' وہ ایک دم طیش میں آگئی۔
''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا، تم نے میری زندگی تباہ کردی ہے۔ بتاؤ انہیں کیا ہوا ہے۔ وجہ بتاؤ، یہ کیسے مرگئیں؟'' میں اس کی طرف یوں بڑھا جیسے میں اس کا منہ نوچ لوں گا۔
''پلیز، ٹیک اٹ ایزی ہاشمی صاحب! خدا کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ بہرحال ہم وجہ معلوم کرلیں گے۔ ڈاکٹر سلیم آپ ڈاکٹر وارثی کو اطلاع دے دیں۔ آپریشن انہوں نے ہی کیا تھا۔''
''میں اپنے ڈاکٹر عبرت کو بھی بلوالیتا ہوں جس کسی کی بھی یہ غفلت ہے اسے سزا بھگتنی ہوگی۔'' میں نے گہرے دکھ اور شدید غضب کا امتزاج اپنی آواز میں پیدا کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر عارف نے مخفی کے چہرے پر کمبل ڈال دیا اور پھر مجھے تسلیاں دیتا ہوا ڈاکٹر سلیم اور نرس کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ ان تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔

میں نے اسی وقت ڈاکٹر عبرت کو فون پر بتایا کہ مجھ پر کیسی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ میری آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ خدا جانے اس وقت کوشش کے بغیر ہی میرے آنسو کیسے آپ ہی آپ بہے چلے آ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خوف وہ اضطراب وہ اپنے مہیب جرم کا احساس مجھے اندر سے کاٹتا جا رہا تھا۔ میں اپنی ہی نگاہوں سے گر گیا تھا۔ میں نے ایک ہنستی کھیلتی جیتی جاگتی زندگی بھسم کر دی تھی اور یہ خوف میرے اعصاب پر سوار تھا کہ اگر بھید کھل گیا تو کیا ہوگا۔ وہ پوسٹ مارٹم کر بیٹھے۔ اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اتنی کثیر مقدار میں انسولین مخفی کے جسم میں اتاری گئی ہے تو وہ مخفی کے قاتل کو پہچان لینے میں قطعاً کوئی غلطی نہیں کریں گے۔ نجمہ نے مجھے ایسی مصیبت میں پھنسا دیا تھا کہ اس کا بہ ظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ میرے اس گناہ کی پردہ پوشی فرمائے۔ جی ہاں، مخفی کو جان سے مار دینے، اسے قتل کر دینے کے بعد بھی میں اس کے خالقِ حقیقی سے اپنے لیے پناہ طلب کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ سنگین مذاق صرف ...... انسان ہی کر سکتا ہے۔ کائنات کی اور کوئی مخلوق ایسی عیاری اور ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی ہے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر عبرت بھی اسپتال آ پہنچا۔ صورتِ حال کی سنگینی کو دیکھ کر وہ بھی سر پیٹ کر رہ گیا۔ روتے روتے میری آنکھیں دکھنے لگی تھیں اور شاید میری ہچکی بھی بندھ گئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ میں عمداً نہیں کر رہا تھا۔ وہ میرے اندر کا بے پناہ خوف تھا جو مجھے مسلسل رلا رہا تھا اور اس کا فائدہ بھی مجھے ہی پہنچ رہا تھا۔ جو کوئی بھی مجھے دیکھتا تھا مجھ سے ہمدردی جتاتا تھا۔ تسلیاں دیتا تھا۔ صبر کی تلقین کرتا تھا۔ اسے خدا کی رضا سمجھ کر مجھے سرِ تسلیم خم کرنے کی ہدایت کرتا تھا جب کسی کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ ایک رات کی دلہن بن کر دنیا سے منہ موڑ گئی ہے تو اسے جھٹکا سا لگتا تھا اور وہ مجھے اور زیادہ ترحم خیز نظروں سے دیکھتا تھا۔

ڈاکٹر وارثی، ڈاکٹر عبرت، ڈاکٹر کلیم اللہ اور ڈاکٹر تیموری نے مخفی کا باقاعدہ معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ مریضہ کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا ہے۔ یہی ان کی متفقہ رائے تھی۔ طے یہ پایا کہ پوسٹ مارٹم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سب کے سب بڑے اعلیٰ پائے کے ڈاکٹر تھے اور مریضہ ان کے اسپتال کی چار دیواری میں مری تھی۔ وہ اس قصے کو اپنی اور اسپتال کی بدنامی سے بچنے کے لیے جلد از جلد نمٹا دینا چاہتے تھے۔ ان پر ناقابلِ معافی پیشہ ورانہ غفلت کا الزام عائد ہوتا تھا۔ میری دھمکیاں بھی ڈاکٹر عارف اور ڈاکٹر سلیم نے ان کے گوش گزار کر دی تھیں۔ میں ان کے سامنے بھی روتا رہا اور انہیں کئی بار میں نے طیش کے عالم میں بے نقط بھی سنا دی تھیں اور وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ میں نے انہیں پاؤں سے یوں اکھاڑ دیا تھا کہ مخفی کی موت کا وہ لاشعوری اور شعوری طور پر اسپتال کو ہی ذمے دار ٹھہرا رہے تھے مگر منہ سے تو وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔

ان کی رائے کا جب اعلان ہو چکا اور انہوں نے اپنا متفقہ فیصلہ مخفی کے کاغذات پر لکھ دیا تو میں نے فون پر بڑے ہی دکھ بھرے لہجے میں یہ خبر چند لفظوں میں نجمہ کو سنا دی۔ ایک لحظہ کے لیے تو وہ سُن ہو کر رہ گئی اور پھر چیخ کر بولی۔

”یہ.... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بھی عمدہ قسم کی اداکاری کرنے لگی تھی۔

”آپ جلدی اسپتال پہنچ جائیں۔ ہم میت کو گھر لا رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں اس کی کوئی اور بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اس کا دیا ہوا تیر بہت ہی مہلک ثابت ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد نجمہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اسپتال آ پہنچی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ مخفی کی میت دیکھ کر وہ اس سے یوں لپٹ گئی جیسے اس کی اپنی ماں مر گئی ہو۔ اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر میں باہر راہداری میں جا ٹھہرا۔ میں اس ماحول میں اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہماری ذرا سی غلطی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔

اس شام جب ہم مخفی کو سپردِ خاک کر کے گھر لوٹے تو اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ہی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہاں مخفی کے عزیزوں میں سے تو کوئی بھی نہیں تھا جو زیادہ دیر تک بیٹھا رہتا۔ علی جواد اور سونی کی حالت بہت ہی قابلِ رحم تھی اور ان دونوں کے گلے لگ کر جس انداز سے نجمہ بار بار روتی تھی اس سے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بھی کہیں زیادہ بڑی اداکارہ ہے۔ علی جو وہ دوا دیکھ دیکھ کر دھاڑیں مار کر روتا تھا جو وہ قصور سے میرے کہنے پر مخفی کے لیے لایا تھا۔ نجمہ نے رات تو بچے سونی کو بازار سے کھانا منگوا کر کھلا دیا اور پھر نیند کی گولی دے کر اسے اس نے بستر میں باندھ دیا۔ یہ کام اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

سوفی کو خدا جانے وہ کب سے اس گولی پر ڈال چکی تھی اور کس مقصد کے لیے وہ ایسا کرتی رہی تھی، یہ بات میرے لیے کسی.... اچنبھے سے کم نہیں تھی۔

رات دس بجے نجمہ جب میرے کمرے میں آئی تو وہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ وہ ایسا نیم عریاں لباس پہن کر آئی تھی اور چہرہ اس کا یوں دمک رہا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑی مملکت فتح کرلی ہو۔ وہ ہماری شب عروسی نہیں تھی مگر وہ اسے اسی طرح گزار دینا چاہتی تھی جیسے ہم پہلی بار مل رہے ہوں۔ ہم رات دو بجے تک مخفی کی لاش پر برہنہ ناچ ناچتے رہے۔ وہ مخفی ہی کا پلنگ تھا جو ہمیں آغوش میں لیے ہوئے تھے۔ مجھ پر نجمہ کی نوازشیں اس رات اپنے عروج پر تھیں۔

ہماری وہ مدہوشی ذرا کم ہوئی تو نجمہ نے گرم دودھ میں شہد ملا کر مجھے بھی پلایا اور خود بھی پیا۔ ہم دونوں ہی بہت تھک گئے تھے۔ جیسے کوئی طویل صحرائی مسافت طے کر کے وہاں تک پہنچے ہوں۔ وہ چہکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اب تو جتنی جلدی ہو سکے بینک سے وہ روپیا نکال کر اپنے قبضے میں کرلیں ہاشمی صاحب! حالات کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔"

"کیا مطلب؟ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

"آپ نہیں سمجھتے ہیں۔ قتل آخر قتل ہے۔ کسی بھی قسم کی خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم وہ روپیا قبضے میں لے کر یہ کوٹھی بھی بیچ دیں گے اور پھر کسی اور شہر میں جا بسیں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کسی کو ہماری اس کارروائی پر شبہ بھی ہو سکتا ہے؟"

"عین ممکن ہے کوئی دشمن ہماری ٹوہ میں لگا ہو۔ اس علی جو کو ہی لیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بی بی اپنی موت نہیں مری ہیں۔ ایک وہم سا اس کے دل میں بیٹھ چکا ہے۔ میں نے اسے سمجھا تو دیا ہے مگر پھر بھی ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر یہ بدھو ایسی بات کیونکر کہہ سکتا ہے؟"

"اسے اتنا بدھو نہ سمجھیں ہاشمی صاحب! وہ جتنا کم گو ہے اتنا ہی گہرا بھی ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں اس کا بھی پتّا صاف کر دوں گا۔ میں کسی کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔"

"نہیں، ایسا سوچیں بھی نہیں۔ یہی سب سے بڑی دیوار تھی جسے آپ نے بڑی ہمت سے گرالیا ہے۔ ہمیں اب اپنے مستقبل کو محفوظ کرنا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ دو چار دن میں، میں وراثت کے کاغذات تیار کروا لوں گا پھر میں رقم گھر ہی لے آؤں گا، اس کا بینک میں رہنا واقعی درست نہیں ہے۔ کوئی بھی دعویدار پیدا ہو سکتا ہے جس کا ہمیں علم نہ ہو۔"

"میں یہی کہہ رہی ہوں۔ آپ اب ساری توجہ اصل کام پر صرف کریں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ میری اصلی تے وڈی پریوش ایسا ہی ہوگا۔"

"ہائے کتنا مزہ آئے گا جب ہم اپنے ہاتھوں سے لاکھوں کے نوٹ گن رہے ہوں گے۔ آپ نے بھی کبھی اتنے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

نوٹ ہاتھ میں نہیں لیے ہوں گے حالانکہ آپ بینک میں کام کرتے ہیں۔''

''میرا کام کچھ اور قسم کا ہے۔ بہرحال، نوٹ تو میں نے منوں کے حساب سے دیکھے ہیں مگر اپنے نوٹوں کی تو بات ہی اور ہے۔''

''آپ کے دوست بھی آپ سے جلتے ہوں گے۔ وہ شعیب اور باری۔ ایک دم بے وقوف لوگ تھے وہ۔ تحقی تو ان کے سامنے آئی ہی نہیں۔ آپ نے البتہ اسے ایسا چکر دیا کہ وہ چت ہو گئی۔''

''یہ سب کچھ حضور کی مہربانی سے ہوا ہے ورنہ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تحقی کو تم نے ایسے طریقے سے قتل کرایا ہے کہ میں خود دنگ رہ گیا ہوں۔''

''میں نے اس قسم کی طب کی بہت سے کتابیں پڑھی ہیں۔ یہ میرا شوق رہا ہے۔ آسان ترین راستہ مجھے یہی نظر آتا تھا۔''

''کیا تم عرصے سے اس منصوبے پر عمل کرنے کا سوچ رہی تھیں؟''

''ہاں مگر میں تنہا یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ میں کر بھی لیتی تو مجھے فائدہ کچھ نہ ہوتا۔''

''اس کے لیے تم نے میرا انتخاب کیا؟''

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بس آپ کو دیکھتے ہی میرے دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ میں نے پہلے ہی روز آپ کو اپنا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر میں سوچتی تھی کہ میں تو مفلس ہوں ہی، آپ کے پاس بھی کچھ نہیں ہے تو پھر ہماری زندگی شادی کے بعد بھی روتے پیٹتے گزرے گی۔ اس مرض کا علاج میں نے بہت سوچ سمجھ کر ڈھونڈا اور خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ہمت نہیں ہاری اور میری بات مان لی۔''

''مجھے یہی کرنا چاہیے تھا نجمہ ورنہ میں اس بلا کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔''

یونہی ہم رات بھر مستقبل کے بارے میں بڑے خوب صورت منصوبے بناتے رہے۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔ نجمہ نے بستر چھوڑ دیا اور تولیا لے کر باتھ روم میں جا گھسی۔ تحقی کے اس باتھ روم میں جس کے اندر وہ صرف صفائی کے لیے جایا کرتی تھی۔ اب وہ سارے کا سارا اس کی ملکیت تھی۔ کیونکہ میں اس کا تھا۔ اس نے بڑی عیاری سے مجھے تحقی کی موت سے پہلے اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا۔

ایک مہینے اور تیرہ دن کی دوڑ دھوپ کے بعد میں نے خود کو تحقی کا تنہا اور جائز وارث ثابت کر دیا۔ وراثت کا تصدیق نامہ کچہری سے لیتے ہی میں نے بینک سے سارا روپیا نکلوایا اور اسے بڑے سے چرمی بیگ میں بھر کر گھر لے آیا۔

نجمہ نے وہ اتنے سارے نوٹ دیکھے تو وہ پاگل ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے لاکھ لاکھ کی الگ الگ ڈھیریاں بنائیں۔ اور پھر ایک ایک کر کے گننے لگی۔ اس کے چہرے کی وہ تمتماہٹ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اتنی زیادہ خوشی میں نے شاید ہی کسی آدمی کے وجود میں ہلکورے لیتی ہوئی دیکھی ہوگی۔ نوٹوں کو گن کر نجمہ نے آہنی سیف میں بند کیا اور پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

''جان!'' میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسا بے مثال آدمی مل گیا ہے، میں آپ کی اس جرأت، دلیری اور بہادری پر آپ کو کیا پیش کروں۔ کیا انعام دوں۔ ایک میری جاں ہے سو حاضر ہے۔'' اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

''میرے لیے یہی بہت ہے نجمہ کہ تم میری ہو اور مجھ سے خوش ہو۔'' میں نے اسے بانہوں میں اٹھا کر بستر پر پھینکتے ہوئے کہا۔ وہ اس گھڑی یہی چاہتی تھی کہ میں اسے خوب زدوکوب کروں اتنا ماروں کہ اس کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

روپیا ہمارے سیف میں بند تھا اور میں نے ابھی تک بینک کی ملازمت ترک نہیں کی تھی۔ محض اس لیے کہ مجھے وہ سب کچھ آہستہ آہستہ جذب کرنا چاہیے۔ دو مہینے گزر چکے تھے اور میں ان دنوں بنگلا بیچ دینے کی کوشش میں تھا۔ اس کی قیمت ساڑھے بارہ لاکھ لگ چکی تھی مگر نجمہ کا اصرار تھا کہ ہم سولہ لاکھ سے کم نہیں لیں گے۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ بنگلا سولہ لاکھ سے بھی زیادہ قیمت کا تھا۔ بالآخر ہمیں ایک ایسا گاہک مل گیا جو ہمیں ساز و سامان سمیت اس بنگلے کے ساڑھے سولہ لاکھ روپے دینے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے نجمہ سے مشورہ کیا تو اس کی آنکھوں میں بلب سے روشن ہو گئے۔ وہ ایک بڑی ہی ہیجان خیز کیفیت کی غماز تھی، وہ روشنی جو اس کی قلبی مسرت کا اعلان ہوتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اب دیر نہ کریں۔ ساڑھے سولہ لاکھ بڑے غنیمت ہیں۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں رکھ سکتے۔''

''ٹھیک ہے عالی مرتبت میں آج ہی یہ سودا طے کر لیتا ہوں۔''

گاہک نے رجسٹری لکھوائی اور چوتھے دن ہمیں عدالت کے روبرو اس نے رقم ادا کر دی۔ نجمہ کی نوازشیں

مجھ پر اتنی زیادہ تھیں کہ میں اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا۔ وہ فضول خرچ بھی نہیں تھی۔ روپے کو سینت سینت کر رکھنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح آزما لیا تھا۔ وہ ایک ایک پیسے کو مستقبل کے لیے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ حالت یہ تھی کہ اس نے اس دوران ایک بار بھی مجھ سے شاپنگ کے لیے نہیں کہا حالانکہ وہ چاہتی تو میں اس پر لاکھوں روپے وار سکتا تھا۔ تخلی کے ڈھیروں ان سلے خوب صورت کپڑے گھر میں موجود تھے، وہ اس نے ایک ایک کر کے خود ہی لیے تھے۔ وہ انہیں میں چاند جیسی حسین نظر آتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو کچھ ہم نے ایک اتنے بڑے جرم کے بعد حاصل کیا ہے کسی طرح بھی اشد ضرورت کے بغیر خرچ کیا جائے۔ میں نے اسے کہا بھی کہ ہم وہ روپیا کسی دوسرے بینک میں رکھ دیتے ہیں۔ ہمیں وہاں سے معقول منافع مل سکتا ہے مگر اسے اندر سے تخلی کے قتل کا راز کھل جانے کے خوف نے اتنا جکڑ رکھا تھا کہ وہ اس روپے کو لاہور کے کسی بینک میں رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم جلد ہی کراچی منتقل ہو جائیں گے ہمارے لیے سب سے محفوظ جگہ وہی تھی۔ یہ اس کا اپنا خیال تھا حالانکہ میں نے اس وقت تک کراچی دیکھا بھی نہیں تھا۔

بنگلا فروخت کر دینے کے پندرہ دن بعد ہم نے اپنا تمام روپیا ایک مضبوط صندوق میں بند کیا اور ضرورت کی دوسری چیزیں جن میں دو ٹیپ دو ریڈیو ایک ٹی وی اور اس قسم کی کچھ اور قیمتی اشیا شامل تھیں اور جو بنگلے کے سامان میں ہم نے نہیں لکھوائی تھیں، اٹھا کر ہم کراچی روانہ ہو گئے۔ علی جو کو نجمہ نے چار تنخواہیں دے کر فارغ کر دیا تھا اور موتی کو اس نے میری تجویز کے مطابق اسکول کے ہاسٹل میں داخل کروا دیا تھا۔

کراچی پہنچ کر ہم ایک مشہور ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ فکر مجھے اس روپے کی طرف سے تھی مگر...... نجمہ سارا دن گھر میں بیٹھ رہنے کی عادی تھی اور ہمیں یقین تھا کہ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہے کہ ہم اتنی بڑی رقم ساتھ لیے پھرتے ہیں اس لیے میں نجمہ کو ہوٹل میں چھوڑ کر ہر روز شہر میں اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس باقاعدگی سے جانے لگا تھا کہ کوئی عمدہ سا بنگلا خرید سکوں۔

چوتھے روز شام کو تین بجے میں ہوٹل پہنچا تو یہ دیکھ کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا کہ ہوٹل کا وہ کمرا تو جوں کا توں موجود تھا مگر وہاں نجمہ کا نام و نشان نہیں تھا۔ کمرے سے وہ صندوق بھی غائب تھا جس میں میں نے پچپن...

## زبان بے زبانی

فیثا غورث انسانوں اور حیوانوں میں فرق کے بارے میں شاگردوں کو سمجھا رہا تھا۔ ''حیوانوں پر مصائب ان کے بے زبانی کی وجہ سے نازل ہوتے ہیں کیونکہ دکھ درد کا اظہار نہیں کر سکتے۔ انسانوں پر ان کی زبان مصائب و آلام لے کر آتی ہے۔ کیونکہ وہ زبان کا غلط استعمال کر بیٹھتے ہیں۔''

لاکھ روپے بند کر رکھے تھے۔ نجمہ کے تمام کپڑے اور اس کا دوسرا ذاتی سامان بھی غائب تھا ریڈیو، ٹیپ اور میری ذاتی ضرورت کی ساری چیزیں وہاں البتہ موجود تھیں۔ میں سمجھا میں پاگل ہو گیا ہوں اور میری بصارت میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ میں نے بار بار آنکھیں مل مل کر ہر شے کو بہ غور دیکھا... مگر حقیقت تو وہی تھی جو مجھے نظر آ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ہوٹل کے استقبالیہ کا رخ کیا۔ وہاں دو خواتین ہمہ وقت موجود رہتی تھیں۔ ان سے میں نے نجمہ کے بارے میں پوچھا تو ان میں سے ایک نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔ بولی۔ ''ہاشمی صاحب آپ ہی ہیں نا؟''

''جی میرا نام انور ہاشمی ہے۔''

''آپ نے ہی تو ایک بجے فون کیا تھا۔ میں نے میڈم سے آپ کو ملا دیا تھا۔ وہ آپ کے کہنے کے مطابق ہی صندوق لے کر یہاں سے گئی ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جناب! میں یونہی از راہ تجسس آپ کی باتیں سن رہی تھی۔ آپ نے میڈم سے کہا تھا کہ میں جمشید صاحب کو بھیج رہا ہوں، آپ صندوق اور اپنے ذاتی کپڑے لے کر فوراً صدر پہنچ جائیں، بلکہ آپ نے کسی نفیس شو کمپنی کا بھی ذکر کیا تھا کہ آپ اس دکان کے سامنے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''کوئی آدمی بھی آیا تھا یہاں، کون تھا وہ؟''

''ایک لمبے چھریرے قد کا جوان تھا جو بڑے خوب صورت انداز سے انگریزی بولتا تھا۔ وہ ڈیڑھ بجے یہاں آیا اور میڈم نجمہ کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔''

''اوہ میرے خدایا! یہ کیا ہو گیا ہے؟''

''گھبرائیں نہیں، وہ آپ کے لیے یہ بریف کیس چھوڑ گئی ہیں۔ میڈم کہہ رہی تھیں کہ اگر آپ یہاں آ گئے تو ہم یہ آپ کو دے دیں۔ وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ رات کو تو

بجے تک بہر حال واپس آجائیں گی۔"

میں نے وہ ہلکا سا بریف کیس اس خاتون سے لیا اور پھر پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں جا گھسا۔ بریف کیس میں نے ایک تار سے کھولا تو اس میں سے مجھے کسی مردانہ ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط ملا۔ جسے پڑھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ اس میں لکھا تھا۔

مسٹر ہاشمی!

آپ نے مس مختی کو جب خوب صورتی سے قتل کیا ہے میں اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے خلاف جرم کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے تو یہ آپ کی خود فریبی ہے۔ اس بریف کیس میں رکھا ہوا ٹیپ سن لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ پھانسی کا پھندا آپ کی گردن سے زیادہ دور نہیں ہے آپ مس مختی کی ملازمہ کو جس طرح دھوکے سے اغوا کر کے کراچی لے آئے ہیں اس کا بھی حساب آپ سے ضرور لیا جائے گا، وہ چھپن۔ لاکھ روپے کی رقم جو آپ نے ہضم کر لی ہے وہ بھی آپ کو اگلنی پڑے گی۔ یہ ٹیپ آپ کے جرائم کو ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ میں یہ خط آپ کو کس حیثیت سے لکھ رہا ہوں یہ جاننے کی کوشش نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اس ٹیپ کی ایک نقل میں پولیس کو فراہم کر رہا ہوں۔ اپنے بچاؤ کے لیے آپ کچھ کر سکتے ہوں تو ضرور کریں مگر آپ کو تو شاید اب زمین بھی نگلنے سے انکار کر دے گی۔ آپ کا خیر اندیش۔

عین، میم، شین۔

وہ خط نکیلے خنجر کی طرح میرے دل میں دھنستا چلا گیا۔ بریف کیس میں سگاروں کا ڈبا ایک عمدہ قسم کا طلائی سگریٹ لائٹر، پرفیوم کی دو بڑی شیشیاں، ایک آئینہ، چند رومال، دو کنگھیاں اور ایک ٹیپ موجود تھے۔ میں نے سب چیزوں کو الگ رکھ کر ٹیپ نکال کر ٹیپ ریکارڈر میں دھنسا دیا۔ وہ چند منٹ تک یونہی بے آواز چلتا رہا پھر اس میں سے میری آواز ابھری اور وہ باتیں پھر میری سماعت سے ٹکرانے لگیں جو میں نے مختلف اوقات میں نجمہ سے کی تھیں۔ اس میں وہ باتیں بھی شامل تھیں جن میں ہم مختی کو انسولین کے ذریعے قتل کرنے کا منصوبہ بناتے سنائی دے رہے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سارا مکالمہ ٹیپ میں میرے اور نجمہ کے درمیان نہیں چل رہا تھا۔ میری آواز تو اس میں بالکل ہی عیاں تھی مگر نجمہ کی جگہ مجھ سے کوئی اور ہی عورت ہم کلام تھی۔ ایسی عورت جس کی آواز بہت ہی بھاری بھرکم تھی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نجمہ کی آواز نہیں ہے۔ بلاشبہ اپنی آواز اس نے بدلی ہوئی تھی۔ میں نے جس جگہ اپنے فقروں میں نجمہ کا نام پکارا تھا وہاں سے نجمہ کا نام بڑی مہارت سے حذف کر دیا گیا تھا اور ٹیپ ایسے طریقے سے دوبارہ تیار کی گئی تھی کہ نجمہ کے لیے فدائیہ کلمہ میرے منہ سے ادا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نجمہ سے نہیں کسی اور ہی عورت سے مصروف گفتگو ہوں اور ہم دونوں نے مل کر مختی کو قتل کر دینے کی سازش کی ہے... اور نجمہ اس سارے کھیل میں کہیں بھی موجود نظر نہیں آتی تھی... وہ ایک گھنٹے کی ٹیپ تھی جس کے دونوں حصے میری اور اس کھردری بھاری بھرکم آواز والی عورت کی گفتگو سے بھرے پڑے تھے اور اس کو سن کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ نجمہ کا اس سارے خونی ڈرامے میں کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔

اب وہ نجمہ کسی جمشید کے ساتھ مل کر چھپن۔ لاکھ کی رقم بڑی صفائی سے اڑا کر چلتی بنی تھی۔ ٹیپ بند کر کے میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ سارے پتے ان کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکے تھے اور اس پر مرے کو مارے شاہ مدار۔ اس جرم کو اس کی تمام تر جزئیات سمیت میری گردن میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ خوفناک ٹیپ یہی ثابت کرتی تھی اور میرے لیے فرار کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ کسی بھی وقت اپنی دھمکی پر عمل کر سکتے تھے۔

میری وحشت گونگے کے خواب ایسی ہو کر رہ گئی تھی۔ میری جیب میں اس وقت دس ہزار موجود تھے۔ وہ بھی میری خوش قسمتی تھی کہ ضروری اخراجات کے لیے میں نے پچاس ہزار روپیا الگ رکھ لیے تھے۔ مگر اس میں سے بھی پینتیس ہزار میں نے نجمہ کے پرس میں ڈال دیے تھے۔ تاکہ محفوظ رہے۔ میں اسے اپنی وفادار اور مخلص شریک حیات سمجھے ہوئے تھا۔ وہ پندرہ ہزار روپے بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی، بیس ہزار ہم نے مونی کے لیے ایک الگ بینک میں جمع کروا آئے تھے جہاں سے ہر ماہ اس کے ہاسٹل والوں کو ڈھائی سو روپے ملتے رہتے۔ مختی کے بینک میں البتہ چالیس لاکھ پر دو سال میں جو منافع ملتا تھا وہ ابھی تک وہاں محفوظ تھا۔ میں تو وہ بھی نکلوا لیتا مگر اس کو میں نے عمداً وہاں چھوڑ دیا تاکہ بینک والے یہ نہ سمجھیں کہ میں وہاں سے ہمیشہ کے لیے حساب ختم کر رہا ہوں۔ میں نے انہیں چالیس لاکھ کا ہی چیک لکھ کر دے دیا تھا۔ مختی کے کاغذات سے یہ بات ثابت تھی کہ وہاں چالیس لاکھ کی رقم جمع کروائی گئی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں کیا کروں۔ نجمہ کی نیت صاف ظاہر تھی وہ عمداً کہیں روپوش ہو

گئی تھی اور اپنی گمشدگی کو پولیس پر کسی بھی ذریعے سے ظاہر کر کے وہ مجھے گرفتار کروا سکتی تھی۔ پولیس یہی سمجھے گی کہ میں نے رقم کے راز کو طشت ازبام ہونے کے ڈر سے اسے بھی قتل کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نجمہ مجھے دہرے قتل کے الزام میں پھانسی چڑھوا کر رہے گی۔ مجھ سے جو کام وہ لینا چاہتی تھی، بڑی عیاری سے لے چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ نخلی کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اس کی دولت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اس کا کوئی قانونی جواز پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ مجھے اس حرافہ نے نخلی کے قتل پر آمادہ کر لیا، اس کا طریقہ بھی اس کے پاس موجود تھا۔ اس دھندے کو ابھی میں پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا تھا کہ اس نے مجھ سے شادی کا ڈھونگ رچالیا۔ اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے خدا جانے یہ منصوبہ کب سے سوچ رکھا تھا مگر اسے کوئی میرے ایسا الو کا پٹھا نظر نہیں آیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے منصوبے میں تاخیر ہو گئی مگر جیسے ہی اسے انور ہاشمی جیسا گدھا نظر آیا، اس نے اسے پھانس لیا۔ حد یہ ہے کہ اس کٹنی نے نکاح نامے پر بھی اپنا نام غلط لکھوایا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ انجمن آرا اس کا نام ہرگز نہیں تھا۔ خدا جانے اس نے اپنی ولدیت کے خانے میں بھی کوئی صحیح نام لکھوایا تھا یا وہاں بھی وہ میرے منہ پر تھوک کر چلی گئی تھی۔

غصے اور تلملاہٹ سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میری بے بسی کا یہ عالم تھا کہ میں نجمہ کی گمشدگی کے بارے میں پولیس سے بھی رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ نکاح نامہ بھی وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی اور میرے ماتھے پر نخلی کے خون کا دھبا ایسا نمایاں تھا کہ میں کسی کا سامنا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میں چاروں طرف سے نرغے میں آچکا تھا اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کراچی ایسے بڑے شہر میں انہیں ڈھونڈوں تو کہاں ڈھونڈوں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ نجمہ پہلے سے شادی شدہ تھی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو وہ جمشید اسے کہاں سے اچانک مل گیا۔ ان دونوں نے مل کر میری وساطت سے اپنا راستہ صاف کیا تھا۔ ایسی خوب صورتی اور مہارت سے کہ میں بس ہاتھ ہی ملتا رہ گیا۔

میں نے وہ ٹیپ جیب میں ڈالا اور کمرے کو تالا لگا کر اسی وقت ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ صدر کے لیے جب میں نے ٹیکسی لی تو مجھے یقین تھا کہ میں ہوا کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اس وقت تک تو خدا جانے وہ لوگ کہاں سے کہاں جا پہنچے ہوں گے۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدانخواستہ اگر وہ روپیا میں نے نخلی سے اپنی تحویل میں رکھا ہوتا یا میں نے نخلی کو قتل کرنے اور اس روپے کا وارث بننے کے بعد نجمہ کے مشوروں پر بعینہٖ عمل نہ کیا ہوتا تو وہ تو شاید کسی رات مجھے بھی نیند کی گولی کھلا کر بے ہوشی میں انسولین کا ٹیکہ لگا دیتی۔ یہ بات اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھی۔

میں نے صدر پہنچ کر نفیس شو کمپنی کی دکان ڈھونڈی مگر جب میں نے دکان دار سے پوچھا کہ وہاں کوئی جمشید صاحب بھی آئے تھے تو اس نے حیرت کا اظہار کیا، بولا۔

”اس نام کے تو کسی آدمی کو میں نہیں جانتا ہوں جناب ویسے خیر تو ہے آپ بہت پریشان نظر آتے ہیں؟“

”خیر ہی ہے یار! مجھے جمشید صاحب نے کہا تھا کہ وہ مجھے اس دکان پر مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں اس دکان دار کے کسی اور سوال کا جواب دینے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

اس رات میں نو بجے تک شہر میں پاگلوں کی طرح گھومتا رہا۔ مگر نجمہ کا یا اس کے یار جمشید کا پتا لگا لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ تھک ہار کر میں رات دس بجے ہوٹل میں جا لیٹا۔ وہ ٹیپ میرے سینے پر مونگ دلتی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے جلا دوں مگر نجمہ کے فریب کا وہ منہ بولتا ثبوت تھا جسے میں کھو دینا عقلمندی نہیں سمجھتا تھا۔ یوں تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عقل میرے پاس سے چھو کر بھی نہیں گزری ہے اور میں اعلیٰ درجے کا نسلی گدھا ثابت ہوا ہوں پھر بھی میں نے اپنے طور پر مصلحت اسی میں سمجھی کہ میں اسے ضائع نہ کروں۔

میں چار دن کراچی میں خوار ہوتا پھرا مگر مجھے نجمہ کی صورت کہیں نظر نہیں آئی۔ پولیس نے بھی میرا تعاقب نہیں کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ مجھے اپنے طور پر راستے سے ہٹا کر کسی طرف نکل چکے ہیں مگر کہاں؟ اس سوال کا جواب مجھے نہیں ملتا تھا۔ مگر میں نے قسم کھائی تھی کہ نجمہ کو یوں نہیں نکلنے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔

اگلے روز میں نے اپنی تمام چیزیں سمیٹیں اور ہوٹل کا بھاری بھرکم بل ادا کر کے ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ میری حماقت کی انتہا یہ تھی کہ میں اپنی ملازمت سے بھی استعفیٰ دے چکا تھا۔ پھر بھی میں نے یہی سوچا کہ مجھے لاہور جانا چاہیے۔ وہاں پہنچ کر میں مونی سے شاید نجمہ کے بارے میں کچھ معلوم کر سکوں اگرچہ اس گم صم سی خاموش طبع لڑکی سے کسی بات کا معلوم ہو جانا مجھے محال ہی نظر آتا تھا مگر پھر بھی وہ مجھ سے کہیں زیادہ لمبے عرصے سے اس حرافہ کی زد میں رہی تھی۔ وہ بہت کچھ بتا سکتی تھی۔ یہ ایک موہوم سی امید تھی جس کے سہارے میں اگلے دن لاہور جا پہنچا۔

اب میرا گھر رہا تھا نہ گھاٹ۔ شعیب اور باری کے کوارٹر سے ویسے ہی میں بے دخل ہو گیا تھا اس اکڑفوں میں کہ اب میرا شمار امرا میں ہونے لگا ہے کیونکہ میں نجمہ کی پھوپی کے بھانجے کی خالہ کے لڑکے کی سالی کا حصہ بن چکا تھا مجھے ان دنوں کچھ ایسی ہی چک پھیریوں ایسے رشتے یاد آرہے تھے اور میرے مغز کا چنبر کھل کھل جاتا تھا۔

میں باؤلے کتے ایسی رفتار سے موٹی کے اسکول میں جا گھسا۔ ہیڈ مسٹریس مس ذکیہ نے مجھے بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا۔ اس خوشامدی کو معلوم تھا کہ ہم بڑی رقموں کے مالک ہیں۔ میں اور نجمہ۔ موٹی کو ہم دونوں اکٹھے وہاں لے کر گئے تھے۔ وہ چائے کا پوچھنے لگی مگر میں تو اپنی ہی شکل میں مرا جاتا تھا۔ میں نے کہا وہ مجھے موٹی سے ملوا دے۔ میری یہ بات سنتے ہی وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! موٹی کو تو کل دوپہر اس کی آنٹی ساتھ لے گئی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ لندن جا رہے ہیں۔''

''ساتھ لے گئی مگر کیوں۔ یہ کیا بتا رہی ہیں آپ مجھے؟''

میں نے چیختے ہوئے کہا۔

''آپ تو ناراض ہونے لگے ہیں صاحب! وہ تو آپ کا بھی نام لے رہی تھیں کہ آپ بھی ان کے ساتھ جا رہے ہیں کیونکہ وہاں آپ اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ کہا تھا آپ سے اس نے؟ وہ نجمہ ہی تھی یا اور کوئی عورت تھی؟''

''بالکل وہی خاتون تھیں جو آپ کے ساتھ آئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بینک سے اپنا ''بیس ہزار بھی لے گئی ہوں گے وہی کہہ رہی تھیں۔ انہی کے دستخطوں سے ہی وہاں ایڈوانس دی گئی تھی۔ حساب انہی کے نام سے کھلا تھا۔''

''کیا وہ تنہا آئی تھیں؟''

''جی نہیں، ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے، ایم جے رانا۔ لمبے سے قد کے گورے چٹے خوب صورت آدمی ہیں وہ... اور موٹی بھی ان سے بہت مانوس معلوم ہوتی تھی۔ نجمہ انہیں رانا صاحب رانا صاحب کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔''

میرا رنگ شاید ہلدی ہوا جاتا تھا۔ میری آنکھوں کی پتلیاں اس انکشاف پر کچھ زیادہ ہی پھیلنے لگیں۔ اب مجھے یاد آرہا تھا کہ نجمہ نے موٹی کی ولدیت کے خانے میں ایم جے رانا ہی لکھوایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہی شخص محمد جمشید تھا اور بریف کیس میں سے مجھے جو خط ملا تھا، وہ اسی کا لکھا ہوا تھا۔

''آپ تو بہت زیادہ پریشان ہو گئے ہیں ہاشمی صاحب! آخر بات کیا ہے مجھے بھی تو بتائیں کچھ؟''

''کچھ نہیں مس ذکیہ! میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ سب کچھ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔''

''نجمہ تو آپ کی بیوی ہیں۔ انہوں نے یہ سب کچھ آپ کو بتائے بغیر کیوں کیا ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں... نجمہ پچھلے تین دن سے گھر پر نہیں ہے۔ وہ مجھے یہ کہہ کر گئی تھی کہ میں کراچی جا رہی ہوں۔ اس کی والدہ وہاں رہتی ہیں مگر وہ لاہور واپس آئی ہے تو گھر کیوں نہیں پہنچی، اچھا مجھے اجازت دیں میں دیکھتا ہوں شاید وہ گھر آ چکی ہو۔''

''یہ تو واقعی بڑی حیران کن بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ گھر پہنچ چکی ہوں گی۔ ویسے وہ بہت جلدی میں تھیں اور بینک سے ہو کر آئی تھیں۔''

''آپ کی مہربانی مس ذکیہ! ضرورت ہوئی تو میں پھر آپ سے ملوں گا۔ اس آدمی کا حلیہ آپ ذہن میں محفوظ رکھیں شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔'' یہ کہہ کر میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے باہر نکل آیا۔

میرے ذہن میں عجیب سی سرخ رنگ آندھی چلنے لگی تھی۔ میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا گیا تھا۔ ایک معصوم بے گناہ اور یک و تنہا لاوارث عورت کو میرے ہاتھوں سے مروا دینے کے بعد اس کی ساری دولت سمیٹ کر وہ شیش ناگ کی مادہ اپنی جون بدل کر نئے قالب میں ڈھل گئی اور میری نظروں سے دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو گئی۔ میرے وجود پر عجیب سی بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ مس ذکیہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں بہت افراتفری میں تھے اور یہاں سے جلدی فارغ ہو جانا چاہتے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لندن جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ کیا وہ واقعی لندن جا رہے تھے یا نجمہ نے ہیڈ مسٹریس کو غلط تاثر دیا تھا۔ چند لمحوں میں اسکول کی شاندار عمارت کے باہر کھلے لان میں کھڑا سوچتا رہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔

ٹیکسی مجھے جلد ہی مل گئی اور میں اس میں بیٹھ کر سیدھا ائرپورٹ جا پہنچا۔ میرا تمام سامان ریلوے اسٹیشن کے کلوک روم میں دھرا تھا اور میرے ہاتھ میں صرف وہ بریف

کیس تھا جو نجمہ میرے لیے جمشید کے خط کے ساتھ چھوڑ گئی تھی وہ بڑا خوب صورت بریف کیس تھا اور میری ذاتی ضرورت کی کئی اور چیزیں بھی اس میں سما گئی تھیں۔ اس کے دستے کے نیچے لگی شیشے کی ایک چھوٹی سی سلائڈ پر بڑے خوب صورت حرفوں میں ایم جے رانا لکھا ہوا تھا۔ وہ لفظ ٹائپ کر کے شیشے کی جھری میں سے اندر گزار دیے گئے تھے۔ اور میرے کوٹ کی جیب میں اس وقت ایک تیز دھار نکیلی چھری تھی جو میں کراچی کے ہوٹل سے اٹھا لایا تھا۔

میرے سر پر اس روز ایک اور خون سوار تھا۔ مجھے وہ ہستی لے ڈوبی جس پر میں نے زندگی میں سب سے زیادہ اعتبار کیا تھا۔ ایک خون میری گردن پر چڑھ چکا تھا اور اب میں دو آدمیوں کی تلاش میں تھا جن سے مجھے نخلی کا بھی انتقام لینا تھا اور اپنا بھی۔ میں اس امید پر ہوائی اڈے کی طرف جا رہا تھا کہ اگر ان کی بات سچ تھی تو مجھے وہاں سے یہ تو معلوم ہو سکتا تھا کہ لندن کی طرف پرواز کر گئے ہیں کہ نہیں۔

ہوائی اڈے پر پہنچ کر میں بھاگتا ہوا متعلقہ شعبے میں جا پہنچا۔ وہاں مجھے اپنا ایک پرانا آشنا مل گیا۔ اس کا نام علی ناصر تھا۔ اس کا حساب میں نے ہی اپنے بینک میں کھلوایا تھا اور وہ ایسا جز رس آدمی تھا کہ ہر ماہ اپنی تنخواہ کا تین چوتھائی حصہ بینک میں جمع کروا دیتا تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"کیسے آئے ہیں ہاشمی صاحب! باہر سفر کریں گے؟"

"نہیں ناصر صاحب دراصل مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ کل یا آج کی کسی پرواز سے ایم جے رانا نام کے کوئی صاحب یہاں سے کراچی یا لندن کی طرف تو نہیں گئے۔ ان کے ساتھ ایک خاتون نجمہ بھی ہیں۔"

"کوئی خاص بات ہے ان لوگوں میں، آپ کچھ گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں؟"

"بس اچھا بھلا ہوں یار! جلدی میں بھاگتا آیا ہوں نا اس لیے ذرا اکھڑا نظر آتا ہوں۔"

"آپ تشریف رکھیں میں ابھی کاغذات دیکھ کر بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا اور ریکارڈ دیکھنے لگا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ کاؤنٹر پر آ ٹھہرا اور بولا۔ "کل شام کی فلائٹ کے لیے ایم جے رانا اور ان کی بیگم نے کراچی کے راستے لندن کا ٹکٹ لیا ہے......" اس کا ریزہ ریزہ ہوتا وجود پھر سے مضبوط ہونے لگا۔

"کل شام! کوئی پتا بھی لکھوایا ہوگا ان لوگوں نے؟"

"وہ کاغان ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، فون نمبر بھی لکھوا گئے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ان کا فون نمبر کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر دے دیا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ ناصر بھائی! مجھے ان لوگوں سے ایک بہت ضروری کام تھا مگر وہ مجھے مل ہی نہیں رہے تھے۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی اور بھی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔" اس نے بڑے ہی دلنواز لہجے میں کہا۔ بے چارہ میری بہت ہی عزت کرتا تھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر میں الٹے قدموں ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ میرے وجود میں اب غیظ و غضب کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ میری چھری ان کے خون میں غسل کے لیے تڑپ رہی تھی۔ مجھ سے بدترین قسم کی غداری کی گئی تھی۔ میرے ہاتھ سے وہ سب کچھ نکلتا جا رہا تھا جس کے حصول کے لیے میں نے نخلی ایسی قابلِ رحم اور قابلِ صد احترام ہستی کو بے موت مار دیا تھا۔ اس کی وہ آخری وقت کی باتیں جو نیند میں کھو جانے سے پہلے اس نے مجھ سے کی تھیں، میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ بڑے ارمان تھے اس کے دل میں۔ وہ میرے ساتھ یورپ کی سیر کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ اس کا پیرس میں جا کر ماہِ عسل منانے کو دل چاہتا تھا۔ مگر... مگر جس گھڑی وہ سہانے خواب دیکھ رہی تھی میرا برا ہو میں اس گھڑی اس کو موت کی ہچکی میں مبتلا کر دینے کی سوچ رہا تھا میں تو اس وقت بلاشبہ اسفل السافلین کے درجے سے بھی نیچے گر چکا تھا۔ نخلی ایسی بدنصیب دلہن تھی کہ شبِ عروسی ہی اس کی شبِ آخر ثابت ہوئی۔ اس کی ساری آرزوئیں دل کی دل میں ہی رہ گئیں۔ محض اس لیے کہ خدا نے اسے ایک شفیق اور مہربان باپ کی وساطت سے چالیس لاکھ روپے عطا کیے تھے مگر اس کی اپنی ہی پروردہ کنیز اسے چاٹ گئی۔ ناگن بن کر ڈس گئی۔ اس کی چالاکی کا شکار نخلی ہی نہ ہوئی تھی میں بھی مارا گیا تھا اور اب مجھے ان سے نمٹنا تھا۔ ہر حال میں نمٹنا تھا۔

بینک پولیس اور کسٹم کی نوکری میں یہ فائدہ ہے آدمی کو ہر قسم کے برے بھلے آدمی سے ملنے اور راہ و رسم بڑھانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ آدمی کا بے بسی کے سبب تلے کا سانس تلے ہی نہیں رہتا۔ اوپر بھی آ جاتا ہے میں کاغان ہوٹل جانے کے بجائے سیدھا وسن پورہ جا پہنچا، ان دنوں کچھ کابلی پٹھان وہاں رہتے تھے جو میرے جاننے والے تھے۔ بڑے زبردست قسم کے سود خور تھے وہ اور اسامیوں سے ہر قسم کی دھونس دھاندلی سے سود وصول کر لیتے تھے۔ اس مقصد کے

لیے انہوں نے خفیہ طور پر ہر قسم کے ہتھیار گھر میں چھپا رکھے تھے کہ کہیں کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو وہ اس سے نمٹ سکیں اگرچہ وہ آتشیں اسلحہ بھی نہیں چلاتے تھے مگر اس کے دم سے ان کا رعب قائم تھا اور اب اسامیاں جانتی تھیں کہ وہ گولی مار کر بندے کا منہ بھی توڑ دیتے ہیں۔

اور اس بجھ بجھ ڑخل سے معاملہ کرنے کے لیے مجھے کسی ایسے ہی ہتھیار کی ضرورت تھی جو میرے ہاتھ میں رہ کر اسے مار تو سکے مگر اس پر خون کے کوئی چھینٹا مجھ پر نہ پڑے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں وسن پورہ پہنچ کر جب اس بڑی سی بوسیدہ حویلی کے سامنے پہنچا تو ایک راہ گیر سے پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ پولیس نے ان لوگوں کو وہاں سے زبردستی نکال دیا ہے اور گرفتاری کے ڈر سے ان میں سے بہت سے آدمی بھاگ کر کابل جا چکے ہیں۔ وہ آدمی بہت خوش تھا۔ وہ موٹی سی گالی انہیں دیتے ہوئے بولا۔

''سو روپیا دے کر پانچ سو کا اسٹامپ لکھواتے تھے اور پھر چل سو چل۔ بندہ کمائے اور کابلی کھائے۔''

''اچھا ہوا یار! ان خنزیروں سے جان چھوٹی۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے لوٹ آیا۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ دن لمبے ہو چکے تھے اور موسم میں وہ پہلے ایسی خنکی باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ مجھے اپنا لائحہ عمل بہت سوچ سمجھ کر تیار کرنا چاہیے تھا۔ میں ان دونوں کو تیتر کے بچوں تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ ان کو نیست و نابود کر دینے سے کم پر میری تسلی نہ ہو سکتی تھی اور ابھی وہ میری زد میں تھے۔

میں کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک ہوٹل میں بیٹھا سوچتا رہا۔ مگر کوئی صاف سیدھی بے عیب تدبیر میری سمجھ میں نہ آسکی۔ آدمی کی بے بسی بھی دیدنی ہے۔ کبھی وہ اپنے حوصلے کے پروں سے فضاؤں پر چھا جاتا ہے اور کبھی وہی پر اسے اپنی گرفت میں لے کر اسے یوں دبا لیتے ہیں کہ اس کا اپنا نکلا اس کے کلیجے میں اتر جاتا ہے۔ میرا بھی اس گھڑی یہی حال تھا جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے کاغان ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا اور سامنے دلی دروازے کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ اپنے عارضی قیام کے لیے انہوں نے ایسا ہی ہوٹل منتخب کیا تھا جو غیر معروف ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی جگہ ہو جہاں انسانوں کی بھیڑ ان کی ڈھال بن سکے۔ ان کی منصوبہ بندی بڑی ہی بے عیب تھی۔ اتنی مضبوط اور بے عیب کہ مجھے اس میں سے سوئی گزارنی بھی مشکل نظر آتی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ ایم جے رانا تو میرا صورت آشنا نہیں ہے اسے میں اگر بے خبری میں جا پکڑوں تو اس پر قابو پا لینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ میں بھی تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے ہوٹل سے اٹھ کر ایک دکان سے آدھ گز لمبی مضبوط سوتلی کی رسی خریدی اور اسے جیب میں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر پرانے کوٹوں کی ایک دکان تھی۔ وہاں سے میں نے ایک لمبا سا اوورکوٹ خریدا اور ایک ہیٹ بھی سر پر رکھ لیا، میری مونچھیں میری شناخت کا بہت بڑا سبب تھیں۔ وہ بھی میں نے ایک حجام کے استرے کی نذر کر دیں۔ میرا حلیہ اس عمل سے گزرنے کے بعد اتنا ضرور بدل چکا تھا کہ پہلی نظر میں مجھے کوئی نہ پہچان سکتا تھا۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں لنڈے بازار کی بھیڑ سے گزرتا ہوا ایک ایسی دکان میں جا گھسا جس کے اندر ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ دکان دار بھلا آدمی تھا اس نے معمولی شرح پر مجھے فون کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ اس ٹیلی فون کو بھی کمائی کا ذریعہ بنا چکا تھا۔ کاغان ہوٹل کے استقبالیہ سے میرا رابطہ قائم ہوا تو میں نے پوچھا۔

''جناب یہاں ایک صاحب ایم جے رانا ٹھہرے ہوئے ہیں وہ کس کمرے میں ہیں؟''

''صاحب وہ دوسری منزل کے پانچ نمبر کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ مگر وہ ابھی اپنی بچی کے ساتھ باہر گئے ہیں کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔''

''کہاں گئے ہیں وہ؟''

''وہ میرا خیال ہے انارکلی گئے ہیں کہہ رہے تھے کچھ شاپنگ کروں گا۔ بچی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اسے وہ ڈاکٹر کو دکھانا چاہتے تھے۔''

''ان کی بچی بیمار ہے؟''

''ہاں، اسے بہت تیز بخار ہے۔ رانا صاحب بہت پریشان تھے اس کی وجہ سے، آپ کون صاحب ہیں؟''

''میرا نام واجد ہے واجد علی۔ میں ائرپورٹ سے بول رہا ہوں خیر میں نو بجے ان سے بات کرلوں گا۔ وہ لندن جا رہے ہیں نا۔ ایک پیغام دینا ہے مجھے لندن میں اپنے بھائی کے نام۔ ان کے کمرے میں فون نہیں ہے؟''

''جی نہیں! بس یہی کمی ہے ہمارے ہوٹل میں۔ آپ بہرحال نو بجے کے قریب ان سے بات کرلیں۔'' استقبالیہ کے خوش خلق کلرک نے بڑے ہی مہذب لہجے میں کہا۔ میں

نے فون بند کر دیا۔

مجھے راستہ مل رہا تھا۔ نجمہ اس گھڑی اپنے کمرے میں تنہا تھی اور میں اس سے رسائن چھین سکتا تھا۔ وہ رسائن کو مخفی کے خون میں حد سے زیادہ انسولین گھول دینے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کے لیے امرت بن گئی تھی۔ حالانکہ اس پر سب سے فائق حق میرا تھا۔

میں نے اپنے فلیٹ ہیٹ کو آنکھوں پر جھکایا اور کاغان ہوٹل میں جا گھسا۔ اس کی عمارت نئی تھی اور پرانی گنجان آبادی میں ہونے کے باوجود اس کو بڑے سلیقے سے تعمیر کیا گیا تھا۔

کسی سے کچھ کہے سنے بغیر میں استقبالیہ سے صرفِ نظر کرتا ہوا بڑے پُراعتماد قدم اٹھاتا ہال سے گزرا اور عقبی دیوار کے ساتھ بنے زینے پر پاؤں دھرتا ہوا دوسری منزل پر جا پہنچا۔ ایک چھ فٹ چوڑی راہداری کے دونوں طرف یہاں سے وہاں تک کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے پر اس کا نمبر لکھا تھا۔ پانچ نمبر کمرے کے سامنے پہنچ کر میں رک گیا۔ راہداری میں اس وقت کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ نجمہ کمرے میں موجود تھی، بولی۔

''کون؟'' اس کی آواز میں عجیب سا لوچ پیدا ہو چکا تھا۔ لفظ کون کو اس نے کچھ اس طرح گھما کر کہا کہ میرے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگی۔ وہ آواز میرے کانوں میں کئی راتیں رس ٹپکاتی رہی تھی۔ مگر... مگر... اب سب کچھ الٹ چکا تھا۔

''آپ کا میسج ہے بیگم صاحب۔'' میں نے اپنی آواز کو مکمل طور پر بدلتے ہوئے کہا۔

مجھے دروازے کی چٹخنی گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی تختہ ذرا سا کھلا تو میں اس کے پیچھے کھڑی نجمہ کو تختے کے ساتھ دھکیلتا ہوا اندر جا گھسا۔ وہ تیز دھار چمکتی ہوئی خون خوار چھری میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے جاتے ہی نجمہ کو بائیں ہاتھ کے حلقے میں لے کر اس کا منہ ہتھیلی سے بند کر دیا اور اپنی دونوں ٹانگوں میں اس کی ٹانگیں دبا کر دروازے پر دائیں ہاتھ سے چٹخنی چڑھا دی۔ اور اسے دھکیلتا ہوا میں سیدھا غسل خانے میں جا گھسا تاکہ وہ اگر چیخنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی آواز راہداری میں کوئی نہ سن سکے۔

غسل خانے کو اندر سے بند کر کے میں نے چھری اس کی شہ رگ پر رکھ کر اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس کا رنگ جلدی ہو چکا تھا اور بدن لرزنے لگا تھا۔ وہ اس جھٹکے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ اور اسے احساس ہو چکا تھا کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔

''کیا حال ہے تمہارے مسز ایم جے رانا... بہت تیزی دکھائی تم نے۔'' میں نے اس کی شہ رگ پر بائیں ہاتھ کا انگوٹھا ذرا سا دباتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے دور رہو، مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔'' وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ اس کی آنکھوں کی ازلی ابدی سرد مہری میں اب اس کی نفرت بھی گھل گئی تھی۔

''اتنی جلدی مجھ سے تمہارا دل بھر گیا۔ یہ رانا صاحب کون ہیں۔''

''وہ میرا شوہر ہے۔''

''گڈ! اور وہ میمونہ۔''

''وہ مخفی کی بیٹی ہے۔ اس کے ایک گناہ کا پھل۔ مونی کا باپ کوٹھی کے ملازم علی جو کا بھائی تھا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی مخفی کے باپ کے ڈر سے۔''

''اتنی بڑی بیٹی! مجھے یقین نہیں آتا۔''

''مخفی کی عمر انتیس سال تھی اور میمونہ دس سال کی ہو چکی ہے۔''

''اسے تم کیوں ساتھ لے جا رہی ہو؟''

''میں اسے بے آسرا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔''

''تمہارا شوہر اتنا عرصہ کہاں رہا؟''

''وہ لندن چلا گیا تھا۔ میں نے اس سے ماں کی اجازت کے بغیر شادی کر لی تھی۔''

''تمہارا کوئی بچہ نہیں ہوا؟''

''نہیں، میں نے اس مونی کو ہی اپنی بچی ظاہر کر دیا تھا۔ تاکہ یہ گھرانہ بدنامی سے بچ جائے۔''

''وہ مخفی تو کہتی تھی کہ یہ مونی اس کی مرحومہ پھوپی زاد بہن کی بیٹی ہے؟''

''وہ بات غلط تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی خود کو آپ کے سامنے اس بچی کی ماں ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

''کیوں؟ مجھ سے کیوں چھپائی یہ بات تم دونوں نے؟'' میں نے پوچھا۔

''مخفی اپنی جگہ آپ کو پسند کرنے لگی تھی اور میرے پیش نظر ایک اور مقصد تھا۔''

''یہ جشید رانا صاحب اتنی دیر بعد لوٹے ہیں؟''

''ہاں اسے وہاں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ پچھلے دو سال سے لاہور میں رو رہا تھا۔''

"اور اپنے ماہانہ پانچ سو روپے سے تم ہر ماہ اس کی مدد کرتی تھیں؟"

"ہاں، اسے کوئی ڈھنگ کا روزگار نہیں مل سکا تھا۔"

"وہ تعلیم یافتہ ہے؟"

"ہاں، وہ ایف اے تک پڑھا ہے۔"

"اور تم اس سے اتنی محبت کرتی ہو کہ تم نے اپنی اتنی بڑی محسنہ کو میرے ہاتھوں مروا دیا؟"

"یہ اسی کا منصوبہ تھا۔ میرے شوہر جمشید کا۔"

"جس میں میرے ساتھ نکاح کا پروگرام بھی شامل تھا؟"

"وہ میری مجبوری تھی۔ اس کی بھی اس نے ہی مجھے اجازت دی تھی۔"

"تاکہ تم مجھ سے یہ کام آسانی سے لے سکو۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"اب کیا خیال ہے؟" میں نے اپنا انگوٹھا کچھ اور زیادہ سختی سے اس کی شہ رگ میں دھنسایا۔ میری چھری کی نوک اس کے سینے کی جلد میں اتنی گہری دھنسی ہوئی تھی کہ میں ذرا سا بوجھ ڈالتا تو وہ آگے چلی جاتی۔ نجمہ کی آواز بالکل سپاٹ ہو گئی تھی۔ وہ بے پناہ دہشت کے زیرِ اثر بے ارادہ میرے سوالوں کا جواب دیتی چلی جا رہی تھی۔

"وہ رقم کہاں ہے؟" میں نے اس کا گلا ذرا اور سختی سے دباتے ہوئے کہا۔

"وہ جمشید نے برٹش بینک میں جمع کروا دی ہے۔"

"اس کا مالک میں ہوں۔ مجھے وہ رقم دے دو۔ میں اتنی آسانی سے تمہیں یہاں سے نکلنے نہیں دوں گا۔" میری یہ بات سن کر اچانک اس نے پوری قوت سے میرے جسم کے نازک اعضا پر کچھ اتنی قوت سے گھٹنے کی ضرب لگائی کہ میں درد کی شدت سے سن ہو کر رہ گیا۔ مگر اس کے ذرا سا آگے جھکنے کا بڑا ہی خوفناک نتیجہ نکلا، تھا اور وہ یہ میری چھری بے ارادہ اس کے سینے میں دستے تک دھنس گئی اس میں میرے ارادے کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ مجھے آج تک اس بات کا افسوس ہے بے حد افسوس۔ وہ یوں اس کے دل میں اتر گئی جیسے چاقو تربوز میں دھنس جاتا ہے۔ کچھ میرا ہاتھ بہت مضبوطی سے اس چھری کے دستے پر جما تھا۔ کچھ وہ اتنی تیز اور نکیلی تھی کہ مجھے احساس اس وقت ہی ہوا جب وہ نجمہ کے دل میں اتری اور ایک دلدوز چیخ بن کر بند غسل خانے میں پھیل گئی۔ میں نے اپنے درد کی ٹیس کو بھول کر وہ چھری فوراً ہی باہر کھینچی مگر وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ نجمہ میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ یوں کہ اس کے دونوں ہاتھ پہلے فرش پر لگے پھر اس کے زانو اور اس کے بعد اس کا سر سامنے کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اور وہ الٹ کر آڑھی ترچھی صورت میں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ میرا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔

میں نے فوراً ہی نل کھول کر ہاتھ اور چھری کو صاف کیا اور پھر بتی جلا کر اپنے اوورکوٹ کو اچھی طرح دیکھا۔ وہاں کوئی چھینٹا نہیں پڑا تھا۔ نجمہ کو وہیں چھوڑ کر میں نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر باہر سے بند کیا اور کمرے میں آ گیا۔ سامنے بڑے سے نئی طرز کے سوٹ کیس پڑے تھے اور وہ مقفل تھے۔ میں نے چابیوں کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارا تو ایک گچھا مجھے نجمہ کے تکیے کے نیچے سے مل گیا۔ پہلی ہی چابی کام کر گئی ایک سوٹ کیس میں مردانہ کپڑے بھرے تھے۔ اور اس کے کیسے میں تین پاسپورٹ ایک موتی کا ایک نجمہ کا اور ایک اس آدمی کا تھا جسے محمد جمشید رانا کہتے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑا وجیہہ و شکیل جوان تھا اور چہرے مہرے سے بالکل انگریز دکھائی دیتا تھا۔ میں نے سوٹ کیس کو اچھی طرح کھنگال لیا۔ اس میں سے مجھے رقم نام کی کوئی شے نہ ملی۔ میں نے دوسرا سوٹ کیس کھول دیا۔ نجمہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہاں بینک کے کچھ ایسے کاغذات تھے جن سے اس کی بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ ان لوگوں نے بیس لاکھ کی رقم ایک بینک میں جمع کروا دی تھی اور وہ ایسا بینک تھا جس کے ذریعے وہ بڑی آسانی سے کسی بھی وقت اس رقم کو لندن منتقل کروا سکتے تھے۔ باقی رقم ایم جے رانا نے ایک پاکستانی بینک میں اے بی رانا کے نام سے جمع کروا دی تھی۔

میری ساری محنت دھری رہ گئی تھی۔ وہ منحوس رقم دو جانوں کی بھینٹ لے چکی تھی۔ ایک کے خون کی ٹکیا اندر غسل خانے میں لگی تھی اور دوسری منوں مٹی تلے جا دبی تھی۔ بینک کے وہ سارے کاغذات اپنی جیب میں دھرا ٹیپ اور پاسپورٹ میں نے یکجا کر کے آتشدان میں ڈال دیے۔ وہ جل کر راکھ ہو گئے تو میں بتی بجھا کر راہداری میں کھلنے والے دروازے کے ایک طرف دیوار کے ساتھ کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ چٹخنی میں نے نیچے گرا دی تھی اب مجھے ایم جے رانا کا انتظار تھا۔ اس شکرے کا جس نے میرا شکار نیچے آنے سے پہلے ہی فضا میں دبوچ لیا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے ابھی بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ کسی نے بڑی تیزی سے دروازہ کھٹکھٹایا اور اس کے ساتھ ہی تختے کو دھکیل دیا۔ دروازہ کھٹ سے کھلا اور راہداری میں جلتے بلبوں کی تیز روشنی کے ساتھ ہی

ہوٹل کا بیرا اندر آ گیا۔ کمرے کا بلب بجھا ہوا تھا مگر راہداری کی روشنی میں، میں نہا سا گیا۔ میں نے تیزی سے سیدھے ہاتھ میں پکڑی چھری کمر کے پیچھے چھپالی۔ مگر اس کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ وہ دہشت زدہ سا ہو کر پیچھے ہٹا تو میں نے جھپٹ کر اسے بالوں سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ مگر میرا وہ اسے کھینچنا ہی غضب ہو گیا اس نے اتنے دردناک انداز میں چیخ ماری کہ ساری راہداری ہل کر رہ گئی۔ اس وقت دوسرے بیرے بھی وہاں کھانا پہنچاتے پھر رہے تھے۔ ان کی تعداد تین تھی وہ سب بھاگ کر وہاں آ پہنچے اتنی تیزی سے کہ میں نہ دروازہ بند کر سکا نہ اس بیرے کو چھوڑ سکا تھا۔ وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیختا تھا۔ میں نے بیرے کے بال چھوڑے اور ان تینوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا راہداری کی طرف دوڑا مگر میرے قدم شاید بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ اچانک میرے بوٹ کا تسمہ کھل گیا اور جیسے ہی دوسرا پاؤں اس تسمے پر پڑا میں پہلا پاؤں اٹھا نہ سکا۔ میری رفتار کچھ مدھم ہو گئی تھی اور وہ تینوں بیرے چیختے ہوئے میرے پیچھے لپکے چلے آ رہے تھے۔ بارھویں قدم پر ان لوگوں نے مجھے آ دبوچا۔ یوں کہ میرے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھری سے خود کو بچاتے ہوئے ان میں سے ایک نے میرا دایاں بازو مضبوطی سے پکڑ کر میری گردن دوسرے بازو کے حلقے میں دبا لیا۔ اس کے بعد مجھے بے بس کر لینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ میرے گرد دیکھتے ہی دیکھتے مجمع لگ گیا۔ وہ چالیس لاکھ کی رقم میری بھی بھینٹ طلب کر رہی تھی۔

اور پھر فوراً ہی انہوں نے نجمہ کی لاش بھی غسل خانے میں دیکھ لی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد مجھے ان لوگوں نے پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ لوگ مجھے اسی وقت تھانے نہیں لے گئے۔ وہ نجمہ کے شوہر ایم جے رانا کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جب بچی کو ساتھ لے کر سامان سے لدا پھندا ہوٹل میں داخل ہوا تو اپنی بیوی کے قتل کی خبر اسے مفلوج کر گئی۔ اس کا سارا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا اور پھر قانون کی چھریاں میرے لہو میں نہانے لگیں۔ مجھے بڑے ہی کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑا مگر میں نے کہہ دیا کہ میں نے نجمہ کو جوشِ رقابت میں اندھا ہو کر قتل کر دیا۔ میری عافیت اسی میں تھی۔ انسانی ذہن کی عیاری پر تو شاید کبھی کبھی وہ خود بھی حیران رہ جاتا ہوگا۔ مخفی سے میری شادی کی بات تو سب پر عیاں تھی مگر میں نے عدالت میں یہ موقف اختیار کیا کہ انہی دنوں میں نے خفیہ طور پر نجمہ سے بھی شادی کر لی تھی اور اس کا ثبوت شاہدرہ کے امام مسجد مولوی عبدالغفور سے مل سکتا ہے۔ جب مخفی اسپتال میں آپریشن کے دوران مر گئی اور اس کی تمام جائداد کا میں وارث بن گیا تو نجمہ نے نہایت ہی عیاری سے وہ تمام روپیا مجھ سے ہتھیایا اور پھر چپکے سے وہ اپنے سابقہ شوہر محمد جمشید رانا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اس صورتِ حال نے مجھے پاگل کر دیا اور میں نے کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اس رات جب نجمہ کو ڈھونڈ لیا تو میں انتقام اور غیرت کی آگ میں اس طرح جل رہا تھا کہ میں نے اسے قتل کر دیا۔ کیونکہ اس نے مجھے تباہ کر دیا تھا۔ محمد جمشید رانا نے میرے اس بیان کی تمام باتوں سے لاعلمی کا اظہار کیا اس نے کہا کہ اسے نہ تو کسی رقم کا علم ہے اور نہ ہی اس بات کی خبر ہے کہ نجمہ نے کسی اور سے بھی شادی کر لی ہے۔ اس کے بیان پر میں نے کوئی تنقید نہیں کی۔ جمشید نے مجھے کسی ذریعے سے کہلوا دیا تھا کہ میں اس کے بیان پر کوئی حرف گیری نہ کروں ورنہ عدالت کے سامنے وہ اس ٹیپ کو بھی پیش کر دوں گا جس کی نقل ابھی تک اس کے پاس محفوظ تھی۔ وہ بڑی ہی خوفناک دھمکی تھی۔ جس نے میری زبان بند کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ رقم جمشید ہی کے قبضے میں رہی۔ اس نے کہہ دیا کہ نجمہ نے اسے کسی ایسی رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے ٹیپ اور جمشید کے بینک کے کاغذات اس کے پاسپورٹ سمیت اسی شام جلا دیے تھے ورنہ جمشید کی گردن اگر شکنجے میں پھنستی تو وہ مجھ پر مخفی کا قتل بھی بڑی آسانی سے ثابت کر سکتا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت نے مجھے بحالتِ اشتعال قتل کا مرتکب قرار دے کر دس سال قید بامشقت کی سزا دے دی اور جمشید اس سارے فساد سے محفوظ رہ کر چھپن ۔۔ لاکھ کی خطیر رقم سمیٹ کر لندن جا پہنچا۔ مونی کو میں نے سنا ہے وہ لاہور کے ایک یتیم خانے میں داخل کروا گیا تھا۔ میں نے اپنی یہ کہانی آپ کو سنا تو دی ہے مگر یاد رکھیں اس میں بھی میں نے اپنے قانونی تحفظ کا خیال رکھا ہے۔ شہروں اور کرداروں کے نام میں نے مکمل طور پر بدل دیے ہیں کیونکہ میری عافیت اسی میں مضمر ہے۔ البتہ دل کا حال آپ سے کہہ کر میں آج بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ غصہ مجھے یہی ہے کہ میں خوانخواہ ہی کٹھن کٹھن گوپال بن کر رہ گیا۔ مگر کوئی بات نہیں لندن کون سا زیادہ دور ہے۔ میری رہائی کے دن بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔ اس ایم جے رانا سے تو میں بہرحال نمٹ ہی لوں گا۔ اسے میں معاف کر ہی نہیں سکتا۔ وہ ہر حال میں واجب القتل ہے وہ دیوزاد۔

# خمیازہ

سلیم انور

زندگی کی کچھ سچائیاں اس قدر تلخ ہوتی ہیں کہ ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا... وہ تُندخو اور غصیلے مزاج کا مالک تھا... حالات کی سرکشی نے اسے زندگی کی رعنائیوں سے دور دھکیل دیا تھا... اور اسی سرکشی نے اسے ایک اور سرکشی پر اکسا ڈالا...

**ایک بوڑھے شخص کا انتقامی جذبہ... مغرب پرستوں کی تندی و تیزی کا ایک اور شاخسانہ...**

جوناتھن حسبِ معمول غصے میں بھرا ہوا تھا۔

اپنے اپارٹمنٹ سے اپنی زنگ آلودہ کھٹارا کار کی جانب جاتے ہوئے وہ اپنے بلاک کی درمیانی سڑک عبور کر رہا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے اس نے سامنے کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ بس سیدھا چلتا چلا جا رہا تھا کیونکہ وہ طیش میں تھا اور اس کا خیال تھا کہ لوگوں کو خود اس کا خیال رکھنا چاہیے اور اگر سڑک عبور کرتے ہوئے کسی گاڑی نے اسے ٹکر مار دی تو وہ گاڑی والے پر مقدمہ دائر کر کے اس سے بھاری رقم وصول کر لے گا۔ جیسے کہ اس کا حق بنے گا۔

اسے اس دنیا پر غصہ آ رہا تھا جس نے اسے خستہ حال اپارٹمنٹ میں پھینکا ہوا تھا اور اس کے پاس ایک کھٹارا زنگ آلودہ کار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے یہ حقیقت کبھی تسلیم نہیں کی تھی کہ وہ جس ماحول میں بس رہا تھا وہ اس کا خود اپنا ہی تخلیق کردہ تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اسکول جانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ منشیات کا عادی تھا اسی لیے کہیں بھی جم کر ملازمت نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ

دنیا والے اس کے ساتھ کبھی بھی اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔

انہی خیالوں میں گم وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک کار والے نے اسے بیچ سڑک میں دیکھ کر اپنی رفتار کم کر دی۔ جوناتھن نے اخلاقاً بھی کار کے ڈرائیور کی طرف دیکھنا یا اس کا شکریہ ادا کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ بس ایک اچٹتی نگاہ پلٹ کر ڈالی تو دیکھا کہ کار رک چکی تھی۔

''اس کار والے کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟'' جوناتھن اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا۔

جوناتھن بھی رک گیا۔ اس کی کار کی چابیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ کار کے ڈرائیور کو گھورنے لگا۔ ڈرائیور کی نظریں بھی جوناتھن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

جوناتھن نے دل ہی دل میں اس ڈرائیور کو ایک گندی سی گالی دی اور پلٹ کر اپنی کار کی جانب چل دیا۔

جب وہ اپنی کار کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ وہ کار بھی اس کے پیچھے اس کی کار کے مقابل آ کر رک گئی تھی۔

اس کار کا اندرونی حصہ روشن نہیں تھا اس لیے ڈرائیور ایک سائے کے مانند نظر آ رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' جوناتھن نے پوچھا۔

کار سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''تمہاری......'' جوناتھن نے ایک گالی دی۔

اب بھی کار کے ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جوناتھن کو طیش آ گیا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر گھونسا تانے اس کار کی جانب لپکا تاکہ اس ڈرائیور کا بھرکس نکال دے۔ جونہی وہ اس کار کے نزدیک پہنچا تو ڈرائیور سائڈ کے دروازے کا شیشہ نیچے کھسک گیا۔ ڈرائیور کی نشست پر گول چہرے اور چھدرے سفید بالوں والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوئٹر پہنا ہوا تھا اور اس کی گردن میں چاندی کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی صلیب لٹک رہی تھی۔

''تم بڈھے، گونگے پدوڑے۔'' جوناتھن پھٹ پڑا۔ ''تم مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہو؟''

لیکن اس شخص نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ پرسکون بیٹھا ہوا تھا اور اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

جوناتھن نے مزید برا بھلا کہنے کے ارادے سے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کی نگاہ ایک بندوق پر پڑی جس کی نال کار کی کھڑکی کے فریم پر ٹکی ہوئی تھی اور اس کا رخ عین جوناتھن کے پیٹ کی جانب تھا۔

جوناتھن قدرے ہچکچایا، پھر اس شخص کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہو، اولڈ مین؟''

''ہاں۔''

اس بوڑھے نے 'ہاں' کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں کہا۔ اس کا لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور چہرے پر کسی قسم کے تاثرات بھی نہیں تھے۔ بس روایتی گفتگو کے انداز میں 'ہاں' کہہ دیا تھا۔

جوناتھن کو اب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بوڑھا آخر کون ہے اور اپنے آپ کو کیا سمجھ رہا ہے؟

جوناتھن بوڑھے ڈرائیور کو گھورنے لگا پھر چیختے ہوئے بولا۔ ''میں پلٹ کر واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں میری پشت پر گولی چلانی پڑے گی جیسے کوئی بزدل کسی کو شوٹ کرتا ہے۔''

''او کے۔''

بوڑھے نے اسی روایتی انداز میں 'او کے' کہا جیسے کچھ دیر پہلے روایتی انداز میں 'ہاں' کہا تھا۔

جوناتھن اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

''تم آخر ہو کون؟'' جوناتھن جھلا گیا۔

''ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔'' جواب آیا۔

''میں جانتا ہوں کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے......''

جوناتھن گالی دینا چاہتا تھا لیکن پھر بندوق کی نال پر نگاہ پڑتے ہی اس نے جملہ مکمل نہیں کیا۔ ''ہاں، مجھے معلوم ہے کہ ہم پہلے کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ تو پھر تم مجھے کیوں شوٹ کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اس دنیا پر ایک احسان کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ تمہاری کوئی اہمیت ہے، کیا سمجھے؟ اس لیے کہ جو سانسیں تم لے رہے ہو وہ فضول ضائع ہو رہی ہیں۔'' اس بوڑھے نے کہا۔

جوناتھن کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس بوڑھے کا چہرہ مسخ کر دے۔ اس نے بوڑھے کو مغلظات سنانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسے وہ بندوق یاد آ گئی جس کی نال اس کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بوڑھے کو مخاطب کیا۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں تمہارے سامنے گڑگڑاؤں گا نہیں اور نہ ہی تم سے زندگی کی بھیک مانگوں گا۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں۔'' بوڑھے نے بھویں

اچکاتے ہوئے جواب دیا۔
جوناتھن کو اب بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ بندوق بدستور اسی جگہ تکی ہوئی تھی اور اس نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی تھی اور نہ ہی بوڑھے کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹی تھیں۔
جوناتھن نے ایک بار پھر کوشش کرنا چاہی۔
''دیکھو، مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں تمہیں بھی نہیں جانتا۔ لہٰذا اب میں اپنی کار کی جانب جا رہا ہوں۔''
''کیا دوسری کار لے لی؟ کیا تم اس کھٹارا تباہ شدہ کار کو ٹھکانے لگا چکے ہو۔ ایسا ہی ہے نا؟'' بوڑھے نے پوچھا۔
''دوسری کار......؟'' جوناتھن الجھن میں پڑ گیا۔ ''یہ تم کیا بے معنی باتیں کر رہے ہو؟''
''تمہاری وہ کار جس سے تم نے میری نواسی کو کچل دیا تھا اور پھر وہ ایک دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ تمہیں یاد آیا؟'' بوڑھے کے لہجے میں کرب تھا۔
جوناتھن کے پسینے چھوٹ پڑے۔ یہ خفیف سا شائبہ اس کے کند ذہن کو جھنجوڑنے لگا کہ وہ کس مشکل کا سامنا کر رہا ہے۔ تب اسے بوڑھے کے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق اور اس کی سرد مہر آنکھوں کا مقصد سمجھ میں آ گیا۔
''لیکن میں نے اس کی سزا بھگت لی ہے۔'' جوناتھن نے اپنے بچاؤ میں کہا۔
''ہاں، گاڑی سے ٹکر کی ہلاکت کے جرم کی سزا تم نے صرف آٹھ ماہ جیل میں کاٹی ہے اور اب تم رہا ہو چکے ہو۔ لیکن میری نواسی اب بھی مردہ ہے۔ تمہیں آزادی مل چکی ہے لیکن اسے زندگی واپس نہیں ملی...... اور میری بیٹی...... اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ وہ کارنر پر کھڑی اپنی بیٹی کو سڑک پار کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور پھر......'' بوڑھے نے اپنے شانے اچکاتے ہوئے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ ''اب وہ بھی کبھی پہلے جیسی نہیں ہو سکتی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا، جبکہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے لیے سب کچھ کر گزرنا چاہیے، اس کی مدد کرنی چاہیے اور وہ کچھ کہنا اور کرنا چاہیے جو درست اور صحیح ہو۔'' بوڑھے کی انگلیاں بے خیالی میں اپنے گلے میں پڑی ہوئی چاندی کی چھوٹی سی صلیب سے الجھ رہی تھیں۔
''او مائی گاڈ، یہ بوڑھا تو پاگل لگتا ہے۔'' جوناتھن نے سوچا۔ پھر اس نے کار کی کھڑکی کے فریم پر ٹکی ہوئی بندوق کی طرف دیکھا۔ وہ جائزہ لے رہا تھا کہ کیا وہ بندوق پر جھپٹ سکتا ہے؟
لیکن تب ہی بوڑھے نے اپنی مکمل توجہ جوناتھن پر مرکوز کی۔ وہ پوری طرح چوکنا دکھائی دے رہا تھا۔
جوناتھن نے بندوق جھپٹنے کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور بوڑھے کے چہرے پر نظریں جما دیں۔
''میں اپنی بیٹی اور نواسی کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتا لیکن میں شاید تمہیں یہ باور کرا سکتا ہوں کہ درست کیا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔
تب جوناتھن کو یہ یقین آ گیا کہ اب اسے بوڑھے سے جان چھڑانی شاید مشکل ہو جائے گی۔ وہ گویا ہوا۔ ''دیکھو، مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بس اچانک ہی میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔''
''وہ تو زیبرا کراسنگ سے گزر رہی تھی اور تم نہایت تیز رفتاری سے آ رہے تھے۔ اس لیے کہ تم غصے سے پاگل ہو رہے تھے کیونکہ تمہیں نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ کیا یہ سب درست نہیں ہے، جوناتھن؟''
جوناتھن نے اپنے لہجے میں قدرے دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''تم مجھے یونہی شوٹ نہیں کر سکتے۔ اطراف میں لوگ موجود ہیں۔'' اس نے خالی سڑک پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''پولیس تمہیں پکڑ لے گی اور تمہیں بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنی پڑے گی۔ تم مرنے تک وہیں سڑتے رہو گے۔''
بوڑھے نے جواباً بے توجہی سے شانے اچکا دیے۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔
''وہ کیوں؟''
''تم تو جانتے ہو کہ زندگی کتنی کٹھور ہے، جوناتھن...... یہ کبھی سنگین مذاق بھی کر جاتی ہے۔ جیسے کسی کو ایسی خبر ملے جو اس کے حوصلے پست کر دے اور وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو جائے۔ لیکن ساتھ ہی وہ خبر اس کے لیے ایک خوشی کی نوید بھی بن جائے۔'' بوڑھے نے خود ہی سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تشخیص کہ آپ آخری درجے کے کینسر میں مبتلا اور قریب المرگ ہیں اور آپ کو جلد ہی زندگی کے جھمیلوں سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ اسی لیے مجھے اب کسی قسم کی کوئی پروا نہیں ہے۔''
یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی بندوق کی نال قدرے بلند کی۔ ''تم سے جلد ہی دوسری دنیا میں ملاقات ہو گی جوناتھن۔'' یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی بندوق کا ٹریگر دبا دیا۔
۸۸

پسندی کے اندھ... ہوس پرمیں پرستی علم کم کی شمع کو روھنے
والے سرفروشندی کے علم کی شم کی شمسل... ہی ایک دانش
زندگی میں ڈو ڈوب مسعلم کی شمعہ دیے کرکی شمع کو روشن کو رو...

کی مشعل کو بجھنے نہ دینا... ہوس پرستی... خفا داری اور دلپسند پسندی کے اندھیروں میں ڈوب کر علم کی شمع کو روشن و بلند رکھنے والے سرفروشوں کی جدوجہدِ مسلسل... ایک دانش مند انسان ہی زندگی کے راستوں کو اسی مشعل سے روشن کرتا ہے...

**خون کی ہولی کھیلنے والے شرپسندوں اور راست گو انسانوں کے ٹکراؤ کی ہولناک کہانی...**

# رقصِ اجل

منظر امام

وہ لرزتا کانپتا ہوا لڑکا نرگس خان کو اپنے گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا ملا تھا۔

نرگس خان اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ وہ ایک مہربان اور شفیق عورت تھی۔ وہ محبت کرنے والے بچوں کی ماں اور بے انتہا خیال رکھنے والے شوہر کی بیوی تھی۔

وہ ایک بڑے اسکول میں انگلش کی ٹیچر تھی۔ انگلش کا شوق اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا باپ انگریزی کا استاد تھا اور اردو کا شاعر۔ جبکہ دونوں کی مادری

زبان پشتو تھی۔

دونوں بہت ہی نفیس انسان تھے، محبت کرنے والے۔ اس لیے نرگس خان نے جب اس لڑکے کو دیکھا جو انتہائی سخت موسم میں اس کی ایک سیڑھی پر بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ نرگس خان کو ایسا لگا جیسے اس کا ارسلان اتنے سرد موسم میں اس طرح آکر بیٹھ گیا ہو۔

''کہاں سے آئے ہو بیٹا؟'' نرگس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''وہ، وہاں سے۔'' لڑکے نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا پا رہا تھا کہ وہ کس جگہ کا رہنے والا ہے۔ نرگس نے دیکھا کہ سردی کی شدت سے اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ وہ ہوا کی زد میں آئے ہوئے کسی پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ نرگس نے اس کے لیے اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی محسوس کی۔

''ٹھہرو ایک منٹ۔'' نرگس نے لڑکے سے کہا۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ گھر واپس چلی گئی۔ پانچ منٹ کے بعد واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں دودھ کا ایک گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا کوٹ تھا۔ ''یہ لو، یہ کوٹ پہن لو۔'' اس نے وہ کوٹ لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ ''اور یہ دودھ پی لو۔ بدن میں گرمی آجائے گی۔''

لڑکے نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دونوں چیزیں اس سے لے لیں۔ اس نے دودھ کا گلاس سیڑھی پر رکھا اور نرگس کا دیا ہوا کوٹ پہننے لگا۔ یہ کوٹ نرگس کے شوہر کا تھا۔ لڑکے کے جسم پر بڑا الگ رہا تھا لیکن کسی حد تک بے رحم سردی سے اس کی بچت ہو سکتی تھی۔

نرگس اسے دلچسپی اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتی رہی۔ وہ اس لڑکے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نہ جانے کون ہے۔ کیا نام ہے؟ صورت شکل کا کتنا پیارا ہے۔ شاید کسی اچھے خاندان سے تعلق ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا اس طرف آگیا ہے۔

لڑکے نے اس دوران میں دودھ ختم کر کے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور ممنونیت بھری نگاہوں سے نرگس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟'' نرگس نے پوچھا۔

''اکبر، اکبر خان۔'' لڑکے نے بتایا پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے نرگس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

''شکریہ ماں۔'' لڑکے نے کہا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

نرگس بھی پگھل کر رہ گئی۔ ''ایک منٹ۔'' اس نے اپنے بیگ سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو، یہ رکھ لو۔ یہ تمہارے کام آئے گا۔''

لڑکے نے ہچکچاتے ہوئے نرگس سے پانچ سو کا نوٹ لے لیا۔ کچھ دیر اسی طرح سوچتا رہا۔ جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو پھر تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ کچھ دور چل کر اس نے نرگس کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ نرگس خان اس وقت تک اسے دیکھتی رہی تھی جب..... امجد خان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ اس کے پاس کھڑا ہوا حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا خیریت تو ہے؟ تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم اسکول پہنچ چکی ہو گی۔''

''وہ، وہ اکبر مل گیا تھا۔'' نرگس نے کھوئے کھوئے لہجے میں بتایا۔

''کون اکبر؟''

''اکبر خان، میں نہیں جانتی۔ بے سہارا لڑکا تھا۔ یہاں سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا کانپ رہا تھا۔ میں نے تمہارا کوٹ اسے دے دیا ہے۔''

''چلو، یہ تو تم نے اچھا کیا۔'' امجد ہنس پڑا۔ ''لیکن میڈم! ہم بھی کہاں تک لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ تم نے وہ پرانا گانا تو سنا ہی ہوگا۔ وہی آنسو وہی آہیں، وہی دکھ ہیں، جدھر جائیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' نرگس نے ایک گہری سانس لی۔ ''پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔''

''چلیں میڈم! میں آپ کو آپ کے اسکول تک ڈراپ کر دوں۔'' امجد نے کہا۔ ''ویسے میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کو واک کا شوق ہے لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے اس ناچیز شوہر کے پاس ایک عدد گاڑی بھی موجود ہے۔''

''ہاں، نہ جانے کیوں میں اس وقت پیدل چلنے کی ہمت نہیں پا رہی۔'' نرگس نے کہا۔

''تم یہیں کھڑی رہو۔ میں گاڑی لے کر آجاتا ہوں۔''

''نہیں، اِٹ از او کے۔''

گھر میں گاڑی رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اسی لیے گاڑی گلی میں کھڑی کی جاتی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر نرگس نے پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

چاروں طرف دکھ ہی دکھ تھے۔ کسی کے چہرے پر زندگی نہیں رہی تھی۔ سائے ہر طرف دوڑتے پھر رہے تھے۔ یہ سائے اپنے ساتھ خوف لے کر آتے اور لمحوں میں بہت سوں کو موت دکھا کر واپس چلے جاتے یا خود بھی اندھیروں میں گم ہو جاتے۔

ایک بار اس کے شوہر امجد نے اس سے کہا تھا۔

''نرگس! میرا خیال ہے کہ ہم بچوں کو لے کر یہاں سے شفٹ ہو جائیں۔''

''وہ کیوں؟''

''یہاں کے حالات تو دیکھ رہی ہو نا۔''

''کیا ہمارے شفٹ ہو جانے سے یہاں کے حالات بدل جائیں گے؟''

''یہاں کے حالات تو شاید نہ بدلیں لیکن کم از کم ہمارے حالات بدل جائیں گے۔ صرف معاشی آسودگی ہی سب کچھ نہیں ہوتی، ذہنی سکون کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔''

''نہیں امجد، میں نے یہاں کی مٹی میں جنم لیا ہے اگر میں یہاں سے چلی گئی تو یہ مٹی مجھ سے شکوہ کرے گی کہ تم کیسی اولاد ہو جو ماں کو پریشانی میں چھوڑ کر بھاگ گئیں۔''

''اس کو آئیڈیلزم کہا جاتا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ دور ہو جانے کے بعد مٹی سے رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے؟''

''نہیں، رشتہ تو کمزور نہیں ہوتا لیکن مٹی کا لمس نہیں ملتا۔ تم نے ارسلان اور فرحان کو دیکھا ہے۔ وہ دونوں جب کچھ دنوں کے لیے ایبٹ آباد اپنی خالہ کے یہاں جاتے ہیں اور جب وہاں سے واپس آتے ہیں تو کتنی دیر تک مجھ سے لپٹے رہتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہاں انہیں کوئی پریشانی ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ انہیں میرا لمس نہیں ملتا۔ لمس کو محسوس کرتے رہو تو محبت میں تازگی رہتی ہے امجد، چاہے وہ لمس رشتوں کا ہو یا وطن کا۔''

ان دونوں کے درمیان اسی قسم کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ انٹیلکچوئل سطح کی۔ امجد کا بھی مطالعہ بہت اچھا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے اپنے گھر میں ایک بڑی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ ان کے بچوں ارسلان اور فرحان کو بھی ایسا ہی ماحول نصیب ہوا تھا۔

''یہ لو تمہارا اسکول آ گیا۔'' امجد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

ان کی کار اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ ابھی اسکول لگنے ہی والا تھا۔ بچے اور بچیاں گیٹ کے اندر جا رہے تھے۔

جہاں انہیں ان کی کلاسوں میں بتایا جانے والا تھا کہ ماں کی گود سے لحد تک علم حاصل کرتے رہو۔ کیونکہ تم صرف اسی لیے انسان ہو کہ علم حاصل کرتے ہو، ورنہ تو جانور بھی اپنی ضروریات پوری کرتے اور زندہ رہتے ہیں۔

☆☆☆

گل زمان کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔

اس نے خود تو تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن اسے اسکول جاتے ہوئے بچے بچیاں بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کے ماں باپ بہت غریب تھے۔ اسے تعلیم نہیں دلوا سکتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ ان کا گل زمان بھی پڑھ لکھ جائے۔

گل زمان کا باپ مزدور تھا جبکہ اس کی ماں ایک گھریلو عورت تھی۔ مجبوریوں نے انہیں اس حد تک کمزور کر دیا تھا کہ وہ اب تک زمان کو اسکول بھیجنے کے بجائے کسی کام پر لگانے کی سوچنے لگے تھے۔

لیکن کون سا کام؟

گل زمان ایک پیارا سا نازک مزاج لڑکا تھا۔ وہ زیادہ محنت کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ جب اس کے باپ کو ایک دن اس کے جاننے والے نے کہا۔ ''یارا! تو اپنے بیٹے کو کام پر کیوں نہیں لگا دیتا۔''

''وہ کون سا کام کر سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں کر سکتا۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اس کے۔ میرے ایک جاننے والے نے ایک بڑے اسکول میں کینٹین کھول رکھی ہے اگر تو کہے تو میں اس سے بات کروں۔''

''وہاں کام کیا ہو گا؟''

''ارے بہت ہلکا کام ہوتا ہے اسکول کی کینٹین کا۔ آٹھ بجے جانا اور دوپہر کو واپس آ جانا اور کام بھی کوئی ایسا خاص نہیں ہے۔ وہاں کی جو استانیاں ہیں ان کو چائے پہنچانا اور جو بچے آئیں ان کو سنبھال لینا۔ وہاں اور بھی دو بچے ہیں، وہ بھی یہی کام کر رہے ہیں۔''

''اور پیسے کتنے ملیں گے؟''

''وہ بھی ٹھیک ہی ہوں گے۔ اپنا خرچہ تو نکال ہی لے گا۔''

''ٹھیک ہے جان، تو اس سے بات کر کے مجھے بتا دینا۔''

گل زمان کو جب یہ پتا چلا کہ اسے کسی اسکول کی کینٹین میں کام ملنے والا ہے تو وہ خوش ہو گیا۔ اس کی خواہش پوری ہونے والی تھی۔ اسکول جانے کی خواہش۔

ان بچوں سے ملنے کی خواہش جو صاف ستھری یونیفارم پہن کر اور کتابیں اٹھائے اسکولوں کی طرف جایا کرتے۔

اور ایک دن اسے اسکول کی کینٹین کے مالک کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ ایک درشت مزاج شخص تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سختی تھی۔ سر کے بال بہت چھوٹے چھوٹے، جیسے فوجیوں کے ہوا کرتے ہیں۔ سامنے کے دو دانت غائب تھے اور جب وہ کسی بات پر ہنستا تو بہت بھیانک دکھائی دیتا۔

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سانپ جیسی تیز آنکھوں سے بہت دیر تک گل زمان کو دیکھتا رہا۔ گل زمان کو خوف کے ساتھ ساتھ اس سے کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' کچھ دیر بعد اس نے گردن ہلائی۔ ''ٹھیک ہے، کل سے کام پر آجانا اور سنو، سات بجے آنا ہوگا۔''

''آجاؤں گا صاحب۔''

''کام سمجھا دیا جائے گا۔ بہت آسان کام ہے۔ اسکول کی استانیوں کو چائے دینی ہے اور ہاف ٹائم کے وقت بچوں کو بھی سنبھالنا ہے۔''

''جی صاحب، ہو جائے گا۔''

''اور ہاں، ایک بات اور...... اپنے کام سے کام رکھنا، دو بجے چھٹی ہوا کرے گی۔''

دوسرے دن سے گل زمان نے کام شروع کر دیا۔ وہ ٹھیک سات بجے پہنچ گیا تھا۔ اس کے لیے صبح اٹھنا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے گھر والے فجر میں اٹھ جایا کرتے تھے۔ گل زمان کو بھی یہی عادت پڑی ہوئی تھی۔

پہلی صبح اس کی ماں اس کے لیے بہت بے قرار ہو رہی تھی۔ ''دیکھ گل زمان! تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ وہاں کسی سے جھگڑا نہیں کرنا۔''

''ماں، میں نے کبھی پہلے جھگڑا کیا ہے جو وہاں جا کر کروں گا۔''

''اور ہاں، کینٹین میں تو کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ہوں گی۔'' ماں نے پوچھا۔

''ہاں ماں، بہت کچھ ہے۔ سموسے، آلو کے چپس، بسکٹ اور پتا نہیں کیا کیا۔''

''لیکن بیٹا تو ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا۔'' ماں نے سمجھایا۔ ''یہ بری عادت ہوتی ہے۔ بس جو میں تجھے باندھ کر دے دیا کروں وہی کھایا کرنا۔''

گل زمان کا باپ ایک طرف کھڑا ہو کر اپنی بیوی کی باتیں سن سن کر مسکرائے جا رہا تھا۔ ''یار! تو بھی کمال کرتی ہے۔'' اس سے جب برداشت نہیں ہوا تو وہ بول پڑا۔ ''گل زمان اب اتنا بچہ بھی نہیں ہے۔ سب سمجھتا ہے اور یہ بھی تو دیکھ اس محلے کے اور کتنے بچے روزانہ کام پر جاتے ہیں۔''

''ان کی بات اور ہے نصیب خان۔'' اس کی ماں دھیرے سے بولی۔ ''یہ تو پہلی دفعہ کام پر جا رہا ہے نا۔''

''سب پہلی دفعہ ہی جاتے ہیں، تو فکر مت کر۔''

گل زمان کو اسکول کا ماحول بہت پسند آیا۔ کام بھی کوئی خاص نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دو بچے اور بھی کام کرتے تھے۔ لیکن وہ دونوں بڑی عمر کے لوگ تھے۔ ان کے علاوہ کینٹین کا مالک ستم گر خان تھا۔ گل زمان کی سمجھ میں اس کا نام نہیں آسکا تھا۔ ستم گر خان، یہ کیا نام ہوا۔

ہاف ٹائم کے وقت بہت زیادہ کام ہو جاتا تھا۔ بچے کلاس رومز سے اس طرح نکل آتے تھے جیسے پنجروں سے ننھے ننھے پرندے آزاد ہو گئے ہوں۔ وہ سب شور مچاتے ہوئے کینٹین کی طرف دوڑ پڑتے۔

اس کے بعد کینٹین کا کام شروع ہو جاتا۔ گل زمان اس لڑکے کو سموسے دو۔ مجھے بسکٹ چاہئے، دو کولڈ ڈرنک، وہ فلاں ٹیچر سامنے درخت کے پاس کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس کو چائے پہنچانی ہے۔

وہ دیکھو، وہ بچی کیا مانگ رہی ہے۔ یہ بیس پچیس منٹ بہت مصروفیت کے ہوتے تھے۔ اس کے بعد بریک ختم ہوتے ہی بچے دوبارہ اپنی اپنی کلاس کی طرف دوڑ پڑتے اور ذرا سی دیر میں سناٹا پھیل جاتا۔

اس وقت ستم گر خان پیسے گن گن کر ایک طرف رکھتا جاتا۔ اسکول بھی بہت بڑا تھا اس لیے کینٹین بھی بہت بڑی تھی اور اس کے ساتھ آمدنی بھی اچھی خاصی ہوا کرتی۔

دس بارہ دنوں کے بعد گل زمان اس ماحول سے پوری طرح مانوس ہو چکا تھا۔ اسکول کی ٹیچرز بھی اسے پسند کرنے لگی تھیں۔ سب کو اس کا نام معلوم ہو گیا تھا۔

''گل زمان دو کپ چائے جلدی سے پہنچا دو اور ہاں چینی کم۔''

''جی مس، چینی کم۔''

''گل زمان! چھ سموسے اور چار کولڈ ڈرنک سامنے لے آؤ، ہم سامنے چبوترے پر بیٹھے ہیں۔''

اسکول کے احاطے میں ایک بڑا سا درخت تھا...

درخت کے چاروں طرف ایک بڑا سا چبوترہ بنا دیا گیا تھا۔ فارغ اوقات میں کئی ٹیچرز اس چبوترے پر گپ شپ کے

لیے بیٹھ جاتیں اور ساتھ میں کولڈ ڈرنک یا چائے بھی پیتی رہتیں۔

گل زمان کو وہ ٹیچر بہت اچھی لگتی تھی جس کا نام نرگس خان تھا۔ وہ بہت نرمی اور شفقت کے ساتھ باتیں کیا کرتی، وہ کینٹین یا چبوترے کی طرف بہت کم آیا کرتی تھی۔

عام طور پر اس کی چائے اسٹاف روم ہی میں بھیجی جاتی۔ جہاں وہ موٹی موٹی کتابوں میں الجھی رہتی یا بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی ہوتی۔

گل زمان جب اس کے لیے چائے لے کر آتا تو وہ اس سے دو چار باتیں ضرور کر لیا کرتی۔

ایک دن اس نے گل زمان سے پوچھا۔ ''تم کو پڑھنے کا شوق نہیں ہے گل زمان؟''

''بہت شوق ہے ٹیچر۔'' گل زمان نے کہا۔ ''اس میں اب اتنا سلیقہ آ گیا تھا کہ وہ اسکول کی استانیوں کو بڑے ادب کے ساتھ ٹیچر کہا کرتا۔

''میں تمہیں کتابیں لا کر دوں گی۔'' نرگس نے بتایا۔ ''میں دو گھنٹے فارغ ہوتی ہوں۔ اس کمرے میں ہوتی ہوں۔ تم میرے پاس آ جایا کرنا، میں پڑھا دوں گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ٹیچر، لیکن میرا... مالک ستم گر خان نہیں مانے گا۔ گل زمان نے کہا۔'' وہ مجھے چھٹی نہیں دے گا۔''

''میں اس سے بات کر لوں گی۔''

لیکن جب نرگس خان نے اس سے بات کی تو اس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''رہنے دیں ٹیچر، آپ بھی کن چکروں میں پڑی ہیں۔ یہ لوگ جہاں ہیں بس وہیں ٹھیک ہیں۔ ان کو تعلیم والیم کے چکر میں نہ ڈالیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تعلیم بری چیز ہے؟'' نرگس نے پوچھا۔

''ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا ٹیچر، میرے خود چار بچے ہیں۔ دو لڑکیاں، دو لڑکے۔ لیکن میں نے کسی کو تعلیم کے چکر میں نہیں ڈالا۔''

''تو پھر کیا کریں گے وہ؟''

''بہت کچھ کر لیں گے۔ لڑکے گیراج میں کام کرتے ہیں اور لڑکیوں کی شادی ہو جائے گی بس۔''

''افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم اسکول کے ماحول میں رہتے ہو۔ تم لڑکے لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھ رہے ہو، اس کے باوجود تعلیم سے دور بھاگتے ہو۔''

''اسکول میں کینٹین چلانا تو اپنا مجبوری ہے ٹیچر، اپنا بزنس ہے اور جہاں تک آپ لوگوں کی بات ہے۔ آپ اپنے بچوں کو تعلیم دلواتی رہیں۔ کیونکہ آپ لوگ آسمان سے اترے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' نرگس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب میں گل زمان کو چھٹی کے بعد پڑھایا کروں گی۔ اس وقت تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟''

ستم گر خان نے جواب تو کچھ نہیں دیا لیکن وہ خونخوار نگاہوں سے نرگس خان کو دیکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت تھک چکا تھا۔

اس کے پیروں میں جو پرانے جوتے تھے، وہ اب بری طرح گھس گئے تھے اور نکیلے پتھروں نے اس کے پیروں کو زخمی کر دیا تھا۔

اوپر سے سورج بھی آگ برسائے جا رہا تھا۔ اسے خود یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرف کیوں آ نکلا ہے۔ بس وہ ایک جنون کی کیفیت میں گھر سے بھاگ نکلا تھا۔

اس کا باپ انتہائی بے رحم انسان تھا۔ نماز روزہ وغیرہ کا سختی سے پابند۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے مزاج میں بلا کی سختی بھی تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر دونوں ماں بیٹے کو دھنک کر رکھ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ تین چیزوں کو ہمیشہ مار کو ٹھیک رکھنا چاہیے۔

گھوڑا، عورت اور اولاد۔ گھوڑا تو اس کے پاس نہیں تھا لہٰذا گھوڑے کی کسر بھی وہ ان دونوں سے پوری کر لیتا۔

وہ اپنے باپ کی وجہ سے کئی بار پہلے بھی گھر سے بھاگ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہر وقت دینی باتیں کرنے والا آدمی اندر سے اتنا بے رحم کیوں ہے۔

اس بار معاملہ کچھ اور خراب ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے ماں کو اس طرح مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔

اور اس دن پہلی بار ایسا ہوا کہ جب اس کا باپ اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے اپنے باپ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''بس بابا بس اب بہت ہو گیا۔''

''کیا؟'' اس کا باپ جیسے ایک دم شاک میں آ گیا ہو۔ ''توبہ توبہ، باپ کا ہاتھ تھامتا ہے۔ کافر ہو گیا ہے۔''

''کافر نہیں ہوا بابا، تم کو ظلم سے روک رہا ہوں۔ اس نے کہا۔'' اب میرے سامنے یہ سب نہیں ہوگا۔ ماں بھی تو انسان ہے۔''

''وہ ایک عورت ہے بدبخت۔''

''تو کیا عورت انسان نہیں ہوتی۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''اب یہ کتنا برداشت کرے گی؟''

''نکل جا یہاں سے بدبخت کافر۔'' باپ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ اس نے ایک طرف رکھا ہوا ایک ڈنڈا اٹھا لیا تھا.... وہ اسے مارنا چاہتا تھا کہ اس کی ماں درمیان میں آگئی۔

''بس کر دو، رحم کرو اس پر، چھوڑ دو۔ اس کے بدلے مجھے مار لینا لیکن اس کو ہاتھ نہیں لگانا۔''

باپ نے برا بھلا کہتے ہوئے ڈنڈا ایک طرف پھینک دیا۔ اس نے ایک نظر اپنے بے رحم باپ کی طرف دیکھا پھر زخمی ماں پر ایک نظر ڈالتا ہوا گھر سے باہر آ گیا۔

وہ ایک جنونی کیفیت میں باہر نکلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف جا رہا تھا۔ ہر طرف سنگلاخ چٹانیں تھیں۔ آگ برساتا ہوا سورج تھا اور پیروں کو زخمی کرنے والے پتھر تھے۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ بہت شدید۔ ہونٹ سوکھ کر تڑخ چکے تھے۔ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ زبان بھی اب کانٹے کانٹے ہو رہی تھی۔

اچانک کچھ فاصلے پر اسے ایک آدمی جاتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ آدمی پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے آواز لگا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز بھی نہیں نکل سکی۔ وہ دوڑنے کی کوشش میں الجھ کر گر پڑا اور گرتا ہی چلا گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا ہوگا۔ وہ ایک سایہ دار کمرے میں تھا۔ حالانکہ گرمی یہاں بھی بہت سخت تھی لیکن کم از کم چھت کا سایہ تو تھا۔

آہستہ آہستہ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے دو آدمیوں کو دیکھا۔ دونوں اسی علاقے کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شکلیں یہی بتا رہی تھیں۔

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ان میں سے ایک نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''پورا نہیں پی جانا، تھوڑا تھوڑا۔''

یہ بات تو وہ خود بھی جانتا تھا کہ جس کو پیاس نے مار دیا ہو اس کو پانی پینے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ اس نے ایک دو گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ وہ دونوں اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

وہ اب توانائی محسوس کر رہا تھا۔ اسے سہارا دے کر بٹھا دیا گیا۔

''نام کیا ہے تیرا؟'' ان میں سے [illegible] کیا۔ حالانکہ اس کا [illegible] گئی۔

''اکبر خان۔'' اس نے بتایا۔

''ادھر کہاں سے آ گیا؟'' [illegible] نے پوچھا۔

اکبر خان نے گردن جھکا لی۔ [illegible] کن حالات میں گھر سے نکل بھاگا تھا۔

''بتا نا، ادھر کہاں سے آ گیا؟'' اس بار پہلے والے نے پوچھا تھا۔

اکبر خان نے ٹھہر ٹھہر کے اپنی پوری کہانی سنا دی کہ وہ کس طرح اپنے باپ کے خوف سے گھر سے بھاگا ہے اور اس کا باپ کتنا بے رحم انسان ہے۔

''یارا! یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔'' دوسرے والے نے کہا۔ ''ایسا لوگ تو ظالم ہوتا ہے۔''

''ہاں، میرا باپ بہت ظالم ہے۔''

''اکبر خان! اب تم ہمارا دوست ہے۔'' دوسرا اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ ''اب تم ہمارے ساتھ رہے گا۔ یہاں تم کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم تم کو اچھی اچھی باتیں سکھائے گا۔ تم کو سیدھے راستے پر چلائے گا۔ کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی جو بولو گے، حاضر ہو گا۔''

''بہت مہربانی جی۔ میں اب خود بھی اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گا۔''

''شاباش تو پھر کیا ہے، اب تم ادھر ہمارے ساتھ ہے ہمارا بھائی ہے۔''

''آپ کون ہیں؟'' اکبر خان نے پوچھا۔

''ہم شہباز خان ہے اور یہ ہمارا دوست بخت آور خان۔'' پہلے والے نے اپنا اور دوسرے کا تعارف کروایا۔

''آپ دونوں یہیں رہتے ہیں؟''

''ہاں یارا، اس میں کیا ہے۔ مرد تو کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ وہ شیر کا بچہ ہوتا ہے چلو اب تم کچھ دیر آرام کرو، ہم تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہے۔''

دونوں کمرے سے چلے گئے۔ اکبر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن لوگوں کے درمیان آ پھنسا ہے۔ ویسے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ باہر جا کر انہوں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ یعنی وہ اب یہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔

لیکن نکل کر جاتا بھی کہاں؟ اپنے گھر میں تو اس کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کا باپ اسے دیکھتے

ہی گولی مار دیتا۔

اسے صرف ماں کی فکر تھی۔ اس کے علاوہ اس کا اور تھا ہی کون۔ پتا نہیں، اس بے چاری کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہوگا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے کی دیواروں پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ آگ اگلنے والے اور موت دینے والے خوفناک ہتھیار۔ اکبر خان ان ہتھیاروں کو پہچانتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی اسی قسم کے ماحول میں گزاری تھی۔

وہ سوچنے لگا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیسے رہ سکتا تھا؟ ان پہاڑوں پر کیا زندگی ہوگی۔ نہ جانے یہ لوگ یہاں رہ کر کام کیا کرتے ہوں گے؟

دروازہ کھلا اور وہی دونوں کھانے کی ٹرے لے کر اندر آگئے۔ ''اکبر خان! یہ لو تمہارے لیے گرما گرم روٹیاں اور گوشت کا سالن۔''

اکبر خان کو حیرت تو ہوئی کہ ان لوگوں نے اس پہاڑ پر کھانے کا بندوبست کیسے کرلیا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

☆☆☆

نرگس کے دونوں بچے ٹی وی پر مار دھاڑ کی کوئی فلم دیکھ رہے تھے۔

اس فلم میں بہت زوردار جنگ ہو رہی تھی۔ ایک ہیرو تھا جس کے پیچھے بہت سے لوگ پڑے ہوئے تھے اور وہ ان کا صفایا کرتا ہوا اپنے مشن کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تشدد کے بھی مناظر تھے اور تشدد کے ہر منظر کو ایک نئے انداز سے فلمایا گیا تھا۔

ارسلان اور فرحان کے لیے وہ بہت مزے کی موو ی تھی لیکن ان کا سارا مزہ اس وقت کرکرا ہوگیا جب امجد اور نرگس کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ٹی وی آف کر دیا۔

''یہ موو ی کہاں سے لے کر آئے تھے؟'' امجد نے پوچھا۔

''بابا! ہم نے کمپیوٹر سے ڈاؤن لوڈ کی تھی۔'' ارسلان نے بتایا۔

''آئندہ ایسی موویز دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ جاؤ جا کر اپنا ہوم ورک کرو۔''

دونوں بچے خاموشی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔

''تو یہ ہے ماڈرن ازم۔'' امجد تلخی سے بولا۔ ''پوری دنیا جیسے تشدد کی وبائی لپیٹ میں آگئی ہے۔ کسی بھی شعبے میں نرمی اور آہستگی نہیں رہی۔ آج کل کی فلموں سے Softness ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ صرف تشدد ہے۔ نئی نئی قسم کی مشینیں اور نئے نئے ہتھیار۔ بس مارتے چلے جاؤ۔ نہ کوئی اسٹوری اور نہ کوئی تھیم۔ ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا ہے۔''

''مجھے یاد ہے۔ ایک زمانے میں ویسٹ میں بھی کتنی خوبصورت سافٹ فلمیں بنا کرتی تھیں۔'' نرگس نے کہا۔ ''پیچ بیک، سن فلاور، بٹر فلائی اور نہ جانے کون کون سی۔ ان فلموں کو دیکھ کر روح تک خوش ہوجاتی تھی۔''

''اصل بات یہ ہے کہ فلمیں اور لٹریچر وغیرہ معاشرے سے الگ ہٹ کر نہیں ہوتیں۔ جیسا معاشرہ ہوتا ہے ویسی ہی پراڈکٹس مارکیٹ میں آرہی ہیں۔''

''بہرحال بچوں پر نظر رکھنا ہوگی۔'' نرگس کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔

''پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ سب کو لے کر اس ملک سے نکل جاؤں۔ پھر سوچتا ہوں فائدہ کیا ہوگا۔ مسائل تو ہر جگہ ہیں۔ کہیں سیاسی خون ریزی ہے۔ کہیں معاشی خون ریزی اور کہیں مذہبی خون ریزی۔''

''ہمارے یہاں تو فساد کی تین وجوہات ہیں۔ ایک اور کا اضافہ ہوگیا ہے۔''

''وہ کون سا؟'' امجد نے پوچھا۔

''پہلے تو تین ہی ہوتی تھیں نا، زن، زمین اور زر۔ اب زبان کا بھی اضافہ کرلیں۔ ہمارے ملک میں تو اس بنیاد پر بھی خون بہایا جا رہا ہے۔''

''اور اتفاق یہ ہے کہ زبان بھی ز سے ہی ہے۔''

''و جائیں جا کر بچوں کو دیکھیں۔ وہ ناراض ہو کر گئے ہیں۔ ان کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کریں۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' امجد نے کہا۔ ''میں کونسلنگ کے ذریعے ان کے ذہن کو ڈائیورٹ کردوں گا۔''

دروازے کی اطلاعی گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور عام طور پر لوگ کسی سے ملنے رات کے وقت نہیں آیا کرتے تھے۔

گھنٹی پھر بجی۔ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ ٹی وی لاؤنج سے ہو کر ایک چھوٹا پیج تھا۔ آمدورفت کا دروازہ اس پیج میں تھا۔

نرگس وہیں لاؤنج میں کھڑی رہی تھی۔ امجد خان نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے داور حیات کھڑا تھا۔ امجد خان کا رشتے دار۔ وہ ایک باہمت اور باحوصلہ نوجوان

تھا۔ امجد خان نے کبھی اسے ٹوٹا ہوا اور نڈھال نہیں دیکھا تھا... ہنستا بولتا رہتا لیکن اس وقت اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے زمانے بھر کے غم اس کے ساتھ لگ گئے ہوں۔

''ارے کیا ہوا؟'' امجد خان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''کیا بتاؤں بھائی۔'' داور حیات کی آواز الجھی ہوئی تھی۔ ''بہت برا ہوا میرے ساتھ۔''

''آؤ اندر آجاؤ۔'' امجد خان اس کا ہاتھ تھام کر لاؤنج میں لے آیا۔ ''پہلے بیٹھ جاؤ، پھر بات کرنا۔''

نرگس بھی داور حیات کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ ''کیا ہوگیا بھائی؟ بھابی اور بچے تو خیریت سے ہیں نا؟''

''ہاں وہ تو خیریت سے ہیں لیکن میں خیریت سے نہیں ہوں۔'' داور حیات نے کہا۔ ''میری دنیا تباہ کردی گئی ہے۔ میرے اسکول کو اڑا دیا گیا ہے۔''

''اوہ۔'' یہ خبر نرگس اور امجد دونوں کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ جانتے تھے کہ داور نے اپنے اسکول کے حوالے سے کیسے کیسے خواب دیکھ رکھے تھے۔ اس نے اپنے وسائل سے اسکول قائم کیا تھا۔ اس کے پاس شہر میں دو مکانات تھے۔ اسکول کے لیے اس نے ایک مکان فروخت کردیا تھا اور اپنے علاقے میں جا کر اسکول کھول لیا تھا۔

اس کا علاقہ پہاڑوں کے دامن میں تھا۔ ایک چھوٹا سا گاؤں۔ جہاں کے بچوں کے لیے سب سے بڑی عیاشی یہی تھی کہ وہ کسی طرح زندہ رہ سکیں۔

اسکول کے افتتاح کے موقع پر امجد خان اور نرگس بھی موجود تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ علاقے کے بچے اور والدین تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ پہلے ہی دن سے داخلے شروع ہوگئے تھے۔ فی الحال داور حیات نے یہ اسکول پانچویں کلاس تک رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا ارادہ میٹرک تک کردینے کا تھا لیکن اب وہ اس خبر کے ساتھ آیا تھا کہ اس کے اسکول کو اڑا دیا گیا ہے۔

نرگس اس کے لیے چائے کے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے کر آگئی تھی۔

چائے پینے کے دوران داور حیات نے بتانا شروع کیا۔ ''بھائی! دھمکیاں تو بہت پہلے سے مل رہی تھیں کہ اسکول بند کردو لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کون ہوسکتا ہے جس کو تعلیم سے نفرت ہو اس لیے میں نے ان دھمکیوں کو درگزر کردیا اور کل یہ ہوا کہ پورا اسکول اڑا دیا گیا۔''

''اور بچے؟'' امجد خان نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''وہ سب خیریت سے ہیں۔'' داور حیات نے بتایا۔ ''کیونکہ یہ کارروائی رات کے وقت کی گئی تھی۔''

''یہی ہوتا ہے اور یہی ہو رہا ہے۔'' نرگس بے چین ہو کر بولی۔ ''ہم کتابوں سے محبت رکھنے والے، شاعر، ادیب، مصنف، دانشور، فلاسفر، سائنس داں، ڈاکٹرز صدیوں کی مسافت طے کر کے کسی ایک جگہ پہنچتے ہیں اور بارود کا ایک دھماکا ہمارے خوابوں کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ ہم پھر سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ جس نبیؐ نے تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اس نبیؐ کی امت یہ کام کر رہی ہے۔''

''اسی بات کا تو افسوس ہے بھابی۔'' داور حیات نے ایک گہری سانس لی۔

''تم نے کہیں رپورٹ کروائی؟'' امجد خان نے پوچھا۔ پھر اسے اپنے اس احمقانہ سوال پر خود بھی شرم سی آگئی تھی۔ اب تک سیکڑوں اسکول تباہ ہو چکے تھے سیکڑوں قبریں تیار ہو چکی تھیں۔ سیکڑوں رپورٹس لکھی جا چکی تھیں۔ لیکن فائدہ کیا ہوا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔

''بھابی اور بچوں کا کیا حال ہے۔'' امجد نے پوچھا۔

''دردانہ نے تو خود کو سنبھال لیا ہے۔'' داور حیات نے بتایا۔ ''لیکن بچوں کا برا حال ہے۔ وہ اسی اسکول میں پڑھتے تھے جس کو تباہ کردیا گیا ہے۔''

''افسوس ہوا سن کر۔'' نرگس نے کہا۔

''مجھے ان کے آنے والے دنوں کی فکر ہے۔ ان کا کیا ہوگا؟ ابھی تو وہ ذہنی مریض سے ہوگئے ہیں، ان کو چپ سی لگ گئی ہے۔ ظاہر ہے انسان کو ان دیواروں اور چھتوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے جن کے درمیان وہ کچھ وقت گزار چکا ہوتا ہے۔''

''میں آپ کو ایک مشورہ دوں بھائی۔'' نرگس نے کہا۔

''ضرور دیں۔ میں ان ہی مشوروں کی تلاش میں تو یہاں آیا ہوں۔''

''آپ اپنے دونوں بچوں کو ہمارے یہاں لے آئیں۔'' نرگس نے کہا۔ ''جہاں ہمارے دو بچے ہیں وہاں آپ کے بھی آجائیں گے۔''

''آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی بھابی۔'' داور حیات خوش ہو کر بولا۔ ''میں بھی یہی درخواست لے کر آیا تھا۔ آپ کے یہاں ان کی پڑھائی بھی ہو جائے گی۔''

''ارسلان اور فرحان کے اسکول میں تو داخلے بند ہو چکے ہیں۔'' نرگس نے بتایا۔ ''لیکن میں آپ کے دونوں بچوں کو اپنے اسکول میں کرواسکتی ہوں۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔ کیونکہ آپ کے اسکول کی پورے پاکستان میں بہت اچھی شہرت ہے۔''

''تو پھر طے ہوگیا کہ تمہارے بچے بھی ہمارے بچوں کے ساتھ رہیں گے۔'' امجد نے کہا۔

''بس مجھے اطمینان ہوگیا۔'' داور حیات نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب میں اپنی جدوجہد اور تیز کردوں گا۔''

''کیا مطلب؟'' نرگس نے اس کی طرف دیکھا۔

''بھابی! اصل کہانی تو یہی ہے۔ اسکولوں کو نقصان پہنچانا ان کا مقصد نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد ہماری ہمت اور ہمارے حوصلے کو توڑنا ہے اور میں نے اپنے آپ سے اور اپنے خدا سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ کم از کم اس جذبے کو تو ٹھنڈا نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے وہ کتنی ہی دیواریں گرادیں۔''

☆☆☆

گل زمان کی زندگی میں نئی اور خوش گوار تبدیلی آچکی تھی۔

کینٹین کے مالک نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ ٹیچر نرگس کے پاس جا کر پڑھ لیا کرے۔ لیکن یہ اجازت صرف ایک گھنٹے کی تھی۔

گل زمان کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ نرگس نے اسے دو تین کتابیں بھی لاکر دے دی تھیں۔ وہ گھر آکر بھی ان کو پڑھتا رہتا۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ ایک آدمی کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہا تھا۔ اس آدمی کا نام باز خان تھا۔ قوی ہیکل چالیس اور پچاس کے درمیان۔ جس کی آنکھوں میں بلا کی پھرتی تھی۔ کسی چالاک پرندے کی آنکھوں کی طرح۔ اس کے دیدے اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہی کینٹین میں مال کی سپلائی کیا کرتا تھا۔ اس مال میں سموسوں کے علاوہ سب کچھ ہوتا۔ آلو چپس کے پیکٹ، بسکٹ، ٹافیاں اور چاکلیٹ وغیرہ۔ اس کینٹین میں جو پرانا آدمی مال سپلائی کیا کرتا تھا وہ اب دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نیا آدمی گل زمان کو شروع ہی سے پسند نہیں تھا۔ وہ کچھ عجیب نگاہوں سے گل زمان کو دیکھا کرتا تھا۔ گل زمان کو اس سے وحشت محسوس ہوا کرتی۔

وہ اپنی پرانی گاڑی میں بڑی بڑی بوریوں میں مال لایا کرتا تھا۔

مال کی بوریاں اندر اسٹور میں پہنچادی جاتیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ان بوریوں کو ستم گر خان اور باز خان کے علاوہ کوئی اور ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ کسی کو اجازت نہیں تھی۔

جب بوریاں اندر اسٹور میں پہنچ جاتیں تو ستم گر خان دروازے پر ایک موٹا سا تالا لگا دیا کرتا اور جب کینٹین میں کسی چیز کی کمی ہو جاتی تو وہ خود ہی اندر جا کر مطلوبہ سامان لے آتا تھا۔ اس معاملے میں بھی کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اندر اسٹور سے سامان لے کر آئے۔

ایک دن باز خان نے نصیب خان سے کہا۔ ''یارا! اس لڑکے کو ہمارے حوالے کردے۔ تیرے پاس اس کا کام ختم ہوگیا ہے۔''

گل زمان اس وقت ان دونوں کے پاس ہی کھڑا تھا۔

''باز خان! تو کیا کرے گا اس کو لے جاکر؟'' ستم گر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے یارا! بس اس کو شہزادہ بنا کر رکھے گا۔ ہمارے پاس راج کرے گا۔''

''نہیں۔'' گل زمان اچانک بھڑک اٹھا۔ ''مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں اِدھر ہی رہوں گا۔''

''تجھ کو یہاں سے دگنے پیسے دوں گا۔'' باز خان نے کہا۔

''نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میری پڑھائی ختم ہوجائے گی۔''

''پڑھائی۔'' باز خان چونک اٹھا۔ اس نے ستم خان کی طرف دیکھا۔ ''یارا! یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیسی پڑھائی؟ کیا اس نے اسکول میں داخلہ لے لیا ہے؟''

''نہیں، داخلہ تو نہیں لیا لیکن ایک ٹیچر اسے روز پڑھاتی ہے۔'' ستم

''اچھا، کون ہے وہ ٹیچر؟'' ستم خان نے بتایا۔

ستم خان نے اِدھر اُدھر گردن گھمائی۔ اسے نرگس اپنے مخصوص درخت کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی دکھائی دے گئی۔ اس کے پاس دو تین بچے بھی تھے۔ جن کو شاید وہ کچھ سمجھا رہی تھی۔

''وہ سامنے بیٹھی ہے۔'' ستم خان نے اشارہ کیا۔

''میں اس سے بات کرلوں؟''

''کیوں، تم کیوں بات کرو گے؟'' گل زمان نے

پوچھا۔ "یہ میرا معاملہ ہے۔ مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔"

"اچھا، اچھا، ناراض نہ ہو۔" باز خان نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سب ٹھیک کردوں گا، جا اپنا کام کر۔"

گل زمان ان بچوں کی طرف متوجہ ہوگیا جو کینٹین سے کھانے پینے کی چیزیں خریدنے آئے ہوئے تھے۔

اس دوپہر کو چھٹی کے بعد جب گل زمان نرگس کے پاس اپنا ہوم ورک لے کر پہنچا تو اس نے نرگس کو بتا دیا۔

"مس (اب وہ اسکول کے دوسروں بچوں کی طرح ٹیچرز کو مس کہنے لگا تھا) مس، ایک آدمی مجھے اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔"

"ساتھ لے جارہا تھا۔" نرگس چونک پڑی۔ "کہاں ساتھ لے جارہا تھا۔ کون ہے وہ آدمی؟"

"مس، وہ کینٹین میں سپلائی لے کر آتا ہے۔" گل زمان نے بتایا۔ "وہ کہہ رہا تھا میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں دگنے پیسے دوں گا لیکن میں نے منع کردیا۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا مجھے پڑھائی کرنی ہے۔ میں میڈم سے کتابیں پڑھتا ہوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" نرگس نے شاباش دی۔ "تمہارا اصل کام اب علم حاصل کرنا ہے۔"

"بات یہ ہے مس کہ وہ اچھا آدمی نہیں لگتا۔" گل زمان نے بتایا۔ "وہ آپ کو بھی بہت غصے سے دیکھ رہا تھا کہ آپ مجھے کیوں پڑھاتی ہیں۔"

"ہاں، بدقسمتی سے ہمارے یہاں بہت سے لوگ ایسے ہی ہیں۔" نرگس نے کہا۔ "چلو، تم اپنا ہوم ورک دکھاؤ کیا کرکے لائے ہو۔"

اس دوران اسٹاف روم میں جنید اور نوید بھی آگئے تھے۔ یہ دونوں داور حیات کے بیٹے تھے۔ نرگس نے انہیں اپنے ہی اسکول میں ایڈمیشن دلا دیا تھا۔

یہ پڑھائی ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد نرگس نے رستم خان کو بلوالیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کینٹین کے مالک ... سے کوئی بات کی تھی۔

رستم خان بڑے ادب سے اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

"جی میڈم! کیا آپ کو کینٹین سے کوئی شکایت ہوگئی ہے؟" اس نے پوچھا۔ "آپ تو جانتی ہیں کہ میں چیزوں کی کوالٹی پر کتنا دھیان رکھتا ہوں۔"

"نہیں، رستم خان! بات کچھ اور ہے۔" نرگس نے کہا۔ "مجھے یہ پتا چلا تھا کہ تمہارے پاس کوئی آدمی آیا تھا۔ وہ گل زمان کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کررہا تھا۔"

"ارے وہ۔" رستم خان ہنس پڑا۔ "میڈم! وہ تو سپلائی والا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ گل زمان اس کے پاس چلے، وہ اسے دگنے پیسے دینے کی بات کررہا تھا لیکن خود گل زمان نے انکار کردیا۔"

"بس، تو اس قصے کو یہیں ختم کردینا۔ گل زمان ذہین لڑکا ہے۔ میں اسے پڑھا رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ آگے جاکر کوئی اور کام کرے۔"

"یس میڈم! اطمینان رکھیں۔ اسے اس کی مرضی کے بغیر کہیں نہیں بھیجا جائے گا۔"

"اب تم جاسکتے ہو اور ہاں اس کا خیال رکھنا۔"

رستم خان نرگس کے پاس سے کینٹین کی طرف واپس آگیا۔ گل زمان بچوں کو سامان دینے میں مصروف تھا۔ گل زمان کو دیکھ کر رستم خان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ ایک خونخوار سا تاثر اس کے چہرے پر ابھر آیا تھا۔

پھر اس نے اپنے تاثرات ٹھیک کیے اور گل زمان کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ "گل زمان۔" اس نے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

"جی صاحب۔" گل زمان نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے باز خان کے بارے میں میڈم کو کیا بتایا تھا؟"

"کوئی خاص نہیں، میں نے ان سے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے کسی کے ساتھ نہیں جانا۔ کیونکہ میں چلا گیا تو میری پڑھائی ختم ہوجائے گی۔" گل زمان نے بتایا۔

"تو تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہوگیا ہے؟"

"جی صاحب، مجھے کتابیں بہت اچھی لگتی ہیں۔" گل زمان نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" رستم خان نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "تم پڑھتے رہو، تمہیں کوئی نہیں لے جائے گا۔"

گل زمان کو پہلی بار رستم خان اچھا لگا تھا۔

اس دوپہر کو باز خان سپلائی کا سامان لے کر آیا تو اس نے گل زمان سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے بس ایک بار اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر رستم خان سے بات کرنے میں مصروف ہوگیا۔

اس دن سپلائی کی دو بوریاں آئی تھیں۔ یہ دونوں

بوریاں ابھی اسٹور میں نہیں پہنچائی گئی تھیں۔ باز اور تمّم کچھ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اسی وقت باز خان کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ گل زمان ان دونوں سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن اس نے محسوس کرلیا تھا کہ فون سن کر وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے تمّم خان سے کچھ کہا اور دونوں کسی سے کچھ کہے بغیر سپلائی لانے والی گاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔ شاید دوسری طرف سے کوئی اہم ہی خبر سننے کو ملی تھی۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سپلائی کی بوریاں باہر ہی رہ گئی ہوں۔ کینٹین کے دوسرے ملازم گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ گل زمان نے ایک بوری کو کھینچنا شروع کردیا۔ وہ اسے اسٹور میں رکھنا چاہتا تھا۔

اسٹور میں داخل ہو کر گل زمان نے بوری کو ایک کونے میں پہنچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں نہ جانے کس طرح بوری کا منہ کھل گیا۔

چاکلیٹ، بسکٹوں کے پیکٹس کے ساتھ ساتھ بے شمار گولیاں بھی بوری سے نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ گل زمان نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، اس ماحول.... میں بندوقوں کی گولیاں اس کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کینٹین کے سامان میں ان گولیوں کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی نہ کوئی خطرناک بات ضرور تھی۔

اس نے بوری کو اچھی طرح دیکھا۔ گولیوں کے علاوہ اس میں دوعدد کلاشن کوف بھی تھیں۔

گل زمان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔ کیا ہورہا تھا یہ سب؟ یہ تو بہت خطرناک بات تھی۔ کسی اسکول میں ایسے اسلحے کا کیا کام ہوسکتا تھا۔

اسٹور میں اور بھی کئی بوریاں تھیں۔ ہوسکتا تھا کہ ان میں بھی کچھ نہ کچھ بھرا ہوا ہو۔ کیا کرنا چاہیے اسے۔ خاموش رہے یا کسی کو بتادے لیکن کو کس بتائے؟

اس کی سمجھ میں یہ بات تو آگئی تھی کہ یہ اسلحہ یونہی نہیں لایا گیا ہے۔ کوئی نہ کوئی خطرناک بات ضرور ہے۔ یہ اسکول تو بہت اچھا تھا۔ یہاں کے سب لوگ اس کے ساتھ بہت پیار اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ خاص طور پر وہ نرگس میڈم، جو اسے پوری محنت اور خلوص کے ساتھ تعلیم دے رہی تھیں۔ حالانکہ گل زمان سے ان کا کیا تعلق تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود وہ اس کے ساتھ اتنی مہربانی سے پیش آتیں۔ گل زمان کے لیے کتابیں بھی خود ہی لے کر آتی تھیں۔ وہ میڈم کو بتادے گا۔

ہاں، وہ صرف میڈم ہی کو بتا سکتا تھا۔ وہ جلدی سے اسٹور روم کے دروازے کی طرف لپکا اور اسی وقت دروازہ کھول کر وہ دونوں اندر آگئے۔ گل زمان اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

ان دونوں نے اکبر خان کو بہت کچھ سکھادیا تھا۔ رائفل کی ٹریننگ، بم استعمال کرنے کے طریقے۔ گوریلا وار۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ اکبر خان کو یہ جان کر حیرت ہوتی تھی کہ اس کے علاوہ اور بھی کئی لڑکے تھے جن کو اس قسم کی ٹریننگ دی جارہی تھی۔

وہ اس سے کہا کرتے۔ ''دیکھو اکبر خان، کیا اس دنیا پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے؟ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارے پاس بھی اپنی گاڑی ہو، دولت ہو، اپنا گھر ہو، اپنی زندگی ہو؟''

''کیوں نہیں چاہتا لیکن مجبوری ہی تو ہے۔''

''یہ مجبوری صرف اس لیے ہے اکبر خان کہ ہم جیسوں نے اپنی ہار مان لی ہے۔'' بخت آور خان کہا کرتا۔ ''انہوں نے میرا اور تمہارا حق چھین لیا ہے۔ یہ کافر لوگ ہیں۔ گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ عورتیں بیوٹی پارلرز میں جاتی ہیں۔ کلب میں جاتی ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ اسکولوں میں جاکر پڑھتے ہیں۔ فلمیں اور ٹی وی دیکھتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟''

''آپ بتائیں۔''

''یہ سب تباہی کی نشانیاں ہیں۔ خدا کا قہر آنے والا ہے اور خدا ان لوگوں سے خوش ہوگا جو ایسے لوگوں کو سزا دیں گے۔ ان کو جہنم واصل کردیں گے، سمجھ گئے۔''

اکبر خان کی سمجھ میں کچھ باتیں آتی تھیں، کچھ بالکل بھی نہیں آتی تھیں۔ اس کے علاوہ جو دوسرے لڑکے تھے، وہ کہیں اور سے آتے اور کسی اور طرف چلے جاتے۔

اس جگہ بہت سخت اصول تھے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرے گا۔ اپنے کام سے کام کرے گا۔ اس کے علاوہ کوئی کسی کو اصلی نام سے نہیں پکارے گا۔

اس کیمپ میں بخت آور خان کو طوفان کہا جاتا تھا۔ شہباز خان بارود تھا۔ اکبر خان کو کبوتر کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے نام تھے۔

کچھ لوگ آتے اور ان کے لیے کھانے پینے کی بنیادی چیزیں دے جاتے۔ یہ آنے والے بھی بہت پُراسرار قسم کے لوگ تھے۔

اکبر خان کو نہیں معلوم ہو پاتا کہ یہ کون لوگ ہیں۔

کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ اتنا ضرور تھا کہ اس کیمپ میں اکبر خان کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔

اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھا جاتا۔ اس کے لیے نئے جوڑے اور جوتے لائے گئے تھے۔ اس اڈے کے ایک کمرے میں ایک بڑا سائی وی سیٹ بھی تھا۔ ان لوگوں نے بجلی کا بھی بہت اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ ڈی وی ڈی پلیئر کے ذریعے فلمیں بھی دکھائی جاتیں۔

عام طور پر بھارتی فلمیں ہوا کرتیں۔ کبھی کبھی انگلش فلمیں بھی دکھاتے تھے۔ اس کے اپنے گھر میں تو ایسی آزادی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہاں تو ہر وقت باپ کے خوف اور اس کے ظلم کا سایہ منڈلاتا رہتا تھا۔

اس دوپہر کو وہ دونوں کیمپ سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ انہیں اب اکبر خان پر اتنا بھروسا ہو گیا تھا کہ وہ اکثر اسے چھوڑ کر... دو تین دنوں کے لیے چلے جاتے۔

اس دوران میں اکبر خان اپنی مرضی کی زندگی گزارتا۔ فلمیں دیکھتا۔ پہاڑیوں میں بھٹکتا رہتا۔ کھانے پینے کا بھی کوئی پرابلم نہیں تھا اس کے ساتھ۔ وہاں سب کچھ تھا۔

اس نے ایک دو بار اپنے گھر جانے کا ارادہ بھی کیا تھا صرف ماں سے ملنے۔ یہ دیکھنے کہ وہ بے چاری اب کس حال میں زندگی گزار رہی ہیں۔ باپ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے لیے ماں ہی سب کچھ تھی لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ جس گھر سے کوئی رشتہ ہی نہیں رہا ہے، اس گھر سے اب کیا لینا دینا۔

وہ دونوں دوسرے دن آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے۔ اکبر خان کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

اسے رات بھی تنہا گزارنی پڑی تھی۔ شروع شروع میں جب ایک بار وہ دونوں باہر گئے تو اس رات اکبر خان کو بے حد خوف محسوس ہوا تھا۔ اس ویران اور پُراسرار مقام پر وہ بالکل تنہا تھا۔

وہ ساری رات خوف سے سو نہیں سکا تھا۔ پہاڑوں کے درمیان چکرانے والی ہوائیں اسے روحوں کی چیخوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ رات خیریت سے گزر گئی تھی۔

اس کے بعد اکبر خان کو پھر کبھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ دونوں اکثر غائب ہو جاتے اور اکبر خان وہاں تنہا رہ جاتا۔

اس رات بھی اکبر خان تنہا ہی تھا۔ جب اس نے ایک عجیب سی چیز دیکھی۔ حالانکہ وہ بہت دنوں سے یہاں رہ رہا تھا لیکن اس مورت پر اس کی نظر پہلی بار گئی تھی۔

یہ ایک ایسی مورت تھی جس میں ایک ایسا انسان تھا جس کی سونڈ ہاتھی کی تھی۔ اور بقیہ دھڑ انسانوں جیسا تھا۔ اکبر خان کو یاد آیا۔ یہاں جو بھارتی فلمیں دیکھنے کو ملتی ہیں ان میں بھی ایسی ہی مورت ہوتی ہے اور لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کو گنیش مہاراج کہتے ہیں۔ گن پتی بابا کہتے ہیں لیکن وہ تو ہندو لوگ ہوتے ہیں۔ پھر یہ مورت ان دونوں کے پاس کیوں ہے؟

یہ راز اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ ان دونوں سے اس مورت کے بارے میں ضرور معلوم کرے گا۔

وہ دونوں دوسرے دن آئے۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ آنے والے لوگوں کے چہروں سے وحشت ظاہر ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے بال، بے ترتیب داڑھیاں۔

سب کے سب کمرا بند کر کے بیٹھ گئے۔ اندر شاید کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔ جو بہت دیر تک چلتی رہی تھی۔ اکبر خان کے ذہن میں جو سوال تھا، وہ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔

بخت آور خان نے اکبر خان کو بھی اسی کمرے میں بلا لیا تھا۔ اکبر خان کو بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ اتنے لوگ یہاں کیوں جمع ہوئے تھے۔

''اکبر خان۔'' شہباز خان نے اسے مخاطب کیا۔

''کل صبح ان مہمانوں کے ساتھ تمہیں جانا ہے۔'' شہباز خان نے وحشت زدہ لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

''کہاں جانا ہے بھائی؟'' وہ ان دونوں کو بھائی کہا کرتا تھا۔

''ایک خاص کام سے جانا ہے۔ ان لوگوں کو سزا دینی ہے جو راستوں سے بھٹک گئے ہیں۔ یاد رکھو، جب ہم کوئی بڑا کام کرنے لگتے ہیں تو اس وقت ہمیں کسی سے ہمدردی نہیں کرنی ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے سب برابر ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب برائیاں پھیلا رہے ہیں۔ برائیاں پھیلانے والوں کو شروع ہی میں سزا دے دی جائے تو پھر آگے چل کر بھلائی ہی بھلائی ہوتی ہے۔ خدا بھی خوش ہوتا ہے کہ ہم نے بھلائی کے راستے کے کانٹے ہٹا دیے ہیں۔''

''کہو اکبر جان، تم تیار ہو؟'' بخت آور نے پوچھا۔
''لیکن بھائی، مجھے کرنا کیا ہوگا؟''
''تم اکیلے نہیں ہو گے۔ یہ خدا کے خاص بندے بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔'' شہباز خان نے ان وحشت زدہ لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو سپاٹ چہروں کے سپاٹ تاثرات کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ دونوں بھی گل زمان کو اسٹور میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔
''تو یہاں کیوں آیا تھا؟'' ستم کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔
''وہ، وہ آپ نے بوریاں باہر رکھ دی تھیں نا، تو ان کو اندر لے کر آیا تھا۔'' گل زمان نے بتایا۔
''تجھے منع کیا تھا نا۔'' ستم نے کہا۔
''ستم خان۔'' باز خان نے مداخلت کی۔ ''جانے دو بچہ ہے۔ غلطی ہوگئی ہوگی۔''
''جی، جی صاحب، غلطی ہو گئی تھی۔'' گل زمان جلدی سے بولا۔
''کوئی بات نہیں۔'' باز خان نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''بس آئندہ سے خیال رکھنا۔''
''جی صاحب۔''
اور اچانک باز خان نے اپنے موٹے، کھردرے اور مضبوط ہاتھوں سے گل زمان کا منہ دبا دیا۔ گل زمان نے خود کو چھڑانا چاہا لیکن اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔
اس دوران ستم نے باز خان کا اشارہ سمجھ کر گل زمان کے گلے میں رسی ڈال کر بل دینا شروع کر دیا۔
گل زمان پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ وہ پھڑپھڑاتا ہوا ایک طرف گر پڑا۔ اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔
وہ دونوں کچھ دیر تک اس کی لاش کی طرف دیکھتے رہے پھر ستم نے کہا۔ ''یارا! ہم نے کہیں غلطی تو نہیں کر دی۔''
''نہیں یارا، ہم نے بالکل صحیح وقت پر یہ کام کیا ہے۔'' باز خان نے کہا۔ ''یہ لڑکا سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ یہ جا کر اسکول والوں کو بتا دیتا۔ پھر ہمارا سارا پروگرام تباہ ہو جاتا۔''
''سوال یہ ہے کہ اس کی لاش کا کیا کیا جائے؟''
''کچھ نہیں۔ اس کو یونہی پڑا رہنے دو۔ ایک دن کی تو بات ہے، کل تو ہمارے ساتھیوں کو اپنا کام کر لینا ہے۔ صرف ایک رات بیچ میں ہے۔ اس کے بعد پوری دنیا میں ہنگامہ مچ جائے گا۔''
ستم کچھ نہیں بولا۔ وہ گل زمان کی لاش کی طرف دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اس رات نرگس اور امجد کے ڈرائنگ روم میں ایک اہم موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔
اس گفتگو میں حصہ لینے والوں میں مقامی یونیورسٹی کے دو پروفیسرز کمال حسین اور امتیاز خان بھی تھے۔ یہ دونوں دردمند دل رکھنے والے پاکستانی اور اسلامی تہذیب کے غلبے کا خواب دیکھنے والے مسلمان تھے۔
پروفیسر کمال حسین کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں جذباتی نعروں کے بجائے یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنے اسلامی معاشرے کو کن بنیادوں پر استوار کر سکتے ہیں۔ معجزات کا دور ختم ہوگیا۔ ہم نعرۂ تکبیر لگا کر توپ کے سامنے نہیں کھڑے ہو سکتے۔ کیونکہ توپ ایک ٹھوس اور غیر جانبدار حقیقت ہے۔ اسے اپنا کام کرنا ہے اور وہ اپنا کام کر کے رہے گی۔''
''آپ درست کہتے ہیں۔ ہمیں حقائق کا سامنا حقائق ہی سے کرنا ہوگا۔''
''آپ کے خیال میں کسی اور پر اثر انداز ہونے کے لیے کس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے؟'' نرگس نے پوچھا۔
''دیکھیں اس وقت پوری دنیا میں مغرب نے جس قسم کی قوتیں حاصل کی ہیں ان کے کئی پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر۔

1- بین الاقوامی بینکنگ سسٹم کی مالک ہیں۔
2- تمام مضبوط کرنسیوں کو کنٹرول کرتی ہیں۔
3- بڑے عالمی خریداروں میں شامل ہیں۔
4- دنیا میں سب سے زیادہ تیار اشیا فراہم کرتی ہیں۔
5- سرمائے کی بین الاقوامی منڈیوں پر غلبہ رکھتی ہیں۔
6- بہت سے معاشروں میں نمایاں اخلاقی قیادت حاصل کرنے کے لیے کوششیں کر رہی ہیں۔
7- بڑے پیمانے پر عسکری مداخلت کی اہلیت رکھتی ہیں۔
8- بحری گزرگاہوں پر قابض ہیں۔
9- انتہائی اعلیٰ تحقیق کا اہتمام کرتی ہیں اور اس حوالے سے بے حد ارتقا پا چکی ہیں۔
10- جدید ٹیکنیکل تعلیم کے شعبے میں رہنما کردار کی حامل ہیں۔
11- خلائی رسائی پانے کے حوالے سے برتر ہیں۔

12- خلائی جہازوں کو تیار کرنے کی صنعت میں برتر ہیں۔

13- بین الاقوامی ذرائع مواصلات کے حوالے سے برتر ہیں۔

14- ہائی ٹیک ہتھیار بنانے کی صنعت میں برتر ہیں۔
اس کے علاوہ ان کے یہاں عمل اور قول میں تضاد بھی نہیں پایا جاتا جبکہ ہماری صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم نے تعلیم کو تعبیر ممنوعہ سمجھ لیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ خدا ہماری مدد کے لیے فرشتے آسمان سے اتار دے گا، ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔''

کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ بہت ہی سچا تجزیہ تھا لیکن بہت تلخ۔

''تو پھر اس کا تدارک کیسے ہو؟'' امتیاز خان نے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے علم۔'' کمال حسین نے کہا۔ ''اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم اپنی ثقافت اور تہذیب کی حد میں رہتے ہوئے بھی علم حاصل کر کے بہت آگے جا سکتے ہیں۔ فرانس اور جرمنی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔''

''لیکن ہم تو راستے بند کیے جا رہے ہیں۔'' امتیاز خان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''اسی بات کا تو افسوس ہے کہ ہمارے یہاں سیاست داں تو بہت پیدا ہو رہے ہیں، لیڈر کوئی نہیں ہے اور ان دونوں کے درمیان بہت واضح فرق ہے۔ سیاست داں اگلے الیکشن تک کا ویژن رکھتا ہے جبکہ لیڈر کا ویژن اگلی کئی نسلوں تک محیط ہوتا ہے۔''

''پروفیسر ایک بات بتائیں۔ یہ جو ہمارے ملک میں تشدد کا سلسلہ چل رہا ہے، اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں۔'' نرگس خان نے پوچھا۔

اس کی کئی وجوہات ہیں میڈم۔'' پروفیسر کمال مسکرا کر بولا۔ ''اور آپ بھی جانتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو بیرونی سازشیں ہیں، آپ کا کیا خیال ہے کہ جو لوگ یہاں اس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں، ان کی لگامیں خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہیں؟ نہیں، یہ ڈوریاں کہیں اور سے ہلائی جا رہی ہیں۔ ریموٹ کسی اور کے ہاتھوں میں ہیں۔ پیسے اور ہتھیار باہر سے آ رہے ہیں۔ ان کی باتوں میں آنے والے تو سیدھے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے لوگوں کو ہماری طرف بھیج رہے ہیں۔ انہیں قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ احادیث کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے حقیقی مسائل بتائے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس کر کے انہیں ہماری طرف بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ بے چارے سیدھے سادے لوگ ان کو اپنا رہنما سمجھ کر ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ ان کے ٹرانس میں آجاتے ہیں پھر وہی کرتے ہیں جو ان سے کہا جاتا ہے۔''

''سوال پھر وہی ہے کہ علاج کیا ہو؟'' امتیاز خان نے پوچھا۔

''وہی کہ انہیں قومی دھارے میں شامل کرلیں۔ ان بے چاروں کو یہ بتایا گیا ہے کہ جن کی ثقافت اور دین نہیں، تم سے الگ ہیں۔ وہ کافر لوگ ہیں۔ اب انہیں یہ بتانے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ثقافتوں کا اختلاف تو خوب صورت ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہیں پروفیسر۔'' امجد خان نے گردن ہلائی۔ ''جس طرح ایک چمن میں مختلف رنگوں کے پھول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ الگ لیکن ہوتے اسی چمن کا حصہ ہیں۔''

''ہاں، ہمیں یہی بات انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کُل عالمِ اسلام کے چمن میں مختلف ثقافتوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی ٹوپی پہنتا ہے، کوئی پگڑی باندھتا ہے، کسی کا لباس شلوار ہے۔ کسی نے پینٹ پہن رکھی ہے۔ ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ سب ایک خدا اور ایک رسولﷺ کو مانتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر ہم نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر ایک ہو جائیں گے۔''

نرگس ان لوگوں کے لیے دوبارہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ آج کی نشست نے بہت سے سوال سامنے کھڑے کر دیے تھے۔

مسئلہ تو سامنے تھا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ سب کیسے ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی قوم نے لیڈر نہیں بنایا بلکہ ایک بڑا لیڈر بڑی قوم بناتا ہے۔ اب ایسا لیڈر کہاں سے آنے والا ہے۔

☆☆☆

صبح ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھی۔

موسم سرما آچکا تھا۔ ہر طرف ایک خنک آمیز دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف جا رہے تھے۔

اسکول جانے والے بچے، بستے اٹھائے گرم کپڑوں میں لپٹے، منہ سے بھاپ اُڑاتے اپنے اپنے اسکولوں کی طرف جا رہے تھے۔

دفتروں کی طرف جانے والے اپنی گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور پبلک ٹرانسپورٹ پر سوار تھے۔ مزدوروں نے اس چوراہے کا رخ کیا تھا جہاں سے انہیں روزگار مل جاتا تھا۔

زندگی رواں دواں ہو چکی تھی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ اس شہر میں دکانیں بہت سویرے سے فجر کی نماز کے بعد ہی کھل جایا کرتیں اور کاروبار شروع ہو جاتا تھا۔

چائے خانے بھرے ہوئے تھے۔ آس پاس کے دکانداروں اور راہ چلتے مسافروں نے چائے کی چسکیاں لینا شروع کر دی تھیں۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن نہیں، معمول کے مطابق ہی تو نہیں تھا۔

وہ ایک کچی کوٹھری تھی۔ بہت بڑی۔ اس کوٹھری کی دیوار اسکول کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ اس کوٹھری میں اس وقت سات آٹھ آدمی جمع تھے۔

یہ وحشت زدہ چہروں کے لوگ تھے۔ جن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور جن کے بھاری لبادوں کے نیچے بھاری ہتھیار تھے۔

ان میں سے ایک نے کوٹھری میں رکھا ہوا ایک بڑا سا برما اٹھایا اور دیوار میں سوراخ کرنے لگا۔ یہ ایک جدید انداز کا برما تھا۔ ہلکی سی گھرگھر کی آواز کے ساتھ دیوار کی ایک اینٹ ٹوٹ کر نیچے گر پڑی تھی۔

گل زمان کا پریشان حال باپ اتنے سویرے بھی اسکول کے گیٹ پر کھڑا ہوا آنے جانے والے بچوں سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ گل زمان کل سے گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اسکول آ کر کینٹین کے مالک سے بھی ملا تھا۔ لیکن اس نے بتایا تھا کہ گل زمان اپنا کام ختم کر کے ہمیشہ کی طرح گھر کی طرف چلا گیا تھا۔

گل زمان کا باپ اسی لیے صبح سویرے اسکول کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ شاید کسی بچے کو اس کے بیٹے کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔

اس نے ایک دو بچوں سے پوچھا لیکن کوئی بھی کچھ نہیں بتا پایا تھا۔ اس نے نرگس میڈم سے بھی پوچھا تھا۔ جس نے یہ بتایا تھا کہ گل زمان اس دوپہر اس کے پاس پڑھنے کے لیے نہیں آیا تھا۔

وہ دونوں چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تھے جو اسی اسکول میں پڑھتے تھے ان دونوں کے ہوم ورک ابھی مکمل نہیں ہوئے تھے۔ اسی لیے وہ جلدی جلدی کینٹین کے سامنے والے درخت کے پاس بیٹھے ہوئے اپنا ہوم ورک مکمل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن ایک خلاف معمول بات یہ تھی کہ سپلائی والا باز خان وقت سے بہت پہلے سپلائی لے کر آ گیا تھا۔ اس کا آنا جانا چونکہ روزمرہ کی بات تھی اسی لیے اس پر دھیان نہیں دیا گیا تھا۔

دھوپ میں ہوم ورک مکمل کرنے والے بچوں کے لیے یہ بہت حیرت کی بات تھی کہ چھ سات انکل کینٹین کی دیوار کے اندر سے باہر آ گئے تھے۔

دونوں کو کچھ خوف بھی محسوس ہوا تھا۔ انہوں نے کلاس روم کی طرف جانے کے لیے اپنی کتابیں سمیٹ لی تھیں کہ اسی وقت ان انکلوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کیں۔ تڑتڑ کی آواز آئی اور بے رحم گولیوں نے ان معصوموں کو خون میں نہلا دیا۔ ان کی کاپیاں اور کتابیں بھی رنگین ہو گئی تھیں۔

اس کے بعد ایک قیامت مچ گئی۔

گولیوں کی آواز سن کر بچے اور ٹیچرز باہر آ گئے تھے پھر ان پر قیامت نازل ہو گئی۔ ان وحشت زدہ لوگوں نے بے دریغ گولیاں برسانی شروع کر دی تھیں۔

بچے چیختے رہے، تڑپتے رہے۔ نرگس خان نے باہر نکلنے کے عالم میں کھڑے ہوئے بچوں کو سمیٹ کر اندر کی طرف جانا چاہا کہ کینٹین کا مالک رستم اور باز خان اس کے سامنے آ گئے۔

اس سے پہلے کہ نرگس خان اپنے بچاؤ میں کچھ کر سکتی، کئی گولیاں اس کے بدن میں پیوست ہو چکی تھیں اور دم توڑتے ہوئے وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ کیا پڑھنا اور سوچنا جرم ہے۔

جب اس کی گردن ڈھلکی تو اس وقت ایک طرف سے ایک وحشت زدہ نوجوان اس کی لاش کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت حیرت اور دکھ سے نرگس کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹ کانپے۔ وہ لاش کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ رو رہا تھا۔

''ماں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''ماں! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ ادا نہیں کر سکا تھا۔'' وہ اکبر خان تھا۔ ایک کانپتا ہوا نوجوان لڑکا جو نرگس کے گھر کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا تھا اور نرگس نے اسے کھانے کے لیے کچھ دینے کے ساتھ پانچ سو کا ایک نوٹ بھی دیا تھا۔

اکبر خان کچھ دیر تک روتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لباس کے اندر پہنے ہوئے جیکٹ کی پن کھینچ لی اور ایک زوردار دھماکے کی آواز گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں شامل ہو گئی۔

سراغ رساں ایڈورڈ گیلون اتنی عجلت میں تھا کہ ہال آف جسٹس میں تیزی سے جاتے ہوئے آرائشی پودوں کے لیے رکھے ہوئے سرامک کے بڑے سے بکس نما گملے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس کا رخ جائے واردات کی جانب تھا۔

میٹل ڈیٹیکٹر کے پاس شیرف کے ڈپٹی کھڑے ہوئے تھے جو آنے جانے والوں کو چیک کر رہے تھے۔ سراغ رساں ایڈورڈ گیلون نے دور ہی سے انہیں اپنا بیج

**باریک بین ذہن کے مالک سراغ رساں کی جستجو...**

آنکھوں میں دھول جھونکنا... ایک عام محاورہ ہے... جسے آپ نے بھی خوب پڑھا اور لکھا ہوگا... مگر اس کا عملی مظاہرہ دیکھنا کسی کسی کے حصے میں آتا ہے... ایک ایسے ہی دیدہ دلیر کا کارنامہ... جو سب کے سامنے جرم کر کے اس کا اعتراف بھی کر رہا تھا...

# دیدہ دلیر

بابر نعیم

دکھلا دیا تاکہ وہ اسے چیک کیے بغیر گزرنے کی اجازت دے دیں۔ لیکن پھر ایڈورڈ کو رکنا پڑا کیونکہ اس سے آگے ایک ذیلی عدالت کے جیوری کے ممبران کا ایک گروپ میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرے بغیر سائڈ کے چھوٹے راستے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

جائے واردات سیکنڈ فلور کا مردانہ ریسٹ روم تھا۔ جب سراغ رساں ایڈورڈ گیلون دروازے پر پہنچا تو چند شناسا باوردی افسران وہاں اندر موجود تھے۔ انہوں نے سراغ رساں کو پہچان لیا۔ وہ سر کی جنبش سے انہیں سلام کرتا ہوا اندر چلا گیا۔

اس نے فرش پر پڑی ہوئی لاش پہچان لی۔ مرنے والا پراسیکیوٹر ڈینیئل لاسن تھا۔

''بے چارہ ڈینیئل۔'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔''وہ ایک اچھا آدمی تھا...... ایک اچھا پراسیکیوٹر۔''

کرائم سین انویسٹی گیٹر کیٹی میلنڈیز ڈینیئل کی لاش کے برابر میں گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ وہ بولی۔''ہمیں آلۂ قتل مل گیا ہے۔'' اس نے ایک ہینڈ گن کی جانب اشارہ کیا جو فرش پر رکھے ہوئے ایک شفاف پلاسٹک بیگ میں دکھائی دے رہی تھی۔

''کوئی گواہ؟'' ایڈورڈ گیلون نے پوچھا۔

''بظاہر ڈینیئل اور قاتل دونوں ہی یہاں تنہا تھے۔'' کیٹی نے بتایا۔

سراغ رساں ایڈورڈ بھی فرش پر جھک گیا اور آلۂ قتل کو غور سے دیکھنے لگا۔''اس پر انگلیوں کے نشانات موجود ہیں؟''اس نے جاننا چاہا۔

''کسی قسم کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے ہیں۔''

''لیکن اس کے دستے پر مٹی سی دکھائی دے رہی ہے۔''سراغ رساں نے کہا۔

''یہ دیکھی تھی۔'' کیٹی نے بتایا۔''معلوم نہیں اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔''

سراغ رساں بولا۔''جب میں یہاں آنے کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو کمپیوٹر کے لوگوں نے کہا تھا کہ وہ ڈینیئل کے حالیہ کیسز کی کراس ریفرنسنگ کر رہے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی اس سے بغض تو نہیں رکھتا تھا۔''

''یہ فہرست تو خاصی طویل ہوسکتی ہے۔'' کرائم سین انویسٹی گیٹر کیٹی نے تبصرہ کیا۔

اتنے میں ایڈورڈ گیلون کا سیل فون بجنے لگا۔

''ہیلو! گیلون اسپیکنگ۔''

''ڈیٹکٹیو، میں کمپیوٹر لیب سے جولی تھامس بول رہی ہوں۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔''جب ہم پراسیکیوٹر ڈینیئل لاسن کے حالیہ کیسز کی چھان بین کر رہے تھے تو ہمیں ایک عجیب سا ربط ملا ہے۔''

''عجیب سا؟ وہ کس لحاظ سے؟''

''زاچیری طر نام کا ایک فرد ہے جس کے بھائی چیسٹر کو چند ماہ قبل ڈینیئل لاسن نے منشیات کے سلسلے میں قتل کے الزام میں سزا دلوائی تھی۔'' جولی تھامس نے بتایا۔

''سو تمہارا مطلب ہے کہ زاچیری طر نے اپنے بھائی کا انتقام لینا چاہا ہوگا؟'' سراغ رساں نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ ایک قیاس ہے۔''

''کیا اس کا کوئی پولیس ریکارڈ ہے؟''

''اس لحاظ سے تو کوئی ریکارڈ نہیں۔ اس پر شبہ تو کیا جاتا رہا ہے لیکن کبھی اس پر منشیات کے کسی کیس سے لے کر ہتھیار استعمال کرنے کا کوئی الزام عائد نہیں ہوا۔ زاچیری طر بظاہر براہِ راست کبھی کسی گڑبڑ پھیلانے کے معاملے میں ملوث نہیں پایا گیا۔ وہ اس قسم کے معاملات میں کبھی اپنے ہاتھ پیر گندے نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن لگ یہی رہا ہے کہ چیسٹر کے معاملے میں اسی کا ذہن کارفرما رہا ہے۔ وہ کمپیوٹر کے معاملات میں خاصا طاق ہے۔''

''وہ اتنا ماہر ہے؟''

''میری خواہش ہے کہ کاش میں بھی اتنی ہی عمدہ ہوتی...... میں اب بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کسی نے جیوری شیڈولنگ کمپیوٹر کو کس طرح ہیک کرلیا تھا۔ میں نے تو کبھی کسی کو جیوری ڈیوٹی سے اجتناب برتنے کی تکلیف اٹھانے کی خاطر اس حد تک جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' جولی تھامس نے قدرے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔

''میں زاچیری کو اٹھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' سراغ رساں نے کہا۔

''اس کے لیے تمہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔'' جولی تھامس نے کہا۔''وہ کمپیوٹر کے معاملے میں طاق تو ہے لیکن بظاہر وہ اتنا ماہر ثابت نہیں ہوا کہ جیوری ڈیوٹی کے ایک ممبر کے فرائض سرانجام دینے سے معذرت کرسکتا۔ وہ اس وقت ہال آف جسٹس میں وہیں موجود ہے۔ جیوری پول کے اندر۔''

سراغ رساں نے فوراً ہی ایک باوردی افسر کو اشارہ

کیا۔ ''فوراً جیوری روم پہنچو ان میں سے کسی کو کمرا خالی کرنے نہیں دینا۔''

☆☆☆

چند منٹ بعد سراغ رساں خود جیوری روم میں داخل ہوا تو باوردی پولیس افسران نے زاچیری طر کو روکا ہوا تھا۔ وہ ایک ہارڈ پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور دو پولیس افسران اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

''مجھے یہاں کیوں روکا گیا ہے؟'' زاچیری نے پوچھا۔

''یہ عجیب سا لگتا ہے کہ جس روز وہ پراسیکیوٹر جس کے خلاف تم عناد رکھتے تھے، قتل ہوا تو تم بھی اسی روز جیوری ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔'' سراغ رساں نے کہا۔

''اتفاقات تو ہوتے ہیں۔'' زاچیری نے جواب دیا۔

''تم کئی ایک جرائم میں مشتبہ قرار دیے جا چکے ہو۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کمپیوٹر کو تمہارا نام جیوری ڈیوٹی سے اڑا دینا چاہیے تھا۔''

''مشتبہ تو قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن کبھی کوئی الزام عائد نہیں ہوا، سراغ رساں! اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ میں...... اپنے شہری فرائض کی انجام دہی کے لیے یہاں موجود نہ ہوں۔''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کمپیوٹر میں طاق ہو۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''تو اسی سبب کوئی بھی خود کو بچانے کے بجائے جیوری ڈیوٹی میں صرف اسی صورت میں شامل کر سکتا ہے کہ کمپیوٹر کے معاملات میں ایکسپرٹ ہو اور جیوری میں شمولیت سے اس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ ہو؟ وہ یہ یقین دہانی چاہتا ہو کہ ہال آف جسٹس سے پرے اس کا عین اسی وقت ذیلی عدالت میں پروگرام شیڈول ہو اور اسے یہ بھی علم ہو کہ اسے بعد میں یہیں واپس آنا بھی ہے؟''

''اگر تم مجھ پر الزام عائد کر رہے ہو تو بھلا میں کوئی بھی ہتھیار لے کر ہال آف جسٹس میں کس طرح داخل ہو سکتا تھا؟'' زاچیری طر نے پوچھا۔

''میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم نے کس صحیح طریقے سے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے جب میں یہاں آرہا تھا تو باہر موجود آرائشی پودوں کے لیے رکھے ہوئے سرامک کے بڑے سے گملے سے ٹکراتے ٹکراتے بال بال بچا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں تم نے اپنی گن پہلے سے چھپا رکھی تھی۔ میں نے اس گن کے دستے

## آرڈر

پیر استینوف ایک مشہور امریکی اداکار ہے۔ اس نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک روز میں دوپہر کو کھانا کھانے ہوٹل میں گیا۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ کافی دیر ہوگئی اور کھانا نہیں آیا۔ آدھ گھنٹے بعد میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے بیرے کو آواز دی اور غصے سے کہا۔

''میں نے جو آرڈر دیا تھا، وہ کہاں ہے؟''

نوجوان بیرے نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''آپ نے کس چیز کا آرڈر دیا تھا جناب؟''

میں نے کہا۔ ''کچھوے کے سالن کا۔''

وہ پھر جھکا اور اسی مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''اگر آپ کو جلدی تھی تو آپ نے کچھوے کے سالن کا آرڈر کیوں دیا تھا۔ خرگوش کا دیتے تو اب تک آچکا ہوتا۔''

عبدالجبار روی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور

پر ابھی بھی مٹی لگی ہوئی دیکھی ہے جو یقیناً اسی گملے کی مٹی ہے۔ جب تمہاری جیوری ذیلی عدالت سے واپس آرہی تھی تو تم نے گملے میں چھپائی ہوئی گن نکال لی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب بات تمہارے بھائی کے کاروبار کی آتی تھی تو تم اس معاملے میں کبھی بھی اپنے ہاتھ پیر گندے نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن اس کیس میں تم اپنے ہاتھ آلودہ کر چکے ہو۔''

''اگر تم اتنے ہی اسمارٹ ہو تو یہ بتادو کہ میں وہ گن ہال آف جسٹس میں کس طرح لایا ہوں گا؟'' زاچیری طر نے پوچھا۔

''جو جیوری ممبران ذیلی عدالت سے آرہے تھے انہیں میٹل ڈیٹیکٹر کو بائی پاس کرنا پڑا تھا۔ اگر وہ میٹل ڈیٹیکٹر کے اندر سے گزرتے تو ڈیٹیکٹر گن کی موجودگی کا اشارہ دے دیتا۔ پراسیکیوٹر ڈینیئل لاسن کو شوٹ کرنے کے بعد تم نے سب کی نظروں کے عین سامنے خود کو جیوری روم میں چھپا لیا۔'' یہ کہہ کر سراغ رساں نے زاچیری طر کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر اپنی جیب سے ہتھکڑی نکال کر زاچیری کے ہاتھوں میں پہناتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ اب آگے ہمیں تمہیں تلاش کرنے کی کوئی زحمت اٹھانا پڑے گی۔ تم زیر حراست ہو۔''

منصوبہ بندی... حکمتِ عملی اور پھر واردات کی عملی کارروائی... ہر چیز اپنی جگہ مکمل اور برمحل تھی... پکڑے جانے اور قابلِ گرفت امر کا کہیں اندیشہ نہ تھا... مگر... لہو... تو لہو ہے... جب رِستا ہے تو ایک قطرہ ہی بازی ڈھا دیتا ہے...

**پُراسرار ماحول میں متحیر کردینے والی مختصر کہانی...**

# قطرۂ خون

ایس... انور

''مسز انتھونی شاید اپنے کمرے میں ہیں۔'' پیٹر انتھونی نے کہا۔ ''تم ایک منٹ انتظار کرو، میں انہیں لے کر آتا ہوں۔''

کیون کے ہونٹوں پر ایک گہری صبر آزما مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ پیٹر انتھونی کو دیکھنے لگا جو پلٹ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ سارا معاملہ قدرے پُراسرار اور ناقابلِ فہم لگ رہا تھا۔ مائیک کیون سوچنے لگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ جس پر انگلی رکھ سکتا۔ اس کے باوجود اسے اس معاملے میں کچھ گڑبڑ کا احساس اسی وقت ہو گیا تھا جس لمحے پیٹر انتھونی نے پولیس اسٹیشن میں قدم رکھا تھا اور تحریری پیغام اس کے سامنے کر دیا تھا۔

یہ پیغام مسز انتھونی کے نام تھا۔ یہ ایک سپاٹ سی دھمکی تھی جس سے مائیک کیون شک میں پڑ گیا۔ نہ رقم کی جبری وصولی کا مطالبہ تھا اور نہ ہی اس قسم کی کوئی کوشش کی گئی تھی۔ بس موت کا وعدہ تھا۔ یہ ایک نرالا اور دل خراش پیغام تھا:

''وہ چیزیں جو انسان نہیں ہوتیں، وہ انسانی حیات کو پسند نہیں کرتیں۔ تم مرنے والی پہلی انسان ہوگی۔''

پیغام میں بس یہی لکھا تھا۔ یہ پیغام باریک خط میں چھپا

ہوا تھا جس کا سراغ لگانا ناممکن تھا۔

پیٹر انتھونی بہت زیادہ اَپ سیٹ تھا۔ مائیک کیون کی نظریں دبلے پتلے صاف ستھرے بے داغ لباس پہنے ہوئے پیٹر انتھونی پر مرکوز تھیں جو سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اخبارات اکثر اس کی رنگین مزاجی کی داستانیں شائع کرتے رہتے تھے جبکہ دولت اور جائیداد کی حقیقی مالکہ مسز انتھونی تھی۔

یہ لگ بھگ پندرہ سیکنڈ بعد کی بات ہے جب مائیک کیون کو وہ دل خراش چیخ سنائی دی۔

یہ ایک بلند آواز، خوف و دہشت سے بھرپور چیخ تھی جو ایک لپک دار شعلے کی طرح بلند ہوتی چلی گئی اور پھر رک گئی۔ یہ ایک نسوانی چیخ تھی۔

عین اسی لمحے پیٹر انتھونی کی چیخ بھی سنائی دی۔

مائیک کیون کے جسم کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب لپکا اور ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔ اوپر پہنچ کر وہ تیزی سے ہال وے کی جانب گھوم گیا۔

بائیں جانب کے دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کمرے سے پیلی روشنی چھن کر باہر نیم تاریک ہال کو روشن کر رہی تھی۔

مائیک کیون کی گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس روشن کمرے کے دروازے تک پہنچا اور پھرتی سے اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک زنانہ خواب گاہ تھی جو نہایت نفاست سے آراستہ تھی۔ بائیں جانب ایک بڑا سا نچلا بیڈ تھا جس پر گلابی رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ بیڈ کی پائینتی کی جانب سفید ساٹن کا ایوننگ گاؤن پھیلا ہوا تھا اور فرش پر سفید ساٹن کے ہلکے جوتے رکھے ہوئے تھے اور ان میں جوتوں کے لکڑی کے فرمے بھی موجود تھے۔

اور ان جوتوں کے پاس ایک عورت کی لاش پڑی تھی جو صرف زیرجامہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے دونوں بازو فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے حلق کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جس سے خون کا ایک قطرہ اس کے گورے بدن پر بہتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

پیٹر انتھونی ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ داہنی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے خوف زدہ سی گھٹی گھٹی رونے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ پھٹی آنکھوں سے کھلی ہوئی کھڑکی کو گھور رہا تھا۔

''وہ... وہ وہاں سے باہر نکل گیا۔'' پیٹر انتھونی نے کہا۔ ''اس نے بس چھلانگ لگائی اور...''

مائیک کیون لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ کھڑکی سے نیچے ٹائلوں والے فرش کا فاصلہ پورے پچیس فٹ تھا اور دھندلی چاندنی میں کوئی بھی شے حرکت نہیں کر رہی تھی۔

پھر وہ مسز انتھونی کی جانب پلٹ گیا۔ اس کے حلق کا سوراخ ایک چھوٹے چاقو کے پھل کے شگاف سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔

مائیک کیون نے اٹھ کر پیٹر انتھونی کی طرف دیکھا جو ابھی تک دیوار کے پاس دبکا ہوا کھلی کھڑکی کو گھور رہا تھا۔

''آل رائٹ۔'' مائیک کیون نے کہا۔ ''اب تم اداکاری چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ چاقو کہاں ہے؟''

پیٹر انتھونی نے اپنے ہونٹوں کی کپکپاہٹ روکنے کے لیے انہیں دانتوں سے دبا لیا۔ پھر بولا۔ ''وہ... وہ چاقو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''

''میرے خیال میں اس کھڑکی کے راستے۔ اور اس نے پچیس فٹ نیچے ٹائلوں کے فرش پر چھلانگ لگا دی تھی اور اسے کوئی چوٹ بھی نہیں آئی۔ کیا وہ مافوق البشر ٹائپ کی شے تھی۔ کیا ایسا ہی تھا؟''

پیٹر انتھونی کے دبلے پتلے ہینڈسم چہرے پر اب خوف کے تاثرات پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ واضح دکھائی دینے لگے۔ ''وہ انسان نہیں تھا۔''

وہ دونوں ایک طویل لمحے تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ایک بار پھر مائیک کیون کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک پُراسرار سنسنی محسوس ہونے لگی۔

''آل رائٹ۔'' اس نے کہا۔ ''تو پھر وہ کیا تھا؟''

''مجھے... مجھے معلوم نہیں۔'' پیٹر انتھونی نے کہا۔ ''جب میں کمرے میں داخل ہوا تو عین اسی وقت وہ کھڑکی سے اندر آچکا تھا۔ وہ ایک بن مانس سا دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی ہیئت اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا وہ مارتھا تک پہنچ چکا تھا اور اس نے مارتھا پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے اپنے راستے سے اچھال دیا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اس نے کھڑکی کے چھجے کو چھوا بھی نہیں۔''

''اگر وہ کھڑکی سے باہر گیا ہے تو ہم اسے تلاش کرلیں گے۔'' مائیک کیون نے کہا۔ ''اور...'' یہ کہتے ہوئے اس نے توقف کیا اور پیٹر انتھونی کو سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''اور اگر وہ ہتھیار ابھی تک یہیں پر موجود ہے تو ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

پیٹر انتھونی نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنی بیوی کی جانب یوں دیکھنے لگا جیسے اس سے پہلے اسے دیکھا نہیں تھا۔

''کیا... کیا یہ...؟''

''ہاں۔'' مائیک کیون نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ پیٹر انتھونی کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا جب اس نے ہیڈ کوارٹرز فون کیا۔

اس نے پیٹر انتھونی پر اس وقت تک مسلسل کڑی نگاہ رکھی جب تک انسپکٹر فنگر پرنٹس کے لوگ اور دیگر عملہ وہاں نہیں پہنچ گیا۔ اس نے پیٹر انتھونی کو دو افراد کی نگرانی میں چھوڑا اور انسپکٹر کو ساتھ لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں مسز انتھونی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

''یوں لگ رہا ہے جیسے یہ کہیں باہر جانے والی تھی۔'' انسپکٹر نے ایوننگ ڈریس اور شوز کی جانب سر کی جنبش سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مائیک کیون نے اسے وہ پوری کہانی سنا دی جو پیٹر انتھونی نے بیان کی تھی۔ ساتھ ہی وہ کچھ بھی جو اس کے سامنے ہوا تھا۔

''مجھے تو یہ سب فضول بکواس لگ رہی ہے۔'' مائیک کیون نے مزید بتایا۔ ''میرا قیاس یہ ہے کہ اسے اس کے شوہر نے ٹھکانے لگایا ہے۔ وہ اسے طلاق دینے والی تھی اور اس کا مطلب ایک بڑی دولت اور جائداد سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا۔''

''ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ آلۂ قتل کو تلاش کریں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے چھپا سکتا۔''

''اسے پندرہ سیکنڈ سے زیادہ مہلت نہیں ملی تھی۔''

لیکن تلاش کے باوجود انہیں آلۂ قتل نہیں ملا۔

انسپکٹر کے آدمیوں نے کمرے کو ادھیڑ کر رکھ دیا، ہر جگہ دیکھ ڈالی۔ حتیٰ کہ بیڈ کے پاس رکھا ہوا لباس اور جوتے تک جھاڑ لیے۔ پیٹر انتھونی کو بلا کر بے لباس کر کے اس کی تلاشی لے ڈالی۔

پھر انسپکٹر نے مائیک کیون کی طرف دیکھا اور مایوس لہجے میں بولا۔ ''اب کیا کریں؟''

مائیک کیون اپنی بڑی سی انگلیوں سے اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ اسے اپنی رگوں میں ایک بار پھر وہی عجیب سی سنسنی محسوس ہونے لگی۔ ''اس نے کہا تھا کہ وہ کوئی انسان نہیں تھا، یہ کہ اس نے اس کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ نیچے پچیس فٹ کے فاصلے پر اور...'' اس کا بڑا سا جبڑا لٹک گیا تھا۔ ''یہ سب فضول بکواس ہے۔''

انسپکٹر کے ساتھ آئے لوگوں نے ایک بار پھر پورا مکان اور نیچے زمین کا چپا چپا چھان مارا لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ بالآخر وہ لوگ تھک ہار کر چلے گئے لیکن مائیک کیون وہیں رکا رہا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

''وہ چیزیں جو انسان نہیں ہوتیں وہ انسانی حیات کو پسند نہیں کرتیں...'' اس نے پیغام کا جملہ دہرایا۔

لعنت ہو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ آلۂ قتل تلاش نہ کر سکے تو پیٹر انتھونی کو مجرم ثابت نہیں کیا جا سکے گا۔

مائیک کیون بیڈ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار پھر محتاط طریقے سے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر واپس آ کر دوبارہ بیڈ پر سفید ساٹن کے لباس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اپنے سیاہ رنگ کے بڑے سے جوتوں پر نظریں جما دیں۔ ان سیاہ بڑے سے جوتوں کے مقابلے میں پتلے سفید سلیپرز نہایت مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔

پھر وہ تیزی سے اٹھا اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی وہ انتھونی کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔

دو منٹ بعد وہ کمرے میں واپس آ گیا۔ پستہ قد پیٹر انتھونی اس کے ساتھ تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے صاف ستھرا بے داغ سیاہ رنگ کا سلک کا ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔

''ویل۔'' مائیک کیون نے کہا۔ ''تمہاری ترکیب نے تقریباً کام دکھا دیا تھا لیکن پوری طرح نہیں۔ تم نے خون کو صحیح طریقے سے صاف نہیں کیا تھا اور ایک قطرہ اندر سے رس گیا۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ زنانہ سلیپرز کے فرے کا ٹو گارڈ اگر علیحدہ کر دیا جائے تو وہ ایک بہترین ہتھیار بن جاتا ہے۔'' مائیک کیون نے دھیرے سے کہا۔ ''ہم نے جوتوں کو پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اس وقت تک ٹو گارڈ کے نیچے سے خون کا قطرہ نہیں رسا تھا۔ لیکن اب...'' اس نے یہ کہتے ہوئے سفید ساٹن کے سلیپرز کی جانب اشارہ کیا جہاں سرخ خون کا ایک دھبّا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

پیٹر انتھونی نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ ''آئی سی۔''

پھر وہ یوں اچھلا جیسے کسی اسپرنگ کے بل کھل جاتے ہیں۔ مائیک کیون نے اس پر قلانچ بھری لیکن وہ اس تک نہیں پہنچ سکا۔

تب تک پیٹر انتھونی کھلی ہوئی کھڑکی سے سر کے بل نیچے چھلانگ لگا چکا تھا۔ مائیک کیون نے اپنی گن نکالی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ لیکن پھر اس نے اپنی گن واپس ہولسٹر میں رکھ دی اور وہیں کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔

پھر دھیرے دھیرے کھڑکی سے پلٹ گیا۔

''وہ چیزیں جو انسان نہیں ہوتیں وہ شاید اس قابل ہوں کہ اگر پچیس فٹ کی بلندی سے نیچے پختہ فرش پر چھلانگ لگائیں تو انہیں کوئی چوٹ نہ آئے۔'' مائیک کیون نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''لیکن جو انسان ہوتے ہیں... وہ اگر اتنی بلندی سے سر کے بل پختہ فرش پر گر پڑیں تو ان کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔''

کاروبار چلانے کے لیے ذہانت کے ساتھ بروقت فیصلے کرنے کی صلاحیت بے حد اہمیت رکھتی ہے... وہ خود کو ذہین بیٹی کی عقل مند ماں سمجھتی تھی... اور بالآخر اس نے ایسا ثابت بھی کر دیا... ایک عام گھریلو عورت کی دلچسپیوں... ذہانت اور فیصلوں کی دلچسپ کتھا...

**ایک مردہ شخص کے بھوت کی صورت واپسی کا سنسنی خیز ماجرا...**

# بھوت کی واپسی

محمد عرفان آزاد

پہلی بار ایسا ہوا کہ مجھے انڈرورلڈ سے کوئی فون کال موصول ہوئی ہو۔ اس وقت میں پیاز کاٹ رہی تھی جب کچن میں رکھا ہوا سرخ رنگ کا فون بجنے لگا۔ میں نے ہی اپنے بچوں سے فرمائش کر کے سرخ رنگ کا فون سیٹ منگوایا تھا کیونکہ میں اسے خوش بختی کی علامت سمجھتی تھی۔ میں نے ایپرن سے ہاتھ صاف کیے اور ریسیور اٹھانے کے بجائے نیلے رنگ کا بٹن دبا دیا۔ اس طرح میں باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی جاری رکھ سکتی تھی۔

''میں چن یانگ ین بول رہی ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری بیٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' دوسری جانب سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

میری بیٹی چائنا ٹاؤن میں واحد پرائیویٹ سراغ رساں ہے۔ اس کا دفتر ایک دوردراز علاقے میں ہے اس لیے لوگ اپنی آسانی کے لیے گھر پر ہی فون کر کے مشورہ کر لیتے ہیں لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ وہ یہ کام جاری رکھے کیونکہ اس میں بعض اوقات بدنام اور گھٹیا لوگوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے اور اپنے کام کو مناسب طریقے سے انجام دینے کے لیے وہ دوسروں کے معاملات میں ملوث ہو جاتی ہے جو کسی عورت کے لیے ٹھیک نہیں لیکن میری بیٹی ان ٹیلی فون کالز سے بالکل پریشان نہیں ہوتی بلکہ مجھے مطمئن کرنے کے لیے کہتی ہے۔

''ماں! تم کیوں فکر کرتی ہو۔ ٹیلی فون آنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی برا شخص ہمارے گھر آرہا ہو۔''

میں اس سے بحث کرنا نہیں چاہتی ورنہ یہ ضرور کہتی کہ کوئی آئے یا نہیں لیکن اس کا پارٹنر بل اسمتھ اکثر منہ اٹھائے چلا آتا ہے جو میری نظر میں ایک گھٹیا شخص ہے اور سب سے بڑھ کر اس طرح کی فون کالز اپنے ساتھ بدقسمتی اور برے اثرات لے کر آتی ہیں جیسا کہ اس مرتبہ ہوا۔ کیونکہ میں فون کرنے والے کی آواز پہچان چکی تھی۔

''جیرالڈ تم۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے یہاں کیوں فون کیا، تم تو مر چکے ہو؟''

''تم نے مجھے پہچان لیا؟'' وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہم ایک عرصے تک پڑوسی رہ چکے ہیں۔ تم نے کئی سال تک میرے شوہر کے ساتھ مون لائٹ پویلین ریسٹورنٹ میں کام کیا ہے۔ میں نے تمہاری تجہیز و تکفین میں بھی شرکت کی تھی پھر تم کیوں واپس آگئے، کیا تم انتقام لینے کے لیے آئے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری موت طبعی نہیں تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو میری بیٹی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی، خدا حافظ۔''

اس سے پہلے کہ میں ٹیلی فون بند کرتی، جیرالڈ بول اٹھا۔ ''چن یانگ ین! رک جاؤ۔ میں انتقام لینے نہیں آیا کیونکہ میں مرا ہی نہیں بلکہ زندہ ہوں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بہت سے لوگ تمہاری موت کے عینی شاہد ہیں۔ کیا وہ سب جھوٹے ہیں؟''

''نہیں، میں نے اپنے آپ کو مردہ ظاہر کیا اور غائب ہو گیا۔''

''اور اب تم زندہ ہونے کا ڈراما کر رہے ہو۔ میں بھوتوں کی چالاکیاں جانتی ہوں۔''

''میری بات کا یقین کرو۔ اس کے لیے مجھے ایک بہت بڑی رقم معاوضے کے طور پر دی گئی تھی۔''

''گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ کسی نے تمہیں مرنے کے لیے معاوضہ دیا تھا؟''

''نہیں بلکہ اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے۔''

''اور وہ معاوضہ کتنا تھا؟''

''پچاس ہزار ڈالر۔'' اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر تمہاری موت سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو وہ اتنی بڑی رقم معاوضے کے طور پر دے گا۔''

جیرالڈ نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس کا تعلق ٹیکس اور درآمدی ڈیوٹی کے معاملات سے ہو سکتا ہے۔ انہیں ایک غیر معروف شخص کے پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔''

''جسے وہ کسی غیر قانونی مقصد کے لیے استعمال کر سکیں۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنے مسائل میں گھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے مجھے یہ پیشکش پُرکشش لگی۔''

''لہٰذا تم نے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''شاید میں پوری بات نہیں سمجھ سکا تھا البتہ میں نے وہ رقم وصول کر لی۔''

''مرنے کے لیے؟''

''نہیں، اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے۔''

''تو پھر وہی کرو جس کی تم نے قیمت وصول کی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ میں فون نہیں اٹھانا چاہ رہی تھی لیکن بھوت بڑے مستقل مزاج ہوتے ہیں اور میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ گھنٹی سارا دن بجتی رہے لہٰذا بحالتِ مجبوری فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے جیرالڈ ہی

بول رہا تھا۔
''تم مجھے اپنی بیٹی کا فون نمبر دے دو۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔''
''میں نہیں دے سکتی۔''
''کوئی بات نہیں۔ میں کسی طرح معلوم کرلوں گا۔''
''اگر تم معلوم کر سکتے تو مجھے دوسری بار فون نہ کرتے۔''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔
''مجھے اس کی ایجنسی کا نام یاد نہیں آرہا۔ بے فکر رہو۔ میں اسے معقول معاوضہ ادا کروں گا۔''
''یہ تو اسی وقت ہوگا اگر تم اسے تلاش کرسکو۔''
''اسی لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''
''لیکن ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''میری بیٹی ایک بھوت کے معاملے میں پڑنا پسند نہیں کرے گی اس لیے تمہیں اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا ایک بیٹا اور بہو بھی ہے۔ اگر تمہیں ان کے نام یاد ہیں تو انہیں فون کرو۔''
''میں انہیں فون نہیں کرسکتا، مجھے اس کے لیے منع کیا گیا ہے۔''
''کس نے منع کیا ہے۔ ان لوگوں نے جن سے تم نے پیسے لیے تھے؟''
''ہاں۔''
''تو پھر جو تمہارا دل چاہے۔''
''فون بند مت کرنا۔ میں اپنے گھر آنا چاہتا ہوں۔''
میں نے جیرالڈ کو اپنی بیٹی کا نمبر نہیں دیا۔ کوئی بھی ماں ایک بھوت کو اپنے بچوں کے قریب نہیں آنے دے گی۔ بہرحال میں ایسی عورت نہیں ہوں جس کے دل میں رحم نہ ہو اور نہ ہی بے وقوف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس نے ہمیشہ بیدردی سے پیسا خرچ کیا حالانکہ وہ اچھا خانساماں تھا لیکن میرا شوہر جیسا نہیں۔ میرے شوہر نے گھر چلانے کے ساتھ ساتھ اتنی رقم پس انداز کر لی کہ مون لائٹ پولینین ریسٹورنٹ میں شراکت دار بن سکے لیکن اس کی وفات کے بعد میں نے اپنا حصہ بیچ دیا کیونکہ ریستوران کے مالکان بدل گئے تھے۔ میرے کچھ رشتے داروں کا خیال تھا کہ مجھے اپنے حصے کی اونچی قیمت لگانا چاہیے تھی لیکن میں لالچی عورت نہیں ہوں۔ مجھے ذہنی سکون چاہیے تھا جو نئے مالکان کے ساتھ ممکن نہ تھا۔
گو کہ اس بات کو کئی سال ہو گئے تھے لیکن اب مجھے

## زندہ باد

ایک فرنچ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ پاکستان کی سیاحت پر آیا۔ وہ دونوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے صدر سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان پر بجلی کے ننگے تار آگرے۔ انہیں ایک خوفناک جھٹکا لگا اور پھر کچھ بھی نہ ہوا... لوڈ شیڈنگ شروع ہوگئی تھی۔ دونوں نے بے اختیار اچھل اچھل کر نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ''پاکستان زندہ باد... کے الیکٹرک پائندہ باد!''
نہ ہوتی یہ لوڈ شیڈنگ تو دونوں بے چارے جل بھن کر راکھ ہو گئے ہوتے۔

لاہور سے شاہدہ گلزار کی دریافت

اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ فیصلہ صحیح تھا۔ نئے مالکان چانگ برادران کے بارے میں خبر گشت کر رہی تھی کہ انہیں کاروبار میں تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کا گھاٹا ہوا ہے گو کہ انہوں نے اپنی زبان بند رکھی ہوئی تھی لیکن لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کسی کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ رقم ایک کاروبار میں لگائی تھی جو ڈوب گئی جبکہ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ پیسے چوری ہو گئے تھے۔ ایسی سرگوشیاں بھی سننے کو ملیں کہ وہ ڈویژر اسٹریٹ پر بیٹھنے والے ساہوکاروں کے پاس بھی ادھار لینے گئے تھے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو افواہوں پر دھیان دیتے ہیں۔ البتہ اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے کافی عرصے پہلے چانگ برادرز سے جان چھڑالی تھی۔
البتہ جیرالڈ اپنی عاقبت نااندیشی اور فضول خرچی کی وجہ سے مون لائٹ پولینین ریسٹورنٹ کی ملازمت کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنی کمائی کا ایک ایک ڈالر ان چینیوں پر ضائع کر دیتا جس پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ اس نے ڈویژر اسٹریٹ کے ساہوکاروں سے بھی ایک سے زائد مرتبہ قرض لیا تھا اور مرتے وقت بھی وہ ان کا مقروض تھا۔ کچھ لوگوں کو یہ بھی شبہ تھا کہ راؤنڈ چونگ نامی ساہوکار کا ضبط جواب دے گیا اور اسی نے جیرالڈ کو قتل کیا تھا جب میں نے اس پر غور کیا تو مجھے یہ ایک فضول سا آئیڈیا لگا۔ راؤنڈ چونگ کوئی احمق شخص نہیں ہے۔ وہ اپنے گاہک کو کیوں قتل کرے گا۔ زندہ جیرالڈ سے تو قرض واپس ملنے کی

امید تھی۔ مردہ لوگ کہاں سے ادائیگی کریں گے؟

جیرالڈ کے گزشتہ طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ وہ میری بیٹی کو تلاش کرنے سے باز نہیں آئے گا اور ممکن ہے کہ اس میں کامیاب بھی ہو جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ کوئی سنگ دل عورت نہیں ہوں۔ ہر شخص کے دل میں گھر آنے کی آرزو مچلتی رہتی ہے چنانچہ میں نے جیرالڈ سے کہہ دیا کہ اس کے معاملے کی تحقیقات میں خود کروں گی۔ اس سے پہلے بھی ایک موقع پر اپنی بیٹی کو ایک نفرت انگیز عورت سے دور رکھنے کے لیے جو اس کی خدمات حاصل کرنا چاہ رہی تھی، میں نے اس معاملے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے وہ مسئلہ بہت سادہ سا لگا اور میں نے اسے ڈنر سے پہلے حل کر لیا لیکن میری بیٹی کو اس سے خوشی نہیں ہوئی اور اس نے مجھ سے کہا کہ سراغ رسانی کے کام میں نہ پڑوں۔

''کیوں؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔ ''کیا یہ خطرناک ہے؟''

اس سے پہلے میں نے جب بھی اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ یہ فضول کام چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کی ملازمت کر لے تو اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ اس میں کوئی خطرہ نہیں اور وہ مکمل طور پر محفوظ ہے لیکن اس روز اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ میں نے بھی اس پر زیادہ زور نہیں دیا لیکن اس سے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا۔

اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں تیار ہو کر گھر سے نکلی اور راؤنڈ چونگ کے دفتر کی طرف چل دی جو ڈوئیرز اسٹریٹ پر ہی واقع تھا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ میں نے اس کے سیکریٹری کو بتا دیا تھا کہ جلدی میں ہوں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ سیکریٹری نے تفہیماً سر ہلایا اور مجھے راؤنڈ چونگ کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں کوئی نئی گاہک ہوں جو بھاری سود پر کچھ رقم قرض لینے آئی ہے۔ کم از کم میرے حلیے سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

راؤنڈ چونگ نے خیر مقدم کرتے ہوئے میری خیریت دریافت کی اور مجھے چائے کی پیشکش کی جو میں نے فوراً قبول کر لی کیونکہ انکار کرنا بداخلاقی کے زمرے میں آتا۔ ویسے بھی اس نے جس چائے کا نام لیا وہ کافی مشہور اور قیمتی تھی اور مجھے بھی اسے پینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں نے چائے کی تعریف کی تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یہ چائے پسند آئی۔ اب بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ کیا تم نے جیرالڈ کو قتل کیا تھا؟''

راؤنڈ چونگ نے مجھے حیرت سے دیکھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اس طرح کا سوال کرنے کے لیے کس نے یہاں بھیجا ہے؟''

''جیرالڈ نے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''مجھے حیرت ہو رہی ہے کیونکہ وہ تو مر چکا ہے۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں کہ تم حیران ہو رہے ہو لیکن میں نہیں بلکہ جیرالڈ یہ جاننا چاہ رہا ہے۔ اس کے بھوت نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ جاننا چاہ رہا ہے کہ اسے کس نے قتل کیا؟''

میں عام طور پر جھوٹ نہیں بولتی لیکن اس کیس میں تھوڑی سی غلط بیانی کرنا پڑ گئی۔ جیرالڈ نے مجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ وہ تو اپنے مرنے کا اعتراف بھی نہیں کر رہا تھا بلکہ اس نے کہا تھا کہ اس کا لاٹری میں ایک بڑا انعام نکلا ہے اور اب وہ اس قابل ہے کہ اس نے اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے جو معاوضہ لیا تھا، وہ واپس کر سکے۔

''میرا بیٹا بھی باپ بن گیا ہے۔'' اس نے کہا تھا۔ ''میں پیسے واپس کر کے مردہ ہونے کا ڈھونگ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ دوبارہ زندگی کی طرف واپس آ جاؤں اور اپنے پوتے کو دیکھ سکوں۔''

''اس کے لیے تمہیں سراغ رساں کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ تم یہ رقم خود بھی واپس کر سکتے ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ ادائیگی کس کو ہو گی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر منظرِ عام پر آ گیا تو وہ سمجھیں گے کہ میں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ مجھے اس بارے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''تمہارا معاہدہ یہی تھا کہ پیسے لو اور ہمیشہ کے لیے مردہ ہو جاؤ؟''

''ہاں بہت سے لوگ اسی طرح اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرتے ہیں لیکن میں تو اس کے بعد بھی بھاگ رہا ہوں جب سے میں نے ٹائیگر چاؤ کو دیکھا ہے۔''

''ٹائیگر چاؤ؟ تمہارا کزن جو مون لائٹ پویلین ریسٹورنٹ پر چانگ برادران کا باڈی گارڈ ہے اور مون اسٹریٹ پر رہتا ہے۔ کیا تم مرنے کے بعد بھی چائنا ٹاؤن میں ٹھہرے رہے؟''

جولائی 2015ء کے پاکیزہ کے خوش کُن انداز

# ماہنامہ پاکیزہ کراچی

**نگہت سیما** کے ناول **اعتبار وفا** کی انکشافات سے پُر نئی قسط

**قیصرہ حیات** کا نیا سلسلے وار ناول...... **آخری امید** بالکل ایک اچھوتے اور پُراثر بیان کے ساتھ

**زندگی خاک نہ تھی** ...... **شیریں حیدر** کا نیا منی ناول

**متاع دل** میں **نبیلہ ابر راجا** نے نمایاں کیے کچھ انوکھے رنگ

عبادات و معاملات کی اصل روح سے آگاہ کرتی **سارہ ملک** کی بے حد دلنشیں تحریر

**خشیت الٰہی**
پر **اختر شجاعت**
کا ایک پُرفکر مضمون

اس کے علاوہ پڑھیے **فرحین اظفر، نگہت اعظمی، سحرش رانی، بشریٰ گوندل، سویرا فلک، ریحانہ حسن، نور عین** و دیگر مایہ ناز رائٹرز کی پُرلطف کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ معلومات اور تفریح سے پُر مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

''ظاہر ہے کہ نہیں، جن لوگوں نے مجھے پیسے دیے، ان کا کہنا تھا کہ میں کہیں دور چلا جاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن اپنی تدفین کے فوراً بعد ہی میں نے ٹائیگر جاؤ کو یہاں دیکھا۔''

''گویا تم چائنا ٹاؤن میں نہیں بلکہ کہیں اور ہو؟''

''ہاں لیکن میں شاید تمہیں اس بارے میں کچھ نہ بتا سکوں۔''

''تمہیں اپنے سراغ رساں کو ہر بات بتانا ہوگی اگر کچھ چھپاؤ گے تو تمہارے کیس کی تحقیقات کس طرح ہوں گی؟''

''میں نے سوچا تھا کہ تمہاری بیٹی میری سراغ رساں بنے۔''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ بھوتوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ تمہیں جو کہنا ہے مجھ سے کہو۔''

جیرالڈ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں میامی فلوریڈا میں ہوں۔ میں نے اس جگہ کا انتخاب بہتر موسم اور بہت اچھے گھڑ دوڑ کے میدانوں کی وجہ سے کیا۔ تم تو جانتی ہو کہ میں گھڑ دوڑ کا کتنا شوقین ہوں۔''

''مجھے یاد ہے کہ تم اپنی کمائی کا بیشتر حصہ گھوڑوں کی ریس پر لٹا دیتے تھے۔ میں بھی میامی سے واقف ہوں۔ ایک دفعہ میرے شوہر ہمیں وہاں لے گئے تھے۔ واقعی وہ خوب صورت جگہ ہے۔''

''ہاں، یہ میری پسندیدہ جگہوں میں سے ایک ہے۔ میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں اور میرا کزن بھی یہاں آکر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اسے یہاں دیکھ کر میں بہت خوش ہوا لیکن پھر اپنا عہد یاد آگیا اور مجھے ایک بار پھر چھپنا پڑ گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نے دیکھ نہ لیا ہو۔ لگتا تو یہی تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے لیکن اس نے مجھے آواز نہیں دی اور نہ ہی میرا تعاقب کیا لٰہذا میں فرض کیے لیتا ہوں کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ یقین جانو کہ میں نے اپنے عہد پر قائم رہنے کی پوری کوشش کی لیکن اب میں اس آنکھ مچولی سے تنگ آچکا ہوں اور اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ اب تو میری لاٹری بھی نکل آئی ہے۔ لٰہذا میں نے گھر واپس آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔ اب مجھے ایک بات اور بتا دو۔ تمہیں یہ رقم کس ذریعے سے ملی تھی؟''

''ایک بڑے سے سرخ لفافے میں۔ جس پر صرف میرا نام لکھا ہوا تھا اور کچھ نہیں۔ میں نے اس لفافے کو اپنے لیے خوش قسمتی جانا اور اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔ اب رقم واپس کرنے کے لیے میں یہی لفافہ استعمال کروں گا۔''

''نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے بلکہ یہ لفافہ مجھے بھیج دو۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اسے میں اپنے لیے خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔''

''اس کے ساتھ ہی ان واقعات کی تفصیل بھی تحریری طور پر بھیجو گے جو تم نے ابھی بیان کیے ہیں۔ کیا تمہارے پاس اپنی مُہر ہے۔''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اس بیان پر اپنی مہر بھی لگا دینا۔ یہ دونوں چیزیں مجھے آج ہی بھیج دو۔''

اب میں راؤنڈ چونگ کے دفتر میں بیٹھی جیرالڈ کے کیس پر غور کر رہی تھی اور میرے ذہن میں ایک ہی سوال ابھر رہا تھا کہ کیا ایک ایسے شخص کی مدد کرنا مناسب ہوگا جو دنیا والوں کے لیے مر چکا ہو لیکن مجھے اپنا کام تو کرنا ہی تھا۔ چاہے جیرالڈ یہی سمجھتا رہے کہ میری بیٹی اس کے لیے کام کر رہی ہے۔

''چن یانگ ین۔'' راؤنڈ چونگ نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تم نے جیرالڈ کا بھوت دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تو مجھے یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ہاں، میری بات غور سے سنو۔ میں نے اسے نہیں دیکھا بلکہ اس نے مجھے فون کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جیرالڈ کا بھوت ہی تھا جبکہ وہ اس سے انکار کر رہا تھا۔''

''یعنی بھوت کا کہنا تھا کہ وہ جیرالڈ نہیں ہے۔''

''نہیں، جیرالڈ نے کہا کہ وہ بھوت نہیں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ نہیں مرا بلکہ کسی شخص نے اسے پیسے دے کر روپوش ہوجانے کے لیے کہا چنانچہ اسے اپنے مرنے کا ڈراما کرنا پڑا۔'' میں نے اپنی آواز اونچی کی اور بولی۔ ''اب وہ ایسی جگہ پر ہے جہاں بہت عمدہ گھڑ دوڑ کے میدان ہیں۔ اس نے مجھے اس جگہ کا نام بھی بتا دیا۔ تم جانتے ہو کہ وہ ہمیشہ سے ہی گھوڑوں پر شرطیں لگانے کا عادی ہے۔''

''ہاں، اس نے کبھی صحیح گھوڑے کا انتخاب نہیں کیا اور ہمیشہ ہارتا رہا۔ تم اور چائے لو۔ تمہیں یاد ہے کہ اس نے کس جگہ کا نام لیا تھا۔''

''نہیں، تم چند ایسی جگہوں کے نام لو جہاں اچھے گھوڑ

دوڑ کے میدان ہیں۔ شاید مجھے یاد آجائے۔''
اس نے چند ایسے نام لیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے پھر ایک نام پر میں نے اسے روک دیا۔
''ہالی وڈ۔'' میں نے دہراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میرا خیال ہے کہ اس جگہ کا نام بھی انگریزی کے حروف ایچ، سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک گرم جگہ ہے اور اس کا کہنا تھا کہ اسے سورج کی روشنی پسند ہے۔''
'سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ ڈھونگ رچانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' راؤنڈ چونگ نے کہا۔
''تم جانتے ہو کہ وہ عقل مند آدمی نہیں تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ خود بھی اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ شاید کسی کو اس کے پاسپورٹ کی ضرورت ہو، بہر حال وہ اس کی وضاحت نہیں کرسکا۔ تاہم اس کا کہنا تھا کہ اب اس بات کی اہمیت نہیں رہی۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کی گمشدگی سے کسے فائدہ پہنچا۔ بہر حال کیونکہ وہ مر چکا ہے اور اس کا بھوت مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے تو میں اس کی مدد نہیں کروں گی کیونکہ وہ زیادہ عقل مند نہیں ہے۔ اس لیے اس نے اپنے بارے میں یہ پیچیدہ کہانی گھڑی ہے لیکن اب مجھے اس معاملے سے دلچسپی ہوگئی ہے۔ اس لیے میں تم سے جاننا چاہ رہی ہوں کہ اگر تم نے جیر اللہ کو قتل نہیں کیا تو پھر اس کا قاتل کون ہے؟''
''نہیں۔'' راؤنڈ چونگ نے کہا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''
میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کھڑی ہوگئی۔ وہ اخلاقاً مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا اور امید ظاہر کی کہ ہماری جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی۔ گو کہ میں دو کپ چائے پی چکی تھی۔ اس کے باوجود قریب میں واقع ٹی پارلر میں چلی گئی۔ جہاں میں نے ادائیگی کر کے نوڈلز خریدے اور ایک ایسی میز پر بیٹھ گئی جہاں سے باہر کا منظر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ ابھی میں نے نوڈلز کھانا شروع کیے ہی تھے کہ راؤنڈ چونگ کا سیکریٹری عمارت سے باہر آتا دکھائی دیا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور ویٹر سے کہا۔ ''یہ نوڈلز سنبھال کر رکھ دو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''
سیکریٹری کا رخ مون لائٹ پولین ریسٹورنٹ کی جانب تھا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور ملبری اسٹریٹ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگی۔ اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے کیشیئر سے کچھ کہا جس نے ایک شخص کو بلا کر سیکریٹری کو اس کے ساتھ اندر بھیج دیا۔ چانگ برادرز کا دفتر کچن کے عقب میں واقع تھا۔ تھوڑی دیر بعد سیکریٹری واپس آیا تو اس کے ساتھ آنے والے شخص کو دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ ٹائیگر چاؤ تھا۔
یہ سب میری توقع کے مطابق تھا۔ میں واپس ٹی پارلر آئی اور اپنے نوڈلز ختم کرنے لگی۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں ملبری اسٹریٹ پر واقع ہونگ جن شان ہوم گئی جو مردوں کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرتے ہیں۔ وہاں میری ملاقات یونگ لی سے ہوئی جس نے چند برس قبل ہی اس ادارے کا انتظام سنبھالا تھا۔ اس نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا اور میرے لیے چائے منگوائی گو کہ مجھے بالکل خواہش نہیں تھی لیکن انکار کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ میری پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔
''کیا تم انتظامات کے سلسلے میں کوئی بات کرنے آئی ہو؟''
''کیسے انتظامات؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''
وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اپنے پیاروں کے لیے اس سے اچھا تحفہ کوئی نہیں ہوسکتا کہ آپ پہلے سے اپنی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرلیں۔ اس طرح غمزدہ رشتے داروں کو مشکل وقت میں فیصلہ کرنے کی زحمت سے بچایا جاسکتا ہے۔''
مجھے غصہ آگیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے مرنے کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے تنک کر کہا۔ ''میں یہاں اپنی تجہیز و تکفین کے انتظامات کے بارے میں بات کرنے نہیں آئی۔ یہ ذمے داری میرے بچوں کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وقت آنے پر وہ اسے بخوش اسلوبی سے انجام دیں گے۔ میں صرف تم سے ایک سوال پوچھنے آئی ہوں۔''
یونگ لی پلکیں جھپکانے لگا۔ شاید اسے میری جانب سے اس شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی، وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''
''جیر اللہ کی آخری رسومات یہیں ادا ہوئی تھیں۔ میں بھی اس وقت موجود تھی لیکن میرا سوال یہ ہے کہ تم نے یہ کیسے جان لیا کہ وہ جیر اللہ ہی تھا۔ کیا تم اسے پہچانتے تھے؟''
''نہیں، ہم اپنے طور پر کوئی شناخت نہیں کرتے۔ ہمیں جیر اللہ کی لاش مردہ خانے سے وصول ہوئی تھی۔ وہیں اس کی شناخت ہوئی ہوگی۔''

''شناخت کرنے والا کون تھا؟ اس کا بیٹا یا بہو؟''

''مجھے یاد نہیں لیکن میں دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر کی طرف مڑا اور اس پر چند الفاظ ٹائپ کرنے کے بعد بولا۔ ''لاش کی شناخت اس کے کزن ٹائیگر چاؤ نے کی تھی۔''

میں نے یونگ کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلی آئی۔ دوسری صبح مجھے ڈاک سے جیرالڈ کا بھیجا ہوا سرخ لفافہ مل گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اسمتھ کا نمبر ملایا۔ وہ صبح سویرے میری آواز سن کر پریشان ہوگیا اور بولا۔ ''مسز چن خیریت تو ہے۔ لائیڈیا ٹھیک ہے نا؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس وقت وہ یہاں نہیں ہے۔ مجھے ایک معاملے میں تمہاری مدد چاہیے۔''

''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں ایک لفافہ بھیج رہی ہوں۔ اس پر جو انگلیوں کے نشانات ہیں، میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کس کے ہیں۔''

''تم نے مجھے کیوں فون کیا۔ یہ بات اپنی بیٹی سے کیوں نہیں کی؟''

''میں یہ ضروری نہیں سمجھتی۔ تم چاہو تو اسے بتا سکتے ہو۔''

مجھے دو دن انتظار کرنا پڑا۔ بل اسمتھ کی رپورٹ توقع کے مطابق تھی۔ میرے لیے یہ اطلاع اس لیے بھی مفید تھی کہ اس طرح میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ گو کہ بل اسمتھ کی رپورٹ کے بغیر ہی میں یہ کیس حل کرچکی تھی اور اس نے مجھے محض ایک ثبوت ہی فراہم کیا تھا۔

''مجھے تمہاری مدد کرکے خوشی ہوئی مسز چن۔'' اس نے مجھے فون پر کہا۔ ''کیا میں تمہیں تحریری رپورٹ بھیج دوں۔''

''ہاں، وہ رپورٹ مجھے بھیجنا، میری بیٹی کو نہیں اور لفافے پر تمہارا نام بھی نہیں ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ کیا تم بتاؤ گی کہ یہ کس بارے میں ہے؟''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ بہت بہت شکریہ اور خدا حافظ۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

تحریری رپورٹ کی صورت میں ایک مستند ثبوت مل جاتا لیکن فی الحال مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایک بار پھر باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ گھر کو تالا لگایا اور مون لائٹ ریسٹورنٹ کی جانب چل دی، ڈائننگ ہال میں پہنچ کر میں نے چانگ برادرز سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ایک گائیڈ نے مجھے کچن کے عقب میں بنے ہوئے دفتر تک پہنچا دیا۔ میری توقع کے مطابق وہ ٹائیگر چاؤ نہیں تھا۔

''چن یانگ ین۔ تم یہاں کس لیے آئی ہو۔ جب سے ہمارا کاروباری تعلق ختم ہوا ہے، اس کے بعد میں نے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔'' چھوٹے بھائی سی سی چانگ نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دوسرا بھائی ٹی ٹی چانگ بھی وہاں موجود تھا لیکن وہ اس طرح لاتعلق بنا بیٹھا رہا جیسے اس کے پاس میرے لیے کوئی وقت نہ ہو۔ گائیڈ کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

''میں یہاں کھانا کھانے نہیں آئی۔ البتہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں حال ہی میں بھاری مالی نقصان ہوا ہے۔''

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ سی سی یانگ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی، ہم......''

''معاف کرنا، میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مجھے بہت سے کام کرنا ہیں۔ تمہیں مالی نقصان ہوا ہے اور میں جانتی ہوں کہ یہ رقم کہاں گئی اور تمہیں بھی اس کا پتا ہے۔''

سی سی چانگ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے بھائی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور میری جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو تو بہتر ہوگا کہ ہمیں ابھی سب کچھ بتا دو۔''

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہاری تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ورنہ یہ دھمکی آمیز لہجہ اختیار نہ کرتے۔ میں یہاں کیوں آئی ہوں۔ صرف یہی بتانے کہ اس بارے میں کیا جانتی ہوں۔''

یہ کہہ کر میں خاموش ہوگئی اور ٹی ٹی چانگ سمجھ گیا کہ میں اس کے دوبارہ کرسی پر بیٹھنے تک کچھ نہیں بولوں گی۔ جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو میں نے کہنا شروع کیا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ رقم جیرالڈ نے چرائی ہے اور تم نہیں سمجھتے کہ وہ مر چکا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ اس نے مرنے کا ڈراما اس لیے رچایا کہ تمہاری رقم چوری کرسکے۔ تم کسی حد تک صحیح ہو لیکن ایک بات بھول گئے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ تم یہ ریسٹورنٹ چلا رہے ہو، اب یہاں کا کھانا پہلے جیسا نہیں رہا، میرے شوہر کے زمانے میں لوگ دور دور سے یہاں کھانا کھانے آتے

تھے۔"

"برائے مہربانی کھل کر بات کرو۔ تم اس بارے میں کیا جانتی ہو۔" سی سی چانگ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنے بھائی کو اس طرح دیکھا جیسے اسے خاموش رہنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ ٹی ٹی چانگ دانت پیس کر رہ گیا۔

"مجھے جیر اللہ کے بھوت نے فون کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بات تم پہلے سے جانتے ہو کیونکہ راؤنڈ چونگ کا سکریٹری یہاں آیا تھا اور اس نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ اس کے بعد ہی تم نے ٹائیگر چاؤ کو جیر اللہ کی تلاش میں ہالی وڈ کیلی فورنیا بھیجا۔"

دونوں بھائیوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں میری معلومات پر حیرت ہو رہی تھی لیکن وہ خاموش رہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بدقسمتی سے ٹائیگر چاؤ کا یہ طویل سفر رائگاں گیا کیونکہ جیر اللہ ہالی وڈ میں نہیں ہے۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا......" ٹی ٹی چانگ نے بولنا شروع کیا۔

"ہاں، میں نے دو وجوہات کی بنا پر راؤنڈ چونگ سے جھوٹ بولا تھا۔ پہلی وجہ تو یہ کہ میں اپنے شبہے کی تصدیق کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ تمہیں جیر اللہ کی جگہ کے بارے میں باخبر کر دے گا۔ تم اس کے یا اس کے ساتھیوں کے ساتھ کاروبار کرتے ہو لہٰذا اس نے بھی اپنے سکریٹری کو اس اطلاع کے ساتھ یہاں بھیج کر تم پر احسان کیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب میں یہاں آؤں تو ٹائیگر چاؤ موجود نہ ہو۔"

"تم ایسا کیوں چاہ رہی تھیں؟" سی سی چانگ نے پوچھا۔

"کیونکہ یہ ٹائیگر چاؤ ہی ہے جس نے تمہاری رقم چرائی تھی۔"

"ناممکن۔" ٹی ٹی چانگ نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ٹائیگر چاؤ کئی سالوں سے ہمارا دوست اور بااعتماد ملازم ہے۔ یہ رقم جیر اللہ نے ہی چرائی ہے۔"

"اوہ، گویا تم اعتراف کرتے ہو کہ تمہاری رقم چوری ہوئی ہے، شکریہ۔ اب یہ گفتگو تیزی سے آگے بڑھ سکے گی۔ اب میں ایک سوال کرتی ہوں۔ تمہیں یہ شبہ کیونکر ہوا کہ جیر اللہ مرا نہیں بلکہ تمہاری رقم لے کر فرار ہو گیا ہے؟"

ٹی ٹی چانگ نے ایک بار پھر مجھے گھورا جیسے اسے میرا سوال پسند نہ آیا ہو لیکن کچھ کہنے کے بجائے بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ سی سی چانگ نے آہستہ سے کہا۔ "ٹائیگر چاؤ نے ہمیں بتایا تھا کہ اسے جیر اللہ پر شبہ ہے۔ گو کہ وہ اپنے کزن پر الزام لگانا پسند نہیں کرتا لیکن اس کی بنیادی وفاداری ہم سے ہے۔"

"اگر یہ بات تھی تو یونگ لی نے کیسے یقین کر لیا کہ جس لاش کی وہ آخری رسومات ادا کر رہا ہے، وہ جیر اللہ کی ہے۔"

"ٹائیگر چاؤ کا کہنا تھا کہ جیر اللہ کی باقیات کو اس کے ایک اور کزن نے شناخت کیا تھا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ جیر اللہ نے اپنے اس کزن کو پانچ ہزار ڈالر دیے تھے تاکہ وہ اس لاش کی شناخت کے بارے میں جھوٹ بولے۔ ٹائیگر چاؤ نے اس کزن سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔"

"تمہیں غلط معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ٹائیگر چاؤ کی کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی اور جس کزن نے جیر اللہ کی لاش شناخت کی وہ خود ٹائیگر چاؤ ہی تھا۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔" ٹی ٹی چانگ نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیے بہت آسان ہے کہ حقائق کو جھٹلا دو لیکن سچ یہی ہے کہ ٹائیگر چاؤ نے تمہاری رقم چرائی تھی۔ میرے پاس بینک ریکارڈ ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک بینک اکاؤنٹ ایسا ہے جو اس کے اپنے نام پر نہیں۔ امریکا میں ایسا ہوتا ہے اور ایسے اکاؤنٹ کے ساتھ مختلف نمبر جڑے ہوتے ہیں جن سے بالآخر اصل مالک کا پتا چل جاتا ہے۔"

"یہ تم نے معلوم کیا ہے تم نے......" ٹی ٹی چانگ اس طرح بولا جیسے میں نے کوئی غیر یقینی بات کہہ دی ہو۔ "تم یہ سب کس طرح کر سکتی ہو؟"

"شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میری بیٹی ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہے۔ میں اکثر اس کے ساتھ کام کرتی ہوں اور ایک ذہین سراغ رساں کے لیے کسی خفیہ اکاؤنٹ کا پتا لگانا کوئی مشکل کام نہیں لیکن اس اکاؤنٹ کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات اس میں موجود رقم ہے۔"

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی۔ اس مرحلے پر تھوڑا ڈرامائی انداز اختیار کرنا چاہ رہی تھی اور یقین کرنا چاہتی تھی کہ دونوں بھائی میری بات توجہ سے سن رہے ہیں۔ میں نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔ "تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ چاؤ کے خفیہ اکاؤنٹ میں ساڑھے چار لاکھ ڈالر

موجود ہیں۔"

چانگ برادرز نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے چہرے حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"تمہاری گمشدہ رقم جس کے بارے میں تمہیں شبہ ہے کہ وہ جیرالڈ نے چرائی، وہ پانچ لاکھ ڈالر تھی۔ اس میں سے پچاس ہزار ڈالر جیرالڈ کو دیے گئے تاکہ وہ کہیں غائب ہوجائے اور اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرے۔ اس نے ان تمام واقعات کی تفصیل اپنی مہر کے ساتھ مجھے لکھ کر بھیجی ہے جن کے تحت اسے یہاں سے جانا پڑا۔ یہ تحریر میرے قبضے میں ہے لیکن اس وقت میرے پاس نہیں اس لیے آرام سے بیٹھے رہو اور مجھے اپنی بات ختم کرنے دو۔ یہ پچاس ہزار ڈالر ٹائیگر چاؤ نے ہی جیرالڈ کو دیے تھے۔"

"چن یانگ ین۔" سی سی چانگ نے کہا۔ "تم ایک مفرور شخص کی تحریر کی بنیاد پر کسی پر چوری اور دھوکا دہی کا الزام ثابت نہیں کرسکتیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کسی ثبوت کے بغیر اتنا بڑا الزام عائد کرسکتی ہوں۔ اگر ثبوت نہ ہوتا تو یہاں کیوں آتی۔ جس لفافے میں رکھ کر جیرالڈ کو پچاس ہزار ڈالر دیے گئے۔ اس پر ٹائیگر چاؤ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ جب تمہیں جیرالڈ پر چوری کا شبہ ہوا تو تم نے ٹائیگر چاؤ کو اسے تلاش کرنے کے لیے میامی فلوریڈا بھیجا کیونکہ تمہیں معلوم تھا کہ اسے وہ جگہ بہت پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ ٹائیگر چاؤ نے ہی تمہیں یہ یاد دلایا ہوگا۔"

ان دونوں بھائیوں کے تاثرات دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ٹائیگر چاؤ نے واپس آکر تمہیں بتایا کہ جیرالڈ میامی میں نہیں ہے جبکہ وہ وہیں موجود تھا۔"

"لیکن ٹائیگر چاؤ تو اسے تلاش نہیں کرسکا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ جیرالڈ جیسا بے وقوف شخص ٹائیگر چاؤ سے چھپ سکتا ہے۔ یقیناً چاؤ نے اسے تلاش کرلیا تھا لیکن وہ اسے یہاں تمہارے پاس واپس لانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو تم جیرالڈ سے اپنے پیسوں کی واپسی کا تقاضا کرتے جو اس کے پاس نہیں تھے اور جب وہ یہ بتاتا کہ اسے کسی نے پچاس ہزار ڈالر کے عوض روپوش ہونے اور اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے کہا تھا تو پھر تم اصل چور کی تلاش شروع کردیتے۔ ٹائیگر چاؤ کی اسکیم ہی یہی تھی کہ تمہیں جیرالڈ کے زندہ ہونے کا یقین دلایا جائے اور جیرالڈ بھی غائب رہے۔"

میں نے چانگ برادرز کے ساتھ بہت تھوڑا وقت گزارا لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا جب میں وہاں سے رخصت ہوئی تو دونوں بھائی ٹائیگر چاؤ سے کافی ناراض نظر آرہے تھے اور اب وہ اس پہلو پر غور کررہے تھے کہ بل اسمتھ کی رپورٹ میں بیان کردہ ثبوتوں کی تصدیق کرکے ٹائیگر چاؤ کے خفیہ اکاؤنٹ کا کس طرح پتا چلایا جائے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جاننا چاہ رہے تھے کہ کس شخص کی لاش کو جیرالڈ کے طور پر شناخت کرکے دفنا دیا گیا لیکن یہ میرا کیس نہیں تھا البتہ میں یقین سے کہہ سکتی تھی کہ واپس آنے کے بعد ٹائیگر چاؤ کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔

اس معمے کے حل ہوجانے کے بعد جیرالڈ کی پریشانی ختم ہوگئی تھی۔ پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کا بیٹا ولیم اور بہو کس طرح ایک بھوت کو اپنے گھر میں رکھنے اور اسے اپنے نومولود بچے کا دادا سمجھنے پر تیار ہوسکتے ہیں لیکن میری اس کامیابی کے بعد جیرالڈ بھوت نہیں بلکہ ایک زندہ انسان کے طور پر اس دنیا میں واپس آگیا تھا۔ اس کے بھیجے ہوئے پچاس ہزار ڈالر میں نے چانگ برادرز کو دے دیے تھے اور اس کے ساتھ ہی بل اسمتھ کی رپورٹ کی نقل بھی انہیں پکڑا دی تھی تاکہ وہ بقیہ ساڑھے چار لاکھ ڈالر کی برآمدگی کے لیے کارروائی کرسکیں۔ البتہ اس پر سے بل اسمتھ کا نام مٹا دیا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بیٹی کسی طرح اس معاملے میں ملوث ہو۔

چانگ برادرز نے انعام کے طور پر مجھے ایک معقول رقم دینا چاہی لیکن میں نے اسے لینے سے انکار کردیا کیونکہ میں ان کے لیے نہیں بلکہ جیرالڈ کے لیے کام کررہی تھی اسی لیے میں نے اس کی دی ہوئی فیس شکریے کے ساتھ قبول کرلی گوکہ میں اب بھی نہیں چاہتی کہ میری بیٹی سراغ رساں کے طور پر کام کرے اور مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ میری اس تجویز سے ضرور اتفاق کرے گی کہ اسے زندگی گزارنے کے لیے کوئی ایسا باعزت پیشہ اختیار کرنا چاہیے جو عورتوں کے لیے مناسب ہو اور اس میں زیادہ خطرات نہ ہوں تاہم اس وقت تک کے لیے میں نے اس کے دفتر کی تزئین و آرائش کروا دی ہے تاکہ جو لوگ اس کی خدمات حاصل کرنا چاہیں، انہیں وہاں جاکر کوئی شرمندگی نہ ہو۔ اب اگر کسی نے مجھ سے اس کے دفتر کا پتا اور فون نمبر مانگا تو بخوشی دے دوں گی کیونکہ بیٹی کے جانے کے بعد مجھے ہی وہاں بیٹھنا ہے۔

## رزاق شاہد کوہلر

رشتہ کسی بھی نوعیت کا ہو... اسے قائم و دائم رکھنے کے لیے اعتماد انتہائی ضروری ہے... اعتماد و اعتبار کے بغیر رشتے کبھی بھی نہیں پنپ سکتے... رشتوں کی بقا کے لیے اعتماد و احترام ہی بنیادی شرائط ہیں... جب کبھی یہ اعتماد اٹھ جاتا ہے تو مضبوط سے مضبوط بندھن بھی کچی ڈور کے مانند ایک پل میں ٹوٹ جاتا ہے... اس ٹوٹی ڈور میں چاہے کتنی ہی گرہیں کیوں نہ لگادی جائیں وہ ڈور پہلے جیسی مضبوط اور پائدار نہیں بن سکتی... جس طرح شیشے میں آیا بال نہیں نکالا جاسکتا... بالکل اسی طرح کھویا ہوا... ٹوٹا ہوا اعتماد بحال کرنا بھی قطعی ممکن نہیں... ایسے ہی کچے دھاگوں کے مانند کرداروں کے بنتے بگڑتے رشتوں کی پل پل رنگ بدلتی داستاں...

**عقلِ باطن کی گہرائیوں سے ہم کلام ہو تو ہر شخص خواہشات سے بالاتر ہو جاتا ہے... طاقتور انسان کے ناقابلِ تسخیر قلعے کی بربادی...**

اسلام آباد کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر چیکنگ کے مراحل سے گزرتا ہوا وہ پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے کندھے سے ایک درمیانے سائز کا سفری بیگ لٹک رہا تھا۔ اس بیگ کے علاوہ وہ کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ اپنے پیاروں کے لیے خریدے گئے بے شمار قیمتی تحائف وہ لندن کے ایک فلیٹ میں چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اُن تحائف کو ساتھ لانے کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ جب تحفہ لینے والے ہی اس دنیا میں نہیں رہے تو وہ بے

کار میں یہ زحمت کیوں کرتا؟

وہ بوجھل قدموں سے پارکنگ ایریے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی اور دُکھ کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں یوں متورم نظر آرہی تھیں جیسے وہ بہت دیر تک روتا رہا ہو۔ وہ ایک خوب رُو اور قدآور نوجوان تھا۔ سُرخ و سفید چہرے پر گھنی مونچھیں اُس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کررہی تھیں۔ مگر اُس وقت اُس کی حالت نہایت ہی ابتر تھی۔ لباس مسلا ہوا، سر کے بال اُلجھے ہوئے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اردگرد کے ماحول سے لاتعلق سا ہوکر جونہی وہ پارکنگ ایریا میں داخل ہوا، ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور والہانہ انداز میں اُس سے لپٹ گیا۔

''عاصم میرے دوست میرے بھائی! یہ... یہ... کیا ہو گیا ہے... کاش... کاش... ایسا نہ ہوا ہوتا... یہ سب میرا قصور ہے۔ میں اگر غفلت کا مظاہرہ نہ کرتا... تو شاید یہ جگر پاش سانحہ رونما نہ ہوا ہوتا... میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کبھی معاف نہیں کروں گا۔ دراصل میں ہی اُن سب کا قاتل ہوں۔'' نوجوان کی آواز شدتِ غم سے لرز رہی تھی۔

''نہیں سلیم نہیں۔'' وہ رنجیدہ آواز میں بولا۔ ''اس میں تمہارا بھلا کیا قصور ہے؟ یہ سب تو تقدیر کا لکھا تھا... تم اگر اُس وقت اُن کے ساتھ ہوتے بھی تو کیا کرلیتے؟''

وہ بولا۔ ''اُن کے ساتھ مر تو سکتا تھا۔ تم مجھے اپنے گھر کی حفاظت سونپ کر گئے تھے۔ میں نے کوتاہی کی ہے۔''

''تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا میرے دوست! یہ سب فضول کی باتیں ہیں۔ اب چلو میں یہاں تماشا بننا نہیں چاہتا۔ بہت سے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔''

''او کے۔'' سلیم نے جیب سے رومال نکال کر اپنی پلکیں صاف کیں۔ ''تم اِدھر ہی ٹھہرو، میں گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا جبکہ سلیم اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ گاڑی نکال کر لے آیا۔ عاصم کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد اُس نے فرنٹ سیٹ کی کھڑکی کھول دی۔ عاصم نے کندھے سے بیگ اُتار کر اُسے گاڑی کی عقبی سیٹ پر پھینکا اور خود سلیم کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سلیم نے گیئر لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کھلی شاہراہ پر پہنچتے ہی سلیم نے سوال کیا۔ ''کیا تم خالی ہاتھ آئے ہو یا پھر باقی سامان...''

''بس یہی بیگ ہے اور کچھ بھی نہیں لایا۔'' اُس نے سپاٹ آواز میں قطع کلامی کی۔

''کیوں؟'' سلیم نے اُلجھ کر پوچھا۔

''کس کے لیے لاتا اور کیوں لاتا؟'' اُس نے کرب کے عالم میں اُلٹا سوال کردیا۔ ''جب اُن میں سے کوئی بچا ہی نہیں تو تحائف کا کیا کرتا؟''

''میری بہن تو زندہ ہے ناں! اُس کے لیے ہی کچھ لے آتے۔''

''اُسے کس چیز کی کمی ہے اور پھر ایسی صورتِ حال میں اپنے ساتھ کچھ لے کر آنا مجھے مناسب نہیں لگا۔ لوگ باتیں بنائیں گے کہ ساری فیملی تو موت کے گھاٹ اُتر گئی اور میں بیوی کے لیے غیر ملکی تحائف لے کر آگیا۔ کیا تمہیں یہ مناسب لگتا ہے؟''

''سوری عاصم بھائی۔'' اُس نے معذرت کی۔ ''مجھے ایسا سوال پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ موقع نامناسب ہے۔ بس ایسے ہی زبان سے نکل گیا تھا تم نے محسوس تو نہیں کیا ناں؟''

وہ بولا۔ ''تمہارا قصور نہیں ہے سلیم! دراصل جس پر گزرتی ہے پتا اُسے ہوتا ہے۔ میں گزشتہ کئی گھنٹوں سے جس کرب سے گزر رہا ہوں، اُس کا اندازہ کوئی دوسرا کیسے لگا سکتا ہے؟ ظاہر ہے تم بھی میرا دُکھ محسوس نہیں کرسکتے اس لیے مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔''

ایک لمحے کے لیے سلیم کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے معدوم ہوگئے۔ وہ نہایت ہی مضبوط اعصاب کا مالک تھا اور اُسے اپنے احساسات و جذبات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ چنانچہ وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا دُکھ بھلا میں کیوں محسوس نہیں کرسکتا... خدا کی قسم جتنا دُکھ مجھے ہوا ہے اتنا شاید ہی تمہارے کسی اور دوست نے محسوس کیا ہو۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ میں تمہاری طرح فطری طور پر اس دُکھ کی شدت محسوس کرنے سے قاصر ہوں۔ وجہ تم جانتے ہو کہ مرنے والوں سے تمہارا خون کا رشتہ تھا جب کہ میرا محض زبانی کلامی رشتہ تھا۔ ظاہر ہے اُن کا دُکھ کوئی بھی تمہاری طرح شدت کے ساتھ محسوس نہیں کرسکتا، چاہے وہ میں ہوں یا کوئی دوسرا؟''

''اگر ثمینہ بھی اُن کے ساتھ ماری جاتی تو تب تمہارے تاثرات کیا ہوتے۔ کیا اُس کے مرنے کا بھی تمہیں اتنا ہی دُکھ ہوتا جتنا مجھے؟'' اُس نے طنز سے پوچھا۔

''اللہ نہ کرے۔'' وہ تڑپ اُٹھا۔ ''ورنہ زندہ تو میں بھی نہ رہتا اور تم بھی خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ زندہ اور سلامت ہے۔''

''کیوں... تم کس لیے مرجاتے۔ تمہارا اُس سے کون سا خون کا رشتہ ہے؟''

یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ سلیم کے چہرے پر سے ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور دل پہلو میں بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ بات اُسے تیر کی طرح لگی تھی مگر موقع مناسب نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ عاصم اس وقت بے انتہا کرب و اذیت سے گزر رہا ہے ورنہ وہ اُسے کھری کھری سنا دیتا۔ تاہم اک ذرا توقف سے وہ بولا۔ ''میں مانتا ہوں کہ میرا ثمینہ سے خونی رشتہ نہیں ہے۔ میں صرف اُس کا منہ بولا بھائی ہوں لیکن تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا رشتہ خونی رشتے سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں نے ہمیشہ اُسے سگی بہن ہی سمجھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس رشتے کو کس نظر سے دیکھتے ہو مگر خدا جانتا ہے کہ اگر اُسے کچھ ہو جاتا تو سب سے زیادہ دُکھ بھی مجھے ہی ہوتا۔''

عاصم نے کہا۔ ''یہی وہ درد ہے جو میں گزشتہ چوبیس گھنٹے سے برداشت کر رہا ہوں۔ میرا وجود اندر سے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے مگر میں پھر بھی زندہ ہوں۔ تم پر گزری نہیں اور تم مرنے کی بات کر رہے ہو۔''

''عاصم بھائی! میں ایک بار پھر آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ بس یوں ہی بے خیالی میں تم سے سامان کے متعلق پوچھ بیٹھا ورنہ یقین مانو اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔''

''میں جانتا ہوں... تمہیں صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے سیٹ سے پشت لگاتے ہوئے جواب دیا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ گزشتہ کئی گھنٹے اُس نے بے آرامی اور پریشانی کے عالم میں گزارے تھے۔ کوشش کے باوجود نیند کی دیوی اُس سے خفا ہی رہی تھی۔ اُس کا سارا بدن کسی پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا مگر نیند اب بھی اُس پہ مہربان نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم گزرے دنوں کی یادیں کسی فلم کی طرح اُس کے دماغ میں گردش کرنے لگی تھیں۔ ایک کے بعد ایک منظر تواتر سے بدلتا جا رہا تھا۔ یادِ ماضی کسی عذاب کی صورت اُس پر نازل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اس اندوہ ناک اور خونچکاں واقعے کی اطلاع اُسے سلیم ہی نے دی تھی۔ سلیم نہ صرف یہ کہ اُس کا گہرا دوست تھا بلکہ گزشتہ پانچ برس سے وہ اُس کی بیوی ثمینہ کا منہ بولا بھائی بھی بنا ہوا تھا۔ اُس نے کبھی دوست اور بیوی کے اس رشتے کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ باتیں کرنے والے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اُس کے کان بھرتے رہتے تھے مگر وہ کسی کی بات کو بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ سلیم اُس کا محسن تھا اور محسن پر شک کرنا اُس کے نزدیک گناہ تھا۔

پانچ برس قبل سلیم نے اُسے باہر بھجوانے کا بندوبست کیا تھا۔ اُس کے لیے رقم اور پاسپورٹ کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ دیارِ غیر میں اُسے ملازمت دلانے تک، سب سلیم ہی کی کاوشوں کے طفیل ممکن ہو سکا تھا۔ چنانچہ وہ سلیم پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ اُس کے خلاف کوئی بھی ایسی ویسی بات سننا اُسے گوارا نہیں تھا۔ پانچ برس قبل اُس کے گھریلو حالات انتہائی ابتر تھے۔ دس بارہ افراد پر مشتمل کنبے کا وہ واحد کفیل تھا۔ اس کنبے میں اُس کی ایک بیوہ بہن اور تین بچے بھی شامل تھے۔ دیگر افراد میں ماں باپ، ایک بھائی اور دو بہنیں شامل تھیں۔ بھائی اور بہنیں چونکہ ابھی زیرِ تعلیم تھے۔ لہٰذا اُن کا بوجھ بھی اُس کے کندھوں پر تھا۔ اُن دنوں وہ ایک ریڈی میڈ گارمنٹس فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ تنخواہ نہایت ہی قلیل تھی۔ گزر اوقات بہت مشکل سے ہو رہی تھی۔ اکثر اوقات وہ مقروض رہتا تھا۔ کبھی کبھار تو نوبت یہاں تک آجاتی تھی کہ محلے کا دکان دار اُسے اُدھار دینے سے بھی انکار کر دیتا تھا۔ تب اُسے دکان دار کی منت سماجت کرنا پڑتی تھی۔ اُس کی زندگی شرمندگی کی صورت بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن اچانک سلیم کسی فرشتے کے روپ میں اُس سے ٹکرا گیا۔

اُس روز وہ محلے کے جنرل اسٹور سے کچھ چیزیں خرید رہا تھا کہ رقم کم پڑ گئی۔ بل تیرہ سو روپے کا بنا تھا۔ جب کہ اُس کی جیب میں ایک ہزار روپے کا اکلوتا نوٹ تھا۔ اُس نے پریشانی کے عالم میں جیب سے نوٹ نکالا اور شرمندہ سا ہو کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ ''انکل! مہربانی فرما کر باقی تین سو روپے میرے کھاتے میں لکھ دیں۔ میں ان شاء اللہ بہت جلد یہ اُدھار چکا دوں گا۔''

''نہ میاں نہ۔'' جنرل اسٹور کے مالک انکل نذیر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ہی تمہارا اُدھار تمہاری استطاعت سے تجاوز کر چکا ہے۔ اب میں مزید اُدھار نہیں دے سکتا... بالکل نہیں دے سکتا۔''

''پلیز انکل پلیز۔'' اُس نے منت کی۔ ''ایسا نہ کریں میں آپ کی پائی پائی چکا دوں گا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے مجھے...''

''قارون کا خزانہ ملنے والا ہے۔'' انکل نذیر نے طنزیہ انداز میں قطع کلامی کی۔ ''ملازمت تو اب تمہاری رہی نہیں تو میرا اُدھار کیسے چکتا کرو گے۔ ڈاکا ڈالو گے یا پھر

کہیں چوری کرو گے؟''

''انکل! میں کوشش کر رہا ہوں۔ بہت جلد مجھے نئی ملازمت مل جائے گی۔'' اُس نے مشکل سے غصہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں میاں نہیں، بہت ہو چکا اُدھار۔ جب تک تم پہلے والا اُدھار چکا نہیں دیتے تب تک میں مزید اُدھار کسی صورت بھی نہیں دوں گا۔''

''انکل! میں محلہ چھوڑ کر بھاگ تو نہیں جاؤں گا۔'' اُس نے احتجاج کیا۔ ''پہلے بھی کئی بار میں نے آپ کا اُدھار چکایا ہے۔ اب بھی چکا دوں گا۔ میں کوئی چور اُچکا تو نہیں ہوں کہ کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔''

''واہ بھئی واہ۔'' انکل نذیر نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچایا۔ ''ایک تو اُدھار اور اُوپر سے دھونس... جاؤ میاں جاؤ مجھے سودا بیچنا ہی نہیں ہے۔ جا کر کوئی اور دکان دیکھو۔ دکان نہ ملے تو داتا دربار پر چلے جانا۔ خود بھی پیٹ بھر کر کھا لینا اور گھر والوں کے لیے بھی لے جانا۔''

''انکل! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔'' وہ چلایا۔ ''میری غربت پر طنز کر رہے ہیں۔ سودا نہیں بیچنا تو دکان کیوں کھول رکھی ہے۔ گھر میں بیٹھ کر آرام کیوں نہیں کرتے؟''

''بک بک بند کرو۔'' انکل نذیر ایک دم بھڑک گیا۔ ''لوٹ اُٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''سودا لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' اُسے بھی طیش آ گیا اور پھر اسی عالم میں اُس نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا شاپنگ بیگ اُٹھا لیا جس میں اُس کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔

''شاپنگ بیگ رکھ دو۔'' انکل نذیر آستینیں چڑھاتے ہوئے کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر سامنے آ گیا۔ ''یہ غنڈا گردی کسی اور کو دکھانا۔''

''نہیں رکھتا، کیا کر لو گے؟'' جواباً وہ پھنکارا۔

''تیری تو میں...'' انکل نذیر ایک گندی سی گالی دیتے ہوئے شاپنگ بیگ پر جھپٹا مگر یہ جرأت اُسے مہنگی پڑ گئی۔ سامنے چھ فٹ کا نوجوان تھا۔ جیب خالی تھی تو کیا ہوا بازوؤں میں تو دم تھا۔ اُس نے ہاتھ گھمایا اور انکل نذیر کاؤنٹر سے جا ٹکرایا۔

آن کی آن میں وہاں تماشا دیکھنے والے لوگوں کا ایک ہجوم سا اکٹھا ہو گیا۔ انکل نذیر تھپڑ کھا کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اب وہ عاصم کو نہایت گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ لوگ معاملہ جاننے کے لیے دونوں سے سوالات کر رہے تھے مگر وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ انکل نذیر کی زبانی گندی گالیاں سن کر وہ غصے سے اُکھڑ گیا اور آگے بڑھ کر اُسے مزید دو تین جھانپڑ رسید کر دیے۔ تب تماشائیوں میں سے چند لوگوں نے مداخلت کرتے ہوئے عاصم کو جکڑ لیا۔ اُس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو اُسے جکڑنے والوں میں سے ایک نوجوان قدرے سخت انداز میں بولا۔ ''کنٹرول یور سیلف یار! یہ حماقت تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ ابھی یہاں پولیس پہنچ گئی تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔ پلیز خود کو سنبھالو۔''

پولیس کا ذکر سن کر اُس نے اپنی جدوجہد ترک کر دی۔ تب نوجوان دوبارہ بولا۔ ''میں تمہارا ہمدرد ہوں اس لیے جو میں کہوں اُس پر عمل کرنا اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ ورنہ یہ پولیس کیس بن جائے گا۔''

اس کے بعد اُسی نوجوان کے اشارے پر عاصم کو چھوڑ دیا گیا۔ ہجوم آہستہ آہستہ چھٹنے لگا کہ اب وہاں لوگوں کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں رہا تھا۔ تاہم چند ایک لوگ بدستور انکل نذیر کو گھیرے اُس سے سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا کام ہمیشہ بھڑکتی پر تیل ڈالنے والا ہوتا ہے۔ بظاہر اپنی باتوں سے یہ لڑنے والے فریقین کو اپنے ہمدرد نظر آتے ہیں۔ مگر ان کا اصل کام تماشا دیکھنا ہوتا ہے۔ یہ کسی کے بھی ہمدرد نہیں ہوتے بس آگ لگا کر تماشا دیکھتے ہیں کہ اسی میں ان کو تسکین ملتی ہے۔ ہجوم کے چھٹتے ہی نوجوان نے عاصم کا کندھا تھپتھپایا۔ ''تم یہیں ٹھہرو، میں معاملہ سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی شرپسند شخص جنرل اسٹور کے مالک کو بھڑکا دے اور معاملہ پولیس اسٹیشن تک پہنچ جائے۔''

عاصم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور نوجوان انکل نذیر کی طرف بڑھ گیا۔ ''جناب! آپ مجھے چند منٹ دیں گے؟ میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

انکل نذیر نے بھڑک کر کہا۔ ''اگر تم اُس غنڈے کے حمایتی بن کر آئے ہو تو پھر میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ میں اسے جیل کی ہوا کھلا کر ہی رہوں گا۔ دادا گیری کرتا ہے اور وہ بھی انکل نذیر کے سامنے۔ میں نے کوئی چوڑیاں تو نہیں پہنی ہوئیں؟ اب تو میں اسے مزہ چکھا کر ہی چھوڑوں گا۔''

''آپ پہلے میری بات تو سن لیں پھر جو دل چاہے کرنا میں آپ کو نہیں روکوں گا۔''

''بولو۔'' انکل نذیر نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔ ''میں سن رہا ہوں۔''

''یہاں نہیں، اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' نوجوان نے انکل نذیر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے بات کریں گے۔''

''تم شاید اُسے بھگانا چاہتے ہو؟'' اُس نے شک کا اظہار کیا۔

''وہ بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے۔ اسی محلے کا تو رہنے والا ہے۔'' نوجوان مسکرایا اور پھر منت سماجت کرتے ہوئے اُسے جنرل اسٹور کے اندر لے گیا۔

''بیٹھو۔'' اندر پہنچ کر انکل نذیر نے بادلِ ناخواستہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے...... ہوئے بولا۔

''میرا نام سلیم ہے اور میں ایک چھوٹی سی فرم کا مالک ہوں جو باہر سے گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس درآمد کرتی ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ دونوں میں ہاتھاپائی کس وجہ سے ہوئی ہے؟''

انکل نذیر نے تو پہلے تو اُسے گھور کر دیکھا پھر ساری کہانی بیان کردی۔ اس کے بعد جواب طلب انداز میں بولا۔ ''اب بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''آپ بالکل حق بجانب ہیں۔'' سلیم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''لیکن وہ نوجوان بھی مجھے مجبور اور مفلس دکھائی دیتا ہے۔ شاید اُس کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تبھی تو زندگی سے بیزار دکھائی دیتا ہے۔''

''کیا تم اُسے جانتے ہو؟'' انکل نذیر نے پوچھا۔

''نہیں، مجھے تو اُس کا نام بھی معلوم نہیں ہے۔''

''عاصم... پورا نام عاصم رشید ہے خبیث کا۔'' انکل نذیر نے تحقیر آمیز انداز میں بتایا۔ ''ملازمت چھوٹ چکی ہے اور اب سارا سارا دن آوارہ گردی کرنے کے ساتھ ساتھ غنڈا گردی بھی کرنے لگا ہے۔''

''اوکے۔'' سلیم نے سر ہلایا۔ ''اُس کے ذمے کتنی رقم ہے آپ کی؟''

''پچیس سو روپے۔'' انکل نذیر نے چونک کر بتایا۔

سلیم نے جیب سے والٹ نکالا اور پھر اُس میں سے پچیس سو روپے نکال کر انکل نذیر کی طرف بڑھا دیے۔ ''یہ لیں پچیس سو روپے اور معاملہ ختم کریں۔''

''نہیں۔'' انکل نذیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ معاملہ اب اتنی جلدی ختم نہیں ہوسکتا۔ پہلے وہ پولیس اسٹیشن جائے گا اور اُس کے بعد میں اُسے عدالت میں گھسیٹوں گا۔ اُس نے غنڈا گردی کی ہے۔ ہاتھ اُٹھایا ہے مجھ پر، میں اُسے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔''

''اُس کی غنڈا گردی کا کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس، کوئی چوٹ، کوئی زخم یا پھر کوئی گواہ؟'' سلیم نے پولیس والوں کے سے انداز میں پوچھا۔

''سب لوگوں نے دیکھا ہے۔ جب وہ مجھے مار رہا تھا۔ کیا ثبوت کے لیے...''

''اُن میں سے کوئی ایک بھی گواہی نہیں دے گا۔'' سلیم نے قطع کلامی کی۔ ''جب کہ میں ابھی عاصم کو ساتھ لے کر تھانے جارہا ہوں۔ وہ آپ کے خلاف ایف آئی آر کٹوائے گا اور گواہی میں دوں گا کہ آپ نے اُسے زخمی کیا ہے بلکہ جان سے ہی مارنے والے تھے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔''

''یہ... یہ بالکل سفید جھوٹ ہے۔'' انکل نذیر نے بوکھلا کر احتجاج کیا۔

وہ بولا۔ ''جھوٹ، جھوٹ ہوتا ہے۔ سفید یا کالا نہیں ہوتا۔ میں ابھی عاصم کو زخمی کرتا ہوں پھر دیکھنا کہ یہ جھوٹ کیسے آپ کے سچ کی دھجیاں بکھیرتا ہے؟ کم سے کم دو سال کی تو لگ ہی جائے گی۔''

اُس کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ انکل نذیر ایک عام سا شخص تھا اور کبھی تھانے کچہری کے چکروں میں نہیں پڑا تھا۔ ایک پل میں اُس کا سارا جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور سلیم کے ہاتھ سے نوٹ پکڑ لیے۔

سلیم نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے آپ کے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ خوامخواہ بات بڑھانے سے آپ کا اُلٹا نقصان ہوتا۔ عدالتوں کے چکر کاٹ کر آپ کے جوتے گھس جاتے مگر فیصلہ پھر بھی نہ ہو پاتا۔ یہاں عدالتوں میں سب انصاف انصاف کھیلتے ہیں، انصاف کرتا کوئی نہیں۔''

''میں تمہارے کہنے پر اُسے معاف کررہا ہوں۔'' وہ اپنا بھرم رکھتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ عدالتوں کے چکروں سے میں نہیں ڈرتا۔''

''میں آپ کا ممنون ہوں۔'' اُس نے اجازت طلب انداز میں انکل نذیر سے ہاتھ ملایا اور جنرل اسٹور سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

یہ عاصم کی سلیم سے پہلی ملاقات تھی اور پہلی ہی ملاقات میں سلیم نے اُسے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ سلیم نے نہ صرف اُس کا قرض ادا کردیا تھا بلکہ انکل نذیر کو بھی معاملہ آگے بڑھانے سے روک دیا تھا۔ ورنہ انکل نذیر اگر پولیس اسٹیشن چلا جاتا تو عاصم کے لیے جان چھڑانا مشکل ہوجاتا۔

اُس کی تو ضمانت دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد اُن کی دوستی اس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھی کہ سلیم کا اُن کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سلیم اُن کے گھر کا ایک فرد سا بن گیا۔ عاصم کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اُس کی بیوی ثمینہ نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی تھی مگر عاصم کی طرح اُس کا تعلق بھی لوئر مڈل کلاس سے تھا۔ وہ لڑکیوں کی اُس قبیل سے تعلق رکھتی تھی جو شادی سے قبل اُونچے اُونچے خواب دیکھتی ہیں اور اُن کے خوابوں میں خوب رُو شہزادے اور خوش نما محل ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی شادی ہمیشہ کسی عاصم جیسے مفلس نوجوان سے ہوجاتی ہے۔ جن کی چادر اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ سر ڈھانپتے ہیں تو پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھانپیں تو سر ننگا رہ جاتا ہے۔

سلیم نے اُن کے ہاں آنا جانا شروع کیا تو ثمینہ ایک بار پھر وہی خواب دیکھنے لگی۔ سلیم کی جیب ہر وقت کرنسی نوٹوں سے بھری رہتی تھی۔ اُسے بزنس سے معقول آمدنی حاصل ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ دل کا بہت کھلا تھا۔ ویسے بھی فطرتاً وہ عیاش طبع شخص تھا۔ اس لیے اپنی آمدنی فضولیات کی نذر کرتا رہتا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں جو اُسے روکتا ٹوکتا۔ سو وہ دل کھول کر یار دوستوں پر خرچ کرتا تھا۔ اُس کی عاصم رشید سے دوستی کیا ہوئی کہ ثمینہ کی تو لاٹری نکل آئی۔ صرف چند ملاقاتوں کے بعد ہی اُس نے ثمینہ کو اپنی منہ بولی بہن بنالیا۔ اب ثمینہ کی وہ تشنہ آرزوئیں پوری ہونے لگیں جو عاصم کبھی پوری نہیں کرسکا تھا۔ سلیم آئے دن اُس کے لیے قیمتی تحائف لانے لگا اور یوں ثمینہ خوشیوں کے جھولے میں جھولنے لگی۔ اس سے قبل وہ ہمیشہ عاصم سے لڑتی رہتی تھی۔ لیکن اب وہ بہت خوش مزاج ہوگئی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگاتی رہتی تھی۔ عاصم بھی اُس کی خوشی میں خوش تھا۔

عاصم سمیت دیگر گھر والے بھی سلیم اور ثمینہ کے رشتے پر خوش تھے لیکن عاصم کا والد رشید احمد اس رشتے پر معترض تھا۔ وہ ہمیشہ اُن کے اس رشتے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ اسکول ماسٹر تھا اور بے حد خوددار انسان تھا۔ اُسے اپنی بہو کا یوں کسی غیر مرد سے ... میل ملاپ قطعی پسند نہیں تھا۔ اکثر اوقات وہ عاصم کو سمجھاتا رہتا تھا لیکن عاصم اُس کی کسی نصیحت کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ اُسے سلیم کی دوستی پر اعتبار تھا۔ سلیم نے اُس پر بے شمار احسانات کیے تھے۔ قدم قدم پر اُس کی مدد کی تھی۔ عاصم جو جاب کر رہا تھا، وہ بھی سلیم ہی کی مرہونِ منت تھی۔ سلیم نے ہی اپنے تعلقات سے اُسے یہ جاب دلائی تھی۔

اس نئی ملازمت میں تنخواہ معقول تھی۔ چنانچہ اُس کی گزر اوقات قابلِ رشک نہ سہی مگر بہتر انداز میں ضرور ہو رہی تھی۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اب اُسے گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے اُدھار نہیں لینا پڑتا تھا۔ وہی انکل نذیر جو کبھی اُسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، اب اُسے دیکھ کر سلام کرنے لگا تھا۔ دوسری طرف ثمینہ کی روز روز کی فرمائشوں سے بھی اُس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ اُس کی فرمائشیں اب سلیم پوری کرنے لگا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن ثمینہ کو کچھ نہ کچھ لا کر دیتا تھا۔

اُس روز عاصم آفس سے قدرے جلدی گھر لوٹا تو ثمینہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اُس نے استفسار کیا تو ثمینہ پھٹ پڑی۔ ”مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ابا جان سے پوچھو۔ میں تو عاجز آچکی ہوں اُن کی روز روز کی نصیحتوں سے۔ جینا حرام کر کے رکھ دیا ہے انہوں نے میرا۔“

”بھئی کچھ پتا تو چلے ایسا کیا کر دیا ہے اباجی نے، جو تم یوں غصہ کر رہی ہو؟“ عاصم نے تحمل سے پوچھا۔

”میرے بھائی کو بے عزت کر کے نکالا ہے انہوں نے گھر سے، اب مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔“ ثمینہ نے روتے ہوئے بتایا۔

”سلیم آیا تھا کیا؟“

”ہاں آیا تھا لیکن تمہارے ابا نے اُس کے ساتھ جو کیا ہے، وہ کوئی گھر آئے دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔“

”لیکن کیوں؟“ اُس نے قدرے تحیّر سے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ میری فرمائشیں پوری کرتا رہتا ہے۔ کیا بہن کو کوئی تحفہ خرید کر دینا گناہ ہے؟ وہ بے چارہ کتنی چاہت کے ساتھ میرے لیے ائیر رِنگ خرید کر لایا تھا۔ لیکن تمہارے ابا جان بھلا مجھے کب خوش دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سلیم کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔“

”کیا یہ سچ ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

”تو اور کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ اگر یقین نہیں آتا تو جا کر اپنے اباجی سے پوچھ لو، تمہیں سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔“

وہ غصے کے عالم میں دندناتا ہوا باپ کے کمرے میں داخل ہوا اور پھر جیسے پھٹ پڑا۔ ”اباجی! آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ آپ نے سلیم کو گھر سے کیوں نکالا، کیا گناہ کیا ہے اُس نے، مجھے بتائیں ناں کہ اُس نے مجھے جاب دلائی اور ثمینہ سے سگے بھائیوں کی طرح پیار کرتا ہے۔ اُس کے کتنے احسان ہیں ہم پر، آپ کو پتا بھی ہے..... کیا

اپنے محسن کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے۔ جیسا آپ نے سلیم کے ساتھ کیا ہے۔ مجھے منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں چھوڑا آپ نے۔''

ماسٹر رشید نے پہلے تو بیٹے کو گھور کر دیکھا پھر بولے۔ ''تم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بنے ہوئے ہو تو میں کیا کروں، ایک غیر مرد کو گھر میں گھسنے دوں؟ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''ابا جی! یہ پرانی باتیں ہیں۔ لوگوں کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ آپ نجانے کس صدی میں جی رہے ہیں؟ یہ اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ چل رہا ہے۔ اب لوگ ان باتوں کو معیوب نہیں سمجھتے۔''

''مطلب اکیسویں صدی میں غیرت کے معنی بدل گئے ہیں؟''

''ابا جی ابا جی! خدا کے لیے یہ فضول وسوسے دماغ سے نکال دیں۔ سلیم کو میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور وہ بھی میرے لیے اپنے دل میں یہی جذبات رکھتا ہے۔''

وہ بولے۔ ''دلوں کے بھید صرف اللہ جانتا ہے۔ تجھے کس طرح معلوم ہوا کہ وہ تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے؟''

''ابا جی! مجھے لگتا ہے کہ آپ سٹھیا گئے ہیں۔ اب کیا وہ مجھے لکھ کر دے گا کہ وہ مجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ اُس نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ مجھے جاب دلائی، جیل جانے سے بچایا، انکل نذیر کا قرض اپنی جیب سے ادا کیا، ثمینہ کو وہ اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہے۔ کیا یہ باتیں کافی نہیں ہیں، اُسے ایک بھائی ثابت کرنے کے لیے؟''

''مجھے اُس کا تمہاری عدم موجودگی میں یہاں آنا پسند نہیں ہے۔ وہ اگر بھائی ہے تو تمہاری بیوی کا ہے جبکہ اس گھر میں میری دو جوان بیٹیاں بھی رہتی ہیں۔''

''آپ کی بیٹیاں میری بھی تو کچھ لگتی ہیں۔ کیا میں اُن کا بُرا سوچوں گا؟''

''اس سے بُرا اور کیا سوچو گے کہ ایک غیر مرد تمہارے گھر میں آتا ہے اور تم نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔''

''تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اور ثمینہ یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں؟'' اُس نے زچ ہو کر پوچھا۔

''یہ پٹی شاید تجھے تیری بیوی نے پڑھائی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ یہ گھر چھوڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔''

''یہ دیکھو ابا جی۔'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ہمیں چین سے یہاں رہنے دیجیے۔ ثمینہ ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی، یہ محض آپ کا شک ہے۔''

''چل ٹھیک ہے، جو مرضی آئے کر، میں کون ہوتا ہوں تجھے روکنے والا؟ اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے تجھے میری نصیحتیں بُری لگتی ہیں مگر میری ایک بات یاد رکھنا، ایک روز تو بہت پچھتائے گا۔ تب تیرے پچھتاوے تیرے نقصان کی تلافی نہیں کر سکیں گے.....'' وہ شکست خوردہ انداز میں بولے اور عاصم اُلٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک بوجھ اُس کے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ چنانچہ اب وہ قدرے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

کمرے سے باہر آتے ہی اُس نے جیب سے سیل فون نکالا اور سلیم کو کال کرنے لگا۔ رابطہ ملتے ہی وہ نادم انداز میں بولا۔ ''سلیم یار! میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ ابا جی نے جو کچھ بھی کیا ہے، بہت غلط کیا ہے۔ میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔''

سلیم نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں ہے دوست، ابا جی میرے بھی بزرگ ہیں بلکہ سچ پوچھو تو انہیں میں اپنے باپ جیسا سمجھتا ہوں۔ پتا نہیں انہیں کس نے میرے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ اس سے قبل تو انہوں نے کبھی بھی ایسے رویے کا اظہار نہیں کیا ہے۔''

''تم ناراض تو نہیں ہو نا یار؟''

''بالکل نہیں۔'' سلیم نے ہنس کر کہا۔ ''باپ کی بات کا کیا بُرا منانا؟ تم کوئی ٹینشن نہ لو، یوں سمجھو کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔''

''بہت بہت شکریہ یار! یہ تو تمہارا بڑا پن ہے۔ ورنہ آج کل کے دور میں تو کوئی کسی کی نہیں سنتا۔''

''بس اب رہنے بھی دو یار! کیوں مجھے بانس پر چڑھانے کے لیے تل گئے ہو؟'' سلیم نے قہقہہ لگایا۔

یوں ہی باتیں کرتے کرتے وہ ثمینہ کے پاس پہنچ گیا۔ ثمینہ کو جب پتا چلا کہ وہ سلیم سے بات کر رہا ہے تو اُس نے عاصم سے فون جھپٹ لیا۔

''ہیلو سلیم! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' اُس نے پریشانی سے پوچھا۔ ''میں... میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ دراصل یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''بھئی! تم میاں بیوی خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ میں نے عاصم کو بتا دیا ہے کہ میں تم لوگوں سے خفا نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے انکل کی باتوں کا بُرا منایا ہے۔ وہ بزرگ ہیں ہمارے، جو دل چاہے کہہ سکتے

ہیں۔ کہیں عاصم نے انکل سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟''

''نہیں نہیں... عاصم بھلا اباجی سے بدتمیزی کر سکتا ہے؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا عاصم تمہارے ساتھ ہے؟'' سلیم نے بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں وہ باتھ روم میں ہے۔'' اُس نے مدھم آواز میں بتایا تاکہ آواز عاصم کی سماعتوں تک نہ پہنچ سکے۔

''ہائے میری جانِ ثمو۔'' سلیم پر ایک دم رومینٹک موڈ طاری ہوگیا۔ ''میں کتنی چاہت سے تمہارے لیے ائررنگ خرید کر لایا تھا۔ مگر اُس بڈھے کھوسٹ نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔''

''وہ رِنگ تو اب میں تمہارے ہی ہاتھوں سے پہنوں گی۔'' اُس نے شوخ مگر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''غلام حاضر ہے جانِ من! حکم کرو کب لے کر پہنچوں؟''

''میں خود کل کسی وقت تمہارے فلیٹ پر آؤں گی۔ اوکے؟''

''میں ابھی سے راہ دیکھنا شروع کر دیتا ہوں جانِ من۔'' وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ''تم کل کس وقت پہنچو گی؟''

''یہ میں تمہیں کل صبح بتاؤں گی۔'' اُس نے مدھم آواز میں بتایا اور پھر عاصم کو باتھ روم سے نکلتے دیکھ کر بلند آواز میں بولی۔ ''اچھا سلیم بھائی پھر بات ہوگی۔ ابھی مجھے عاصم کو کھانا بھی دینا ہے۔ اوکے خداحافظ۔''

''اچھا جانِ من! خداحافظ۔'' سلیم نے کس کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

وہ دونوں ہفتے میں دو تین بار سلیم کے فلیٹ پر ملتے اور خوب جی بھر کر انجوائے کرتے تھے۔ عاصم اس بات سے لاعلم رہا۔ بارہا اُسے سلیم پر شک کرنے کے مواقع دستیاب ہوئے مگر ثمینہ چاپلوسی سے کام لیتے ہوئے خود کو ستی ساوتری ثابت کرنے میں کامیاب رہی۔ ویسے بھی عاصم سلیم پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ لہٰذا اُس پر کسی قسم کا شبہ کرنا عاصم کے نزدیک محسن کشی کے مترادف تھا۔ ایک دن سلیم کے فلیٹ پر پہنچتے ہی ثمینہ بولی۔ ''سلیم جانو! میں اب عاصم کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیوں نہ میں اُس سے خلع لے لوں؟''

''وہ کس لیے؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اُسے مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دراصل تم ہی میرے خوابوں کے شہزادے ہو۔ عاصم سے تو میری شادی میرے والدین کی مرضی سے ہوئی ہے۔ ورنہ وہ تو مجھے پہلے دن سے ہی زہر لگتا ہے۔''

''وہ تمہیں خلع دینے کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہو گا۔'' سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمیں اُس سے جان چھڑانے کے لیے یا تو عدالت سے رجوع کرنا پڑے گا یا پھر کوئی اور منصوبہ بنانا پڑے گا۔''

''کیسا منصوبہ؟ کیا... کیا تم اُسے جان سے مارنا...''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' سلیم نے قطع کلامی کی۔ ''میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

وہ بولا۔ ''میں اُسے ملک سے باہر بھجوا دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہمارے مزے ہی مزے ہوں گے۔''

''ملک سے باہر... لیکن کیسے؟'' اُس نے تحیر کے عالم میں پوچھا۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ میں اُسے کیسے ملک سے باہر بھجواتا ہوں۔''

''ہائے جانو! اگر ایسا ہو جائے تو پھر تو ہم دونوں کے مزے ہی مزے ہوں گے۔'' وہ سلیم سے لپٹتے ہوئے خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔ ''کمائے گا وہ اور عیش ہم دونوں کریں گے۔ قسم سے زندگی کا لطف آ جائے گا۔''

''ڈونٹ وری میری جان! ایسا ہی ہوگا۔'' سلیم نے اُسے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر یہ انتظام جلد سے جلد کرو نا؟''

''جلدی ہو جائے گا میری جان! فکر کیوں کرتی ہو... کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ دن کی طرح ہماری راتیں بھی رنگین گزرا کریں؟''

وہ بولی۔ ''نہیں رات کے وقت میں تم سے نہیں مل سکوں گی۔ دراصل اُس بڈھے کا مجھ پر کڑا پہرا ہوتا ہے۔''

''اس کا انتظام بھی ہے میرے پاس مگر پھر کبھی سہی۔ ابھی وقت ضائع کیوں کرتی ہو؟'' سلیم نے جذبات سے بوجھل آواز میں جواب دیا اور پھر کمرے میں شیطان کا من پسند کھیل شروع ہو گیا۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق دوسرے ہی دن ثمینہ نے عاصم کو بیرونِ ملک جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر

دیا۔ ادھر عاصم نے لنچ کیا اور ادھر ثمینہ نے بیرونِ ملک جا کر قسمت آزمائی کرنے والوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اُن لوگوں کا تذکرہ رشک کے ساتھ کر رہی تھی جو کمانے کے لیے خلیجی ممالک، امریکا اور یورپ کا رخ کر رہے تھے۔ عاصم چند لمحے تو بڑی توجہ سے اُس کی باتیں سنتا رہا پھر اکتا کر بولا۔

''تو میں کیا کروں بھئی! مجھے کیوں سنا رہی ہو یہ باتیں؟''

وہ بولی۔ ''عاصم! میں چاہتی ہوں کہ تم بھی باہر جا کر قسمت آزمائی کرو، کیا خبر ہمارے بھی دن پھر جائیں؟''

''تم ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہی ہو؟'' اُس نے آنکھیں نکالیں۔ ''میں بھلا کیسے باہر جا سکتا ہوں۔ بوڑھے والدین اور چھوٹے بھائی بہنوں کو میری ضرورت ہے۔''

''انہیں کو سکھ دینے کی خاطر تو میں تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں۔ ورنہ ہاشم، شبانہ اور ریحانہ کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ بھائی ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ انہیں اچھی سے اچھی تعلیم دلاؤں۔ تمہیں بھائی بہنوں کے اچھے مستقبل کے لیے یہ قربانی دینا پڑے گی۔''

''نہیں ثمینہ نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تم یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔''

وہ بولی۔ ''اس میں رسک لینے والی بھلا کون سی بات ہے؟ یہاں کتنے ہی لوگ ہیں جو ملک سے باہر جاب کر رہے ہیں۔ ڈالر، پونڈ اور ریال کما رہے ہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اس گھر میں خوش حالی آئے؟''

''دیکھو یہاں میں اچھی بھلی جاب کر رہا ہوں۔ مجھے پردیس میں دھکے نہیں کھانے۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میں شیخوں کے باتھ روم صاف کرتا پھروں؟''

''انگلینڈ میں شیخ کہاں سے آ گئے؟''

''اوہ تو محترمہ مجھے انگلینڈ بھجوانے کے خواب دیکھ رہی ہیں؟'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''اگر وہاں مجھے کوئی گوری میم پسند آ گئی تو تمہاری تو چھٹی ہو جائے گی۔ کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتی ہو؟''

''مجھے اپنے عاصم پر اعتماد ہے کہ وہ ایسا قدم کبھی بھی نہیں اُٹھائے گا۔''

وہ بولا۔ ''انگلینڈ کی گوریاں تم جیسی کئی بے وقوف عورتوں کے اعتماد خاک میں ملا چکی ہیں۔ جو وہاں کمانے کے لیے جاتا ہے، پلٹ کر کبھی واپس نہیں آتا۔''

''میں اس گھر کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لوں گی۔''

''یعنی میں اگر واپس نہ آیا تو تم میرے بغیر رہ لو گی؟''

''مر مر کر جی ہی لوں گی۔'' وہ مصنوعی دکھ کا شان دار مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میرا عاصم مجھ سے بے وفائی نہیں کرے گا۔ مجھے خود سے زیادہ تم پر بھروسا ہے۔''

''لیکن میں انگلینڈ جاؤں گا کیسے؟ پاسپورٹ اور ویزا تو میں حاصل کر ہی لوں گا۔ مگر وہاں انگلینڈ میں مجھے جاب کون دے گا؟'' اُس نے اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ سب تم سلیم بھائی پر چھوڑ دو۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔ ''وہ سب انتظام کر دے گا۔''

''نہیں بھئی نہیں... اُس کے پہلے ہی ہم پر بہت زیادہ احسان ہیں۔ کیوں مجھے شرمندہ کرانا چاہتی ہو؟ سلیم ..... کیا سوچے گا ہم لوگوں کے متعلق۔۔ یہی نا کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے لوگ ہیں؟''

وہ بولی۔ ''وہ ایسا نہیں سوچتا بلکہ وہ تو خود تمہیں باہر بھجوانا چاہتا ہے۔ تاکہ ہم لوگوں کے حالات سنور جائیں۔ شبانہ اور ریحانہ کی شادیاں اچھے اور امیر گھرانوں میں ہوں اور ہاشم پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن جائے۔ سلیم بھائی سے زیادہ ہمدرد تم کہیں بھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس سلسلے میں سلیم بھائی سے خود بات کی ہے۔ بہت بے وقوف ہو تم۔ کم سے کم مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔ اُس نے کوئی ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہم لوگوں کا کہ ہر وقت بس ہمارے ہی مسائل حل کرتا رہے؟''

''ارے نہیں بھئی! ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''وہ تو سلیم بھائی نے خود ذکر چھیڑا تو مجھے بات کرنا پڑ گئی ورنہ میں کب اُس پر بوجھ ڈالنے کے حق میں ہوں؟''

اس کے بعد ثمینہ نے کچھ اس طرح اُسے مستقبل کے سہانے سپنے دکھائے کہ وہ فوراً ملک سے باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

دوسرے دن جب عاصم ناشتا کرنے کے بعد آفس چلا گیا تو ثمینہ نے فوراً سلیم کا نمبر ملا دیا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی سلیم نے پوچھا۔ ''سناؤ جانِ من! منصوبے کا کیا بنا؟''

وہ بولی۔ ''منصوبہ کامیاب ہو گیا ہے۔ تم فوراً اُسے باہر بھیجنے کا انتظام کرو۔''

''کیا... واقعی؟''

''تو اور کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔'' اُس نے جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''تو اسی خوشی میں آج میرے فلیٹ پر آرہی ہو نا؟''

''نہیں جانو! اب ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اُسے اگر ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو سارا منصوبہ چوپٹ ہو جائے گا۔''

''یہ تو تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو جانِ من۔'' اُس نے شکوہ کیا!

وہ بولی۔ ''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تم کچھ دن صبر کرلو، میں تمہیں خوش کردوں گی۔''

''پھل سامنے رکھا ہو تو کون کم بخت صبر کرسکتا ہے؟'' اُس نے ایک ٹھنڈی آہ خارج کی۔

وہ ہنسی۔ ''اتنے بے صبرے مت بنو ڈیئر! ہم بہت جلد ملیں گے۔ کیا مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟''

''خود سے بڑھ کر تم پر بھروسا ہے اس لیے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہا ہوں۔''

''سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی تم فائدے میں رہو گے۔ کمائے گا وہ اور عیش ہم کریں گے۔''

''کہیں یہ خواب، خواب ہی نہ رہ جائے؟'' اُس نے دل میں چھپے خدشے کا اظہار کیا۔ ''انگلینڈ جا کر اکثر لوگ سب رشتے ناتے بھول جاتے ہیں۔ اگر وہ بھی ایسا ہی نکلا تو ہمارے تو سب خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔''

''آئندہ ایسا خیال بھی دل میں مت لانا۔ وہ مجھے پاگل پن کی حد تک چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس پر کسی گوری کا جادو نہیں چل سکتا۔'' ثمینہ نے پُرغرور لہجے میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''اتنی اُونچائی پر مت اُڑو، نیچے گرو گی تو بہت زیادہ چوٹ لگے گی۔''

''فکر مت کرو میں نیچے نہیں گروں گی۔ بس تم اُسے جلد سے جلد کسی طرح انگلینڈ بھجوا دو۔''

''اوکے میں ایک ہفتے کے اندر ہی سارا انتظام کر دوں گا۔''

ایسے ہی وقت باہر کاریڈور میں قدموں کی چاپ اُبھری تو اُس نے جلدی سے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق سلیم نے کوشش کی اور عاصم کو دس دنوں کے اندر ہی انگلینڈ بھجوا دیا۔ جاتے ہی عاصم کو جاب بھی مل گئی۔ انگلینڈ میں سلیم کا ایک رشتے دار گاڑیوں کے کاروبار سے منسلک تھا۔ چنانچہ اُسی کے شوروم میں عاصم کو سیلز منیجر کی جاب مل گئی۔ ماہانہ سیلری عاصم کی توقع سے بھی زیادہ تھی۔ لہٰذا وہ ہر ماہ ثمینہ کو موٹی موٹی رقمیں بھیجنے لگا۔ اب ثمینہ کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ اُس نے سلیم کے ساتھ مل کر شہر کی نئی آبادی میں ایک پلاٹ خریدا اور مکان کی تعمیر شروع کردی۔ عاصم اس بات سے بے خبر شب و روز پیسا کمانے میں لگا رہا۔ ثمینہ ہر ماہ دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت رقم ساس سسر کو بھی دے دیتی تھی۔ چنانچہ گھر کی گاڑی بھی آسانی سے چل رہی تھی۔ عاصم کبھی کبھار فون پر گھر والوں سے بات کرلیتا تھا۔ تاہم ثمینہ کو وہ..... ہفتے میں تین چار مرتبہ کال کرتا تھا۔

وہ دونوں نہ صرف عاصم کی کمائی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے بلکہ ہر دوسری رات ثمینہ کے بیڈ روم میں رت جگا بھی منا رہے تھے۔ گھر کے دوسرے افراد چونکہ سلیم کے ساتھ ایک عرصے سے گھلے ملے ہوئے تھے۔ لہٰذا اُن کی طرف سے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ماسٹر رشید احمد بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ اُن کی تاڑ میں لگا رہا۔ اُسے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ ثمینہ اور سلیم کے درمیان ناجائز مراسم ہیں۔ لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ اب تک اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔ دراصل وہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ ہر رات اُسے جلدی نیند آجاتی تھی۔ حالانکہ عاصم کے جانے سے قبل وہ ہمیشہ دیر سے سویا کرتا تھا۔

ماسٹر رشید رات کو سونے سے قبل باقاعدگی سے دودھ پینے کا عادی تھا اور یہ دودھ ہمیشہ اُس کی ٹیبل پر ثمینہ ہی رکھا کرتی تھی۔ اُس رات جب وہ عشا پڑھ کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹا تو اُسے گرانیٔ شکم کی شکایت ہوگئی۔ حالانکہ کھانا بھی اُس نے معمول سے زیادہ نہیں کھایا تھا۔ دودھ کا گلاس حسبِ معمول ٹیبل پر رکھا ہوا تھا مگر آج دودھ پینے کو اُس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اُس کی بیوی خدیجہ بیگم چند لمحے تو غور سے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر پوچھا۔ ''کیا بات ہے آج آپ پریشان لگ رہے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟''

وہ بولا۔ ''ہاں بس ٹھیک ہی ہوں۔ تم ایسا کرو یہ دودھ پی لو یا پھر ہاشم کو دے دو۔ میں آج نہیں پیوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔'' اُس نے کہا۔ ''ارے نیک بخت! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ذرا پیٹ بھرا بھرا سا محسوس ہو رہا ہے اس لیے

میں دودھ نہیں لینا چاہتا۔ یہ نہ ہو کہ پیٹ میں گڑبڑ ہو جائے اور ساری رات ٹوائلٹ کے چکر کاٹتا رہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ تو پھر آج میں ہی دودھ پی لیتی ہوں۔'' خدیجہ بیگم نے بستر سے اُٹھتے ہوئے جواب دیا اور پھر آگے بڑھ کر دودھ کا گلاس اُٹھا کر منہ سے لگا دیا۔

دودھ پینے کے بعد وہ دوبارہ سو گئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ خدیجہ بیگم کے خراٹے گونجنے لگے لیکن وہ جاگتا رہا۔ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، کتنی ہی دیر گزر گئی مگر آج خلاف توقع اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ جب کہ خدیجہ بیگم معمول سے تھوڑی دیر قبل ہی سو گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا اسی سوچ میں غرق تھا کہ معاً اُس کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''اوہ... اب میں سمجھا۔'' اُس نے مدھم سی آواز میں خود کلامی کی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ دودھ نشہ آور ہوتا ہے۔ شاید اس میں خواب آور گولی گھولی جاتی ہے۔''

''لیکن کیوں؟'' دماغ نے سوال کیا۔

اس ''کیوں'' کا فی الفور اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ دوبارہ سوچنے لگا۔ ایک بار پھر اُس کے دماغ میں روشنی سی لپکی اور پھر اس ''کیوں'' کا جواب بھی اُسے مل گیا۔ ''ہاں بالکل یہی بات ہے۔'' اُس نے پھر خود کلامی کی۔ ''یہ ثمینہ اور سلیم کی پلاننگ ہے۔ وہ مجھے خواب آور گولی کھلا کر یقیناً منہ کالا کرتے ہیں لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ بالکل نہیں ہونے دوں گا۔''

کمرے میں زیرو پاور بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ساتھ والی ٹیبل پر اُس کی رسٹ واچ اور نظر کا چشمہ رکھا ہوا تھا۔ اُس نے چشمہ لگا کر وقت دیکھا تو رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ وہ بستر سے اُٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کا رُخ ثمینہ کی خواب گاہ کی طرف تھا۔ جو طویل کاریڈور کے کارنر میں واقع آخری کمرا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ کمرے کے اندر سے دھیمی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ ان آوازوں میں ثمینہ کی ہنسی بھی شامل تھی۔ ماسٹر رشید کا خون کھولنے لگا اور پھر اُس نے کمرے کے دروازے کو ایک دم کھول دیا۔

ثمینہ اور سلیم آنے والی افتاد سے بے خبر تھے کہ معاً کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر ''چٹ'' کی آواز کے ساتھ ہی کمرا دودھیا روشنی میں جگمگا اُٹھا۔ سامنے موجود منظر دیکھ کر ماسٹر رشید پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کسی دن ایسا بے حیائی کا کھیل اُس کے گھر میں کھیلا جائے گا۔ چند لمحے تو اُس پر سکتے کی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''بے حیا عورت! یہ میرا گھر ہے جسے تم نے عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔ آج تجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

سلیم اور ثمینہ اس دوران نہ صرف تن ڈھانپ چکے تھے بلکہ اچانک لگنے والے جھٹکے سے بھی سنبھل چکے تھے۔ چنانچہ اُسے جارحانہ انداز میں ثمینہ کی طرف بڑھتا دیکھ کر سلیم نے فوراً مداخلت کی۔ ''رُک جاؤ بڑے میاں! ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' سلیم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول لہرایا۔

''تم... تم مجھ پر گولی چلاؤ گے؟'' وہ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اتنی ہمت ہے تجھ میں؟''

''تم اگر مجبور کرو گے تو ضرور چلاؤں گا۔ بہتر ہوگا کہ جو دیکھا ہے، اُسے خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ کسی سے ذکر کیا تو بے موت مارے جاؤ گے۔'' اُس نے دھمکی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم آستین کے سانپ نکلو گے اور یوں اپنے دوست کی عزت پہ ڈاکا ڈالو گے؟ تم نے میرے بیٹے کے بھرم کا خون کیا ہے۔ بہن اور بھائی کے مقدس رشتے کا مذاق اُڑایا ہے۔ تم پر اللہ کا قہر نازل ہوگا۔''

''بڑے میاں! تمہارے بیٹے کا بھرم ہمیشہ مجھ پر قائم رہے گا۔'' اُس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ''تاہم اب تم پر سے اُس کا بھرم ضرور اُٹھ جائے گا۔''

''میں... میں تجھے چھوڑوں گا نہیں... تم نے... تم نے...''

''غصہ تمہاری صحت کے لیے مضر ہے بابا جی۔'' اُس نے طنزیہ لہجے میں قطع کلامی کی۔ ''بقول تمہارے میں آستین کا سانپ ہوں اور سانپ کا کیا بھروسا کسی کو بھی ڈس سکتا ہے۔ تم تو اپنی زندگی جی ہی چکے ہو، کم سے کم اپنی جوان ہوتی بیٹیوں کا ہی خیال کرلو۔ تم کیا چاہتے ہو کہ وہ بے چاریاں کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہیں؟ جاؤ اور آرام سے سو جاؤ، منہ بند رکھو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ بہت نقصان اُٹھاؤ گے۔''

یہ کھلی دھمکی تھی۔ گو کہ ماسٹر رشید موت سے نہیں ڈرتا تھا لیکن بیٹیوں کے خوف ناک انجام کے متعلق سوچ کر وہ لرز اُٹھا۔ سلیم کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر اُس

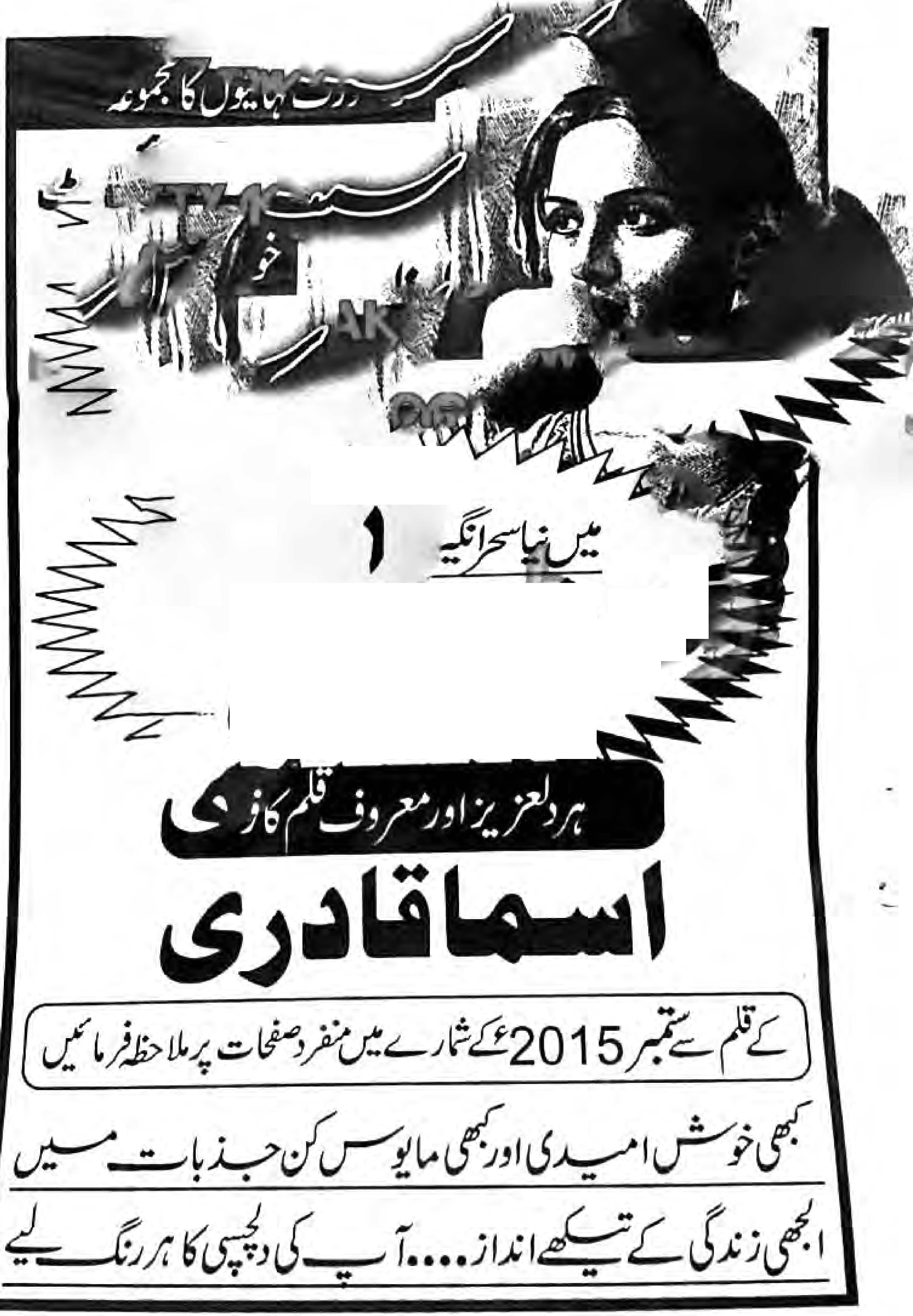

میں نیا سحر انگیز
1
ہر دلعزیز اور معروف قلم کار
اسما قادری
کے قلم سے ستمبر 2015ء کے شمارے میں منفرد صفحات پر ملاحظہ فرمائیں
کبھی خوش امیدی اور کبھی مایوس کن جذبات میں
الجھی زندگی کے تیکھے انداز... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ لیے

نے زبان بند نہ رکھی تو اس کا خمیازہ اُس کی بیٹیوں کو بھگتنا ہوگا۔ چنانچہ بہتری اسی میں تھی کہ وہ اپنی زبان بند رکھتا۔ اُس نے ایک نظر اُن دونوں پر ڈالی اور پھر ہارے ہوئے جواری کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ماسٹر رشید جونہی کمرے سے باہر نکلا تو ثمینہ نے رونا شروع کردیا۔ سلیم نے کہا۔ ''یہ کیا حماقت ہے، تم کیوں رو رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''روؤں نہ تو اور کیا کروں؟ انکل ساری بات عاصم کو بتادیں گے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یقین کرو وہ بڈھا مرتا مرجائے گا مگر یہ بات عاصم کو نہیں بتائے گا۔''

''کیوں نہیں بتائے گا جب کہ سب کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔''

وہ بولا۔ ''اس لیے کہ وہ ایک باپ ہے اور دنیا کا کوئی بھی باپ اپنی بیٹیوں کا بُرا نہیں چاہتا۔ چاہے وہ اس بڈھے کی طرح پڑھا لکھا ہو یا چٹا اَن پڑھ۔''

''لیکن جب عاصم چھٹی پر آئے گا تو تب کیا ہوگا؟'' اُس نے دل میں چھپے خدشے کا اظہار کیا۔ ''تب تو یہ بڈھا چپ نہیں رہے گا نا؟''

''اس کا حل بھی ہے میرے پاس۔'' وہ چہرے پر خباثت آمیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''تم ایسا کرو ابھی عاصم کو کال کرو اور اُسے بتاؤ کہ اُس کے باپ نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ تھوڑی بہت رونے کی اداکاری بھی کرلینا تاکہ اُسے کسی قسم کا شبہ نہ رہے۔''

''نن... نہیں یہ میں نہیں کرسکتی۔'' وہ ایک دم بوکھلا گئی۔ ''ایک سفید بالوں والے بزرگ پہ اتنا گھناؤنا الزام لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ پر اللہ کا قہر نازل ہوجائے گا۔''

وہ بولا۔ ''تم اگر اللہ کے قہر سے ڈرتی رہوگی تو پھر عاصم کا قہر تم پر ضرور ٹوٹے گا۔ پہلے اس قہر سے بچو بعد میں توبہ کرلینا۔ مرنے سے پہلے تک توبہ کے دروازے کھلے ہی رہتے ہیں۔''

ہائے رے انسان کی خوش فہمی! بےچارہ ساری زندگی توبہ کی اُمید میں گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن توبہ کی سعادت ہزاروں میں سے کسی ایک کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ ثمینہ بھی اُس وقت توبہ کی اُمید میں یہ گھناؤنا گناہ کرنے پر تل گئی۔ ''ٹھیک ہے میں عاصم سے بات کرلیتی ہوں۔'' وہ رضامند ہوکر بولی۔ ''مگر اس وقت لندن میں بجانے ٹائم کیا ہوگا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ عاصم سو رہا......''

''ٹائم کو گولی مارو یار!'' اُس نے جھنجلا کر بات کاٹی۔ ''تم بس عاصم سے بات کرو اور اُسے یقین دلاؤ کہ اُس کے باپ نے واقعی تمہاری عزت تار تار کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ جب کہ تم نے بڑی مشکل سے اپنی عزت بچائی ہے اور یہ کہ اب تم اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی ہو کیونکہ وہ دوبارہ بھی ایسی مذموم حرکت کرسکتا ہے اور ہاں کال کرتے وقت فون کا اسپیکر آن رکھنا۔''

''او کے میں ٹرائی کرتی ہوں۔'' اُس نے ٹیبل پر رکھا ہوا سیل فون اُٹھایا اور عاصم کا نمبر ملادیا۔

دوسری جانب سے عاصم کی ہیلو سنائی دی تو وہ رونے لگ گئی۔ انداز ایسا تھا کہ اداکاری کے بجائے حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ لحہ بھر کے لیے تو اُس کی اداکاری پر سلیم بھی حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ثمینہ اتنی اچھی اداکارہ ہوگی۔

عاصم نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔ ''ثمینہ! میری جان مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟ یوں رو کر مجھے تکلیف تو نہ دو۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں شاید یقین نہ آئے مگر میں تمہیں پھر بھی بتاؤں گی۔ دراصل... دراصل... بات...'' جملہ اُدھورا چھوڑ کر وہ پھر رونے لگی۔ یہاں تک کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

عاصم نے پریشان ہوکر کہا۔ ''تمہارے آنسو گواہی دے رہے ہیں کہ تم سچی ہو۔ پلیز اب بتادو کہ بات کیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''انکل... انکل نے... ابھی کچھ دیر قبل... میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے... م... میں اب اس گھر میں... نہیں رہ سکتی... مجھے ان سے ڈر لگتا ہے... وہ... وہ پھر کسی وقت بھی ایسی حرکت کرسکتے ہیں۔'' اُس نے رک رک کر بات پوری کی اور ایک بار پھر رونا شروع کردیا۔

دوسری طرف سے عاصم چلا رہا تھا۔ ''نہیں نہیں... یہ جھوٹ ہے... جھوٹ ہے... کہہ دو کہ جھوٹ ہے۔ ورنہ اتنے مقدس رشتے پر سے میرا اعتبار اُٹھ جائے گا۔''

مگر وہ عاصم کی بات سننے کے بجائے روئے چلے جارہی تھی۔ جب عاصم کو چلاتے ہوئے کافی دیر گزر گئی تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اسی لیے تو میں تمہیں بتانا نہیں

چاہتی تھی کہ تم میرا اعتبار نہیں کرو گے۔ مگر عاصم! یہی سچ ہے۔ تمہیں اگر یقین نہیں آتا تو میں کوئی بھی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

وہ بولا۔ "میں... میں کیسے یقین کرلوں کہ اباجی اس حد تک گر سکتے ہیں؟ ثمینہ! خدا کی قسم مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔"

"تم اگر مجھ پر شک کر رہے ہو تو پھر میرے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ میں ابھی اسی وقت خودکشی کرلیتی ہوں۔" اُس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں ثمینہ، نہیں۔" وہ چلّایا۔ "تم ایسا کچھ بھی نہیں کروگی۔ تمہیں میری قسم... بولو کہ تم دوبارہ اپنی جان لینے کی بات نہیں کروگی۔"

"بے عزت ہوکر جینے سے بہتر ہے کہ میں عزت کے ساتھ اپنی جان دے دوں۔"

"نن... نہیں مجھے تم پر اعتبار ہے۔" اُس نے بوکھلا کر جواب دیا۔ "تم صبح ہوتے ہی اپنے گھر چلی جانا۔ اس ماسٹر رشید سے میں خود نمٹ لوں گا۔" نفرت کی شدت سے عاصم نے اُسے اباجی کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔

"ٹھیک ہے، میں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

اس کے بعد عاصم نے چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر رابطہ منقطع کردیا۔

"یہ ہوئی ناں بات، کمال کی ایکٹنگ کی ہے تم نے۔ اب ہوگی باپ بیٹے کی جنگ۔" سلیم نے ثمینہ کو داد دیتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "آؤ اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے فلیٹ پر چلتے ہیں۔ وہیں سے صبح کے وقت تم اپنے گھر چلی جانا۔"

"چلو۔" ثمینہ مسکرائی۔ "تمہارا فلیٹ ٹھیک رہے گا۔ یہاں تو بڈھے نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔"

☆☆☆

صبح ماسٹر رشید اور اُس کے گھر والے جاگے تو ثمینہ غائب تھی۔ سبھی گھر والے پریشان ہوگئے مگر ماسٹر رشید مطمئن تھا۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ناشتے کی میز پر خدیجہ بیگم چند لمحے تو اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔ "آپ تو ایسے مطمئن بیٹھے ہیں جیسے ہماری لاٹری نکل آئی ہو؟ کوئی پروا ہی نہیں ہے آپ کو بہو کے غائب ہونے کی۔"

وہ بولا۔ "تم اُس کی فکر مت کرو، مجھے معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہوگی اور کیا کر رہی ہوگی؟"

"آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ ثمینہ..."

"ناشتا کرو بیگم۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔"

جواب میں خدیجہ بیگم اُسے محض گھور کر رہ گئی۔ ناشتا کرنے کے بعد بچے اسکول و کالج روانہ ہوگئے۔ جب کہ اُن کی بڑی بیٹی فرحانہ برتن سمیٹ کر کچن کی طرف چل دی۔ اب ناشتے کی میز پر وہ میاں بیوی تنہا رہ گئے۔

"اب بتاؤ، بات کیا ہے؟" خدیجہ بیگم نے سوال کیا۔

وہ بولا۔ "ہماری بہو ایک بدکار اور بدچلن عورت ہے۔ گزشتہ رات میں نے اُسے سلیم کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ صبح سویرے ہی اپنے میکے کی طرف بھاگ گئی ہے۔"

"یہ... یہ... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ سلیم تو اُس کا بھائی ہے؟" خدیجہ بیگم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "مم... مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ سلیم اور ثمینہ اس طرح کی گھناؤنی حرکت... نہیں بھئی نہیں... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"تم احمق کی احمق ہی رہوگی۔" وہ طیش میں آکر بولا اور پھر گزشتہ رات والا واقعہ بغیر کسی لگی لپٹی کے اُسے سنادیا۔

"ارے تو پھر فوراً عاصم سے بات کرو نا؟" اُس نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

"نن... نہیں۔" ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر میں نے عاصم کو کچھ بتایا تو سلیم ہماری بیٹیوں کا دشمن بن جائے گا۔ جب تک عاصم چھٹی کر کے نہیں آجاتا تب تک ہمیں اس راز کو راز ہی رکھنا ہوگا۔"

وہ بولی۔ "آپ اگر اسی طرح ڈرتے رہے تو وہ ڈائن وار کر جائے گی۔ میری مانو تو ابھی عاصم کو کال کر کے ساری بات بتادو۔ اللہ مالک ہے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

"قطعی نہیں، سلیم بہت خطرناک آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہماری بیٹیوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" وہ جھنجلا گئی۔ "یہ بہت

نازک معاملہ ہے۔ آپ کی خاموشی آپ کو مجرم بنا دے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈائن عاصم سے بات کر کے اُس کے کان بھرے، آپ خود ہی عاصم کو ساری سچائی بتا دیں۔''

بیوی کی بات دل کو لگتی تھی۔ اُس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر بولا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو میں ابھی اپنے کمرے میں جا کر عاصم سے بات کرتا ہوں۔'' وہ اُٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

اُس کا سیل فون بستر کے ساتھ والی ٹیبل پر رکھا تھا۔ اُس نے سیل فون اُٹھایا اور عاصم کا نمبر ملا دیا۔ چوتھی بیل کے بعد عاصم کی خمار آلود ہیلو سنائی دی تو وہ بولا۔ ''بیٹے! میں تمہارا ابو بات کر رہا ہوں۔ دراصل مجھے تم سے ایک بہت ہی سیریس مسئلہ ڈسکس...''

''مر گیا آپ کا بیٹا۔'' عاصم نے نفرت انگیز لہجے میں قطع کلامی کی۔ ''آئندہ مجھے کال مت کرنا۔ ورنہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں گا۔''

بیٹے کا لہجہ اور لفظ بتا رہے تھے کہ بازی اُس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ تاہم اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بیٹے! مجھے نہیں معلوم کہ تم سے کیا کہا گیا ہے اور کس نے کہا ہے۔ مگر خدا جانتا ہے کہ...''

''میں نے کہہ دیا ہے نا کہ مجھے کچھ نہیں سننا۔'' عاصم نے دوبارہ بات کاٹی۔ ''پھر آپ کیوں اور کس لیے اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں؟ آپ نے تو مجھے منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں چھوڑا۔ ثمینہ آپ کی بہو ہے اور بہو بیٹی کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے اس مقدس رشتے کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔''

''یہ... یہ تم... کک... کیا... کہہ رہے... ہو؟'' عاصم کی بات سن کر اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اُسے سرِ بازار بے لباس کر دیا ہو۔ اُس کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔ بولنے کے لیے اب کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ فون ہاتھ میں لیے وہ یوں ساکت و جامد تھا جیسے کوئی سنگی مجسمہ ہو۔ دوسری طرف سے عاصم کب کا کال منقطع کر چکا تھا۔ مگر وہ بدستور فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے اُسے بہت دیر گزر گئی تو وہ اُٹھا، ٹیبل کی دراز سے ایک نوٹ بک نکالی اور کچھ لکھنے لگا۔

☆☆☆

ابھی اس واقعے کو ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک روز اچانک عاصم کو سلیم کی طرف سے کال موصول ہوئی۔ ''عاصم میرے دوست! تم پہلی فرصت میں چھٹی لے کر پاکستان پہنچ جاؤ۔'' سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔

''مگر کیوں سلیم؟'' اُس نے حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔ ''مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے۔ اور... اور یہ تم رو کیوں رہے ہو، خیر تو ہے نا؟''

''کچھ بھی نہیں بچا یار۔'' سلیم نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''سلیم... سلیم...'' وہ چلّایا۔ ''خدا کے لیے مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے؟''

''وہ... وہ انکل... آنٹی... تمہاری بہنیں... بھائی اور بھانجے... سب کے سب... مم... ما... ما...'' بات ادھوری چھوڑ کر اُس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ شاید شدتِ غم سے وہ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

عاصم کے منہ سے ''نہیں'' کی آواز چیخ کی صورت برآمد ہوئی اور پھر وہ جیسے پتھر کا بن کر رہ گیا۔ سیل فون اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دبیز قالین پر گر گیا۔ چند لمحے تو اُس پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھ گیا۔ ''نہیں نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ روتے روتے چیخ کر کہتا اور پھر رونے لگتا۔ دوسری طرف سیل فون سے سلیم کی ہلکی ہلکی ''ہیلو، ہیلو'' کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مگر عاصم اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو سیل فون کی طرف متوجہ ہوتا۔ آخر کار سلیم نے نا اُمید ہو کر کال ڈس کنکٹ کر دی۔

عاصم نجانے کتنی ہی دیر اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ روتے روتے اُس کی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا مگر وہ پھر بھی رو رہا تھا۔ اچانک اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے بادلِ ناخواستہ سیل فون اُٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر سلیم کا نام جھلملا رہا تھا۔ کال ریسیو کرنے کو اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر اُس نے کال ریسیو کر لی۔ تب سلیم نے اس اندوہ ناک واقعے کے بارے میں اُسے ساری تفصیل بتا دی۔ سلیم کے مطابق یہ ڈکیتی کی واردات تھی مگر عاصم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ڈاکوؤں کی بچوں کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟'' تفصیل سننے کے بعد اُس نے غمزدہ انداز میں پوچھا۔ ''اور... اور میری معصوم بہنوں کا کیا قصور تھا؟ مزاحمت تو غالباً میرے بھائی اور باپ نے کی ہوگی؟''

سلیم نے کہا۔ ''اس بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں میرے بھائی! تم بس چھٹی لے کر پہنچ جاؤ، اُن کی تجہیز و تکفین

بھی تو کرنی ہے نا؟''

''م... میں اُن سب کو مُردہ کیسے دیکھوں گا۔'' وہ پھر رو دیا۔ ''اُن کی زندہ صورتیں میرے ذہن میں محفوظ رہنے دے سلیم! م... میں برداشت نہیں کرسکوں گا، تم ہی انہیں قبروں میں اُتار دو۔''

''یہ دنیاداری کے تقاضے ہیں میرے دوست! تمہیں باپ اور ماں کے جنازے کو کندھا دینا ہی پڑے گا۔ ثمینہ بھی تو تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔''

سلیم کافی دیر تک اُسے سمجھاتا رہا۔ آخرکار اُسے سلیم کی بات ماننا ہی پڑی اور وہ دو ماہ کی چھٹی لے کر وطن واپس آگیا۔

معاً گاڑی کے ٹائرز چیخے، اُسے ایک جھٹکا لگا اور وہ ماضی سے نکل کر حال میں پہنچ گیا۔ گاڑی رک چکی تھی۔ اُس نے سامنے دیکھا تو گاڑی کے آگے سے بھینسیں روڈ کراس کر رہی تھیں۔

سلیم نے جھنجلا کر کہا۔ ''پتا نہیں اس ملک کے لوگوں کو کب عقل آئے گی اور کب یہ سڑکوں کے کنارے مویشی چرانا چھوڑیں گے؟''

جواب میں وہ خاموش رہا۔ سلیم نے روڈ خالی ہوتے ہی گاڑی آگے بڑھادی۔ لگ بھگ وہ تین گھنٹوں کے اندر گھر پہنچ گئے۔ جہاں ایک ساتھ نو میتیں عاصم کی منتظر تھیں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔ گھر میں عاصم کے تقریباً دور و نزدیک کے تمام رشتے دار موجود تھے۔ وہ ایک ایک میت سے لپٹ کر روتا رہا۔ دوست رشتے دار اُسے سچی جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ مگر آج ہر تسلی اُس کے غم کی شدت کم کرنے میں ناکام رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جنازے اُٹھائے گئے تو وہ لوگوں کے ہجوم کے ساتھ قبرستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ جنازے پڑھے گئے اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے ہی اُس کے سارے گھر والوں کو زمین میں اُتار دیا گیا۔ قبرستان سے فارغ ہو کر جونہی وہ لوگوں کے ساتھ اپنے گھر تک پہنچا تو گیٹ کے سامنے ہی ایک پولیس وین موجود تھی۔

☆☆☆

پولیس انسپکٹر ایک چھریرے بدن والا خوب صورت سا نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ سب سے پہلے اُس نے پولیس والوں کے روایتی انداز سے ہٹ کر عاصم سے اظہار تعزیت کیا اور پھر شائستہ انداز میں بولا۔ ''گو کہ آپ سے سوال و جواب کرنا مجھے بہت معیوب محسوس ہو رہا ہے۔ مگر میں اپنی پروفیشنل ذمے داری سے مجبور ہوں ورنہ یہ موقع ایسی گفت گو کے لیے نہایت نامناسب ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے برا نہیں منائیں گے؟''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! مجھے اب کچھ بھی اچھا برا نہیں لگتا۔ آپ کو جو کچھ بھی پوچھنا ہے، بلاجھجک پوچھیں..... ویسے آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ میں ملک سے باہر رہتا ہوں۔''

''آپ مجھے.... شیر دل کے نام سے پکار سکتے ہیں۔'' وہ کیپ اُتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے سینے پہ لگی نیم پلیٹ تو آپ نے پڑھ ہی لی ہوگی۔''

''پڑھ چکا ہوں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ سوال کیجیے۔''

''سلیم سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟'' انسپکٹر نے پہلا سوال کیا۔

وہ بولا۔ ''سلیم میرے لیے ایک بھائی کی طرح ہے۔ اگر آپ کو اُس پر کسی قسم کا شک ہے تو پھر آپ کی تفتیش غلط رخ پر جارہی ہے۔''

''یعنی بھائی کی طرح ہے مگر بھائی نہیں ہے؟ آپ کے کہنے کا یہی مطلب ہے نا؟'' انسپکٹر نے اُس کی بات کو یکسر نظرانداز کر دیا۔

''ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا اُس سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن مجھے اُس پر کسی قسم کا بھی شک نہیں ہے۔ اُس نے بے شمار احسانات کیے ہیں مجھ پر۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، سلیم ہی کے دم سے ہوں۔''

''میں نے ابھی تک اُس پر کسی قسم کا بھی شک نہیں کیا۔ تاہم میں اُس سے چند سوالات ضرور کرنا چاہوں گا۔''

''سوری انسپکٹر صاحب! میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ سے کس نے اجازت مانگی ہے؟'' انسپکٹر مسکرایا۔ ''یہ تو میری ڈیوٹی ہے جو بہرصورت مجھے سرانجام دینی ہے۔ آپ چاہیں بھی تو مجھے اس اقدام سے نہیں روک سکتے۔ کیونکہ یہ کارِسرکار ہے اور کارِسرکار میں آپ تو کیا کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔''

''یہ تو آپ زیادتی کر رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔'' اُس نے احتجاج کیا۔ ''سلیم میرا دوست ہے اور مجھے اپنی جان سے بھی پیارا ہے۔ میں اُس کی بے عزتی کسی صورت بھی برداشت نہیں کروں گا۔''

''مسٹر عاصم! میں ایک پولیس والا ہوں اور ہمارے سینے میں موجود دل احساسات وجذبات سے قطعی عاری ہوتا ہے۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ صوبائی حکومت نے یہ کیس دس روز کے اندر نمٹانے کا حکم دیا ہے۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر سوری میں آپ کے جذبات کو اپنی تفتیش کے راستے میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بے شک وہ آپ کا انتہائی عزیز دوست ہے لیکن بدقسمتی سے وہ شک کی زد میں آتا ہے۔ مجھے آپ کی بیوی ثمینہ اور سلیم دونوں سے پوچھ تاچھ کرنی ہے۔''

''مطلب آپ مجھے رسوا کرنے پہ تلے ہوئے ہیں؟''

''آپ اگر ایسا سمجھتے ہیں تو پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''او کے۔'' عاصم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں انہیں بلاتا ہوں، آپ اپنا یہ شوق بھی پورا کر لیجیے۔''

وہ بولا۔ ''شوق اور ڈیوٹی دو الگ الگ فعل ہیں مسٹر عاصم اور ڈیوٹی کو سرانجام دینا میرا شوق نہیں بلکہ جنون ہے۔''

''تو ٹھیک ہے آپ اپنا جنون پورا کر لیجیے۔''

''یہاں نہیں، میں انہیں پولیس اسٹیشن لے کر جاؤں گا۔'' انسپکٹر شیر دل نے جواب دیا۔

''نو نو۔'' وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں یہ قطعی نہیں ہونے دوں گا۔ یہ بہت غلط بات ہو گی۔''

''آپ اگر تعاون نہیں کریں گے تو یقیناً مجھے انہیں گرفتار کرنا پڑے گا۔''

''یہی ایک تو خامی ہے ہمارے محکمۂ پولیس کی کہ مقتول کے ورثا کو بھی تفتیش میں شامل کر لیتی ہے۔ اسی لیے تو شرفا تھانوں کا رُخ نہیں کرتے۔''

وہ بولا۔ ''دیکھیے مسٹر عاصم! آپ جب تک یہ جذبات کا چشمہ آنکھوں سے اُتار نہیں دیتے تب تک آپ محکمۂ پولیس کی مجبوری کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہماری تفتیش ہمیشہ شک سے شروع ہو کر یقین تک پہنچتی ہے۔''

''یعنی آپ اپنی من مانی کر کے ہی رہیں گے؟''

''من مانی نہیں فرض پورا کروں گا۔ گڈ بائے مسٹر عاصم۔'' اُس نے کیپ اُٹھا کر سر پر رکھی اور عاصم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

پولیس اُسی روز سلیم اور ثمینہ کو شک کی بنیاد پر ساتھ لے گئی۔ جب کہ عاصم نے انہیں چھڑانے کی تگ و دو شروع کر دی۔ وہ پولیس کے افسرانِ بالا سے ملا مگر کوئی بھی اس معاملے میں اُس کی مدد کرنے پر راضی نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ اُن میں سے کوئی بھی پولیس افسر انسپکٹر شیر دل سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے انسپکٹر شیر دل کو صوبائی حکومت کی بھی مکمل سپورٹ حاصل تھی۔ ایسی صورتِ حال میں کوئی افسر بالا کیسے راضی ہو سکتا تھا؟ چنانچہ ہر آفس سے عاصم کو ایک ہی جواب ملا اور وہ تھا ''سوری''۔ تھک ہار کر وہ گھر لوٹ آیا جہاں اُس کے چند قریبی رشتے دار ٹھہرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

انسپکٹر شیر دل کا اپنا ایک مخصوص اسٹائل تھا تفتیش کرنے کا۔ وہ ہمیشہ مجرم کو جسمانی کے بجائے نفسیاتی ٹارچر کرنے کا قائل تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے اُس نے ثمینہ کو بلایا اور شائستہ انداز میں بولا۔ ''ثمینہ بی بی گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُن پولیس والوں میں سے نہیں ہوں جو بلاوجہ مجرم کو ٹارچر کرنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ آپ اگر سچ بولیں گی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچے گی۔''

وہ بولی۔ ''انسپکٹر صاحب! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ جب کہ آپ مجھے مجرم کہہ چکے ہیں اور رہ گئی سچ بولنے والی بات تو میں بھلا کیوں جھوٹ بولوں گی۔ کیا مرنے والے میرے کچھ نہیں لگتے تھے؟''

''سوری آپ شاید میری بات سمجھ ہی نہیں سکیں۔ مجرم کا لفظ میں نے آپ کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ ویسے ہی بطور محاورہ بولا ہے۔''

''اٹس او کے۔'' اُس نے سر ہلایا۔ ''پوچھیے کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟''

''وقوعہ کی رات آپ کہاں تھیں؟'' انسپکٹر شیر دل نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''اپنے گھر میں۔''

کون سے گھر میں؟ میکا گھر یا...''

''ظاہر ہے میکے والے گھر میں تھی ورنہ آج یہاں آپ کے سامنے نہ بیٹھی ہوتی۔'' اُس نے قطع کلامی کرتے ہوئے جواب دیا۔

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اگلا سوال کیا۔ ''کیا یہ محض اتفاق ہے کہ آپ وقوعہ کی رات اپنے میکے میں تھیں یا پھر...''

''دیکھیے انسپکٹر صاحب۔'' اُس نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ ''پلیز آپ یوں گھما پھرا کر سوال مت کریں جو پوچھنا

ہے صاف صاف الفاظ میں پوچھیں۔''

اُس کے انداز میں اُلجھن تھی۔ چنانچہ انسپکٹر چوکنا ہوکر بولا۔ ''بی بی! نو جیتے جاگتے بے گناہ انسان قتل ہوئے ہیں اور پولیس کی تفتیش ہمیشہ گھر سے ہی شروع ہوتی ہے۔ آپ کی بیزاری دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کچھ جانتی ہیں مگر بتانا نہیں چاہتیں۔''

''یہ وہم ہے آپ کا۔ میں اگر کچھ جانتی تو ضرور بتاتی۔ مجھے بھلا کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اوکے... تو یہ بتائیں کہ یہ سلیم آپ کا کیا لگتا ہے؟''

''بھائی ہے۔'' اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

انسپکٹر بولا۔ ''جہاں تک مجھے معلوم ہے تو آپ کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ تو پھر یہ سلیم شاید آپ کا کوئی کزن وغیرہ ہوگا؟''

''وہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔''

''یعنی آپ کا اُس سے کوئی رشتہ نہیں ہے؟'' انسپکٹر نے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

''کیا منہ بولا رشتہ آپ کے نزدیک رشتہ نہیں ہے؟''

انسپکٹر نے ہوا میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ کے پڑوسی وغیرہ تو آپ دونوں کے اس رشتے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟''

''مم... میں سمجھی نہیں... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ پل بھر کے لیے بوکھلا گئی۔

''یہی کہ آپ کے اور سلیم کے درمیان کوئی چکر وغیرہ چل رہا ہے۔ جسے آپ کے مقتول سسر پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کا اور سلیم کا ایک بار جھگڑا بھی ہوا تھا، کیا یہ سچ ہے؟''

''بکواس کرتے ہیں ہمارے پڑوسی۔'' وہ ایک دم بھڑک اُٹھی۔ ''دراصل وہ ہمیں آگے بڑھتا دیکھ کر حسد اور جلن کا شکار ہوگئے ہیں اس لیے مجھ پر اُلٹے سیدھے الزام لگاتے رہتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں حسد اور جلن سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

وہ بولی۔ ''دراصل میرے شوہر عاصم کو سلیم نے ملک سے باہر بھجوایا ہے۔ سلیم نہ صرف میرا منہ بولا بھائی ہے بلکہ عاصم کا بھی قریبی دوست ہے۔ ہمارے اس رشتے کے متعلق میرے شوہر کو بھی اچھی طرح معلوم ہے لیکن لوگوں سے ہماری ترقی ہضم نہ ہوسکی اس لیے وہ میرے اور سلیم کے رشتے کو غلط رنگ دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔''

''یعنی آپ کے سسر اور سلیم کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بلکہ میرے سسر مرحوم تو سلیم کو اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔''

''مطلب وہ آپ دونوں کے اس رشتے سے خوش تھے؟''

''بلاشک وشبہ خوش تھے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''اوکے۔'' انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ایک لیڈی کانسٹیبل کو بلا کر کہا۔ ''اس بی بی کو لے جاؤ اور اس کے آرام کا خصوصی خیال رکھنا ہے۔ مجھے شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔''

''ڈونٹ وری سر۔'' خرانٹ سی لیڈی کانسٹیبل ذومعنی انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کی توقع سے بھی زیادہ اس بی بی کا خیال رکھوں گی۔''

اُن دونوں کے جانے کے بعد انسپکٹر نے سلیم کو طلب کرلیا۔ سلیم ایک کانسٹیبل کی معیت میں اندر داخل ہوا اور سلام کرنے کے بعد جواب طلب نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

''تشریف رکھیں۔'' انسپکٹر نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور پھر کانسٹیبل کو دو بہترین چائے لانے کا کہا۔

''ہاں تو مسٹر سلیم! کیا خیال ہے، سوالات کا آغاز کیا جائے؟'' انسپکٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیوں نہیں جناب! یہ تو آپ کی ڈیوٹی ہے۔ آپ پوچھیں مجھے جو کچھ بھی معلوم ہوگا، میں بلا جھجک بتاؤں گا۔''

''اوکے تو یہ بتائیے کہ آپ کی اور عاصم کی دوستی کس طرح اور کیسے ہوئی؟''

''بس ویسے ہی ہوگئی جس طرح سب کی ہوتی ہے۔''

''یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔'' انسپکٹر معترض ہوا۔

''ٹھیک ہے میں آپ کو ساری کہانی سنا دیتا ہوں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر انکل نذیر کے جنرل اسٹور میں پیش آنے والا واقعہ انسپکٹر کے سامنے بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کردیا۔

جب وہ واقعہ سنا رہا تھا تو اُس دوران کانسٹیبل چائے کے دو گرماگرم کپ انسپکٹر کی ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ انسپکٹر نے ایک کپ اُس کی طرف کھسکا دیا جب کہ دوسرا کپ خود اُٹھا

لیا۔ ''ہاں تو مسٹر سلیم!'' وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

''میں نے سنا ہے کہ عاصم کے والد مقتول رشید احمد آپ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟ اگر آپ نے جھوٹ بولا تو یقیناً آپ پھنس جائیں گے اس لیے جواب سوچ سمجھ کر دینا۔''

سوال سن کر لمحہ بھر کے لیے وہ کش مکش کا شکار ہو گیا مگر چہرے کے تاثرات سے اُس نے انسپکٹر کو پتا نہ چلنے دیا۔ ویسے بھی وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ چنانچہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ''ہاں انکل رشید واقعی مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔''

''گڈ، آپ نے سچ بول کر ایک معزز شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔'' انسپکٹر نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''اب ذرا یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ دونوں کے بیچ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟''

''وہ جی بس ایک عام سی گھریلو بات تھی۔ آپ جان کر کیا کریں گے؟''

''دیکھیے مسٹر سلیم! یہ کوئی عام سا معاملہ نہیں ہے۔ دو انسانوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا ہے۔ آپ اگر سب کچھ ہمیں نہیں بتائیں گے تو پھر ہم قاتلوں تک کیسے پہنچیں گے؟ آپ کو ہمارے ساتھ مکمل تعاون کرنا پڑے گا۔ یہی آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔''

''وہ جی دراصل میں ثمینہ کے لیے ایک تحفہ لے کر گیا تھا۔ جس پر انکل رشید کو غصہ آ گیا اور پھر ہم دونوں کے بیچ تُو تُو میں میں ہو گئی۔ مگر یہ تو بہت پُرانی بات ہے۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''لیکن میں نے تو کچھ اور سنا ہے؟''

''وہ... وہ کیا جی؟'' اُس نے حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔

''یہی کہ وقوعے سے چند روز قبل بھی آپ دونوں کے بیچ کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا؟'' انسپکٹر نے ہوا میں تیر چلایا۔

''نن... نہیں جی... آپ کو کیسے پتا؟'' غیر ارادی طور پر اُس کے منہ سے نکلا تو انسپکٹر شیر دل معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

''مسٹر سلیم!'' معاً انسپکٹر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تمہاری زبان سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔'' اس بار اُس نے اُسے ''آپ'' کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ''بہتر ہوگا کہ خود ہی سچ بول دو ورنہ منہ کھلوانے کے میرے پاس اور بھی طریقے ہیں۔''

''مم... میں کچھ نہیں جانتا جی۔'' اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اوکے... اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھی طرح نہیں مانو گے۔ مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔''

''جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اُس نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔

''واقعی تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' انسپکٹر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''اوکے اب تم سے کل صبح ملاقات ہوگی۔''

اس کے بعد اُس نے کانسٹیبل کو آواز لگائی تو وہ فوراً حاضر ہو گیا۔ ''حکم سر۔'' کانسٹیبل نے سلیوٹ کیا۔

''اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دو اور حوالدار الطاف سے کہو کہ اُسے صاحب بلا رہے ہیں۔'' انسپکٹر نے حکم دیا۔

''بہت بہتر جناب۔'' کہتے ہوئے کانسٹیبل سلیم کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ جب کہ انسپکٹر شیر دل سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد ایک موٹا تازہ حوالدار اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور انسپکٹر کو سلام کرتے ہوئے بولا۔ ''حوالدار الطاف حاضر ہے جناب! حکم کیجیے۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''الطاف! آج رات یوں سمجھو کہ تمہارا امتحان ہے۔ تم نے اس حوالاتی کو رات بھر پلک بھی نہیں جھپکنے دینی۔ لیڈی کانسٹیبل فرزانہ کو بھی بتا دو کہ اُس نے ثمینہ کو نہیں سونے دینا۔''

''بے فکر رہیے جناب! ایسا ہی ہوگا۔'' حوالدار نے فرماں برداری سے جواب دیا تو انسپکٹر نے اُسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد شیر دل آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایسے وقت گھریلو ملازم نے آ کر اُسے بتایا۔ ''جناب! کوئی عاصم نامی شخص آپ سے ملنے کے لیے آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے وغیرہ پلاؤ میں آ رہا ہوں۔''

ملازم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔ جب کہ وہ یونی فارم پہننے لگا۔ یونی فارم پہن کر اُس نے قدِآدم آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لیا اور پھر مطمئن ہو کر ٹیبل پر رکھی دو تین فائلیں اُٹھاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب اُس کا رُخ ڈرائنگ روم کی جانب تھا۔

جونہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو عاصم اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''پلیز تشریف رکھیے۔'' وہ عاصم کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''حکم کیجیے کیسے تشریف آوری کی زحمت کی؟''

عاصم نے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں کل رات سے نہیں سویا۔ پلیز آپ میری وائف اور دوست کو چھوڑ دیں۔ مجھے اُن پر یقین ہے وہ بے قصور ہیں۔ وہ اس قدر گھناؤنا جرم کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ نے ڈکیتی کی واردات میں خواہ مخواہ اُن بے چاروں کو ملوث کر دیا ہے۔''

''ڈونٹ وری مسٹر عاصم! وہ اگر بے گناہ ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی اُن کا بال بانکا بھی نہیں کر سکتا۔''

وہ بولا۔ ''جناب! میں مقتولین کا وارث ہونے کے ناتے آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ اُن دونوں کو چھوڑ دیں۔ مجھے اپنی بیوی اور دوست پر پورا اعتماد ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔''

''آپ جذباتی ہو کر سوچ رہے ہیں مسٹر عاصم! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ دونوں اس گھناؤنی واردات میں ملوث ہیں۔ مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ضرور ہیں۔ آپ آج شام تک صبر کر لیں، اگر وہ دونوں بے گناہ ہوئے تو بغیر کسی سفارش کے رِہا ہو جائیں گے ورنہ اُن کی قسمت کا فیصلہ عدالت کرے گی۔''

''میں آپ کے شک کی وجہ جان سکتا ہوں؟ آپ کو کون سا ایسا اہم کلیو ملا ہے کہ آپ نے اُن دونوں کو گرفتار کر لیا؟''

''وقت آنے پر یہ بھی بتا دوں گا۔ بس آپ تھوڑا سا صبر کر لیں۔''

''صبر... کیسے صبر کر لوں انسپکٹر صاحب!'' وہ جھنجلا اُٹھا۔ ''میرے سارے گھر والے بے دردی کے ساتھ قتل کر دیے گئے۔ شبہے میں میری بیوی اور دوست سلاخوں کے پیچھے چلے گئے۔ مگر آپ ہیں کہ پھر بھی مجھے صبر کی تاکید کر رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟''

''عاصم صاحب! آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں گے؟'' انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بس اب یہی کسر رہ گئی تھی۔ او کے، مجھے بھی تفتیش میں شامل کر لیں۔''

''آپ بھی اگر تفتیش کی زد میں آ گئے تو میں اس سے گریز نہیں کروں گا۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور عاصم بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

''آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں... دراصل میں اس اُلجھن میں ہوں کہ ڈاکو کبھی بے جا خون خرابا نہیں کرتے تو پھر انہوں نے آپ کی فیملی کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں کیا۔ اگر لوٹنا ہی اُن کا مقصد تھا تو پھر انہیں یہ خون ریزی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ زیادہ سے زیادہ آپ کے والد یا پھر بھائی نے مزاحمت وغیرہ کی ہو گی۔ عورتیں اور بچے تو مزاحمت کرنے سے رہے۔ مجھے یہ کسی دشمن کی کارروائی لگتی ہے۔ کوئی ایسا دشمن جس کے لیے آپ کے سب گھر والے خطرے کا الارم تھے۔ اب آپ سوچ کر بتایئے کہ آپ کا ایسا کوئی دشمن تھا؟''

''میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔'' اُس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''تو پھر میری تفتیش کے راستے میں روڑے کیوں اٹکاتے ہو؟'' انسپکٹر نے قدرے بُرا مان کر پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔ لہٰذا آپ اپنی تفتیش جاری رکھیں۔ اب میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

''گڈ، یہ ہوئی نا بات۔'' انسپکٹر مسکرایا۔ ''اب آپ بے فکر ہو جائیں، بہت جلد قاتل کی گردن میرے ہاتھوں میں ہو گی۔''

''او کے۔'' وہ انسپکٹر سے ہاتھ ملا کے..... رخصت ہو گیا۔

شیر دل پولیس اسٹیشن پہنچا اور فوراً ثمینہ کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ وہ لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ جب انسپکٹر کے سامنے پیش ہوئی تو اُس کی حالت بہت بری تھی۔ ایک ہی رات میں جیسے وہ آدھی ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ انسپکٹر شیر دل کے حکم کے مطابق اُس پر کسی قسم کا جسمانی تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ اُسے صرف ساری رات زبردستی جگا کر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اُس کی خوب صورت آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ریشمی زلفیں جھاڑ جھنکاڑ کے مانند اُلجھی ہوئی تھیں اور لباس میں سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔ انسپکٹر نے ایک نظر اُس کا جائزہ لیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تشریف رکھیے ثمینہ بی بی۔''

''خدا کے لیے... م... مجھے سونے دیجیے انسپکٹر صاحب۔'' وہ منمنائی۔ ''میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ م... میں مر جاؤں گی... پلیز پلیز... میں سونا چاہتی ہوں۔''

''سچ بولو گی تو ضرور سونے دیا جائے گا۔ ورنہ یوں ہی جاگ جاگ کر پاگل ہو جاؤ گی۔'' انسپکٹر نے بے رحم انداز میں جواب دیا۔

''کک... کیسا سچ؟''

''یہی کہ عاصم کی فیملی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''م... مجھے کیا پتا جی... م... میں تو اپنے گھر میں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ میکے میں تھی۔''

وہ بولا۔ ''ثمینہ بی بی! تمھیں جو عزت دینی تھی، وہ میں کل دے چکا ہوں۔ اب ''آپ جناب'' والے القاب نہیں چلیں گے۔ لہٰذا جو کچھ تمہیں معلوم ہے مجھے بتا دو، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کم سے کم سزا ہو۔''

''م... میں کچھ بھی نہیں جانتی جی۔'' وہ رونے لگی۔

''بی بی! یہ تھانہ ہے۔ یہاں آنسو بہانے سے جان نہیں چھوٹتی بلکہ سچ بولنے سے چھوٹتی ہے۔ بولو تم کیا جانتی؟''

''م... میں کچھ نہیں جانتی۔'' اُس نے روتے روتے جواب دیا۔

''فرزانہ!'' انسپکٹر نے لیڈی کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔ ''اسے لے جاؤ اور زندہ چھپکلی والا فاسولا آزماؤ۔''

''یس سر۔'' کہتے ہوئے فرزانہ نے اُسے بازو سے پکڑا اور تقریباً کھینچتے ہوئے باہر لے گئی۔

☆☆☆

عاصم پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا اور پھر بیڈ پر گر سا گیا۔ اُس کی سماعتوں میں رہ رہ کر انسپکٹر شیر دل کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''ڈاکو کبھی بھی بلاوجہ کی خون ریزی پسند نہیں کرتے۔ یہ کسی دشمن کی کارروائی لگتی ہے۔ کوئی ایسا دشمن جس کے لیے آپ کے سب گھر والے خطرے کا الام تھے۔ خطرے کا الارم تھے۔ خطرے کا الارم تھے۔'' لفظ ہتھوڑے کی طرح اُس کی سماعتوں پر برسنے لگے۔

''شاید مجھ سے کہیں بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔'' اُس نے خود کلامی کی اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایسے ہی وقت ماضی کے واقعات کی ایک فلم سی اُس کے دماغ میں چلنے لگی۔ اُسے ثمینہ پر سلیم کی بے انتہا مہربانیاں یاد آگئیں، ساتھ ساتھ بوڑھے اور جہاں دیدہ باپ کی نصیحتیں یاد آگئیں پھر ثمینہ کا الزام یاد آیا جو اُس نے عاصم کے نیک نام باپ پر لگایا تھا۔ مجبور اور بدقسمت باپ کی آخری کال کے الفاظ یاد آئے۔ اُن لفظوں میں کس قدر درد تھا اور سچائی جیسے چھلک رہی تھی مگر وہ بدبخت تھا، باپ کے بجائے ایک مکار عورت پر اعتبار کر بیٹھا۔ سوچ سوچ کر وہ پچھتا رہا تھا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ اُٹھا اور باپ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ جب سے وہ آیا تھا ابھی تک باپ کے کمرے میں اُس نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اس کی وجہ وہ نفرت تھی جو باپ کے خلاف ثمینہ نے اُس کے دل میں پیدا کی تھی۔

وہ یوں پشیمانی کے انداز میں کمرے کے اندر داخل ہوا جیسے اُس کا باپ زندہ ہو اور کمرے میں بیٹھا اُسے ملامت کرنے کا منتظر ہو۔ لیکن کمرا بالکل سنسان تھا۔ کمرے میں موجود ہر چیز پر گرد کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بالکل دیوار کے ساتھ اُس کے باپ کا بیڈ تھا۔ بیڈ سے چند فٹ اُوپر دیوار میں پیوستہ ایک چوبی الماری تھی۔ جو نہ صرف بند تھی بلکہ اُسے تالا بھی لگا ہوا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ اُس کی ماں کا بیڈ تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا باپ کے بیڈ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ ایسے ہی وقت بے اختیار اُس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ درد نمکین پانی کا روپ دھار کر اُس کا چہرہ بھگونے لگا۔ روتے روتے اُسے کئی لمحات بیت گئے۔ مگر آج اُس گھر میں کوئی ایک بھی نہیں تھا جو اُسے تسلی دیتا۔ اُس کے آنسو پونچھتا، اُسے گلے لگا کر اُس کی بلائیں لیتا یا پھر اُس کی پشت سہلاتے ہوئے کہتا۔ ''بیٹے! مرد کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔''

رونے سے غم کی شدت کچھ کم ہو گئی تو وہ اُٹھا اور ٹیبل کی دراز سے چابی نکال کر چوبی الماری کھولی اور اندر سے باپ کی چیزیں نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرنے لگا۔ ان چیزوں میں زیادہ تر روزمرہ کے استعمال کی اشیا تھیں۔ جن میں باپ کے تہ شدہ کپڑے، جوتے، چند کتابیں، پنشن بک اور ڈائری نما ایک نوٹ بک تھی۔ اس نوٹ بک میں ماسٹر رشید اکثر گھریلو حساب کتاب درج کیا کرتا تھا۔ اُس نے نوٹ بک اُٹھا کر کھولی تو صفحات کے درمیان سے ایک تہ شدہ کاغذ نکل کر بیڈ پر گر گیا۔ اُس نے تہ شدہ کاغذ اُٹھا کر دیکھا تو اُس کے ایک کونے میں لکھا تھا۔ ''عاصم کے لیے۔'' اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کاغذ کی تہیں کھولیں اور نظریں تحریر پر جما دیں۔ ماسٹر رشید نے لکھا تھا۔

عزیز از جان پیارے بیٹے عاصم کے نام

السلام علیکم! بیٹے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں زندگی بھر خوش و خرم رکھے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ خط تمھیں تب ملے گا جب میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا۔ نجانے مجھے کیوں یقین سا ہو چلا ہے کہ میں طبعی موت نہیں مروں گا۔ اگر میرا یہ یقین سچ ثابت ہو جائے تو پھر میری موت کے ذمے دار میری بہو ثمینہ اور اُس کا دوست سلیم ہوں گے کیونکہ اُن دونوں کو میں نے گزشتہ رات ثمینہ کے بیڈ روم میں نہایت ہی شرم ناک حالت میں دیکھا ہے۔ وہ دونوں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ بہن بھائی کے مقدس رشتے کو پامال کر رہے تھے۔ تب میں نے انھیں برا بھلا کہا تو سلیم نے مجھ پر پستول تان کر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو وہ میری دونوں چھوٹی بیٹیوں کو منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ میں نے خوف کے مارے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی۔ مگر جب صبح کے وقت میں نے ثمینہ کو گھر سے غائب پایا تو پھر مجبوراً مجھے یہ بات تمھاری امی کو بتانا پڑی۔ اس کے بعد تمھاری امی ہی کے مشورے پر میں نے تمھیں کال کی مگر تب تک وہ ڈائن ثمینہ تمھارے کان بھر چکی تھی۔ لہٰذا تم نے میری بات سننے کے بجائے اُلٹا مجھ پر الزام لگا دیا۔ بیٹے! میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ بس دُکھ ہے تو صرف اس قدر کہ تم نے مجھے اعتبار کے قابل نہیں سمجھا۔ بہرکیف میں نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔ آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ اگر تم ثمینہ کی اصلیت جان جاؤ تو پھر اُس سے قطع تعلق کر لینا۔ خواہ مخواہ کی دشمنی مول مت لینا۔ سلیم بہت خطرناک آدمی ہے۔

خدا حافظ

تمھارا بدنصیب باپ ماسٹر رشید احمد

باپ کا خط پڑھنے کے بعد وہ دیر تک روتا رہا۔ دل ہی دل میں خود کو کوستا رہا۔ جب روتے روتے تھک گیا تو ثمینہ اور سلیم سے انتقام لینے کے منصوبے سوچنے لگا۔ پہلے تو اُس نے انسپکٹر شیر دل سے مدد لینے کا سوچا مگر پھر خود ہی یہ پلان رد کر دیا۔ آخرکار بہت دیر کے بعد ایک بے داغ پلان اُس نے تیار کر لیا۔ اب اُسے مناسب وقت کا انتظار تھا۔

اُدھر پولیس اسٹیشن میں اُسی روز سلیم اور ثمینہ نے اقبالِ جرم کر لیا تھا۔ انسپکٹر شیر دل کا نفسیاتی حربہ اس بار بھی کامیاب ثابت ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں مجرموں کو اسی روز جیل کے حوالات میں منتقل کر دیا گیا کہ اب انھیں سزا دینا یا بری کرنا عدالت کی ذمے داری تھی۔

☆☆☆

دس بارہ دنوں کے بعد ایک بار پھر عاصم انسپکٹر شیر دل کے ڈرائنگ روم میں اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ انسپکٹر شیر دل بڑی حقارت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے اُسے گھورنے کے بعد انسپکٹر بولا۔ ”مجھے آپ سے اس قدر گرنے کی اُمید نہیں تھی۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں میں نے پہلا شخص دیکھا ہے جو اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے لہو کا سودا کرنا چاہتا ہے۔“

وہ بولا۔ ”مجبوری ہے انسپکٹر صاحب! میں جانتا ہوں کہ اس ملک کا قانون انھیں شک کا موقع دیتے ہوئے بری کر دے گا۔ کوئی چشم دید گواہ تو ہے نہیں میرے پاس تو پھر کیس لڑنے کا کیا فائدہ؟ اس سے بہتر ہے کہ میں کیس لڑنے کے بجائے خون بہا لے لوں؟ مذہب اور قانون دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں۔“

”لیکن مجھے یقین ہے کہ انھیں سزا ہو جائے گی پھر آپ کیوں اپنوں کا خون بیچنا چاہتے ہیں؟“

”انھیں سزا ہو بھی گئی تو مرنے والے تو واپس نہیں آئیں گے نا؟“

انسپکٹر نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آپ ابھی تک اُس بے وفا اور قاتل عورت کو بھولے نہیں ہیں۔ اب بھی آپ کا دل اُس کے نام پر دھڑکتا ہے۔“

”میں اُس پہ کب کی لعنت بھیج چکا ہوں۔“ اُس نے تحقیر سے جواب دیا۔

”مسٹر عاصم! میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ خون بہا لینے کے بجائے کیس لڑیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُن دونوں کو موت کی سزا ضرور ہوگی۔“

وہ بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! آپ مجھ سے کہیں بہتر جانتے ہیں اس ملک کے قانون کو، یہاں انصاف کوئی نہیں کرتا۔ سب اپنی جیبیں بھرتے رہتے ہیں۔ اُن کی بلا سے کوئی مرے یا جیے، انھیں صرف اور صرف اپنی...“

”بے وقوف مت بنو۔“ انسپکٹر نے قطع کلامی کی۔ ”کیس کی پیروی تو کرو، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں ہوگا جناب! سوائے اس کے کہ میں یہ کیس ہار جاؤں گا۔ پلیز مجھے مجبور مت کریں۔“

”او کے۔“ انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جیسے آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ خون بہا دلانا عدالت کا کام ہے پولیس کا نہیں۔ قاتلوں کے وکیل سے رجوع کرو یا پھر سیدھا جیل جا کر اُن دونوں سے ملاقات کر لو۔“

”ٹھیک ہے جناب! تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔“

اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''ان شاء اللہ بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔''

''خون بہا لینے کے بعد مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔'' اُس نے بے دلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''میں بزدلوں کو پسند نہیں کرتا۔''

''خون بہا لینے کے بعد میں اس ملک سے واپس انگلینڈ چلا جاؤں گا۔''

''میری طرف سے جہنم میں چلے جانا۔'' انسپکٹر نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

وہ سلیم اور ثمینہ کے مشترکہ وکیل کے ساتھ سینٹرل جیل میں داخل ہوا تو وکیل نے کہا۔ ''خصوصی ملاقات کی اجازت جیلر سے لینا پڑے گی۔''

اُس نے کہا۔ ''اسی لیے تو آپ کو ساتھ لایا ہوں سر! اس خصوصی ملاقات کا انتظام آپ کو کرنا ہے اور ہاں آپ بے فکر رہیے خون بہا لینے کے بعد میں آپ کو بھولوں گا نہیں بلکہ آپ کا خصوصی شکریہ ادا کروں گا۔''

''ڈونٹ وری سر!'' وکیل نے خوشی سے دانت نکالے۔ ''میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں مگر جیلر کو بھی راضی کرنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں وہ بھی کرلیں گے۔'' اُس نے جیب سے والٹ نکالا، اُس میں سے چند بڑے نوٹ نکال کر وکیل کی طرف بڑھا دیے۔ ''کیا خیال ہے کافی رہیں گے یا مزید بھی دوں؟''

''کافی ہیں سر۔'' وکیل مسکراتا ہوا جیلر کے آفس کی جانب بڑھ گیا۔

وکیل کی کوششوں سے نصف گھنٹے کے اندر ہی سلیم اور وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں اُن کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ سلیم کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر ندامت و پچھتاوے کے تاثرات تھے۔

''تمہارا پچھتاوا اور ندامت اب بے معنی ہیں۔'' عاصم نے پہل کی۔ ''تم دونوں کو پھانسی کی سزا ہوجائے گی۔''

وہ بولا۔ ''تم یہی بتانے آئے ہو مجھے؟''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تم دونوں سے ایک سودا کرنے آیا ہوں۔''

''کیسا سودا؟'' سلیم کے چہرے پر حیرت تھی۔

''تمہاری اسپیئر پارٹس درآمد کرنے والی فرم کتنی مالیت کی ہوگی؟'' اُس نے اُلٹا سوال کردیا۔

''اُس کی مالیت تو کروڑوں میں ہوگی مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ یہ فرم تمہیں موت کی سزا سے بچا سکتی ہے۔'' اُس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' سلیم کے چہرے پر حیرت دوچند ہوگئی۔

''میں نے کہہ تو دیا ہے کہ سودا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ فرم تمہیں میرے نام کرنا پڑے گی۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

''اوکے تو پہلے یہ دیکھ لو، پھر بات کریں گے۔'' اُس نے ایک تہ شدہ کاغذ جیب سے نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

سلیم نے ناگوار انداز میں کاغذ لیا، اُس کی تہیں کھولیں اور پھر پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا توں توں اُس کی رنگت اُڑتی چلی گئی۔

''یہ... یہ... کیا ہے؟'' کاغذ پڑھنے کے بعد سلیم نے خوف زدہ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ میرے باپ کے اُس خط کی فوٹو کاپی ہے جو میں عدالت میں بطور ثبوت پیش کروں گا۔ انسپکٹر شیر دل کہتا ہے کہ اس خط کی موجودگی میں چشم دید گواہ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اچھی طرح سوچ لو فرم پیاری ہے یا اپنی زندگی؟''

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔''

''تو سوچو میں تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں مگر ذرا جلدی کرنا ابھی مجھے تمہاری قاتل محبوبہ سے بھی ایک سودا کرنا ہے۔''

''مم... میں اپنے وکیل سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

عاصم نے کہا۔ ''یہ مشورہ تمہارے وکیل نے ہی دیا ہے۔ وہ باہر موجود ہے۔ بلاؤں اُسے؟''

''ہاں... میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''انصاری صاحب! اندر آجایئے آپ کے کلائنٹ کو آپ کی ضرورت ہے۔'' عاصم نے قدرے بلند آواز میں وکیل کو پکارا۔

انصاری فوراً کمرے میں داخل ہوا اور بلاتمہید بولا۔ ''سلیم صاحب! عاصم ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نے ہی اسے منت سماجت کرکے خون بہا لینے کے لیے راضی کیا ہے۔''

"لل... لیکن ہم... میں تو برباد ہو جاؤں گا۔" سلیم نے بوکھلائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

انصاری بولا۔ "بربادی کو آبادی میں بدلتے دیر نہیں لگتی مگر زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ سوچو مت بس ہاں کہہ دو۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" سلیم نے نہ چاہتے ہوئے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

سلیم کے جانے کے بعد اُس نے ثمینہ سے ملاقات کی تو وہ بھی خون بہا میں وہ بنگلا دینے کے لیے راضی ہو گئی جو اُس نے عاصم کی محنت کی کمائی سے تعمیر کرایا تھا۔ عاصم اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پیتا رہا مگر بظاہر وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اُس سے ملا تھا۔

وکیل کے ساتھ رخصت ہوتے وقت وہ ثمینہ سے بولا۔ "فکر نہ کرو راضی نامہ کے ساتھ ساتھ تمہیں طلاق نامہ بھی ملے گا۔ اب تم دونوں کو بہن بھائی بننے کا ڈھونگ نہیں رچانا پڑے گا۔"

☆☆☆

چند روز کے اندر ہی سارے معاملات طے پا گئے۔ سلیم کی فرم اور ثمینہ کا بنگلا عاصم کے نام منتقل ہو گئے تھے۔ چنانچہ بظاہر وہ بڑا خوش اور مطمئن تھا۔ سلیم کے وکیل کو بھی بطور نذرانہ اُس نے خاصی رقم ادا کی تھی۔ خون بہا لینے کے بعد عاصم نے باقاعدہ تحریری طور پر سلیم اور عاصم کو معاف کر دیا تھا۔ جس دن سلیم اور ثمینہ کو جیل سے رہا ہونا تھا اُسی دن عاصم نے ثمینہ والے بنگلے میں ایک پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس پارٹی میں انسپکٹر شیر دل اور سلیم کے وکیل کے علاوہ عاصم کے چند پڑوسی اور رشتے دار مدعو تھے۔ پارٹی کا ٹائم دوپہر دو بجے کے لگ بھگ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ایک بجتے ہی مدعوئین پہنچنے لگے۔ ڈیڑھ بجے تک قریب قریب تمام مہمان پہنچ گئے۔ اب انہیں ثمینہ اور سلیم کا انتظار تھا، جو اس پارٹی کے مہمانِ خصوصی تھے۔ کیونکہ عاصم کو انہیں سب مہمانوں کی موجودگی میں معاف کرنا تھا۔

سب لوگ خوش تھے اور آپس میں گپ شپ لگا رہے تھے۔ جب کہ چند ایک لوگ ٹی وی پر معروف ٹاک شو دیکھنے میں محو تھے۔ مگر انسپکٹر شیر دل... بیزار سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اُس کی شکل دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اُسے جبراً پارٹی میں لایا گیا ہو۔ عاصم کافی دیر سے اُس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ اُسے انسپکٹر کی ناراضی کی وجہ بھی معلوم تھی لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ انسپکٹر کا مشورہ مان کر کیس نہیں لڑ سکتا تھا۔ لہٰذا خون بہا لے کر اُس نے قاتلوں سے صلح کر لی تھی۔ یہ پارٹی بھی اسی مقصد کے لیے منعقد کی گئی تھی۔

عاصم مہمانوں سے ہائے ہیلو کرتا ہوا انسپکٹر شیر دل کے پاس پہنچ گیا۔ "کیسے ہیں سر آپ؟" عاصم نے ہنس کر پوچھا۔

انسپکٹر شیر دل نے ناگوار نظروں سے اُسے گھورا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس قدر لالچی نکلیں گے۔ اس بنگلے اور فرم کا آپ کیا کریں گے؟"

"یہ بنگلا اور وہ فرم اب میرے کہاں رہے ہیں؟" وہ مسکرایا۔ "دونوں کو بیچ دیا ہے میں نے۔"

وہ بولا۔ "بنگلا اور فرم نہیں بلکہ آپ نے اپنوں کا لہو بیچا ہے۔"

"دیکھیے سر!" وہ پھر مسکرایا۔ "جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ پلیز اب غصہ تھوک کر پارٹی انجوائے کیجیے۔ ویسے بھی کل صبح میں واپس انگلینڈ چلا جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری یادوں میں آپ کی اُتری ہوئی شکل محفوظ ہو رہے؟"

"اوہ... تو آپ چاہتے ہیں کہ میں قہقہے لگاؤں؟" اُس نے جل کر پوچھا۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"داد دینا پڑے گی بھئی! آپ کے حوصلے کی۔" انسپکٹر کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ "مجھے آپ کی تعریف بیان کرنے کے لیے لفظ ہی نہیں مل رہے۔"

"آپ صرف ہنس دیجیے۔ میں سمجھوں گا کہ آپ نے میری تعریف کر دی ہے۔"

ایسے ہی وقت اچانک اُس ہال نما کمرے میں خاموشی چھا گئی اور سب کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جم کر رہ گئیں۔

بریکنگ نیوز میں ایک مرد اور عورت کو دکھایا جا رہا تھا۔ دونوں گولیوں سے چھلنی تھے۔ جب کہ نیوز چینل کا نمائندہ چلا چلا کر واقعے کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ ہال میں موجود سب لوگوں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مرنے والے سلیم اور ثمینہ تھے۔ جنہیں نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے جیل روڈ پر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ نیوز چینل کا نمائندہ بتا رہا تھا کہ موٹر سائیکل سوار موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ تاہم پولیس انہیں سرگرمی کے ساتھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

خبر سن کر انسپکٹر شیر دل نے مشکوک نگاہوں سے عاصم کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم مسکرا دیا۔

# ٹکراؤ

مریم کے خان

کچھ لوگوں کی زندگی کا دستور عجب طرح کا ہوتا ہے... وہ ساری عمر زخم خوردہ ہی رہتے ہیں... ایسے زخموں سے چور چور جن سے ہر دم لہو رستا رہتا ہے... خوشی آتی ہے پل بھر کے لیے پھر الم کا سیلِ رواں... وہ وقت اور لمحات کی قید میں اس طرح جکڑ جاتے ہیں کہ کھلی فضائوں کی خواہش کے باوجود آزادی و تروتازگی سے کوسوں دور حسرتوں سے کھڑے دیکھتے رہتے ہیں... خوابوں اور خواہشات کی دسترس سے دور جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ایک مسلسل جنگ کا سامنا کرنے والوں کی دردناک داستان...

**زندگی کے لازوال اندھیروں میں روشنی کی کرن کے متلاشی... بے کارواں و بے سایباں نشینوں کا قصہ غم**

صوفیہ کی آنکھ الارم سے کھلی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ شاور لے رہی تھی۔ تولیے سے جسم خشک کر کے اس نے پہلے سے استری کیا ہوا لباس پہنا۔ ناشتے کا وقت نہیں تھا۔ دفتر کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ اس جنگ زدہ ملک میں بہت عرصے بعد کچھ قدر امن وسکون آیا تھا۔ اگرچہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مزاحمت کار سرگرم تھے۔ ان سے نمٹنے کے لیے غیر ملکی فوج سے تربیت یافتہ مقامی فورس بھی کام کر رہی تھی۔ مگر وہ مزاحمت کاروں پر پوری طرح قابو پانے میں ناکام رہے تھے۔ سرکاری مشینری کا آلۂ کار ہونے کی بنا پر وہ جانتی تھی کہ اس ناکامی کی بڑی وجہ سرکاری اہلکاروں کی نااہلی اور بدعنوانی تھی۔ گزشتہ چودہ برسوں میں بہت بڑی تعداد میں غیر ملکی امداد ملک میں آئی مگر اس کا بہت کم حصہ ترقیاتی کاموں پر خرچ ہوا تھا۔ ملک کے چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر باقی ملک میں حکومتی رٹ بہت کم رہ گئی تھی۔

صوفیہ تقریباً پچیس برس کی کھڑے اور بڑے نقوش والی خوب صورت لڑکی تھی۔ خاص طور سے دہانہ اور ستواں ناک بڑی تھی مگر اس کے مجموعی خدوخال بہت دلکش تھے۔ اس کے بال اور آنکھیں سرمئی رنگ کی تھیں۔ شہابی رنگت اسے مزید دلکش بناتی تھی۔ جسم کی بناوٹ مضبوط لیکن اس میں نسوانیت کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کا تعلق امن وامان اور ملکی سلامتی کے لیے کام کرنے والی ایک فورس سے تھا۔ وہ ان سولڑکیوں کے بیچ میں شامل تھی جسے غیر ملکی فوج نے اسپیشل ٹریننگ دی تھی اور ان دنوں وہ محکمۂ داخلہ کے لیے کام کر رہی تھی۔ صوفیہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے کوئی ملازمت کی۔ وہ اس چھوٹے سے فلیٹ سے نکل رہی تھی جو اسے حکومت کی طرف سے ملا تھا کہ اس کے موبائل نے بیل دی۔ اس نے دروازہ لاک کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”صوفیہ۔“ دوسری طرف سے کسی نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”بات کر رہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

''میں تمہارا چچا زاد شہزاد بات کر رہا ہوں۔'' اس نے تعارف کرایا۔ ''تمہاری چھوٹی بہن ماہ نور کل سے غائب ہے۔ اس کے ساتھ اس کی سہیلی رضیہ بھی غائب ہے۔ دونوں چشمے پر پانی بھرنے گئی تھیں اور اس کے بعد واپس نہیں آئیں۔ مقامی پولیس کا کہنا ہے انہیں اغوا کر لیا گیا ہے مگر اغوا کاروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' صوفیہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی چھوٹی کار میں تیزی سے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں اس نے جاتے ہی اپنے باس سے چھٹی مانگی اور اس نے انکار کر دیا۔ صوفیہ کو اسی کی توقع تھی۔ ادارے میں اس کے اور دوسری خواتین اہلکاروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ شدید قسم کے مردانہ معاشرے میں لوگوں کے لیے یہ بات آج بھی قابلِ قبول نہیں تھی کہ عورتیں ان کے شانہ بشانہ دفتر میں کام کریں۔ خاص طور سے وہ کام جو ترقی یافتہ دنیا میں بھی مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ جنس کی تفریق تو عام تھی ہی، جنس کی بنیاد پر انہیں ہراساں بھی کیا جاتا تھا۔ کئی بار صوفیہ نے سوچا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے، اس سے پہلے کہ کوئی اس کے ہاتھ سے قتل ہو جائے۔ ایسا کئی بار ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

صوفیہ باس کے کمرے سے باہر آئی اور پھر دفتر سے بھی نکل گئی۔ اس نے پہلے ہی ذہن بنا لیا تھا کہ انکار کی صورت میں اسے کیا کرنا ہے۔ یہ جاب معمولی سی چیز تھی۔ ماہ نور کے سامنے ساری دنیا کے عہدے بھی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اگر وہ مضبوط اعصاب کی نہ ہوتی تو اس وقت دہاڑیں مار کر رو رہی ہوتی۔ ایک گھنٹے بعد وہ برقع میں روپوش ایک مسافر بس میں گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا گاؤں دارالحکومت سے کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر شمال مغرب میں تھا۔ کسی زمانے میں یہ بڑی آبادی والا ہنستا بستا گاؤں تھا مگر چار عشروں سے جاری جنگ نے اسے برباد کر دیا تھا۔ اس کے زیادہ تر گھر کھنڈر تھے اور یہاں انسانوں سے زیادہ کتے بلیاں بستے تھے۔ صوفیہ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال اسی گاؤں میں گزارے تھے۔

صوفیہ قتل و غارت گری کے دوران میں پیدا ہوئی۔ اس کے خاندان کے نصف لوگ جنگ میں ہونے والی بمباری میں مارے گئے تھے۔ اس کے بعد ہونے والی لڑائیوں میں مزید لوگ مارے گئے۔ صوفیہ کا باپ جرگے کی ایک لڑائی میں قتل ہوا تھا۔ صوفیہ کا چچا جو سرکاری ملازم تھا، اسے دارالحکومت لے گیا۔ وہ پڑھا لکھا اور نئے زمانے کا آدمی تھا۔ اس نے ایک غیر ملکی عورت سے شادی کی تھی جو غیر ملکی افواج کے ساتھ آئی تھی۔ وہ بہ طور سب کنٹریکٹر کام کرتی تھی۔ چچا نے صوفیہ کو وہاں لکھایا پڑھایا۔ اس کی حوصلہ افزائی پر صوفیہ نے اسپیشل فورس کی ٹریننگ کے لیے درخواست دی اور اسے چن لیا گیا۔ ایک سال کی کڑی تربیت کے بعد اسے سرکاری ملازمت مل گئی...... جس سال اسے ملازمت ملی اسی سال اس کا چچا اپنی بیوی کے ساتھ اس کے ملک منتقل ہو گیا۔ اسے وہاں کی شہریت مل گئی تھی۔ اس نے جاتے ہوئے صوفیہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بھی اپنے پاس بلانے کی کوشش کرے گا۔

گاؤں میں ماں کے ساتھ ماہ نور تھی۔ وہ اس سے آٹھ سال چھوٹی تھی مگر اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ صوفیہ کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس کے پاس شہر آجائے مگر ماں گاؤں اور ماہ نور دونوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے ماہ نور اس کے پاس شہر نہیں آسکی مگر اس نے گاؤں سے پڑھا تھا۔ ان کی کچھ زمین تھی جس پر بادام اور کاجو کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان سے ملنے والی رقم زیادہ تو نہیں تھی مگر اس آمدنی سے اس خاندان کا گزارا ہوتا تھا۔ صوفیہ کے لیے دنیا میں بس یہی دو فرد تھے۔ ابھی اسے ایک چھوٹا فلیٹ ملا ہوا تھا مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی اسے ذرا بڑا گھر ملا، وہ ماں اور ماہ نور کو یہاں لے آئے گی۔ اگر ماں نے انکار بھی کیا تو وہ اس کی ایک نہیں سنے گی۔ گاؤں میں اس کا اور ماہ نور کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ شہر میں وہ پھر بھی محفوظ تھے۔ اگر چچا اسے باہر بلاتا تو وہ ماں اور ماہ نور کو بھی ساتھ لے جاتی۔

ماہ نور نے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور اب فارغ تھی کیونکہ وہاں لڑکیوں کے لیے اس کے بعد کوئی تعلیمی ادارہ نہیں تھا۔ صوفیہ چاہتی تھی کہ وہ شہر آئے اور آگے تعلیم حاصل کرے۔ یہاں بہت سے تعلیمی ادارے کھل گئے تھے، جہاں اعلیٰ تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان کا معاشرہ پچھلے پندرہ سال میں بہت بدل گیا تھا۔ جو بچے جہالت کی آغوش میں پیدا ہوئے تھے اب وہ یونیورسٹیز سے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ان میں سے بہت سے بیرونِ ملک سے پڑھ کر آئے تھے۔ مگر اب بھی ملک کا ایک بڑا حصہ جہالت کی تاریکیوں میں گم تھا۔ صوفیہ جانتی تھی کہ یہ تعلیم ہی ہے جو کسی ملک اور قوم کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مگر اس نے جو سوچا تھا، وہ پورا نہیں ہو سکا۔ ماہ نور کے بارے میں خبر سن کر اس کے اندر کیا حالت ہوئی، یہ وہی جانتی تھی۔ وہ گاؤں اور پھر گھر پہنچی تو اس کی ماں سکتے کی کیفیت میں تھی۔ پولیس صرف اتنا معلوم کر سکی تھی کہ ایک جیپ میں چند افراد چشمے تک آئے اور زبردستی ان دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے گئے۔

یہ کوئی نئی اور پہلی بار ہونے والی واردات نہیں تھی۔ اس جنگ زدہ ملک میں آئے دن لوگ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوتے تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں اغوا ہوتی تھیں۔ خاص طور سے بے سہارا اور ایسی عورتیں جن کا کوئی محافظ مرد نہ ہو، وہ بہت آسانی سے غائب ہو جاتی تھیں۔ مسلسل جنگ، اسلحے کی بہتات اور منشیات کی آمدنی نے بے شمار ایسے جرائم پیشہ گروہ پیدا کر دیے تھے جن کا کام ہی جرائم کو فروغ دینا اور اس سے آمدنی اور آسائشیں حاصل کرنا تھا۔ صوفیہ جانتی تھی کہ اسلحے اور منشیات کے بعد اب بردہ فروشی اس ملک میں ایک نفع بخش کاروبار بن چکا ہے۔

صوفیہ دو دن گاؤں میں رہی اور جب ماں کی طبیعت سنبھل گئی تو وہ دوبارہ شہر روانہ ہوئی۔ مگر وہ ڈیوٹی پر نہیں گئی، اسے معلوم تھا یوں بغیر اجازت جانے پر اس کے خلاف چارج شیٹ تیار ہوگی اور ممکن ہے اسے ملازمت سے برطرفی کا پروانہ بھی تھما دیا جائے۔ اس نے فلیٹ سے اپنا ضروری سامان لیا اور اپنا حلیہ بدلا۔ وہ ایک سرحدی علاقے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت وہ ایک نوخیز لڑکے کے روپ میں تھی۔ اس نے پگڑی سمیت روایتی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے شانے پر کلاشنکوف لٹکی ہوئی تھی۔ یہ سرحدی آبادی مکمل طور پر اسمگلروں اور جرائم پیشہ افراد پر مشتمل تھی۔ یہاں قلعے نما عالی شان مکانات تھے جو اسمگلنگ کے سامان سے بھرے پڑے تھے۔ اس میں وہ سامان بھی تھا جو بیرونِ ملک سے آتا تھا اور وہ سامان بھی جو یہاں سے جاتا تھا۔ صوفیہ نے ایک ہوٹل میں کمرا لیا اور رات کی تاریکی میں اس کی کھڑکی سے پہلے نیچے اتری اور پھر تاریک راستوں سے ہوتی ہوئی آبادی کے آخری حصے کی طرف بڑھی۔ اس نے چست سیاہ لباس پہن رکھا تھا، اس میں اس کی نسوانیت نمایاں تھی مگر اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس حیثیت سے پکڑی جاتی ہے۔ پکڑے جانے کی صورت

میں اسے اپنا انجام معلوم تھا۔

وہ چھپتی چھپاتی ایک بڑے احاطے والے مکان تک آئی اور پھر کمند ڈال کر دیوار پر چڑھ گئی۔ اس پر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں مگر اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اس نے ایسی ہی مشکلات سے نمٹنے کی مکمل تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اسی کمند کی مدد سے دوسری طرف اتر گئی۔ اندر کہیں ہلکی آواز میں ڈیک چل رہا تھا جس پر ایک واہیات گانا بج رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مکان میں موجود لوگ جاگ رہے تھے۔ وہ پہلے اس حصے تک آئی جو تاریک تھا۔ یہاں دو دروازے تھے اور دونوں پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے لباس سے دو باریک پنیں نکالیں اور ان کی مدد سے ایک منٹ سے پہلے ایک تالا کھول لیا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے اندر آکر ایک چھوٹی ٹارچ جلائی تو اسے فرش پر کئی لڑکیاں سوتی نظر آئیں۔ ان کی حالت تباہ تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں دور دراز سے اغوا کر کے لایا گیا تھا اور وہ یہاں قید تھیں۔ ان کی تعداد نو تھی۔ صوفیہ ان کے چہروں پر روشنی مار کر دیکھنے لگی مگر ان میں کوئی ماہ نور نہیں تھی۔ اسی اثنا میں ایک لڑکی کی آنکھ کھل گئی اور اس نے سہمے لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

''تمہاری ہمدرد۔'' صوفیہ نے نرم لہجے میں کہا۔ اس نے ہاتھ میں موجود سائلنسر لگا پستول پیچھے کر لیا تھا۔ ''یہ تمہیں اغوا کر کے یہاں لائے ہیں؟''

لڑکی نے سر ہلایا۔ ''مجھے دو ہفتے پہلے اغوا کیا تھا۔''

''یہ لڑکیاں؟'' اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ مختلف جگہوں سے آئی ہیں مگر سب اغوا کر کے لائی گئی ہیں۔'' لڑکی ہوشیار اور پڑھی لکھی لگ رہی تھی۔ اس کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ یہاں موجود تمام ہی لڑکیاں بیس سے نیچے کی تھیں۔ صوفیہ نے پوچھا۔

''کیا ان لوگوں نے تمہارے ساتھ جسمانی زیادتی کی ہے؟''

لڑکی اس کا مطلب سمجھ گئی، اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس یہی نہیں کیا ورنہ انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جب موقع ملتا ہے ہمیں نوچتے کھسوٹتے ہیں اور گندی حرکتیں کرتے ہیں۔ زبردستی ہم سے بھی کرواتے ہیں۔''

صوفیہ کا خون کھول اٹھا۔ ''میں ان لوگوں سے نمٹتی ہوں تب تک تم ان لڑکیوں کو جگا لو اور ان سے کہنا کہ آواز نہ نکالیں۔''

اسے ہدایت دے کر صوفیہ باہر آئی اور تالے کو یوں اٹکا دیا کہ وہ لگا ہوا نظر آئے۔ دوسرے کمرے میں بھی لڑکیاں ملیں اور یہاں بارہ تھیں مگر گل ان میں بھی نہیں تھی۔ اب اسے ان لوگوں سے نمٹنا تھا۔ اس کے پاس خودکار رائفل تھی مگر اس نے پستول کو ترجیح دی کہ یہ خاموش تھا۔ تیسرا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ڈیک وہیں چل رہا تھا۔ صرف ڈیک نہیں چل رہا تھا بلکہ گانے کی لے پر دو لڑکیاں رقص کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں مجبور کیا گیا ہے۔ ان کے جسموں پر نوچے کھسوٹنے کے نشانات نمایاں تھے۔ ان کے رقص سے لطف اندوز ہونے والے چار افراد جب تک سنبھلتے اور اپنے ہتھیار اٹھاتے، صوفیہ ان میں سے تین کو شوٹ کر کے چوتھے کو شانے میں گولی مار کر زخمی کر چکی تھی۔ تربیت کے دوران اس نے شارپ شوٹر کی کیٹگری میں دوسرا نمبر حاصل کیا تھا۔ مگر اسے اپنی تربیت آزمانے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ لڑکیاں سہم کر ایک کونے میں جا گھسی تھیں۔ صوفیہ نے زخمی سے پوچھا۔ ''یہاں کا انچارج کون ہے؟''

''سمیر شاہ۔'' وہ کراہ کر بولا۔ ''لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔''

''یہاں دو کمروں میں لڑکیاں قید ہیں، باقی لڑکیاں کہاں ہیں؟''

''میں نہیں جانتا یہاں اتنی ہی ہیں۔'' وہ بولا۔

صوفیہ نے اس کے ماتھے پر پستول کی نال رکھی اور دوسرے ہاتھ سے ماہ نور کی ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے کی۔ ''یہ لڑکی کہاں ہے؟''

پستول کی نال ماتھے پر محسوس کر کے وہ سورما کانپنے لگا اور اس کے منہ سے بڑی مشکل سے آواز نکلی۔ ''وہ کل جا چکی ہے۔''

''کہاں ..... کس کے پاس؟''

''سرحد پار۔'' اس نے جواب دیا۔ ''نیا روز کے پاس۔''

''نیا روز۔'' صوفیہ نے زیر لب کہا۔ ''تمہارا شکریہ۔''

اس نے کہتے ہوئے ٹریگر دبا دیا، اس نے مرنے والے کا انجام نہیں دیکھا۔ آج سے پہلے اس نے کسی کو نہیں مارا تھا اور اگر ماہ نور کا معاملہ نہ ہوتا تب بھی اتنی آسانی سے اس کا ہاتھ نہ اٹھتا مگر وہ پورے یقین اور معلومات کے

ساتھ آئی تھی کہ یہ گروہ ملک میں اغوا ہونے والی ستر فیصد وارداتوں کا ذمے دار تھا۔ کچھ لڑکیاں مقامی طور پر فروخت کر کے باقی کو وہ بیرونِ ملک اور خاص طور سے مڈل ایسٹ بھیج دیتا تھا جہاں ان کی بہت مانگ تھی۔ اس نے پورے مکان کی تلاشی لی اور پھر لڑکیوں کو ان کے کمروں سے نکالا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ خاموشی سے نزدیک ہی بنی سرکاری فوج کی چوکی تک چلی جائیں اور اغوا کاروں کے بارے میں بتائیں لیکن اس کا ذکر نہ کریں۔ اگرچہ اس کی امید کم تھی کہ سرکاری حکام اس مکروہ دھندے سے بے خبر ہوں گے۔ انہیں ان کا پورا حصہ ملتا ہوگا اس لیے صوفیہ کو زیادہ امید نہیں تھی کہ لڑکیاں واپس اپنے گھروں کو پہنچ سکیں گی۔

جب سب لڑکیاں مکان سے نکل گئیں تو اس نے وہاں موجود کچھ دھماکا خیز مواد مکان میں جگہ جگہ فٹ کیا اور مرنے والوں کی لاشوں پر پیٹرول ڈالا جو اسے وہیں مل گیا تھا۔ اپنا کام کر کے وہ مکان سے نکل آئی۔ وہ واپس ہوٹل آئی اور اسی راستے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ پورا قصبہ زوردار دھماکے سے گونج اٹھا۔ تباہ شدہ مکان سے اٹھنے والے شعلے اتنی دور سے بھی واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اب اسے امید ہوئی کہ بات دارالحکومت تک جائے گی اور شاید یہ لڑکیاں بچ جائیں۔ اسے پروا نہیں تھی کہ لڑکیاں اس کے بارے میں بتا دیں گی، وہ زیادہ سے زیادہ اس کا حلیہ بتا سکتی تھیں یا پھر تصویر میں موجود ماہ نور کا حلیہ۔ کل صبح اس کے کمرے سے حیات خان نکلے گا۔ وہ ماہ نور کو پانے میں ناکام رہی تھی مگر اسے اطمینان تھا کہ اس نے اس جیسی بہت سی لڑکیوں کو بچا لیا تھا۔

☆☆☆

یاسر اپنے کمرے میں تھا کہ اسے ماجد کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ وہ باقاعدہ گرج رہا تھا اور اس کی گرج کے پس منظر میں روبینہ کی دبی دبی آواز آرہی تھی۔ آج پھر روبینہ کی شامت آئی تھی اور ماجد کے ہاتھوں اس کی بے عزتی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی آئے دن ماجد اسی طرح بے چاری روبینہ پر گرجتا برستا تھا اور کبھی اس کا غصہ بڑھتا تو وہ اس پر تشدد بھی کرتا تھا۔ روبینہ، ماجد کی بیوی تھی اور یاسر روبینہ کا بیٹا تھا مگر ماجد اس کا باپ نہیں تھا۔ وہ اس کا سوتیلا باپ تھا۔ آج سے سات سال پہلے جب وہ صرف دس سال کا تھا تو اس کا سگا باپ جو ماجد کا بہترین دوست تھا، پُراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ قتل سے چند گھنٹے پہلے یاسر کا باپ ابصار، ماجد کے ساتھ کہیں گیا تھا اور یہ ماجد ہی تھا جس نے روبینہ کو اس قتل کی اطلاع دی تھی۔ اس نے صرف اطلاع نہیں دی بلکہ وہ روبینہ اور یاسر کو لے کر اس گھر سے بھی نکل گیا جہاں وہ رہتے تھے۔

یاسر نے ہوش سنبھالنے کے بعد گھر میں بہت عجیب سا ماحول دیکھا تھا۔ اس کے لیے دنیا صرف دو رشتوں پر بنی تھی۔ ماں اور باپ۔ اس میں سے بھی باپ کا رشتہ اس کے لیے صرف خوف کی علامت تھا کیونکہ ابصار جب گھر آتا تو وہ یاسر کو اپنے سامنے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ذرا سی غلطی پر وہ اسے مارتا تھا اور اس بات کی پروا نہیں کرتا تھا کہ یاسر بہت چھوٹا اور کمزور سا لڑکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ باپ کے گھر میں آتے ہی وہ کوشش کرتا کہ اس کے سامنے نہ آئے۔ صرف وہی نہیں اس کی ماں بھی ابصار کے سامنے ڈری سہمی رہتی تھی۔ یاسر نے ان دونوں کے سوا اور کسی رشتے دار کو نہیں دیکھا تھا جب اس نے ہوش سنبھالا اور اسے بولنا آیا تو اس نے روبینہ سے رشتے داروں کے بارے میں پوچھا۔ ''ماں کیا ہمارے رشتے دار نہیں ہیں؟''

''ہیں۔'' روبینہ نے کہا۔ ''لیکن وہ اس ملک میں نہیں ہیں۔ پڑوس والے ملک میں ہیں۔''

''تب ہم یہاں کیوں ہیں؟''

''کیونکہ مجھے تیرا باپ شادی کر کے یہاں لے آیا ہے۔'' روبینہ بے بسی سے بولی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ صرف سولہ سال کی تھی جب اس کے باپ نے اسے بھاری رقم کے عوض ابصار کو فروخت دیا۔ اگرچہ اس خرید و فروخت کی دستاویز بھی بنی تھی جسے عرفِ عام میں نکاح نامہ کہتے ہیں۔ مگر عملاً یہ ایک انسان کی فروخت تھی۔ یہ رواج عام تھا اس لیے روبینہ احتجاج نہیں کر سکی۔ ابصار کا تعلق پڑوسی ملک سے تھا اور وہ اسے اپنے ملک لے آیا۔ یہاں آنے کے بعد روبینہ کو اندازہ ہوا کہ وہ خاصا پیسے والا شخص تھا۔ وہ شمالی صوبے کے دارالحکومت کے ایک شاندار مکان میں رہتا تھا اور اس کے پاس دنیا کی ہر سہولت اور آسائش تھی۔ وہ عمر میں روبینہ سے خاصا بڑا تھا۔ شاید پینتیس سال کا تھا۔ اس لحاظ سے روبینہ اس سے پورے اکیس برس چھوٹی تھی۔

روبینہ اس کے شاندار مکان میں ایک بیوی کے بجائے زرخرید کنیز کی طرح رہ رہی تھی۔ ابصار نے یہ شادی عیاشی کے لیے کی تھی۔ اسے بیوی کی ضرورت نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح اسے اولاد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر

روبینہ سترہ سال کی ہونے سے پہلے ماں بن گئی تھی۔ ناتجربے کاری کی وجہ سے اسے اپنے حمل کا علم بھی بہت تاخیر سے ہوا تھا۔ جب ابصار کو پتا چلا تو اس نے روبینہ کا حمل ضائع کرانا چاہا مگر ڈاکٹر نے بتادیا کہ اس صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہوگا۔ ابصار اسے بڑی رقم دے کر لایا تھا کیونکہ روبینہ بہت خوب صورت تھی اس لیے وہ اپنی سرمایہ کاری ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے یاسر کی دنیا میں آمد کو قبول کیا تھا۔ البتہ یاسر سے اس کا رویہ ایسا تھا جیسے روبینہ اسے جہیز میں ساتھ لائی تھی۔

روبینہ خود ابصار کے ظلم کا شکار تھی مگر یاسر کو اس سے بچانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ اسے یاسر کے مستقبل کا بھی بہت خیال تھا۔ خود وہ انگوٹھا چھاپ تھی کیونکہ اس کا تعلق جس خاندان سے تھا وہاں صدیوں سے کسی عورت نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ یاسر پڑھے لکھے۔ یاسر چار سال کا ہوا تھا تو روبینہ نے نہ جانے کیسے ابصار کو راضی کرلیا کہ وہ اسے اسکول میں داخل کرائے۔ پیسے کی کمی نہیں تھی اس لیے یاسر کو بہت اعلیٰ درجے کے اسکول میں داخل کرایا گیا مگر ماں کے توسط سے ابصار نے یاسر کو ذہن نشین کرادیا تھا کہ اسے کوئی دوست نہیں بنانا ہے اور اسکول میں گھر کی کوئی بات نہیں بتانی ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اسے فوری اسکول سے اٹھالیا جائے گا اور جو سزا ملے گی، وہ اس کے علاوہ ہوگی۔

چار سال کی عمر میں یاسر سزا کے مفہوم سے اچھی طرح آشنا ہوگیا تھا۔ اس نے ماں کی ہدایات پر بہت سختی سے عمل کیا۔ گھر کے ماحول اور باپ کے سلوک کی وجہ سے جو اسے باہر جانے اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا تھا۔ اسے اپنا اسکول پہلے دن ہی بہت اچھا لگا۔ یہاں کھیلنے کے لیے بے شمار بچے تھے۔ البتہ اس نے یہاں کسی کو دوست بنانے سے گریز کیا۔ صورت شکل اور رنگ وروپ میں یاسر بالکل ماں پر گیا تھا۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر ٹیچرز اور کلاس فیلوز اس کے نزدیک آنا چاہتے تھے مگر وہ اپنی ذات میں گم رہا۔ اس نے کسی کو خود سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اسکول جانا اس کے لیے جہنم سے نکل کر جنت جانے کے مترادف تھا اس لیے وہ بہت خوش تھا۔

گھر میں اس کا دل اسی وقت لگتا تھا جب ابصار گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ دعا کرتا کہ اس کا باپ گھر سے کہیں دور چلا جائے اور کبھی واپس نہ آئے مگر اس کی یہ دعا خاصی دیر میں جاکر پوری ہوئی تھی اور وہ بھی ادھورے انداز میں۔

یاسر کے بعد ابصار نے کوئی ایسا بندوبست کیا تھا کہ روبینہ پھر ماں بننے نہ پائے۔ وہ اسے کئی بار ڈاکٹرز کے پاس لے گیا اور اس نے جو دوائیاں دی تھیں، وہ ابصار اسے اپنے ہاتھ سے اپنے سامنے کھلاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کا اور کوئی بچہ نہیں ہوا اور یاسر اکلوتا ہی رہا۔ ان دنوں وہ چھٹی کلاس میں تھا کہ ایک صبح اسکول جانے کے لیے تیار کرنے کے بجائے روبینہ نے اسے عام کپڑے پہنائے اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر تقریباً خالی ہاتھ اس گھر سے نکل گئے جو گزشتہ دس سال سے ان ماں بیٹے کا مسکن تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ گاڑی ابصار نہیں بلکہ اس کا دوست ماجد چلا رہا تھا۔ یاسر حیران تھا اور روبینہ روہانسی ہورہی تھی۔

ماجد سرخی مائل لمبے بالوں اور گھنی مونچھوں والا سخت گیر شخص تھا۔ یاسر بچپن سے اسے دیکھتا آیا تھا کیونکہ وہ آئے دن ان کے گھر میں براجمان ہوتا تھا۔ روبینہ اور یاسر اسے یکساں ناپسند کرتے تھے۔ جب تک ابصار سامنے ہوتا ماجد شریف بن کر رہتا تھا مگر جیسے ہی اسے موقع ملتا وہ روبینہ کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے سامنے آنا روبینہ کی مجبوری تھی کیونکہ کھانا وہی بناتی اور لگاتی تھی۔ ابصار کو کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں تھا اسی طرح وہ چاہتا تھا کہ کھانے کے دوران روبینہ اس کے آس پاس رہے۔ جب ماجد ہوتا تو وہ ساتھ ہی کھاتا تھا اور اس وقت روبینہ کو اس کی نظریں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ماجد میں اس سے زیادہ کی ہمت نہیں تھی کیونکہ ابصار روبینہ کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ البتہ یہ حساسیت میاں بیوی کے رشتے کے حوالے سے نہیں تھی۔ وہ اسے اپنی زرخرید سمجھتا تھا اور اس پر صرف اپنا حق سمجھتا تھا۔

جس صبح وہ [illegible] نکلے ابصار رات ہی ماجد کے ساتھ کہیں گیا تھا۔ اور وہ خاصا تیار ہوکر گئے تھے۔ یعنی پوری طرح مسلح ہوکر۔ ان کے پاس چھوٹے ہتھیار بھی تھے اور خودکار رائفلیں بھی۔ یاسر نے بچپن سے پیسے اور آسائشوں کے ساتھ گھر میں اسلحے کی بہتات بھی دیکھی تھی بعض اوقات تو ان کے گھر میں بڑی بڑی پیٹیوں میں اسلحہ آتا اور پھر کہیں جاتا تھا۔ کھلا اسلحہ بھی بے شمار تھا۔ کھلا اسلحہ تو سامنے تھا مگر جب پیٹیوں میں اسلحہ آتا تو ابصار روبینہ اور یاسر کو ان کے کمروں تک محدود کردیتا تھا۔ ابصار اپنے طور پر بہت احتیاط کرتا تھا مگر ایک گھر میں رہنے والوں سے اس طرح کی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ یاسر نے بھی بہت کچھ دیکھا تھا۔ یہ بھی پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ ابصار اور ماجد خوب مسلح ہو

کر کہیں گئے تھے۔ مگر یہ پہلی بار ہوا تھا کہ ابصار کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور ماجد نے عجلت میں آ کر روبینہ کو کچھ بتایا تو اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یاسر بار بار پوچھ رہا تھا کہ ماں کیا ہوا ہے؟ روبینہ اسے چپ کرا رہی تھی مگر ٹھیک سے چپ اسے ماجد نے کرایا جب اس نے ایک جگہ گاڑی روکی۔ پلٹ کر یاسر کو تھپڑ مارا اور خونخوار لہجے میں بولا۔

''اب زبان کھولی تو کاٹ دوں گا۔''

ایک تھپڑ نے یاسر کو ایسا گنگ کیا کہ کئی گھنٹے کے طویل سفر میں اس نے پھر زبان ایک بار بھی نہیں کھولی۔ روبینہ اسے خود سے لگائے روتی رہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بابا کہاں ہے؟ اور وہ ماجد کے ساتھ کیوں جا رہے تھے؟ دونوں سوالوں کا جواب اسے منزل پر پہنچ کر ملا۔ وفاقی دارالحکومت کے پاس یہ ایک کھنڈر نما تاریخی یادگار تھی جس کا اب اوپری گنبد نما حصہ سلامت رہ گیا تھا۔ ماجد نے گاڑی وہاں روکی اور ان دونوں سے نیچے اترنے کو کہا۔ مسلسل ڈرائیو سے گاڑی گرم بھی ہو گئی تھی مگر یہاں اسے کسی سے بات کرنی تھی۔ اس نے موبائل پر کسی کو کال کی۔ اس زمانے میں موبائل نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ چھوٹے سیٹ آتے تھے اور موبائل سگنل بھی زیادہ طاقتور نہیں ہوتے تھے۔ یہاں بھی سگنل کا مسئلہ تھا اس لیے ماجد کو چیخ چیخ کر بات کرنی پڑ رہی تھی اور وہ کسی کو بتا رہا تھا۔

''بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے..... شہریار والی پارٹی کا..... ہاں میں اور ابصار گئے تھے..... پر جھگڑا ہوا اور فائرنگ میں ابصار مارا گیا..... میں بہت مشکل سے جان بچا کر نکلا ہوں۔ میرے ساتھ ابصار کا بیوی بچہ بھی ہے۔ مجھے کچھ دن کے لیے جگہ چاہیے۔ ٹھیک ہے، پتا بتاؤ۔''

ماجد پین اور کاغذ نکال کر پتا نوٹ کرنے لگا تو یاسر نے روبینہ سے پوچھا۔ ''بابا مر گیا ہے کیا؟''

اس نے سر ہلایا اور پھر رونے لگی مگر اس کا رونا شوہر کے لیے نہیں تھا، وہ تو اپنے اور یاسر کے مستقبل کے لیے رو رہی تھی۔ اسے آگے تاریکی دکھائی دے رہی تھی۔ ابصار جیسا بھی تھا ان کے لیے تو وہی پناہ گاہ تھا۔ اب وہ بغیر پناہ کے ہو گئے تھے۔ موبائل پر بات کر کے ماجد ان کے پاس آیا اور انہیں گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دارالحکومت کے پاس مین ہائی وے پر یہ بستی آباد ہو رہی تھی ...اب یہاں اچھے مکان بھی بننے لگے تھے ورنہ کچھ عرصے پہلے تک یہ صرف گاؤں شمار ہوتا تھا۔ ماجد نے ہائی وے سے گاڑی اندر موڑی اور ایک نئے تعمیر شدہ کئی منزلہ مکان کے سامنے گاڑی روکی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور ان دونوں کو لے کر مکان کی تیسری منزل پر آیا۔ یہ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ مگر صاف ستھرا اور فرنش تھا۔ پانی، بجلی اور گیس سمیت وہاں ہر سہولت تھی۔ ماجد نے روبینہ سے کہا۔

''تمہیں اور یاسر کو یہاں رہنا ہو گا۔ جب تک تمہاری عدت ختم نہیں ہو جاتی۔''

روبینہ نے شاید پہلی بار پوچھا۔ ''ابصار کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''یہ اسی کی غلطی تھی۔'' ماجد نے الزام دینے والے انداز میں کہا۔ ''اس نے خطرے کا صحیح اندازہ نہیں کیا ورنہ ہم اپنے ساتھ تین چار آدمی لے جاتے۔ دوسری پارٹی نے دیکھا کہ دو آدمی ہیں تو ان کی نیت خراب ہو گئی۔ میں بھی زخمی ہوا ہوں۔'' ماجد نے اپنی شلوار کا پائنچہ اوپر کیا تو نیچے خون آلود پٹی بندھی تھی۔ ''مگر جان بچ گئی، ابصار اپنی حماقت کا شکار ہو گیا۔''

روبینہ رونے لگی۔ جب اس کا دل ہلکا ہوا تو اسے اپنی اور یاسر کی فکر ہوئی۔ ''ہم گزارا کیسے کریں گے؟''

''فکر مت کرو ہر چیز ملے گی مگر کچھ عرصے چھپ کر رہنا ہو گا۔ دشمن اب میری اور تمہاری تلاش میں ہیں۔''

''میری تلاش میں کیوں؟''

روبینہ کے اس سوال پر ماجد جاتے ہوئے پلٹ آیا اور اس نے روبینہ کے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔ ''رقم کا معاملہ ہے۔ ہمیں ان کی بہت بڑی رقم دینی تھی اور جب رقم نہیں ملی تو انہوں نے ہتھیار استعمال کیے۔ مگر تم فکر مت کرو، میں مسئلہ حل کر لوں گا۔ اب مجھے ابصار کا حساب بھی لینا ہے ان سے۔ ادھر ایسے رہنا کہ آس پاس والوں کو بھی پتا نہ چلے اور باہر مت جانا۔ میں شاید ایک دو دن میں آؤں۔''

''تم کہاں رہو گے؟'' روبینہ نے پوچھا تو غالباً ماجد اس کے سوال میں چھپا ہوا اصل سوال بھانپ گیا۔ اس نے جواب دیا۔

''کہیں اور تم فکر مت کرو میں صرف دیکھ بھال کرنے آؤں گا یہاں رکوں گا نہیں۔''

روبینہ نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ ڈر رہی تھی کہ ماجد نے بھی یہیں رہنے کا فیصلہ کیا تو وہ کیسے مزاحمت کرے گی..... خود کو اس سے کیسے محفوظ رکھے گی۔ روبینہ ابھی ستائیس کی ہوئی تھی مگر دیکھنے میں چوبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ یاسر جتنے بڑے بیٹے کی ماں تو ہرگز نہیں دکھائی دیتی

تھی۔ ابصار کے ساتھ مشکلات تھیں مگر اس نے آسائشیں بھی خوب دی تھیں۔ کھلا کھانا پینا اور آرام تھا۔ اس وجہ سے روبینہ کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ شاید اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس کے آبشار جیسے گھنے سرخی مائل سنہرے بال کمر سے نیچے آتے تھے۔ جلد یوں دمکتی تھی جیسے اندر بلب روشن ہوں اور ستواں ناک نقشے کے ساتھ اس کا بدن کسی قدر بھاری مگر متناسب تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت حسین ہے اور یہی اس کی فکر کی وجہ تھی۔ ماجد کے جانے پر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

مگر وہ جانتی تھی کہ ماجد پر اس گھر کے دروازے مستقل بند نہیں کر سکتی۔ شاید جلد یا بدیر اسے یہ دروازہ کھولنا پڑے۔ ماجد نے ٹھیک کہا تھا، وہاں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ فریج کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں تازہ اشیا بھی تھیں اور ٹن بند کھانے بھی۔ کچن میں منرل واٹر اور سافٹ ڈرنک کی بڑی بوتلوں کے بڑے پیک رکھے تھے۔ چائے، کافی اور شربت کے تمام لوازمات تھے۔ ٹیٹرا پیک کے ساتھ خشک دودھ بھی تھا۔ یہ سامان اتنا تھا کہ وہ مہینے بھر گزارا کر سکتے تھے۔ مگر ان کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ ماجد نے اسے صرف قیمتی چیزیں اور کچھ کاغذات لینے کو کہا تھا۔ روبینہ کو تجوری کا نمبر پتا نہیں تھا، یہ بھی اسے ماجد نے بتایا تھا۔ تجوری میں لاکھوں روپے کیش کے ساتھ سونا اور جواہرات بھی تھے۔ کاغذات کئی فائلوں کی صورت میں تھے مگر روبینہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے نہیں جان سکی کہ کاغذات کس قسم کے تھے۔ مگر رقم اور دوسری چیزوں کی مالیت کا اسے علم تھا۔ اس میں روبینہ کا زیور بھی تھا۔

ماجد نے یہ سب ایک بڑے سوٹ کیس میں بھرا۔ نوٹوں کی سو کے قریب گڈیاں تھیں۔ سوٹ کیس کار میں ان کے ساتھ تھا مگر جب ماجد نے انہیں یہاں چھوڑا تو سوٹ کیس ساتھ لے گیا تھا۔ روبینہ کو بعد میں خیال آیا مگر پہلے بھی آتا تو وہ اسے کہاں روک سکتی تھی۔ وہ ماجد کے ہاتھ میں زندہ بدست مردہ تھی۔ یاسر ابھی بچہ تھا، اس کا سہارا نہیں بن سکتا تھا۔ گھر میں ٹی وی تھا اس سے ان کا وقت اچھا گزرتا۔ روبینہ نے رات کے وقت ٹی وی لگایا تو اس میں ابصار کے مارے جانے کی خبر بھی تھی۔ پولیس کے مطابق ویران علاقے سے ملنے والی لاش پولیس کو مطلوب جرائم پیشہ ابصار شاہ کی ثابت ہوئی تھی۔ وہ منشیات، اسلحے اور انسانی اسمگلنگ میں پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس کے مطابق اسے اس کے مخالف جرائم پیشہ افراد نے قتل کر کے لاش اس ویرانے میں پھینک دی تھی۔ خبر میں روبینہ یا یاسر کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔ گویا پولیس کو ان کے بارے میں علم ہی نہیں تھا اور یہ اچھی بات تھی۔

''ماما کیا بابا غلط کام کرتا تھا؟'' یاسر نے پوچھا۔

''وہ غلط کام ہی کرتا تھا۔'' روبینہ نے تلخی سے کہا۔ ''میں نے غلطی سے بھی اسے اچھا کام کرتے نہیں دیکھا۔''

یاسر ذہین تھا اور اس کے ذہن میں بھی وہی خیال آیا جو روبینہ کے ذہن میں آیا تھا، اس نے پوچھا۔ ''ماما یہ چاچا ہمیں یہاں کیوں لایا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' روبینہ نے جواب دیا۔

''ماما ہم کہیں اور نہیں جا سکتے؟'' یاسر نے بے چین ہو کر کہا۔ ''مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔''

''نہیں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''میں یہاں کسی کو نہیں جانتی اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔''

یاسر بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا کہ فی الحال ماجد کا سہارا ضروری تھا۔ وہ ان کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ ورنہ باقی ان کا کوئی ہمدرد اور دوست نہیں تھا۔ ماجد دو کے بجائے چار دن بعد آیا۔ وہ ان کے لیے کھانے پینے کا تازہ سامان اور ایک بڑا سا شاپر لایا تھا اور وہ زیادہ دیر نہیں رکا اور بس سامان اور کچھ ہدایات دے کر چلا گیا۔ اس میں خاص ہدایت یہ تھی کہ وہ یہاں سے باہر نہ جائے اور ساتھ ہی اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ فرار کا بھی نہ سوچے۔ یہاں ان کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ اگر وہ یہاں سے نکل بھی گئی تو ابصار کے قاتلوں کے ہتھے چڑھے گی جو اسے شدومد سے تلاش کر رہے تھے تاکہ اس سے اپنا پیسا وصول کر سکیں۔ روبینہ کے پاس پیسا نہیں تھا اس لیے وہ دوسرے طریقے سے وصول کرتے۔ روبینہ کا پہلے بھی فرار کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر ماجد کی بات نے اسے سہما دیا۔ اتنا تو وہ سمجھتی تھی کہ دشمنوں والی بات میں جھوٹ نہیں تھا اور وہ سچ مچ اتنے سفاک تھے کہ اسے اور اس کے بیٹے کو جانوروں کی طرح کاٹ ڈالتے۔ اسے مارنے سے پہلے بار بار مارتے۔ اس نے ماجد کو یقین دلایا۔

''میں یہاں سے باہر جھانکوں گی بھی نہیں۔''

''اسی میں تمہاری عافیت ہے۔'' ماجد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ان دنوں اس نے اپنا حلیہ بدل لیا۔ اس نے بال کریو کٹ کرا کے انہیں سیاہ رنگ سے ڈائی کرا لیا تھا اور مونچھیں صاف کر دی تھیں۔ وہ شلوار قمیص کے بجائے جین اور ٹی شرٹ میں تھا۔ یہاں آتے ہوئے اس نے سن

گلاسس لگائے ہوئے تھے جو اب اس کی ٹی شرٹ کے گریبان میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ کھانے پینے کے سامان کے ساتھ ان کے لیے کچھ ریڈی میڈ سوٹ بھی لے کر آیا تھا۔ دوسرے شاپر میں کپڑے تھے۔ یاسر کے کپڑے اسے پورے آئے مگر روبینہ کے سوٹس کو کاٹ چھانٹ کی ضرورت تھی۔ گھر میں سلائی مشین بھی تھی۔ روبینہ نے اس پر کپڑے اپنے ناپ کے لحاظ سے کرلیے۔ وہ زیادہ تر فارغ ہوتی تھی کیونکہ ناشتے کے بعد ایک ہی وقت کھانا بنانا پڑتا تھا جو دونوں ٹائم چل جاتا تھا۔

یاسر اسکول چھوٹنے کے بعد بور ہوتا تھا اور کبھی کبھی ماں سے پوچھتا کہ وہ اسکول بھی جائے گا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب روبینہ کے پاس بھی نہیں تھا مگر وہ اسے تسلی دیتی کہ جلد وہ اسکول جاسکے گا۔ جیسے ہی حالات نارمل ہوئے اور وہ اپنے گھر واپس گئے۔ روبینہ کو اب بھی امید تھی کہ وہ اپنے گھر واپس جاسکے گی۔ اسے ابصار سے نہ سہی لیکن اس گھر سے انسیت ہوگئی تھی۔ وہ خود کو اور یاسر کو بہلانے کے لیے اکثر ٹی وی لگا کر رکھتی تھی۔ باہر وہ جانہیں سکتی تھی مگر دل جب زیادہ گھبراتا تو بالکونی میں آجاتی جہاں سے دور ہائی وے کے ساتھ آس پاس کی عمارتوں اور خالی جگہوں کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہاں زیادہ آبادی نہیں تھی اور جو لوگ رہ رہے تھے وہ بھی آپس میں ملتے جلتے نہیں تھے۔ اتنے عرصے میں کسی نے ان کے گھر کا دروازہ نہیں بجایا تھا۔ خود تو وہ باہر جاتے نہیں تھے۔

باہر دیکھ کر اور ٹی وی سے کب تک دل بہلاتی۔ ایک مہینے بعد وہ اور یاسر دونوں کی برداشت جواب دینے لگی۔ خاص طور سے یاسر باقاعدہ آنسوؤں سے روتا کہ اسے باہر جانا ہے اور روبینہ بہت مشکل سے اسے بہلاتی تھی۔ اپنے آپ کو وہ اس سے زیادہ مشکل سے بہلاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ یاسر کو لے کر یہاں سے نکل جائے مگر اسے خود کو یاد دلانا پڑتا کہ باہر کی دنیا ایک خوب صورت عورت کے لیے اچھی نہیں ہے۔ اسے قدم قدم پر ماجد جیسے لوگ ہی ملیں گے۔ بس یہی سوچ کر وہ خود کو روک لیتی تھی۔ انہیں یہاں ایک مہینہ رہنا پڑا تھا۔ اس دوران میں ماجد تین چار بار ہی آیا تھا اور وہ بھی بس کھڑے کھڑے آتا تھا۔ سامان، ہدایات اور ڈھکی چھپی دھمکیاں دے کر چلا جاتا۔ ایک مہینے بعد وہ آیا تو روبینہ اس پر پھٹ پڑی۔ اس نے غصے سے کہا۔

''کیا تم نے ہم ماں بیٹے کو جانور سمجھا ہوا ہے جو یہاں بند کر کے رکھا ہے۔ آتے ہو اور کھانا ڈال کر چلے جاتے ہو۔''

ماجد کو اس ردعمل کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ ذرا دب گیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''یہ مجبوری ہے، میں تمہارے اور اپنے دشمن سے نمٹ رہا ہوں اور جلد میں ان کا خاتمہ کر دوں گا اس کے بعد ہم آزاد ہوں گے۔ لیکن اگر تم اس جگہ نہیں رہنا چاہتیں تو میں نے ایک جگہ اور دیکھی ہے۔ وہاں تم لوگ باہر بھی نکل سکو گے۔ جگہ بھی خوب صورت ہے۔''

یہ جگہ اوپر پہاڑوں میں ایک چھوٹا سا لیکن خوب صورت بنگلا ثابت ہوئی۔ اس پوری پہاڑی پر دولت مندوں نے اپنے بنگلے بنوائے ہوئے تھے۔ روبینہ اور یاسر جس بنگلے میں رکے وہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس میں تمام سہولتیں تھیں۔ وہاں ایک چوکیدار اور اس کی بیوی خادمہ کے طور پر کام کرتے تھے۔ یہاں آکر روبینہ اور یاسر کو کسی قدر آزادی کا احساس ہوا تھا۔ مگر یہاں ٹی وی نہیں تھا۔ بجلی تھی اور دوسری سہولتیں بھی تھیں۔ سڑک اس بنگلے سے کوئی دو کلومیٹرز دور سے گزرتی تھی اور وہاں سے یہاں تک ایک کچا پکا راستہ آتا تھا۔ ماجد نے یہاں بھی روبینہ کو خبردار کیا کہ وہ یہاں سے جانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ ان کے دشمن ابھی تک آزاد تھے اور ان کی تلاش میں تھے۔ روبینہ نے اس سے کہا۔ ''میں بالکل خالی ہاتھ ہوں اور ایسے میں کہاں جا سکتی ہوں۔''

عدت کے باقی دن روبینہ نے یہیں گزارے تھے اور یہیں اس کا جبراً ماجد سے نکاح ہوا۔ ایک دن وہ اچانک ہی نکاح خواں اور دو افراد کو لے کر آیا اور اس سے تقریباً زبردستی نکاح پر اقرار کرایا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھے کے نشانات لیے۔ روبینہ روتی رہ گئی مگر بیٹے کی وجہ سے مجبور تھی۔ ماجد نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس سے نکاح پر راضی نہیں ہوئی تو وہ اسے اور اس کے بیٹے دونوں کو دشمنوں کے حوالے کردے گا۔ یاسر کی خاطر اسے ماننا پڑا۔ اس کے باوجود اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ شادی کی رات وہ رونے کی وجہ سے ماجد سے پٹی تھی۔ ایک رات میں اسے پتا چل گیا کہ وہ ایک درندے کے چنگل سے نکلنے کے بعد دوسرے درندے کے پنجوں میں پھنس گئی ہے اور وہ اسے تاعمر ادھیڑتا رہے گا۔ دوسرے کمرے میں دبکا ہوا یاسر اپنی ماں کی سسکیاں سنتا رہا اور خود بھی روتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس کا باپ زندہ ہو کر واپس آگیا ہو۔ جب وہ زندہ تھا اور روبینہ اس کے ساتھ ہوتی تب بھی اس کی راتیں روتے گزرتی تھیں۔

نکاح کے فوراً بعد ماجد اسے دارالحکومت کے پاس اس پوش آبادی کے ایک شاندار بنگلے میں لے آیا۔ یہ جگہ کسی زمانے میں فارمز کے لیے مختص کی گئی تھی مگر امرا نے یہاں زمینیں لے کر ان پر شاندار گھر اور ذاتی فارم ہاؤس بنوا لیے تھے۔ پوش ایریا ہونے کی وجہ سے یہاں تمام سہولتیں تھیں اور یہاں کی سیکورٹی کی وجہ سے کوئی غیر متعلقہ فرد علاقے میں گھس نہیں سکتا تھا۔ ماجد جو دھندے کرتا تھا، ان میں دشمنیاں لازمی تھیں اور شاید اسی وجہ سے اس نے یہاں گھر لیا تھا۔ یہ جگہ اسے مہنگی پڑی تھی مگر اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس نے خود کو محفوظ کر لیا تھا اور یہاں بیٹھ کر وہ اپنا دھندا زیادہ آسانی اور محفوظ طریقے سے چلا سکتا تھا۔ اس نے بنگلے کی سیکورٹی بھی بہترین کرائی تھی۔ اس کی بلند دیواروں پر خاردار تاریں لگی تھیں جن میں کرنٹ دوڑتا تھا۔ داخلی گیٹ آٹومیٹک طریقے سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ بنگلے میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔ کسی مداخلت کی صورت میں کئی طرح کے الارم تھے جو بج اٹھتے اور وہ خبردار ہو جاتا۔

اگرچہ کوٹھی ایک کنال پر تھی جو یہاں کے لحاظ سے چھوٹی تھی مگر روبینہ اور یاسر کے لیے یہ خاصی بڑی تھی۔ وہ اس سے پہلے جس گھر میں رہتے آئے تھے، وہ اس سے آدھا تھا۔ روبینہ نے چند دن میں رو دھو کر اپنے مقدر پر صبر کر لیا تھا۔ اس کی ذات پھر شوہر کے ستم کا نشانہ تھی مگر اسے یاسر کے مستقبل کا سوچنا تھا۔ اب اس کی واحد امید اس کا بیٹا تھا۔ اگر وہ کسی قابل ہو جاتا اور وہ ماجد کے چنگل سے نکل جاتے تو ان کی زندگی شاید کچھ سکون سے گزرتی۔ ماجد شاید یاسر کو آگے پڑھانے کے حق میں نہیں تھا مگر روبینہ نے کسی طرح اسے راضی کر لیا۔ اسے دارالحکومت کے ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا۔ اس کے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھا اس لیے اسے ٹیسٹ لے کر داخل کیا گیا اور یاسر نے اتنا اچھا ٹیسٹ دیا کہ اسے ساتویں کلاس میں داخلہ مل گیا۔ فارغ دنوں میں وہ ازخود چھٹی کلاس کا کورس پڑھتا رہا تھا۔

چند مہینے کے وقفے کے بعد ان کی زندگی تقریباً اسی ڈگر پر چلنے لگی۔ جب تک ماجد گھر میں نہیں ہوتا تھا سکون ہوتا اور جب وہ آ جاتا تو یاسر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کمرے سے نہ نکلے۔ ابصار کی طرح ماجد اوباش ہی نہیں بے پروا بھی تھا۔ اسے پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بیوی کا ایک نوجوان ہوتا بیٹا بھی ہے۔ وہ اکثر روبینہ کے معاملے میں حد کراس کر جاتا تھا اور وہ بے چاری شرمندہ ہوتی تھی۔ ابصار بھی ایسا ہی کرتا تھا مگر ایک تو یاسر اس کا بیٹا تھا اور دوسرے اسے ان



باتوں کا اتنا شعور نہیں تھا۔ مگر اب وہ بڑا ہو رہا تھا اور ماجد بے شک اس کی ماں کا شوہر سہی لیکن وہ اس کا باپ نہیں تھا اس لیے جب وہ اس کے سامنے یا اس کے آس پاس ہوتے ہوئے روبینہ کے نزدیک آتا تو یاسر کے اندر غصہ ابھرنے لگتا تھا۔ ایسے موقع پر وہ وہاں سے دور چلا جاتا۔ اس نے ایک بار سنا کہ روبینہ ماجد سے کہہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں تمہاری بیوی ہوں مگر یاسر کا تو خیال کیا کرو۔"

"اس کی کیا جرأت؟" ماجد غرایا۔

"بات جرأت کی نہیں ہے۔ اگر وہ تمہارا سگا بیٹا ہوتا تب بھی تم ایسا ہی کرتے۔"

"سگا ہو یا سوتیلا میرے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔" ماجد نے جواب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرنے لگا تھا۔ شاید وہ یاسر کو اکسا رہا تھا کہ وہ احتجاج کرے یا کچھ بولے تو اسے مار پیٹ سکے۔ اب تک تو اسے موقع نہیں ملا تھا۔ کار میں مارے جانے والے پہلے تھپڑ کے بعد اس کا ہاتھ صرف روبینہ پر چل رہا تھا۔ روبینہ اس بات کو سمجھ رہی تھی اس لیے وہ اکثر یاسر کو سمجھاتی تھی کہ وہ خود پر قابو رکھے۔ ماجد کی کسی بات سے مشتعل نہ ہو۔ یاسر دبے لفظوں میں شکایت کرتا تھا کہ ماجد اس کے ساتھ بہت سختی اور اہانت آمیز انداز میں پیش آتا ہے۔ مگر روبینہ کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو جاتا اور خود پر قابو رکھتا تھا۔ وقت مشکل اور آسانی سے گزرتا رہا۔ آسانی یہ تھی کہ کوئی مالی مسئلہ نہیں تھا۔ ابصار کی طرح ماجد نے بھی گھر میں کھلا کھاتا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف روبینہ کو بلکہ یاسر کو بھی کھلا خرچ دیتا تھا۔ ان کی ضرورت اور آسائش کی ہر شے بن کہے آ جاتی تھی۔

ابصار کی تجوری سے نکلنے والا باقی سارا مال اور دستاویزات ماجد نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں البتہ اس نے روبینہ کا زیور اسے دے دیا تھا۔ یہ دو کلوگرام سے زیادہ وزن کا زیور تھا جو ابصار اسے وقفے وقفے سے دیتا رہا تھا۔ تجوری میں موجود رقم بھی ماجد نے اسے نہیں دی تھی۔ البتہ بعد میں اس نے کسر پوری کر دی تھی۔ گھر کے خرچ کے علاوہ بھی وہ اسے بڑی رقمیں دیتا رہتا تھا اور کبھی پلٹ کر حساب نہیں لیا۔ اسے باہر لے جاتا تو ساری ادائیگیاں خود کرتا تھا۔ یوں روبینہ کے پاس موجود رقم جمع ہوتی رہی تھی اور اس وقت بھی اس کے پاس بیس بائیس لاکھ کی رقم تھی جو اس کی الماری میں موجود تھی۔ یاسر کا خرچ اس کے پاس آتا تھا اور موجود رہتا

تھا جب یاسر کو ضرورت ہوتی وہ اس سے لے لیا کرتا تھا۔

مگر اس کے علاوہ سب مشکل ہی تھا۔ روبینہ پر تو باہر جانے پر پابندی تھی۔ یعنی وہ اکیلے اور ماجد کے بغیر باہر نہیں جاسکتی تھی۔ البتہ یاسر کے باہر جانے پر پابندی نہیں تھی۔ یہ شاید ماجد کی مجبوری تھی مگر یاسر خود بھی باہر رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ گھر میں ہوتا تھا۔ اس کا کوئی دوست یا بے تکلف واقف کار نہیں تھا۔ ماجد نے بھی اسے اسکول اور محلے میں دوستی سے منع کیا تھا اور اسے خبردار کیا تھا کہ اگر اس نے کوئی حماقت کی تو اس کا نتیجہ وہ ہی نہیں اس کی ماں بھی بھگتے گی۔ بہرحال ماجد کو اس حوالے سے بھی شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ یاسر کی ساری توجہ تعلیم پر تھی اور گھر میں وہ فارغ اوقات میں ٹی وی دیکھتا یا پڑھتا تھا۔ اس کی پاکٹ منی کا زیادہ حصہ کتابیں اور ماہانہ رسائل کی خرید میں لگتا تھا۔ ماجد کو اس کا پڑھنا اچھا نہیں لگتا تھا مگر اس نے بھی یاسر کو اس حوالے سے کچھ کہا نہیں تھا۔

☆☆☆

یاسر ہائی اسکول کا آخری امتحان دے چکا تھا اور اس کا رزلٹ آگیا تھا مگر ابھی اس نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آگے کیا کرے۔ ماجد کا کہنا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرے۔ (اگرچہ روبینہ اور یاسر جانتے ہی نہیں تھے کہ اس کا اصل دھندا کیا ہے کیونکہ وہ گھر میں نہ تو کچھ لاتا تھا اور نہ لے جاتا تھا اور نہ ہی ان لوگوں کے سامنے کسی سے فون پر بات کرتا تھا۔ بس انہیں یہ احساس تھا کہ ماجد بھی اچھا کام نہیں کرتا ہے) مگر روبینہ چاہتی تھی کہ وہ آگے پڑھے اور یونیورسٹی میں داخلہ لے۔ یاسر کا رجحان آئی ٹی کی طرف تھا اور وہ سوفٹ ویئر انجینئر بننا چاہتا تھا۔ اس نے روبینہ سے بھی کہہ دیا تھا اور وہ ماجد کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی کشمکش میں کچھ وقت گزر گیا تھا اور یاسر کو خطرہ تھا کہ اس کا ایک سمسٹر ضائع نہ ہوجائے۔ اگرچہ عمر مسئلہ نہیں تھی وہ اٹھارہ کا ہونے والا تھا اور اس کے پاس ابھی پڑھنے کے لیے خاصا وقت تھا۔

اسکول بھی نہیں رہا تو اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا۔ وہ ٹی وی اور رسائل و کتب سے دل بہلانے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی زیادہ بوریت ہوتی تو بائیک لے کر نکل جاتا۔ روبینہ سادہ سی عورت تھی اسے زیادہ باتیں کرنا نہیں آتی تھیں اور دنیا کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کی ساری کائنات اس کا گھر اور اس کا بیٹا تھا۔ شوہر سے بس ایک برائے نام تعلق تھا۔ جسے انسیت بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ بھول نہیں سکی تھی کہ ماجد نے اسے پر جبراً قبضہ کیا تھا اور وہ اسے برداشت کرتی تھی کہ ایسا کرنا اس کی مجبوری تھی۔ اسے انتظار تھا کہ اس کا بیٹا کسی قابل ہوجائے تو شاید اسے ماجد کے اس جہنم سے نجات مل سکے۔ مگر اس کے آثار بھی نہیں تھے۔ کیونکہ یاسر کسی صورت ماجد جیسے خطرناک آدمی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

اس لیے روبینہ نے اپنا معاملہ اوپر والے پر چھوڑا ہوا تھا کہ وہی اس کے لیے بہتری کرے۔ یاسر آج صبح سے باہر نکلا ہوا تھا کیونکہ موسم بارش کا تھا اور ایسے میں اسے باہر جانا اچھا لگتا تھا۔ وہ باہر نکلا تو بارش ہوگئی اور وہ ہلکی رفتار سے بائیک ویران سڑکوں پر گھماتا رہا۔ کئی گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو شرابور تھا۔ کچھ دیر وہ باہر ہی رک کر پانی جھاڑتا رہا۔ اندر لاؤنج سے ماجد کے چلانے کی آواز آرہی تھی اور وہ اس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے ٹھیکا نہیں لے رکھا کہ دوسرے کی اولاد کو پالتا رہا ہوں۔''

''وہ بچہ ہے۔''

''وہ بچہ نہیں ہے اب بڑا ہوگیا ہے اور اس گھر میں رہتا ہے تو وہ کرنا پڑے گا جو میں کہوں گا۔''

''اس کا باپ تمہارا دوست تھا اور تم نے ہی از خود یہ ذمے داری لی تھی۔'' روبینہ نے اسے یاد دلایا۔ ''میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرو۔''

''بہت زبان چلنے لگی ہے تیری۔'' ماجد غرایا اور ایسی آواز آئی جیسے اس نے روبینہ کو تھپڑ مارا پھر وہ گرجا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا، اب یاسر میرے ساتھ کام کرے گا یا وہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔''

''وہ پڑھے گا۔'' روبینہ پھر بولی۔ وہ مار کھانے کے باوجود ماجد کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ''تم اپنا کام خود کرو۔ میرا بیٹا کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔''

''غلط کام۔'' ماجد بولا اور شاید اس نے روبینہ کے بال پکڑ لیے تھے۔ ''میں جو کرتا ہوں اس کی وجہ سے تم دونوں ماں بیٹے عیاشی کر رہے ہو اور تم اسے غلط کام کہہ رہی ہو؟''

''یہ بھی تمہاری مرضی ہے تم ہماری خاطر نہیں کر رہے ہو۔ دوسری بات یہ کہ یاسر اپنے باپ کی دولت پر پلا بڑھا ہے وہ دولت جو اس کی تجوری سے نکلی تھی اور تم سوٹ کیس میں ڈال کر لے گئے تھے۔''

''وہ صرف ابصار کی رقم نہیں تھی، اس میں میرا حصہ بھی تھا اور پھر میں اس کے دشمنوں سے نمٹتا رہا، اس میں

بہت خرچ ہوا۔ تمہارا کیا خیال ہے یہ سب فری میں ہو گیا جو آج ہم سب آزادی سے بیٹھے ہیں۔ پھر میں تم دونوں کو بھرتا رہا ہوں۔ کھلا پلا دیتا رہا ہوں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' روبینہ کا حوصلہ برقرار تھا۔ ''یاسر کوئی غلط کام نہیں کرے گا وہ پڑھے گا اور شریف آدمی کی زندگی گزارے گا۔''

''لگتا ہے تم اس طرح نہیں مانو گی۔'' ماجد نے کہا اور پھر تھپڑ کی آواز آئی۔ ماجد نے اسے گلے سے پکڑا ہوا تھا اور بے رحمی سے اسے مار رہا تھا۔ ایک تھپڑ کے بعد اس نے پھر ہاتھ بلند کیا تھا کہ عقب سے یاسر نے کہا۔

''میں آپ کے ساتھ کام کروں گا۔''

ماجد کا ہاتھ رک گیا اور اس نے مڑ کر یاسر کو دیکھا جو گیلے کپڑوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے جوتوں سے بدستور پانی بہہ رہا تھا۔ ماجد نے سنا نہیں تھا۔ اس نے سمجھا کہ شاید یاسر اسے ماں کو مارنے سے روک رہا ہے۔ ''کیا... کیا کہا تم نے؟''

''میں کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ کام کروں گا۔''

ماجد کے پُر وحشت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے روبینہ کی طرف دیکھا۔ ''سنا تم نے اپنے بیٹے کا فیصلہ؟ یہ میرے ساتھ کام کرے گا۔''

ماجد نے روبینہ کا گلا اب تک جکڑا ہوا تھا۔ اس کی سانس رک رہی تھی مگر اس نے نفی میں سر ہلا کر یاسر کو منع کیا۔ ماجد ہنسا اس نے روبینہ کا گلا چھوڑ دیا۔ ''تم اسے منع کر رہی ہو مگر اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔ میرے بعد اسے ہی یہ سارا کام دیکھنا ہے اور اسے کام آنا چاہیے۔''

روبینہ اس کی طرف آئی۔ ''تو نے یہ کیا کیا؟''

''ماما میں کام کروں گا اور پڑھوں گا بھی۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میں فیصلہ کر چکا ہوں۔''

ماجد دیوانوں کی طرح ہنسا۔ ''سنا تم نے یہ فیصلہ کر چکا ہے۔ یہ اتنا سا لڑکا فیصلہ کر چکا ہے۔ تم نے غلط کہا تھا، یہ بچہ ہے۔ یہ بڑا ہو گیا ہے اور فیصلے کر سکتا ہے۔''

یاسر نے ماجد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''میں آپ کے ساتھ کام کروں گا جو آپ کہیں گے وہ کروں گا مگر اب آپ ماما پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔''

یاسر نے کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا، روبینہ اس کے پیچھے تھی۔ وہ اسے سمجھا رہی تھی کہ وہ ماجد کو انکار کر دے۔ وہ کیا کرے گا انہیں مارے گا اور گھر سے نکال دے


دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

گا۔ وہ اس کے لیے بھی تیار تھی۔ یاسر نے اپنے لیے لباس نکالا اور واش روم میں آکر تبدیل کرنے لگا۔ باہر روبینہ مسلسل بول رہی تھی۔ اس کا انداز ہذیانی ہو گیا تھا۔ یاسر کپڑے بدل کر باہر آیا تو روبینہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''یاسر تو ایسا نہیں کرے گا۔ سنا تو نے تو اس کے ساتھ کام نہیں کرے گا۔''

''ماما اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میرے منع کرنے پر ماجد ہمیں مارے گا اور گھر سے نکال دے گا تو آپ اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں۔''

''تو جانتا ہے اسے؟''

''ہاں میں اب جان گیا ہوں۔'' یاسر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ان دنوں ماجد بہت پریشان اور ہمہ وقت غصے میں ہوتا تھا۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔ یاسر صبح اٹھا اور ناشتے کے لیے باہر آیا تو اس نے اتفاق سے ماجد کے خاص کمرے کا دروازہ کھلا پایا۔ وہ اسے ہمیشہ لاک رکھتا تھا۔ یہ کمرا اس کا دفتر تھا اور وہ یہیں سارے کام نمٹاتا تھا۔ یاسر کو خیال آیا اور وہ اندر آیا۔ تب اس نے دیکھا کہ میز پر رکھا ہوا کمپیوٹر آن تھا اور بڑے سے ایل سی ڈی پر اسکرین سیور آن تھا۔ اس نے ماؤس ہلایا تو اسکرین سیور ختم ہو گیا۔ تب اس نے دیکھا کہ ایک فولڈر کھلا ہوا تھا جس میں بہت سی میڈیا فائلز تھیں۔ اس نے سب سے اوپر والی فائل کو کلک کیا اور ایک ویڈیو آن ہو گئی۔ ویڈیو کیمرا ایک کمرے میں بچھے لوہے کے پلنگ پر لیٹی ایک لڑکی کو دکھا رہا تھا۔ لڑکی کے جسم پر معمولی سا شلوار قمیص تھا اور وہ بہت حسین اور دلکش لڑکی تھی۔ یاسر نوجوان تھا، وہ اس منظر سے متاثر ہوا تھا۔ لڑکی ساکت تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے سو رہی ہے یا پھر بے ہوش ہے۔ پلنگ پر اسپرنگ والا گدا تھا جس پر لڑکی کا جسم کسی قدر ترچھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر تھے۔ یاسر نے غور کیا تو اسے لڑکی کے ہاتھ ہتھکڑیوں سے پلنگ کے سرہانے والے پائپ سے بندھے دکھائی دیے۔ یعنی لڑکی کو اس جگہ جبراً رکھا گیا تھا۔

اس کمرے کی لان والی دیوار پوری شیشے کی تھی اور اس پر چوڑی پٹی والی سفید جھالریں لٹکی ہوئی تھیں جن میں کہیں کہیں خلا تھا۔ یاسر نے دیکھا کہ ماجد موبائل پر بات کرتے ہوئے لان میں ٹہل رہا ہے۔ شاید اسی کال کی وجہ سے وہ باہر گیا تھا اور عجلت میں دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ یاسر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے یہاں سے چلا جائے کہ اسکرین پر ہونے والی حرکت نے اسے متوجہ کیا اور اب کیمرے میں ایک شخص اور آیا تھا اور یہ ماجد تھا۔ یاسر نے اس کے بڑھے ہوئے سرخ بالوں سے اسے پہچان لیا۔ ابصار کے مارے جانے کے بعد اس نے کچھ عرصے کے لیے حلیہ بدلا تھا۔ مگر جب وہ روبینہ سے شادی کے بعد انہیں اس گھر میں لایا تو اس نے پھر وہی حلیہ اپنا لیا تھا۔ ویڈیو میں وہ صرف پتلون میں تھا اور اس کا اوپری جسم عریاں تھا۔ یاسر کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ماجد اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنے جا رہا تھا۔

ماجد جھکا اور اس نے لڑکی کا منہ ہلایا۔ وہ یوں کسمسانے لگی جیسے گہری نیند میں ہو۔ اب ماجد بستر پر چڑھ گیا اور سیدھا ہوتے ہوئے اس نے اچانک پوری قوت سے لڑکی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ یاسر اچھل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ ماجد وحشی آدمی ہے مگر وہ اس بے ہوش اور حسین لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ پھر ماجد کا ہاتھ رکا نہیں اور وہ لڑکی کے چہرے پر مسلسل تھپڑ مارتا رہا۔ ذرا سی دیر میں اس نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ لڑکی کے ناک منہ سے خون نکل رہا تھا اور اب وہ تڑپ رہی تھی مگر بے بسی سے مار کھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر وڈیو ختم ہو گئی۔ یاسر نے جلدی سے ویڈیو پلیئر بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اسے اے سی کی خنکی میں بھی پسینا آ گیا تھا۔ ماجد جس طرح لڑکی کو مار رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے اسے ختم کر دیا ہوگا۔ وہ بہت سفاک شخص تھا۔ یاسر کمرے سے نکلا اور لاؤنج کی طرف آیا تھا کہ باہر سے آنے والی گیلری سے ماجد نمودار ہوا، اس نے کمرے کا کھلا دروازہ دیکھا اور یاسر کو آواز دی۔

''کیا تم کمرے میں گئے تھے؟''

''نہیں۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ ''میں اپنے کمرے سے آرہا ہوں۔''

یاسر کہہ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ ماجد اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آیا۔ مانیٹر پر اسکرین سیور آن تھا۔ اس نے ماؤس ہلایا تو اسکرین سیور ہٹ گیا۔ فولڈر اوپن تھا۔ ماجد سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

اس دن یاسر نے جانا کہ اس کا سوتیلا باپ کس قدر خوفناک آدمی ہے۔ نہ جانے وہ لڑکی کون تھی اور کس جرم کے پاداش میں ماجد نے اس پر اتنا بہیمانہ تشدد کیا تھا؟ وہ بہت کم عمر تھی شاید سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ نقوش سے وہ شمالی

علاقے یا پڑوسی ملک کی لگ رہی تھی جہاں سے روبینہ کا تعلق بھی تھا۔ لڑکی کو باندھنے کا انداز، وہ جگہ، وہاں لگا ہوا کیمرا اور ماجد کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ سب پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس نے بچپن میں گھر میں اسلحہ آتے جاتے دیکھا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ اور ماجد اسلحے کے تاجر تھے شاید وہ منشیات بھی اسمگل کرتے ہوں لیکن اس ویڈیو نے اسے بتایا تھا کہ ماجد کا شاید ایک دھندا اور بھی تھا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے اس گھر میں کچھ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ ماجد نے اس جگہ کو اپنے کاروبار سے بالکل الگ رکھا تھا اور وہ یہاں سے صرف رابطے کرتا تھا اور احکامات جاری کرتا تھا۔ کوئی اس سے ملنے بھی نہیں آتا تھا۔ پھر جب اس نے ماجد کو روبینہ پر جبر کرتے دیکھا تو اسے خوف ہوا کہ کہیں ماجد اس کی ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک نہ کرے۔ اس لیے وہ مان گیا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرے گا۔ اس ایک اقرار کے بعد گھر میں سکون اور خاموشی چھا گئی تھی مگر یاسر کو لگ رہا تھا کہ اس خاموشی وسکون کے پیچھے کوئی بڑا طوفان ہے۔

اس نے کام کے ساتھ پڑھنے کو بھی کہا تھا اور ماجد نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے کچھ یونیورسٹیز کے پراسپیکٹس حاصل کر لیے تھے اور انہیں بھر کر جمع کرا دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے ٹیسٹ اور انٹرویو کے لیے بلا لیا۔ وہ جس یونیورسٹی میں جانا چاہ رہا تھا، اسے وہاں داخلہ مل گیا۔ روبینہ کے پاس موجود رقم سے اس کی سارے سال کی فیس اور دوسرے اخراجات کی رقم بہت آسانی سے نکل آئی۔ اسے ماجد سے مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور اس کا آرام سے داخلہ ہو گیا۔ کلاسز شروع ہوئیں تو اس کا دن کا نصف یونیورسٹی میں گزرنے لگا۔ صبح وہ یونیورسٹی جاتا اور کلاسز لیتا۔ ایک بجے کلاسز آف ہو جاتیں تو وہ لائبریری چلا جاتا اور ایک دو گھنٹے وہاں رہتا تھا۔ وہ تقریباً تین بجے گھر کے لیے نکلتا تھا۔ اس دن وہ گھر جانے کے لیے ذرا لیٹ یونیورسٹی سے نکلا تھا۔ وہ باہر آیا تو سڑک کے ساتھ کھڑی ایک لڑکی نے اسے روک لیا۔

''کیا تم مجھے لفٹ دے سکتے ہو؟''

لڑکی کسی قدر گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے باریک کپڑے کے کرتے کے نیچے اسکن فٹ ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ کرتے سے اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ اس کے ساتھ نیلی جینز تھی۔ وہ خوش شکل اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے بائیں شانے پر ایک بڑا ہینڈ بیگ تھا۔ یاسر نے آج تک کسی لڑکی کو بائیک پر لفٹ نہیں دی تھی مگر وہ اسے منع نہیں کر سکا۔ ''تمہیں کہاں جانا ہے؟''

''کہیں بھی لے چلو۔'' وہ بولی اور اچک کر اس کے عقب میں بیٹھ گئی۔ ''بس یہاں سے نکلو۔''

''کیا مطلب کہیں بھی لے چلوں؟'' یاسر کسمسایا کیونکہ اس نے بیٹھتے ہی اسے کمر سے پکڑ لیا تھا۔ وہ اس سے چپک کر بیٹھی اور یاسر اس کے بدن کی نرمی و گرمی محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اس کے کان میں بولی۔

''اپنے گھر کی طرف چلو۔''

یاسر نے بائیک آگے بڑھائی۔ ''تم جانتی ہو کہ میرا گھر کہاں ہے؟''

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن تمہارا گھر کہیں نہ کہیں تو ہو گا۔''

دس منٹ بعد ایک سگنل آ گیا۔ یاسر نے بائیک روکی تو وہ اچانک ہی اتر گئی۔ ''تمہارا شکریہ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' یاسر نے کہا۔ ''ویسے کیا تمہیں یہیں تک لفٹ چاہیے تھی؟''

وہ مسکرائی۔ ''ہاں لیکن تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ چھوٹی سی لفٹ دے کر تم میرے کتنے کام آئے ہو۔''

''ویلکم۔'' یاسر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے کام آیا۔''

اس نے بائیک آگے بڑھا دی کیونکہ اس دوران میں سگنل کھل گیا تھا اور پیچھے موجود گاڑیوں کے ہارن بج رہے تھے۔ بیک مرر میں اسے لڑکی وہیں کھڑی دکھائی دی تھی۔ یاسر نے اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔ اس کا خیال تھا یہ لڑکی ان بہت سے لوگوں میں سے ایک ہے جو انسان کو کبھی راہ چلتے ملتے ہیں۔ کچھ دیر ساتھ رہتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں کبھی نہ ملنے کے لیے۔ ان کے بنگلے کا گیٹ ریموٹ سے کھلتا تھا اور ایک ریموٹ یاسر کے پاس بھی تھا۔ یہ اس کی بائیک کی کی چین سے لگا ہوا تھا۔ گھر کے نزدیک آ کر اس نے ریموٹ کا بٹن دبایا اور گیٹ کھلتے ہی اندر آ گیا۔ اس نے پورچ میں بائیک روکی تو ماجد لان میں ٹہل رہا تھا اور کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ وہ چہرے سے پریشان دکھائی دے رہا تھا اور اس کی آواز بلند تھی۔ یاسر نے اندر جاتے ہوئے سنا۔

''اسے ہر صورت تلاش کرو... میں کچھ نہیں جانتا... وہ میرے چار قیمتی ترین آدمی مار چکی ہے... تم لوگوں کو کس لیے اتنی بڑی رقمیں دیتا ہوں... مجھے ہر صورت اس کا پتا چاہیے... معاملہ اب میری برداشت

سے باہر ہو گیا ہے میں نے اسے پکڑنے کا پورا پلان بنا کر دیا اور وہ تمہارے منہ پر..... کر نکل گئی۔"

یاسر ایک لمحے کو ٹھٹکا تھا۔ بات کسی عورت کے بارے میں ہو رہی تھی۔ ماجد کس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً اپنے آدمیوں سے بات کر رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو نقصان پہنچا کر نکل جائے۔ کم سے کم ماجد کے الفاظ سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ داخلی دروازے کے پاس تھا کہ ماجد نے اسے عقب سے آواز دی۔ "اِدھر آؤ۔"

وہ پلٹ کر آیا۔ "جی؟"

"یونیورسٹی سے آرہے ہو؟" ماجد نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

"جی۔" اس نے پھر کہا۔

"پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

ماجد نے دھواں خارج کرتے ہوئے اسے پُرخیال نظروں سے دیکھا۔ "پڑھائی جاری رہے گی، کام کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں تیار ہوں۔" اس نے محتاط انداز میں کہا۔

"خوب۔" ماجد نے کہا۔ "ٹھیک ہے، جا کر فریش ہو جاؤ۔"

جب تک یاسر نے فریش ہو کر کھانا کھایا، ماجد کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس نے یاسر سے کہا۔ "کے ایف سی چلے جاؤ۔ وہاں ایک شخص تمہیں ملے گا وہی کام بتائے گا۔"

"کیسا کام؟" یاسر نے پوچھا تو ماجد کا موڈ آف ہو گیا، اس نے غرا کر کہا۔

"بولا ہے کہ کام وہی بتائے گا۔"

یاسر ہچکچا رہا تھا اور جب ماجد نے اسے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ باہر نکل گیا۔ وہ روبینہ سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ ماجد اسے اتنی جلدی کسی کام پر روانہ کر دے گا۔ ماجد نے اسے جس طرح جانے کو کہا تھا، وہ پھر ہمت نہیں کر سکا کہ ماں کے پاس جائے اور اسے بتائے کہ ماجد اسے کہیں بھیج رہا ہے۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اسے کس شخص سے ملنا تھا اور وہ اسے کیا کام بتاتا۔ وہ بائیک پر کے ایف سی پہنچا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ ماجد نے کہا تھا کہ مطلوبہ شخص اسے وہیں ملے گا اور کیونکہ اس نے اس کی کوئی نشانی نہیں بتائی تھی اور نہ ہی رابطے کا نمبر دیا تھا اس لیے لازمی تھا کہ وہی آدمی اس سے رابطہ کرتا۔ وہ کھڑا ہوا تھا کہ ایک پرانے ماڈل کی واکس ویگن وہاں آ کر رکی۔ یہ کم سے کم بھی تیس برس پرانی گاڑی تھی اور اب سڑکوں پر بہت کم نظر آتی تھی۔ مگر اس کی حالت بہترین تھی اور اس کے چاروں ٹائر یوں چمک رہے تھے جیسے ابھی ڈلوائے گئے ہوں۔ انجن کی آواز بھی بہت معمولی سی تھی۔

ویگن سے ایک بوڑھا اور مہذب سا شخص اترا۔ اس نے نارمل موسم میں پتلون کے ساتھ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی اور اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر پچاس کے آس پاس تھی۔ قامت متوسط اور جسم مضبوط تھا۔ وہ دھیرے قدموں سے کے ایف سی کے اندر گیا۔ یاسر نے اسے سرسری نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اب تک آس پاس موجود اور آنے جانے والے افراد کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ ان میں سے کون ہو سکتا ہے اور کون نہیں۔ بوڑھے کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں تھا کہ جو شخص اس سے ملتا، وہ حلیے سے ہی بدمعاش نظر آتا۔ بوڑھا تقریباً بیس منٹ بعد اندر سے برآمد ہوا اور اس نے ہاتھ میں دو شاپرز اٹھا رکھے تھے۔ ایک میں کھانے کو کچھ تھا اور دوسرے میں کولڈ ڈرنک کے پیک تھے۔ دونوں شاپرز خاصے بڑے تھے۔ وہ اس نے لے جا کر وین میں رکھے اور پھر پلٹ کر یاسر کے پاس آیا۔ اس نے بلاتمہید کہا۔

"میرے ساتھ چلو۔"

یاسر نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ "آپ کے ساتھ مگر کیوں؟"

"تمہارے باپ نے تمہیں میرے پاس ہی بھیجا ہے۔" وہ بولا اور ویگن کی طرف پلٹ گیا۔ یاسر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے ساتھ چلے یا ویگن میں جائے۔ اس نے بائیک چھوڑی اور اس کے پیچھے لپکا۔

"میں کیسے چلوں، بائیک پر؟"

"نہیں ویگن میں۔" بوڑھے نے کہا۔ "بائیک یہیں چھوڑ دو، میں تمہیں بعد میں یہیں ڈراپ کر دوں گا۔"

یاسر نے مجبوراً بائیک وہیں چھوڑی اور اس کے ساتھ ویگن میں آ بیٹھا۔ بوڑھے نے ویگن اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ وہ خاموش تھا۔ یاسر نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میرا نام یاسر ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" بوڑھے نے کہا اور کولڈ ڈرنک والے شاپر سے کاغذی گلاس لگے پیک کولڈ ڈرنک نکال کر

اس کا ڈھکن ہٹانے لگا۔ ’’تمہارے باپ نے بتایا تھا۔‘‘

’’وہ میرا باپ نہیں ہے۔‘‘ یاسر نے بے ساختہ کہا۔ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ ماجد کو اس کا باپ سمجھا جائے۔

’’باپ نہیں ہے؟‘‘ بوڑھے نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

’’نہیں باپ ہے.... میرا مطلب ہے کہ وہ سوتیلا باپ ہے۔‘‘

بوڑھے نے یوں سنا جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو اور وہ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ کولڈ ڈرنک پینے میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ویگن شہر سے باہر جانے والی ہائی وے پر آگئی۔ یاسر بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ’’ہم کہاں جارہے ہیں؟‘‘

’’شمال کی طرف۔‘‘ بوڑھے نے جواب دیا۔

’’ہماری منزل کیا ہے؟‘‘ یاسر کا لہجہ تیز ہوگیا۔

’’کوئی نہیں۔‘‘ بوڑھے نے خالی ہوجانے والا گلاس کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ یاسر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماجد جیسے شخص کے ساتھ اس شخص کا کیا تعلق ہوسکتا تھا؟ اپنی صورت اور حلیے سے تو وہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسر لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روبینہ کو کال کرکے بتادے اور ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک بوڑھے نے کہا۔

’’تمہارے پاس موبائل ہے؟‘‘

’’ہاں ہے۔‘‘

’’دکھانا۔‘‘ بوڑھے نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے موبائل نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بوڑھا شاید کال کرنا چاہ رہا تھا مگر اس نے موبائل بند کرکے اسے ویگن کے ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال دیا۔ یاسر نے پوچھا۔

’’یہ کیوں؟‘‘

’’تو موبائل۔‘‘ بوڑھا بولا۔ ’’واپسی پر تم لے سکو گے۔‘‘

’’کہاں سے واپسی پر؟‘‘

’’جہاں ہم جارہے ہیں۔‘‘

اس جواب کے بعد مزید سوالوں کی گنجائش نہیں تھی۔ شہری آبادی ختم ہوگئی تھی اور اب وہ ایسے ویرانوں سے گزر رہے تھے جہاں کہیں کہیں چھوٹی آبادیاں تھیں مگر بیشتر جگہوں پر ہائی وے کے ساتھ قدرتی مناظر تھے۔ بوڑھے نے اچانک ہی ویگن ایسی ہی ایک چھوٹی لیکن جدید آبادی کی طرف موڑ دی۔ اسے باقاعدہ بسایا گیا تھا اور یہ کوئی ترقی یافتہ گاؤں نہیں تھا۔ یہاں اونچے اور درمیانی طبقے کے افراد رہتے تھے جن کا روزگار ہائی وے کے آس پاس تھا۔ یہاں دن میں بھی سناٹا اور ویرانی تھی۔ ویگن ایک چھوٹے سے پارک کے ساتھ روک کر بوڑھے نے اس سے کہا۔ ’’تم یہیں رکو اور اگر میں آدھے گھنٹے میں نہ آؤں تو تم ویگن لے کر چلے جانا اور ماجد کو بتادینا۔ میری بات سمجھ گئے ہو۔‘‘

یاسر نے سر ہلایا تو بوڑھا اتر کر پارک میں داخل ہوا اور پھر اسے کراس کرکے دوسری طرف موجود ایک چھوٹے سے بنگلے میں داخل ہوگیا۔ اس کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یاسر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اسے موبائل کا خیال آیا جو سامنے ہی خانے میں موجود تھا مگر نہ جانے کیوں وہ موبائل نکالنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ دس منٹ گزرے اور پھر بیس منٹ گزرے۔ پچیس منٹ کے بعد وہ بار بار بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ اٹھائیسویں منٹ پر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا اور جیسے ہی تیسواں منٹ پورا ہوا اس نے ویگن اسٹارٹ کرنا چاہی اور اسی لمحے بوڑھا بنگلے سے نمودار ہوا اور چہل قدمی کرتا ہوا ویگن کی طرف آنے لگا۔ یاسر کھسک کر اپنی سیٹ پر واپس آگیا۔ بوڑھا آکر بیٹھا اور اس نے ویگن اسٹارٹ کرکے واپس موڑ دی۔ وہ ہائی وے کی طرف جارہے تھے۔ یاسر نے اسے بتایا۔

’’اگر آپ ایک منٹ اور دیر کرتے تو میں یہاں سے جاچکا ہوتا۔‘‘

بوڑھے نے کوئی ردِعمل نہیں دیا۔ یاسر کی توجہ اس کے ہاتھ پر گئی اور اسے لگا جیسے وہاں خون ہو۔ مگر یہ اس کا خون نہیں تھا بلکہ کسی اور کا خون تھا جو اس کے ہاتھ پر لگ گیا تھا اور صاف کرنے پر بھی پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔ بوڑھے نے اس کی نظر محسوس کی اور پھر غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ موڑ لیا۔ یاسر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھا اس بنگلے میں کیا کرنے گیا تھا؟ اس کے ہاتھ پر کس کا خون لگا ہے؟ بوڑھے نے گاڑی کو ہائی وے پر شمال کی طرف موڑا تو اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ واپس جارہے تھے، وہ مزید دور جارہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد بوڑھے نے کہا۔ ’’تمہیں بھوک لگی ہے تو اس میں کھانے کے لیے برگر ہے۔‘‘

مگر اسے بھوک نہیں تھی۔ البتہ اس نے کولڈ ڈرنک کا ایک پیک نکالا اور اسے کھول کر پینے لگا۔ اس سے فارغ ہو

کر وہ اونگھنے لگا اور کچھ دیر بعد پشت سے سر لگا کر سو گیا۔ پھر ہلکے سے جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ شام ہو گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں تاریکی چھانے والی تھی۔ ویگن ایک کچے راستے پر جارہی تھی۔ ہائی وے ذرا ہی پیچھے رہ گئی تھی اور اس سے گزرتی گاڑیوں کا شور یہاں تک آرہا تھا۔ ویگن کی رفتار بہت سست تھی مگر اس کے باوجود جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ''ہم کہاں ہیں؟''

بوڑھے نے پوری توجہ سے ڈرائیو کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک جنگل میں۔''

اس کا جواب اس حد تک ٹھیک تھا کہ وہ جس کچی سڑک پر جارہے تھے، اس کے دونوں طرف گھنے اور اونچے درختوں پر مشتمل جنگل تھا۔ یاسر نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''میرے باپ..... میرا مطلب ہے سوتیلے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کام کرنا ہے اور اسی لیے اس نے آپ کے پاس بھیجا تھا۔''

''تم کام ہی کر رہے ہو میرا ساتھ دے کر۔''

''آپ نے اس مکان میں کیا کیا تھا؟'' یاسر نے پوچھا اور اس کی نظر بوڑھے کے ہاتھ پر گئی مگر اب وہ صاف تھا۔ بوڑھے نے ایک بار پھر صفائی سے اس کے سوال کا جواب گول کر دیا۔

''ہمیں کسی کی تلاش ہے۔''

''کیا وہ مکان میں مل گیا تھا؟''

''نہیں مگر اس سے ایک پتا ملا ہے۔''

''ہم وہیں جارہے ہیں؟''

''شاید۔'' بوڑھے نے جواب دیا اور اس نے اچانک وین درختوں کے درمیان ایک خالی جگہ گھما کر روک لی۔ انجن بند ہوا تو یک دم سناٹا چھا گیا۔ یہاں سناٹے میں اس کول انجن کی آواز خاصی محسوس ہو رہی تھی۔ بوڑھے نے سیٹ بیلٹ کھولی اور نیچے اتر گیا۔ یاسر بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ شہر کے برعکس یہاں موسم خوشگوار اور خنک تھا۔ ہوا میں پودوں اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ ہلکی سی نمی بتا رہی تھی کہ آس پاس کہیں پانی بھی تھا۔ بوڑھا یوں چہل قدمی کر رہا تھا جیسے جسم کھول رہا ہو۔ اس وقت وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہاں پر اکیلا ہو۔ یاسر ویگن کی باڈی سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''مجھے ابھی تک آپ کا نام نہیں معلوم ہے۔''

بوڑھے نے رک کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''تم مجھے ڈاکٹر کہہ سکتے ہو۔''

''ڈاکٹر..... ایم بی بی ایس؟''

''نہیں؟''

''آپ نے پی ایچ ڈی کی ہے؟''

''بعض لوگ اپنی فیلڈ میں بہت ماہر ہو جاتے ہیں اور انہیں ڈاکٹر کہا جانے لگتا ہے، میں اسی قسم کا ڈاکٹر ہوں۔''

''آپ کی فیلڈ کیا ہے؟''

''جو میں کرتا ہوں۔''

''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''جلد تم دیکھ لو گے بیٹے۔'' اس نے بیزاری سے کہا اور ٹہلتا ہوا ذرا دور چلا گیا۔ ویگن کا پچھلا خانہ ڈرائیونگ کمپارٹ سے الگ تھا اور اس کا دروازہ پیچھے کی طرف تھا۔ یاسر نے پیچھے آکر اس کا ہینڈل گھمایا مگر خانہ لاک تھا پھر اس نے دیکھا کہ دروازے پر اضافی تالے کے لیے جگہ بنی تھی اور اس پر مضبوط تالا بھی لگا ہوا تھا۔ یعنی عقبی حصے کا دوگنا حفاظتی انتظام تھا۔ اس میں آخر ایسی کیا چیز تھی جس کی حفاظت کے لیے اتنا تردد کیا گیا تھا۔ اب اسے یہ سادہ نظر آنے والا بوڑھا پُراسرار لگنے لگا تھا۔ اپنے سوتیلے باپ سے بھی زیادہ پُراسرار۔ ماجد جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا تھا مگر ڈاکٹر نامی یہ بوڑھا جیسا نظر آتا تھا ویسا نہیں تھا۔ وہ ٹہلتے ہوئے آگے گیا اور پھر واپس آیا۔ اس نے یاسر سے کہا۔

''ذرا آگے ایک چھوٹا سا نالا بہہ رہا ہے۔ نہانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

یاسر آج تک باتھ روم سے باہر نہیں نہایا تھا۔ ''مجھے تیرنا نہیں آتا ہے۔''

''پانی زیادہ گہرا نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور ویگن کی چابیاں نکال کر اسے لاک کر کے نالے کی طرف روانہ ہو گیا۔ یاسر اس کے پیچھے تھا۔ جب وہ نالے تک پہنچا تو ڈاکٹر کپڑے اتار کر صرف کسی قدر لمبی نیکر میں آگیا تھا۔ جسم سے وہ اتنا بوڑھا نہیں لگتا تھا، اس کا جسم جوانوں کی طرح پُر گوشت اور پٹھوں سے بھرپور تھا۔ نالا واقعی چھوٹا تھا۔ مشکل سے چھ فٹ چوڑا اور تین ساڑھے تین فٹ گہرا تھا۔ اس میں بہنے والا پانی شفاف تھا مگر دھارا تیز نہیں تھا۔ ڈاکٹر اس کے کنارے دھیرے سے اندر اتر گیا اور کچھ دیر بعد سوائے سر کے اس کا پورا جسم پانی میں تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے پانی کی ٹھنڈک اور تازگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا پھر اس نے یاسر کی طرف دیکھا۔ ''آجاؤ پانی مزے کا ہے۔''

یاسر کا دل چاہ رہا تھا مگر اس کے پاس نیکر نہیں تھی اس

لیے وہ کپڑے اتار کر انڈرویئر میں جھجکتا ہوا پانی میں آگیا۔ زندگی میں پہلی بار بہتا پانی جسم پر بہت اچھا لگا تھا، وہ بھی ڈاکٹر کی طرح پورا جسم پانی میں کر کے بیٹھ گیا۔ اسے ذرا مشکل ہوئی مگر جلد اس نے خود کو بہاؤ کے خلاف سیٹ کر لیا۔ ڈاکٹر نے اچانک پوچھا۔ ''تم نے کبھی کسی کو قتل کرنے کا سوچا؟''

یاسر کے ذہن میں بے اختیار ماجد کا خیال آیا جب وہ اس کی ماں پر ظلم کرتا تھا تو اسے کئی بار اسے قتل کرنے کا خیال آیا تھا مگر وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر کے پوچھنے پر اسے خیال آیا مگر اس نے جھوٹ بولا۔ ''نہیں آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟''

''اعداد و شمار کے مطابق انسانوں میں سے ہر ایک ہزار پانچ سو بارھواں شخص قاتل ہوتا ہے مگر ماہرین کہتے ہیں کہ باقی کے ایک ہزار پانچ سو گیارہ لوگ جو کبھی قتل نہیں کرتے، وہ اس کی کبھی نہ کبھی خواہش ضرور رکھتے ہیں۔''

''آپ نے کبھی کسی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا۔''

''میں سوچتا نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا اور کنارے رکھے سگار کو اٹھا کر لائٹر سے سلگایا اور ایک گہرا کش لیا.... تمباکو کی خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ بہت اعلیٰ درجے کا سگار ہے۔ یاسر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا مگر اس نے پھر توجہ نہیں دی اور سگار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ چند منٹ بعد پانی میں دو تین بار اپنا سر ڈبو کر وہ باہر نکل آیا۔ ''بس اب باہر آجاؤ۔ تاریکی چھانے والی ہے۔''

یاسر بھی باہر آگیا۔ دونوں نے درختوں کی آڑ میں اپنے کپڑے پہنے اور واپس ویگن کی طرف آگئے۔ اندر بیٹھتے ہی ڈاکٹر نے کھانے والا شاپر کھول لیا تھا اور کھانے میں مصروف ہو گیا پھر اس نے یاسر کی طرف شاپر بڑھایا۔ اب اسے بھی بھوک لگ رہی تھی اور اس نے شاپر لے لیا۔ شاپر میں خاصی چیزیں تھیں۔ یاسر کا پیٹ بھر گیا تو اس نے ہاتھ روک کر ایک کولڈ ڈرنک کا پیک نکال لیا۔ ڈاکٹر سست روی اور دل جمعی سے کھا رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگ رہا تھا جو ہر کام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے شاپر آدھا کر دیا۔ کھانے کے بعد اس نے بھی کولڈ ڈرنک لی اور بولا۔ ''تم پڑھ رہے ہو؟''

''ہاں یونیورسٹی میں میرا پہلا سمسٹر ہے۔''

''کس شعبے میں؟''

''آئی ٹی....''

''آہا۔'' ڈاکٹر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''آج سے تیس سال پہلے ڈاکٹری اور انجینئرنگ اور آج کل ایم بی اے اور آئی ٹی۔ کیا ہمارے ہاں اور شعبے نہیں ہیں۔''

''ہیں مگر مجھے آئی ٹی میں دلچسپی ہے۔''

''جن کو نہیں ہوتی وہ بھی ان ہی شعبوں میں گھستے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ جاننے کا رواج ہی نہیں ہے کہ آدمی کو اصل میں کس شعبے سے دلچسپی ہے۔''

''آپ کو کس شعبے سے دلچسپی ہے۔''

''جس میں میں ہوں۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''میں نے بہت جلد جان لیا تھا کہ میں کون سا کام اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں اور میں آج تک وہی کر رہا ہوں۔''

اس بار ڈاکٹر کے مبہم انداز نے اسے بے سکون نہیں کیا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ ان لوگوں میں سے جو زبان سے بتانے کے بجائے عمل سے وضاحت کرتے ہیں۔ وہ جو اندر سے تھا ویسا اوپر سے نظر نہیں آتا تھا۔ اب تک یاسر نے اسے خاصی حد تک جان لیا تھا اور اگر وہ اس کے ساتھ کچھ وقت اور رہتا تھا تو باقی بھی جان جاتا۔ ماجد نے اسے بلا وجہ اس شخص کے ساتھ نہیں بھیجا تھا۔ ''آپ ماجد کے ساتھ کام کرتے ہیں؟''

''میں معاوضے پر کام کرتا ہوں۔''

''آپ فری لانسر ہیں؟''

''ہاں۔'' اس نے پہلی بار کسی سوال کا واضح جواب دیا۔

''آپ جانتے ہیں، ماجد کیا کام کرتا ہے؟''

''تم جانتے ہو؟'' ڈاکٹر نے الٹا سوال کیا۔

''نہیں۔''

''جب تم بیٹے ہونے کے باوجود نہیں جانتے تو میں کیسے جان سکتا ہوں؟''

''میں اس کا نام نہاد بیٹا ہوں۔'' یاسر نے تلخی سے کہا اور پہلی بار اپنے بارے میں زبان کھولی۔ ''اس نے تقریباً زبردستی میری ماں سے شادی کی اور اب ہم اس کے گھر میں یوں زندگی گزار رہے ہیں جیسے چڑیا کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا جائے۔''

ڈاکٹر ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور تب یاسر کو احساس ہوا کہ وہ جذبات میں آکر ایک ایسے شخص کے سامنے ماجد کے بارے میں بات کر گیا ہے جو اصل میں ماجد کا ملازم ہے۔ یاسر نے گہری سانس لی۔ ''سوری میں جذبات میں آکر بول گیا۔''

''میرا خیال ہے ہمیں کچھ آرام کر لینا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے یوں کہا جیسے اس نے یاسر کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنی نشست ذرا پیچھے سرکائی اور سر لگا دیا۔ ''ہمیں صبح سے پہلے اٹھنا ہے۔''

گرمیوں کی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ نو بجے سوئے تھے اور عین اس وقت جب ساری رات بے چین رہنے کے بعد یاسر کی آنکھ لگی تھی تو ڈاکٹر نے اسے اٹھا دیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ ڈاکٹر فریش لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ گاڑی کی نشست پر سونے کا عادی تھا۔ اس نے کہا۔ ''جا کر منہ ہاتھ دھو آؤ مگر احتیاط کرنا اس وقت پانی میں کیڑے مکوڑے اور چھوٹے جانور ہو سکتے ہیں۔''

ابھی آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ یاسر منہ دھو کر آیا تو ڈاکٹر ایک کسی قدر بڑا بیگ شانے پر لادے جیسے تیار تھا۔ اس بار اس نے ویگن لاک نہیں کی تھی اور چابی اندر لگی چھوڑ دی تھی۔ ''آؤ چلیں۔''

''کہاں؟'' یاسر نے اس کے ساتھ آتے ہوئے کہا۔

''اس طرف۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ سے ہائی وے کے مخالف سمت اشارہ کیا۔ وہ ہائی وے سے کوئی نصف کلومیٹر دور تھے۔ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے تاریکی کی وجہ سے انہیں ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ یہاں درختوں میں تاریکی تھی اور ڈاکٹر نے روشنی کے لیے کچھ نہیں کیا تھا اور وہ بہت دبے قدموں چل رہا تھا۔ مشکل سے کوئی سو گز بعد وہ ایک پتھر اور لکڑی سے بنے چھوٹے سے مکان تک پہنچے جسے چاروں طرف سے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ یاسر حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ جس جگہ رکے ہیں، اس کے قریب ہی کوئی مکان بھی ہوگا۔ ورنہ دیکھنے میں یہ جگہ بالکل ویران لگ رہی تھی۔

اس وقت کسی قدر روشنی ہونے لگی تھی اور یہاں سے مکان اور پیچھے کھڑی ویگن دونوں نظر آ رہے تھے۔ مکان کا ایک حصہ اور عقبی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرا حصہ اور سامنے والا حصہ نظروں سے اوجھل تھا۔ عقب میں سپاٹ دیوار تھی اور اس میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ جو لکڑی کے مضبوط تختوں سے بنی ہوئی اور بند تھی۔ ڈاکٹر نے بیگ نیچے رکھا اور پھر اپنا کوٹ اتارا۔ اس کے بعد اس نے بیگ سے ایک بلٹ پروف جیکٹ نکال کر پہنی۔ اس پر دوبارہ اپنا کوٹ پہن لیا۔ پھر اس نے لوہے کی ایک ڈیڑھ فٹ لمبی سیاہ سلاخ نکالی جس کے سرے پر گول مٹھ بنی ہوئی تھی۔ وہ اس نے کوٹ کی آستین میں کر لی اور آہستہ سے کہا۔ ''تم یہیں رکو گے اور کچھ بھی ہو جائے ویگن پر نظر رکھنا۔''

یاسر نے سر ہلایا تو ڈاکٹر ذرا گھومتے ہوئے مکان کے سامنے والے حصے کی طرف جانے لگا۔ یاسر اسے بھی دیکھ رہا تھا اور اس کی نظر ویگن کی طرف بھی تھی مگر جب ڈاکٹر، مکان کے سامنے پہنچا تو اس کی توجہ اس پر زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ مکان کے دروازے تک پہنچا تو یاسر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر اس نے کسی کے چلّانے کی آواز سنی۔ اسی لمحے اسے لگا کہ کوئی ویگن والی سمت میں حرکت کر رہا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا تو اب کوئی نظر نہیں آیا مگر حرکت اسے واضح محسوس ہوئی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ کیونکہ اس نے کبھی ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں کیا تھا پھر ایک فائر ہوا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور وہ بے ساختہ مکان کی طرف بڑھا۔

وہ مکان کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر سینے پر ہاتھ رکھے ذرا جھکا کھڑا ہے اور اس کے سامنے ایک تومند اور ادھیڑ عمر قبائلی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ گولی اسی نے چلائی تھی اور وہ غور سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ یاسر جانتا تھا کہ ڈاکٹر ٹھیک ہے، اس نے بلٹ پروف پہن رکھا ہے۔ گولی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یاسر کی موجودگی محسوس کر کے اس نے بھڑک کر پستول والا ہاتھ یاسر کی طرف کیا تھا کہ ڈاکٹر بہت تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کے ہاتھ میں چھپی فولادی سلاخ ٹھیک قبائلی کی کنپٹی پر لگی۔ ضرب شدید تھی اور وہ فوراً ہی زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے سلاخ کا رخ یاسر کی طرف کیا اور گرج کر بولا۔ ''یہاں کیوں آئے ہو، تم سے کیا کہا تھا؟''

''وہ..... میں.... فائر کی آواز۔'' اس نے ہکلا کر کہنا چاہا۔

''دفع ہو جاؤ اور ویگن کو دیکھو۔'' ڈاکٹر اس کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ یاسر بوکھلا کر واپس بھاگا۔ وہ اپنی جگہ آیا تو اس نے ویگن کو اسی جگہ پا کر اطمینان کا سانس لیا ورنہ ڈاکٹر کے انداز سے تو لگ رہا تھا کہ ویگن غائب ہو گی۔ ڈاکٹر کچھ دیر بعد واپس آیا اور اس نے بیگ سے ہتھکڑی نکالی اور واپس چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر آیا اور اس نے بیگ سے شفاف پولی تھین کا بنا ہوا اوور آل نکالا کر اپنے لباس پر پہن لیا۔ اس نے دوسرا اوور آل نکال کر یاسر کی طرف بڑھایا۔ ''اسے پہنو۔''

یاسر نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اوور آل نے اسے پیروں سے لے کر گردن تک مکمل ڈھانپ لیا تھا اور اب

صرف اس کے ہاتھ، جوتے اور سر اس سے باہر تھا۔ یاسر سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کیوں یہ سب کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے بیگ سے ایک چھوٹے دستے لیکن چوڑے پھل والی کلہاڑی نکالی۔ جیسی کلہاڑی فائر فائٹرز کے پاس ہوتی ہے، یہ بالکل ویسی ہی کلہاڑی تھی۔ حد یہ کہ اس کے دستے کا رنگ تک سرخ تھا۔ اس نے یاسر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور جب وہ مکان کے سامنے پہنچے تو ایک درخت کے تنے کے گرد ادھیڑ عمر قبائلی کے دونوں ہاتھ کر کے اسے ہتھکڑی سے جکڑ دیا گیا۔ وہ ہوش میں آگیا تھا اور ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اس کا منہ چوڑے ٹیپ سے بند تھا۔ ڈاکٹر نے اچانک کہا۔ ”تم نے کبھی کسی زندہ انسان کے جسم کے حصے کو کٹتے دیکھا ہے؟“

یاسر کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ قبائلی نے سن لیا تھا اور وہ ہلنے لگا۔ یاسر نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“

”مگر آج تم اس شخص کا دایاں ہاتھ کاٹو گے۔“ ڈاکٹر نے کہتے ہوئے کلہاڑی اس کی طرف بڑھا دی۔ قبائلی یہ سنتے ہی مچلنے اور مختلف آوازیں نکالنے لگا۔

”نہیں۔“ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے یوں کہا جیسے اسے کوئی صحت بخش نسخہ تجویز کر کے اس کے استعمال پر زور دے رہا ہو۔

”کیوں؟“

”کیونکہ تمہارے باپ..... میرا مطلب ہے سوتیلے باپ نے تمہیں کام پر بھیجا ہے۔ یہ تمہارا کام ہے۔“

”مگر یہ کیسا کام ہے؟“ یاسر بولا۔ ”اس شخص کا ہاتھ کیوں کاٹنا ہے؟“

”تمہارے باپ کو ایک لڑکی کی تلاش ہے جس نے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اس کے چار اہم ترین آدمیوں کو قتل کر چکی ہے اور اس نے اس لڑکی کی تلاش کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں مگر میں اکیلے یہ کام نہیں کر سکتا..... اس لیے اس نے تمہیں میرے ساتھ بھیجا ہے۔ یہ شخص اس لڑکی کو جانتا ہے مگر زبان نہیں کھول رہا ہے۔ شاید اس کا ایک ہاتھ کٹ جائے تو اس کی زبان کھل جائے۔ اب تم کلہاڑی لے رہے ہو یا میں تمہارے باپ کو کال کروں؟“ اس نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے موبائل فون نکال لیا۔

ماجد کا سنتے ہی یاسر نے جلدی سے کلہاڑی لے لی۔ اس کے لباس تلے پسینا اس کے بدن پر بہہ رہا تھا۔ کلہاڑی وزنی اور اس کی دھار بہت تیز تھی۔ یہ ایک ہی ضرب میں جسم کا کوئی بھی حصہ کاٹ سکتی تھی۔ وہ قبائلی کی طرف بڑھا تو اس کی تڑپ میں اضافہ ہو گیا۔ اتنی ہی شدت سے یاسر کا جسم کانپ رہا تھا۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ آگے آیا۔ اس نے قبائلی کی کلائی پکڑی اور انگلی سے ایک جگہ نشان لگایا۔ ”اس جگہ مارنا ہے۔ کلائی سیکنڈ میں کٹ جائے گی۔“

یاسر نے کلہاڑی اور پھر اس شخص کے ہاتھ کو دیکھا تو اسے لگا جیسے کوئی چیز اس کے معدے سے نکل کر حلق میں آرہی ہے۔ اس نے بے ساختہ گھومتے ہوئے قے کر دی۔ ڈاکٹر اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔ ”یہ اتنا بڑا کام بھی نہیں ہے کہ تمہارا معدہ الٹ کر حلق میں آجائے۔“

یاسر ہانپ رہا تھا اور پسینا اس کی ناک سے بہہ رہا تھا۔ اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ چاہے آپ میرے سوتیلے باپ کو کال کریں یا میرے سگے باپ کو۔“

شاید اس نے بھی محسوس کر لیا کہ اس لڑکے سے یہ کام نہیں ہوگا۔ اس نے یاسر سے کلہاڑی لی اور پلٹ کر اچانک قبائلی کے ہاتھ پر ماری۔ اس کے انداز میں غصہ تھا۔ قبائلی کی کلائی بازو سے الگ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ درخت سے بھی آزاد ہو گیا۔ کیونکہ کٹ جانے والی کلائی سے ہتھکڑی کا کڑا نکل گیا تھا۔ وہ چلاتے ہوئے اپنی کٹی کلائی سے خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے سر پر وار کیا اور وہ نیچے گر گیا۔ یاسر نے صرف ایک نظر کٹی ہوئی کلائی دیکھی تھی اور اب جھکا ہوا قے کر رہا تھا مگر اب اس کے منہ سے صرف ابکائیاں نکل رہی تھیں۔ اس کا معدہ مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ اس نے دوسرا وار ہوتے نہیں دیکھا مگر قبائلی کا چلانا رک گیا تھا پھر اس نے سر اٹھایا تو ساکت رہ گیا۔ سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی جس نے اس سے یونیورسٹی سے لفٹ لی تھی۔

وہ اس وقت ٹی شرٹ اور جینز میں تھی اور اس نے پشت پر بیگ باندھ رکھا تھا۔ وہ ساکت کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ یاسر نے مڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر قبائلی پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ یاسر نے سر کے اشارے سے لڑکی سے وہاں سے جانے کو کہا مگر وہ ساکت کھڑی رہی۔ پھر یاسر نے جسم کی اوٹ لے کر اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اس بار بھی نہیں سمجھی۔ قبائلی پر جھکے ڈاکٹر کی چھٹی

حس نے اسے چونکایا اور اس نے سر آگے کر کے درخت کے تنے سے جھانکا تو اسے لڑکی نظر آگئی تھی۔ لڑکی کو قبائلی نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے سر میں دھنسی کلہاڑی کا دستہ ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر آگے آیا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا حال ہیں ینگ لیڈی۔''

لڑکی کا چہرہ خوفزدہ ہو گیا۔ ڈاکٹر آگے آیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ''یہ جگہ تم جیسی خوب صورت لڑکی کے لحاظ سے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تم واپس چلی جاؤ۔''

یاسر نے دیکھ لیا تھا کہ ڈاکٹر کے پیچھے موجود ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا اور اس کا دل ایک بار پھر متلانے لگا کہ ابھی وہ اس لڑکی کو بھی شوٹ کر دے گا۔ لڑکی نے پلٹنا چاہا مگر ڈاکٹر کا ہاتھ سرعت سے سامنے آیا اور اس میں ایک چھوٹا سا پستول دبا ہوا تھا۔ وہ پھر ساکت ہو گئی۔ ڈاکٹر آگے آیا اور اس نے پستول کی نال کا رخ لڑکی کے چہرے کی طرف کر دیا۔ یاسر، قبائلی کا انجام دیکھ چکا تھا اور اب لڑکی کے قتل کے خیال سے اس کی حالت خراب ہونے لگی، اس نے منہ پھیر لیا اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ ڈاکٹر نے پستول لڑکی کے ماتھے پر رکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''مگر تم یہاں موجود ہو، آخر کیوں؟''

لڑکی خاموش رہی، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ ڈاکٹر ابھی گولی چلا دے گا۔ ڈاکٹر نے پستول اس کے چہرے سے ہٹایا تو اس نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ ڈاکٹر نے اسے اشارے سے بیگ اتارنے کو کہا۔ لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے حکم کی تعمیل کی۔ ڈاکٹر نے بیگ لے کر یاسر کی طرف اچھالا۔ ''اسے چیک کرو۔''

یاسر نے بیگ پکڑ لیا تھا مگر اسے کھولا نہیں اور بولا۔ ''اسے جانے دیں۔''

''میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا مگر اب یاسر متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ''اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسے جانے دیں۔''

ڈاکٹر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور لڑکی اچانک بھاگ گئی تو اسے فائر کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ لڑکی بچ گئی۔ وہ درختوں میں اس طرح سے بھاگ رہی تھی کہ ڈاکٹر ٹھیک سے نشانہ نہیں لے پا رہا تھا۔ اس نے دوسرا فائر کیا۔ پستول کی آواز زیادہ نہیں تھی۔ اسی طرح اس کی گولی زیادہ دور تک کام نہیں کرتی تھی۔ دوسرے فائر تک لڑکی خاصی آگے نکل گئی تھی۔ اس کا رخ ویگن کی طرف تھا۔ ابھی تک ڈاکٹر کھڑے کھڑے لڑکی کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب وہ ویگن کے پاس پہنچی تو وہ حرکت میں آیا۔ اب ڈاکٹر اس کے پیچھے بھاگا اور یاسر اس کے پیچھے تھا۔ مگر جب تک وہ ویگن تک پہنچتے، لڑکی ڈرائیونگ کمپارٹ میں گھس کر انجن اسٹارٹ کر چکی تھی۔

اس نے ریورس گیئر لگایا اور ڈاکٹر کی چلائی گولی کھڑکی کے شیشے پر لگی۔ وہ خود بال بال بچی تھی، شیشے سے آنے والی گولی اس کی نشست میں سر کے بالکل برابر میں اتر گئی تھی۔ ریورس ہوتے ہوئے ویگن گھومی، ذرا لڑکھڑائی اور پھر تیزی سے ہائی وے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ایک فائر اور کیا مگر یہ بے سود تھا۔ یاسر اس کے پیچھے آ گیا۔ ڈاکٹر کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اس سے بیگ چھینا اور اسے کھولا تو اس میں .... ایک سائلنسر لگا پستول اور کچھ رقم کے ساتھ بعض استعمال کی عام اشیا تھیں۔ اس نے پستول یاسر کے سامنے کیا۔

''اس لیے اسے روکا تھا۔ وہ یہاں ایسے ہی نہیں آئی تھی۔'' ڈاکٹر نے کہا اور واپس مکان کی طرف جانے لگا۔ یاسر اس کے پیچھے لپکا۔

''پھر کس لیے آئی تھی؟''

''وہ اس قبائلی کے پاس آئی تھی۔ اب مجھے لگ رہا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جو تمہارے ..... باپ کو مطلوب ہے۔'' ڈاکٹر نے بیگ کے پاس آ کر سب کچھ اس میں ڈالا۔ پھر اوور آل اتارا اور یاسر کو بھی اتارنے کو کہا۔ جن چیزوں پر خون لگ گیا تھا ان کو ندی پر لے جا کر صاف کیا۔ پولی تھین کے اوور آل اسی لیے پہنے گئے تھے کہ قبائلی کے ٹکڑے کرتے ہوئے ان کا لباس خون سے محفوظ رہے۔ قبائلی کے ہاتھ سے ہتھکڑی بھی اتار لی تھی البتہ اس کی لاش وہیں چھوڑ دی تھی۔ ڈاکٹر پہلی بار عجلت میں نظر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ یاسر نے کہا۔

''آپ نے ویگن میں چابی کیوں لگی چھوڑی؟''

''تمہارے لیے احمق۔'' ڈاکٹر ابھی بھی غصے میں تھا۔ ''اگر میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا تو تم یہاں سے نکل سکتے تھے۔ چابی میرے پاس ہوتی تو تم بھی پھنس جاتے۔''

یاسر سوچ رہا تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے کہ وہ لڑکی اسے گزشتہ روز ملی تھی اور اس نے اسے لفٹ دی تھی۔ کسی قدر سوچنے کے بعد اس نے نہ بتانے کا فیصلہ کیا اس لیے

جب ڈاکٹر نے اچانک پوچھا۔ ''تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟''

وہ اچھل پڑا۔ ''میں... ؟ نہیں تو۔''

''تب تم نے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا؟''

''میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی اور قتل ہو۔''

''وہ تمہاری حماقت سے نکل گئی اب اسے تلاش کرنا ہوگا۔''

یاسر بے چین ہوگیا۔ ''وہ کیوں؟''

''اس کے پاس میری ویگن ہے اور اس میں کچھ خاص سامان ہے جو کسی اور کے علم میں نہیں آنا چاہیے۔''

یاسر لڑکی کے بارے میں سوچتے ہوئے محتاط ہوگیا کہ اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو لڑکی سے اس کے تعلق کو واضح کردے۔ اس لیے اب وہ جان بوجھ کر اس کے بارے میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا مگر اس کا لاشعور کڑیاں ملا رہا تھا۔ اس کے باپ کو کسی لڑکی کی تلاش تھی جو اس کے ساتھیوں کو مار رہی تھی اور یہ لڑکی اسے از خود یونیورسٹی کے باہر ملی اور اس سے لفٹ لی۔ اگر اس نے اس کے باپ کے آدمیوں کو مارا تھا تو وہ اس کے بارے میں بھی جان سکتی تھی۔ کیا وہ اسے بھی مارنا چاہتی تھی؟ مگر اس نے صرف لفٹ لی اور وہ بھی مشکل سے دس منٹ کے لیے۔ اس نے کوئی ایسا تاثر نہیں دیا جس سے اسے لگتا کہ وہ اسے جانتی ہے۔

وہ دونوں ہائی وے تک آگئے تھے اور اسے کراس کر کے دوسری لین میں آئے جہاں گاڑیاں دارالحکومت کی طرف جا رہی تھیں۔ یاسر نے پوچھا نہیں کہ ڈاکٹر کو کیسے علم ہوا کہ وہ دارالحکومت کی طرف ہی گئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے وہ اس کے مخالف سمت گئی ہو۔ ایک پرانے ماڈل کی شیورلیٹ کار ان کے سامنے رکی تو یاسر چونکا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوچوں میں گم ہوگیا تھا اس لیے ڈاکٹر کو لفٹ کے لیے اشارہ کرتے نہ دیکھ سکا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر شریفانہ سے تاثرات تھے اور بیگ یاسر نے شانے پر لیا ہوا تھا۔ لڑکی والا بیگ بھی انہوں نے اسی میں ڈال لیا تھا۔ بہ ظاہر وہ لفٹ کے مستحق لگ رہے تھے اور یہی سوچ کر ڈرائیور نے گاڑی روکی تھی۔ گاڑی میں ایک معمر جوڑا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر ایک معمر عورت تھی اور تقریباً اس کے مساوی عمر والا مرد ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''لفٹ چاہیے؟''

''نہیں گاڑی چاہیے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور پستول نکال لیا۔ یاسر کا منہ کھلا رہ گیا۔ ایک منٹ بعد دونوں میاں بیوی ہراساں سڑک کے کنارے کھڑے تھے اور ڈاکٹر نے ان پر پستول تان رکھا تھا۔ اس نے یاسر سے کہا۔ ''ڈرائیونگ سیٹ پر جاؤ۔''

یاسر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا تو ڈاکٹر نے مہذب لہجے میں جوڑے سے معذرت کی۔ ''میں بہت زیادہ مجبور ہوں ورنہ کبھی یہ حرکت نہ کرتا اور آپ کی حفاظت کے خیال سے آپ کو یہاں اتار دیا کیونکہ ہمارے ساتھ جانے کی صورت میں آپ کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ گاڑی بھی جلد یا بدیر آپ کو واپس مل جائے گی۔ یہاں جلد آپ کو مدد مل جائے گی۔ ایک بار پھر معذرت۔''

وہ کہتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر آگیا اور یاسر نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ بھی ویگن کی طرح تیس سال پرانا ماڈل تھا مگر نہایت مضبوط اور طاقتور انجن کا حامل تھا۔ سیٹیں بہت بڑی اور نہایت آرام دہ تھیں۔ گاڑی کے اندر اور باہر سے لگ رہا تھا کہ اسے بہت سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ اس بار یاسر نے ڈاکٹر کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ اس نے جیسا کہا، یاسر نے ویسا ہی کیا۔ ورنہ اسے اس بوڑھے جوڑے کے ساتھ ڈاکٹر کا یہ سلوک پسند نہیں آیا تھا۔ خود ڈاکٹر کو بھی اچھا نہیں لگا تھا اور اس نے جوڑے سے معذرت کی تھی۔ اس نے یاسر کے تاثرات بھانپ لیے۔ ''تمہیں اچھا نہیں لگا ہے نا... مجھے بھی نہیں لگا۔ مگر یہ تمہاری حماقت تھی جس نے مجھے اس حرکت پر مجبور کیا۔ مجھے ہر صورت اپنی ویگن واپس چاہیے۔''

کچھ آگے نکلنے کے بعد یاسر نے لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ ''اسے کیسے تلاش کریں گے؟''

ڈاکٹر نے اپنا موبائل نکالا اور یاسر سے کہا۔ ''اپنا سیل نمبر بتاؤ۔''

یاسر نے نمبر بتایا تو اس نے ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل جانے لگی۔ لڑکی نے چند لمحے بعد کال ریسیو کی۔ ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں بات کر رہا ہوں۔''

''کہو۔'' لڑکی نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیوں کال کی ہے؟''

''تم میری ویگن لے گئی ہو۔ وہ تمہارے لیے غیر ضروری ہے لیکن میرے لیے بہت ضروری ہے۔'' ڈاکٹر اسی لہجے میں بولا۔ ''کیوں نہ ہم ایک ڈیل کرلیں؟''

''کیسی ڈیل؟''

''تم مجھے ویگن واپس کر دو اور بدلے میں جو تم چاہتی ہو، وہ تمہیں مل جائے گا۔''

"تم جانتے ہو، میں کیا چاہتی ہوں؟"

ڈاکٹر خاموش رہا پھر اس نے جواب دیا۔ "نہیں لیکن میں تمہاری مدد ضرور کرسکتا ہوں۔"

"میں بتاؤں گی۔" لڑکی نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مجھے رات آٹھ بجے کال کرنا۔"

☆☆☆

صوفیہ نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی اور موبائل آف کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ جدید اسمارٹ فون کی لوکیشن کا پتا چلایا جاسکتا ہے۔ وہ اس وقت دارالحکومت میں ایک نمائش گاہ کی پارکنگ میں موجود تھی۔ فی الحال وہاں کسی قسم کی نمائش نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے نمائش گاہ بند تھی اور پارکنگ خالی تھی۔ اگر وہاں کوئی نگرانی کرنے والا ہوتا تھا تو وہ بھی چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ ایک جان لیوا موقع سے بچ نکلنے کے بعد وہ یہاں آئی اور یہاں کی تنہائی کو انجوائے کر رہی تھی۔ سرحد پار کرنا اس کے لیے آسان ثابت ہوا۔ اس کے پاس حیات خان کے نام کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات تھے مگر اسے ان کو دکھانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ وہ سرحد پار کرنے کے لیے چور دروازوں سے واقف تھی۔

یہاں آنے کے بعد دو دن تک وہ بھٹکتی رہی۔ اس دوران میں اس نے کئی افراد سے رابطہ کیا مگر صحیح شخص تک رسائی حاصل نہ ہوسکی۔ تیسرے دن وہ صوبائی دارالحکومت پہنچی اور اسے درست آدمی مل گیا۔ اسی نے رہنمائی کی۔ یہ شخص اسی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا جس سے لین دین کے تنازعے پر ابصار اور ماجد کا جھگڑا ہوا تھا اور اس نے بڑی خوشی سے صوفیہ کی رہنمائی کی کیونکہ اس لڑائی کے بعد اس کے گروہ کے اکثر بڑے ایک ایک کر کے مارے گئے اور یہ گروہ تتر بتر ہوگیا تھا۔ وہ صوفیہ کو حیات خان ہی سمجھ رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے باوجود صوفیہ کو پوری طرح یقین نہیں تھا کہ یہی گروہ اس کی بہن کے اغوا میں ملوث ہے مگر مذکورہ شخص نے اسے یقین دلایا تھا کہ مڈل ایسٹ کا سارا بزنس اسی کے پاس تھا۔ اس نے ماہ نور کی تصویر دیکھ کر یقین سے کہا۔

"یہ لڑکی اس قابل ہے کہ کسی شیخ کے حرم میں جائے۔ اس کے بدلے پانچ لاکھ ڈالرز ملنا معمولی بات ہوگی۔"

ماجد کیونکہ وفاقی دارالحکومت میں تھا اس لیے وہ یہاں آئی اور یہاں اس نے کچھ افراد کو ہائر کیا۔ اس کے پاس پیسا زیادہ نہیں تھا مگر اس نے رقم کا بندوبست کرلیا۔ اس کے پاس کچھ اسلحہ تھا جو اس نے اچھے داموں فروخت کر دیا اور اسے رقم مل گئی۔ اسلحہ وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کے ملک میں یہ بے وقعت تھا مگر یہاں اس کی بہت اچھی قیمت مل گئی۔ ہائر کیے دو افراد نے بہترین کام کیا اور انہوں نے ماجد کے لیے کام کرنے والے اہم ترین افراد کا پتا چلا لیا۔ یہ چار افراد تھے جو اصل میں ماجد کا دست و بازو تھے۔ وہ اپنے گھر کے قلعے میں بیٹھ کر انہیں استعمال کرتا تھا۔ صوفیہ نے ایک ایک کر کے ان چاروں کو پکڑا اگر وہ ان سے کوئی خاص بات معلوم نہ کرسکی۔ صرف ایک آدمی نے کہا کہ شاید یہ لڑکی آئی تھی مگر وہ آگے کیمپ میں نہیں گئی۔ صوفیہ نے ان چاروں کو قتل کر دیا۔ وہ اس سے بھی زیادہ سخت سزا کے مستحق تھے۔ انہوں نے سیکڑوں لڑکیوں کو فروخت کیا تھا۔ صوفیہ کو انہیں مارتے ہوئے ذرا رحم نہیں آیا۔

مگر اس دوران میں اس کے آدمیوں سے کوئی غلطی ہوئی اور ماجد کے آدمی اس تک پہنچ گئے۔ اس کی قسمت نے ساتھ دیا اور وہ بچ نکلنے میں کامیاب رہی۔ اگر اسے یہ لڑکا نہ ملتا تو۔۔۔ شاید وہ ماجد کے بھیجے آدمیوں کے ہتھے چڑھ جاتی۔ وہ بچ بچ اس لڑکے کی شکر گزار تھی اور اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے پھر ٹکر جائے گا۔ جب وہ ماجد کے آدمیوں سے نمٹ رہی تھی تو شاید اپنا کوئی نشان چھوڑ آئی تھی اور اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ اس تک آئے اور اسے اس گیسٹ ہاؤس میں پالیا جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی مگر خوش قسمتی سے وہ ان کی آمد سے باخبر ہوگئی اور گیسٹ ہاؤس کی عقبی دیوار سے کود کر فرار ہوگئی۔ وہ گلی سے نکلی تو سامنے ہی یونیورسٹی کا مین گیٹ تھا اور وہ لڑکا وہیں سے نکلا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے لفٹ مانگ لی اور لڑکے نے بھی انکار نہیں کیا تھا۔

اب شہر میں رہنا اسے خطرناک لگ رہا تھا۔ اس نے ہائی وے کے ساتھ آبادی میں رہنے والے شخص کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ صوفیہ کا ہم وطن تھا مگر اس نے یہاں کی شہریت حاصل کرلی تھی اور اب یہیں رچ بس گیا تھا۔ اس کے لہجے سے بھی کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ اس کا تعلق پڑوسی ملک سے ہے مگر جب وہ اس کے بنگلے پر پہنچی تو وہاں اس کی لاش پڑی تھی۔ اسے کسی نے بڑی اذیت دے کر قتل کیا تھا، اس کا پورا جسم تیز دھار آلے سے گدا ہوا تھا اور اس نے یقیناً بہت مشکل سے جان دی تھی۔ صوفیہ کو اس کی موت کا صدمہ ہوا تھا۔ اس کے پاس یہاں گاڑی نہیں تھی۔ رات اس نے اسی بنگلے میں گزاری اور صبح سے پہلے وہ روانہ ہوئی۔ ایک بس نے اسے اس جگہ اتارا جہاں اس کا دوسرا آدمی جنگل

میں رہتا تھا مگر جب وہ وہاں پہنچی تو دوسرا آدمی بھی مر چکا تھا۔

اس کی چھٹی حس نے اشارہ دے دیا تھا اس لیے اسے اس حوالے سے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ہاں وہ اس لڑکے کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی جو اسے یونیورسٹی کے باہر ملا تھا اور اس نے صوفیہ کو لفٹ دی تھی۔ حیرت کی وجہ سے اس نے وہ وقت گنوا دیا جب وہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔ لڑکا اسے اشارہ کر رہا تھا اور وہ نہیں سمجھ سکی۔ اس نے دوسرے آدمی کو دیکھا تو اسے خطرے کا احساس ہوا۔ مگر اس سے پہلے وہ پلٹتی دوسرے آدمی نے اسے دیکھ لیا۔ وہ پشت پر ہاتھ کر کے آگے آیا۔ صوفیہ جانتی تھی کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوگا۔ اس نے وقت گزاری کے لیے صوفیہ کی یہاں آمد کو اس کی غلطی قرار دیا اور اسے جانے کا مشورہ دیا۔ مگر جیسے ہی صوفیہ حرکت میں آئی، اس نے پستول والا ہاتھ آگے کر دیا۔ صوفیہ جانتی تھی، اسے دوسرا قدم اٹھانا نصیب نہیں ہو گا اس لیے وہ پھر ساکت ہوگئی۔

صوفیہ نے قبائلی کی لاش نہیں دیکھی تھی مگر وہ جان گئی تھی کہ کلہاڑی کس جگہ دھنسی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے یہاں ہوتے ہوئے اس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بوڑھا بہت خطرناک تھا اور وہ اسے ہرگز نہ بخشتا مگر یہ لڑکے کی مہربانی تھی جو وہ وہاں سے بچ نکلی اور فرار کے لیے ویگن بھی اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ البتہ اس کا پستول اور جمع پونجی بیگ کی صورت میں وہیں رہ گئی تھی اور اب اس کے پاس بہت معمولی سی رقم تھی۔ ہائی وے پر ایک جگہ ویگن روک کر اس نے اس کا عقبی حصہ کھولا... ویگن کی چابیوں میں ان کی چابیاں نہیں تھیں۔ پھر دونوں تالے اس کی توقع سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ثابت ہوئے تھے اور انہیں کھولنے میں اس کا نصف گھنٹا لگا تھا مگر اس کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔ وہ عقب میں موجود سامان دیکھ کر حیران رہ گئی، یہ کسی اعلیٰ درجے کے پیشہ ور قاتل کا سامان تھا۔

اس میں ہر طرح کا اسلحہ اور دوسرا سامان تھا جس کی کسی مہم میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس میں میک اپ اور گیٹ اپ کا سامان مع کپڑوں کے تھا مگر سب سے زیادہ خوشی اسے رقم کی ہوئی تھی۔ یہ شاید ایک لاکھ روپے تھے مگر اس کی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھے۔ اس نے اسلحہ اور دوسرا سامان نہیں چھیڑا تھا۔ دونوں لاک لگا دیے۔ کیونکہ وہ ان کا میکنزم سمجھ گئی تھی اس لیے اب ضرورت پڑنے پر وہ انہیں جلد کھول سکتی تھی۔ اس نرم صورت نظر آنے والے بوڑھے کے بارے میں اس کا تاثر درست تھا۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ صرف خطرناک ہی نہیں وہ یقیناً پیشہ ور قاتل تھا۔ یہ سامان دیکھ کر صوفیہ اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ اس کی جان بچ گئی مگر وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اس وقت وہ اس سے بے خبر تھی مگر اب وہ اسے جان گئی تھی اور اس سے نمٹ سکتی تھی۔

عقبی خانہ بند کر کے اس نے اگلے حصے کی تلاشی لی۔ وہاں اسے موبائل ملا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں اسی لڑکے کی اور ایک عورت کی تصاویر تھیں۔ دونوں کی صورتیں آپس میں مل رہی تھیں اور صوفیہ کو خیال آیا کہ یہ عورت اس کی ماں ہے۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری تصویریں دیکھیں۔ صرف ایک تصویر میں اسے ایک سرخ بالوں والے آدمی کے سر کی پشت دکھائی دی وہ اسی میز پر تھا جس پر عورت بیٹھی تھی۔ موبائل میں چند ایک ہی نمبر تھے۔ سوائے ایک نمبر کے باقی تمام نمبر یونی کے سائن کے ساتھ شروع ہو رہے تھے یعنی متعلقہ فرد یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ صوفیہ نے موبائل پاس رکھا، اسے معلوم تھا کہ عینک والا قاتل کال کرے گا۔ ویگن میں اس کی جو چیزیں تھیں، ان کے لیے وہ لازمی اس سے رابطہ کرتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے کال کی تو وہ اس سے کیا بات کر سکتی تھی؟ کیا وہ اسے ماہ نور کے بارے میں معلومات دے سکتا تھا۔ اگر وہ ماجد کا آدمی تھا تو اسے ماہ نور کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تھا مگر صوفیہ کو شبہ تھا کہ وہ ہائر کیا ہوا ہے۔ اس صورت میں ماہ نور کے بارے اسے مشکل سے ہی کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

عینک والے کے بارے میں اسے یقین تھا مگر لڑکے کے حوالے سے وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تو وہ اسے سلجھا ہوا اور مثبت سوچ کا حامل لگا تھا مگر وہ اس قاتل کے ساتھ تھا۔ اگرچہ اس نے صوفیہ کو بچانے کی کوشش کی تھی اور پھر اسی کی وجہ سے وہ بچ کر بھاگی تھی اس کے باوجود یہاں اس لڑکے کی موجودگی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہائی وے پر اس نے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ ویگن کے طاقتور انجن نے اس کا پورا ساتھ دیا تھا۔ مگر دارالحکومت میں داخل ہوتے ہی اسے محتاط ڈرائیونگ کرنی پڑی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس خطرناک ویگن کے ساتھ اسے کوئی روکے اور وہ اسی لیے یہاں ویران پارکنگ میں چلی آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سکون سے آگے کا لائحہ عمل سوچنا چاہتی تھی اور یہ جگہ اس کے لیے بہت موزوں تھی۔

کچھ دیر بعد بھوک لگنے لگی۔ ویگن میں موجود شاپر میں کھانے کی اشیا باسی ہو چکی تھیں اور ان سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے شاپر ایک ڈسٹ بن میں ڈالے اور ناشتے کے لیے ایک ریسٹوران کا رخ کیا۔ اس نے ویگن جان بوجھ کر عقبی گلی میں کھڑی کی اور پیدل ریسٹوران میں آئی۔ ناشتے کے وقت کا اختتام تھا اس لیے اسے چند سینڈوچز اور چائے ہی ملی۔ سینڈوچز خاص نہیں تھے مگر چائے بہت اچھی تھی۔ اس کا گزارہ ہو گیا تھا۔ ناشتے کے دوران میں وہ ایک کونے میں موجود ٹی وی پر خبریں دیکھتی رہی پھر اس کی مطلوبہ خبر آگئی۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی۔ ''پولیس کی تحقیق کے مطابق وفاقی دارالحکومت میں دو دن میں ملنے والی چار لاشوں کا تعلق ممکنہ طور پر انسانی اسمگلنگ اور بردہ فروشی سے تھا۔ ان کے قتل میں کاروباری حریفوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

صوفیہ کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ پولیس والوں سے زیادہ انہیں کون جان سکتا تھا۔ ان کا دھندا پولیس اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد کے بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر باہر رہی اور پھر باہر آکر نزدیکی کمرشل ایریا آئی جہاں اب دکانیں کھل رہی تھیں۔ اس نے ایک اسپورٹس شاپ کا رخ کیا۔ وہاں اس نے ایک چھوٹے سائز کا بیس بال بیٹ لیا۔ یہ بھاری اور ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک طاقتور دوربین اور ایک شکاری چاقو لیا۔ اس کا واحد اسلحہ یعنی سائلنسر لگا ہوا پستول اس کے بیگ میں تھا اور وہ قاتل کے پاس رہ گیا تھا۔ اگرچہ ویگن میں اسلحے کی کمی نہیں تھی۔ مگر وہ اس معاملے میں محتاط رہنا چاہتی تھی۔ کسی دوسرے کا کیا دھرا اس کے گلے پڑ سکتا تھا۔ اسلحے کے معاملے میں وہ اتنی محتاج بھی نہیں تھی، اس کے لیے چاقو بھی کافی تھا۔ یہ ویگن اس کی مجبوری تھی مگر اس کے لیے بہت زیادہ رسکی بھی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اس سے چھٹکارا پالے۔

دن میں گزارے کے لیے اس نے ایک بیکری سے کچھ ہلکے پھلکے آئٹم اور کولڈ ڈرنک کے ٹن لیے تھے۔ شام ہوتے ہی اس نے دوبارہ نمائش گاہ کی پارکنگ کا رخ کیا۔ یہاں سے کچھ دور بلندی پر ایک تفریح گاہ تھی جہاں ہوٹل، ریسٹورانز اور دوسری شاپس تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور ایک پلان واضح کرلیا۔ اب اسے اس کے مطابق عمل کرنا تھا۔ وقت گزاری کے دوران اس نے کچھ شاپنگ اور بھی کی تھی۔ اس میں ایک عدد بلوٹوتھ ہینڈ فری بھی تھا۔ ہینڈ فری اس موبائل کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس نے تجربہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ اب اسے عینک والے قاتل کی کال کا انتظار تھا۔ آٹھ بجتے ہی اس کی کال آئی۔ صوفیہ نے ریسیو کی۔ عینک والے نے بلاتمہید پوچھا۔ ''کیا سوچا؟''

''میں راضی ہوں۔'' وہ بولی۔

''ملاقات کہاں ہوگی؟''

صوفیہ نے نمائش گاہ کا بتایا اور بولی۔ ''تم نے یہ جگہ دیکھی ہے؟''

''ہاں دیکھی ہے۔'' ڈاکٹر نے اقرار کیا۔ ''میری ویگن کہاں ہے؟''

''میں اور ویگن دونوں یہاں ہیں آجاؤ۔''

صوفیہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ البتہ موبائل آن رہنے دیا تھا۔ وہ ویگن سے اتری، اس نے چابیاں اسی میں چھوڑ دی تھیں۔ اس نے ان تمام جگہوں سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے جہاں جہاں اس کے ہاتھ لگے تھے۔ پھر وہ نمائش گاہ کے بعد چھوٹے سے جنگل سے ہوتی ہوئی اوپر تفریح گاہ کی طرف جانے لگی۔ اگرچہ یہاں راستہ نہیں تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچ گئی اور پتھر کی چوڑی دیوار پر بیٹھ کر اس نے دوربین آنکھوں سے لگا کر ایڈجسٹ کی کوئی نصف کلومیٹر نیچے نمائش گاہ کا منظر صاف نظر آنے لگا تھا۔ اب اسے انتظار تھا جو زیادہ دیر نہیں کرنا پڑا۔ رات کے نو سے اوپر کا وقت تھا جب سڑک سے ایک بڑی کار نمائش گاہ کی طرف مڑی۔ اس نے دوربین لگا کر دیکھی۔ کار کی اگلی نشستوں پر لڑکا اور عینک والا قاتل موجود تھے۔

☆☆☆

شیورلیٹ، ویگن کے پاس آکر رکی اور ڈاکٹر نے اتر کر چاروں طرف دیکھا اور پھر پستول نکالتا ہوا ویگن کی طرف بڑھا۔ اس نے بہت محتاط انداز میں اچانک دروازہ کھولا اور پھر کسی کو نہ پا کر وہ پُرسکون ہو گیا۔ وہ آخری وقت تک احتیاط کرنے والا شخص تھا۔ اس نے کار سے اترتے ہوئے یاسر کی طرف دیکھا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''میرا موبائل کہاں ہے؟'' یاسر نے پوچھا تو ڈاکٹر نے گلوزٹ میں دیکھا مگر وہاں موبائل نہیں تھا۔

''اسی کے پاس ہے۔'' ڈاکٹر نے کہتے ہوئے اسے کال کی۔

آنکھوں سے دوربین لگائے صوفیہ نے بلوٹوتھ ہینڈ فری کا بٹن دبا کر کال ریسیو کی۔ ''یس۔''

''تم کہاں ہو؟''

"میں وہاں نہیں ہوں۔" صوفیہ نے کہا۔ "تمہیں ویگن مل گئی ہے؟"
"ہاں۔"
"تو اپنے وعدے کے مطابق میری مدد کرو۔"
"کیسی مدد؟"
"مجھے اپنی بہن کی تلاش ہے۔"
"میں تمہاری بہن کو نہیں جانتا۔"
"ویگن کے کلوزٹ میں اس کی تصویر موجود ہے۔"
ڈاکٹر نے ایک بار پھر کلوزٹ دیکھا تو وہاں تصویر تھی اس نے نکال کر دیکھی اور بولا۔ "میں نے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا۔"
"مجھے بھی یہی امید تھی۔" صوفیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "امید ہے اب تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے۔"
"ضرور۔" ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ اس نے کال کاٹ دی اور ویگن کے عقبی حصے میں آ کر اس نے ایک بیلچہ اور ایک گیتی نکالی۔ اس نے دونوں چیزیں یاسر کو تھمادیں اور تماشا گاہ کے ساتھ جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں جا کر ایک گڑھا کھودو۔"
"کس لیے؟"
"ایک لاش دفن کرنی ہے، وہ لڑکی یہاں آنے والی ہے۔"
یاسر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا کہ لڑکی یہاں آسکتی تھی۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں اور بیلچہ و گیتی اٹھا کر جنگل کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر نے موبائل نکال کر ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ماجد نے کال ریسیو کی۔ وہ روبینہ کے ساتھ کھانے کی میز پر تھا۔
"کہو۔"
"پہلا کام نہیں ہوا۔" ڈاکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "دونوں آدمیوں نے زبان نہیں کھولی۔"
"دوسرا کام؟" ماجد نے کہا، روبینہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔
"اس کا آغاز کر دیا ہے، بس ایک گھنٹا لگے گا۔"
"او کے۔" ماجد نے کہہ کر موبائل رکھ دیا۔ تو روبینہ بولی۔
"کس کا فون تھا اور یاسر کب آئے گا؟"
"جلد آجائے گا۔" ماجد نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ دودھ پیتا بچہ نہیں ہے جو تم اس کی اتنی فکر کر رہی ہو۔"
☆☆☆

ڈاکٹر نے ماجد کو لڑکی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ماجد ناکامی معاف کر سکتا ہے، غلطی نہیں۔ پھر یہ اس کی ساکھ کا سوال بھی تھا۔ ماجد کو صرف یاسر یہ بات بتا سکتا تھا مگر اب اسے یہ فکر بھی نہیں تھی۔ اس نے موبائل رکھا پھر بیگ سے لوہے والی چھڑی نکالی اور یاسر کی طرف بڑھا۔ وہ تندہی سے گڑھا کھودنے میں مصروف تھا اور اس نے اچھا خاصا گڑھا کھود بھی لیا تھا۔ یہاں مکمل ویرانی تھی اور جنگل کے اوپر موجود تفریح گاہ سے یہاں دیکھنا ممکن نہیں تھا گویا انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کام کے لیے اس سے زیادہ آئیڈیل حالات کم ہی ملتے تھے۔ نزدیک آنے پر ڈاکٹر نے چھڑی ہاتھ کے پیچھے کر لی تھی۔ یاسر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اتنا ٹھیک ہے۔"
ڈاکٹر نے اندر جھانکا اور بولا۔ "ہاں ٹھیک ہے مگر یہ اس کی تہ میں کیا ہے؟"
یاسر نے اندر جھانکا تھا کہ ڈاکٹر کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کے سر پر چھڑی کا مٹھ لگا۔ یاسر منہ کے بل گڑھے میں گرا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ وار کے لیے ہاتھ بلند کیا مگر اس کا ہاتھ نیچے نہیں آیا۔ یہ ختم کرنے والا وار تھا مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے چھڑی ایک طرف ڈال دی اور یاسر کو گڑھے سے کھینچ کر ایک طرف کیا اور گیتی اٹھا کر گڑھا مزید گہرا کرنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چند دن بعد بدبو آئے اور لاش دریافت ہو جائے۔ وہ اسے خاصی گہرائی میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا اور یقینی وار کرنے کے بجائے اس نے مناسب سمجھا کہ یاسر کی موت کو دم گھٹنے سے ہونے دیا جائے۔ گڑھا مناسب حد تک گہرا کر کے اس نے چند لمحے رک کر سانس لیا اور پھر یاسر کے کپڑے اتارنے لگا۔ ذرا دیر میں وہ صرف انڈرویئر میں رہ گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر رک کر اپنی سانس درست کی تھی اور گڑھے میں جھانکا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔
"تم دونوں کے لیے ٹھیک ہے۔"
اس نے چونک کر دیکھا تو اسے بیس بال کا بلا اپنے سر کے پاس دکھائی دیا اور اگلے ہی لمحے وہ بہت قوت سے اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ وہ کراہ کر نیچے گرا اور دوسری ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ اسے لڑکی کی بس ایک جھلک نظر آئی تھی۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کب وہاں آئی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ یہاں سے جا چکی ہے مگر وہ اس کی توقع سے زیادہ چالاک اور دلیر ثابت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کو بے ہوش کر کے صوفیہ نے بلا نیچے پھینکا اور اطمینان سے جھک کر اس کے

لباس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول اور چابیوں کا گچھا نکال لیا اور پھر وہ ویگن کی طرف آئی۔ اس نے بے ہوش یاسر کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یا ڈاکٹر دونوں ہی جلد ہوش میں آنے والے نہیں تھے۔

☆☆☆

یاسر کی آنکھ کھلی تو اسے لگا جیسے اس کے سر میں کنکریٹ مکسر گھوم رہا ہو۔ ایسا شور اور دباؤ تھا جو بیان سے باہر تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ وقت گزرا تو کنکریٹ مکسر رک گیا۔ شور ختم ہو گیا اور درد میں بھی کمی آئی۔ اس کے شانوں میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھ کھولی اور چونک گیا۔ اس کے جسم پر صرف انڈر ویئر تھا اور جسم مٹی میں لت پت تھا۔ اسے ابکائی سی آ رہی تھی مگر یہ بہت شدید نہیں تھی۔ وہ گہری سانسیں لے کر خود پر قابو پانے لگا۔ وہ اس جگہ نہیں تھا جہاں بے ہوش ہوا تھا۔ آخری لمحے تک اسے گمان نہیں تھا کہ ڈاکٹر اس کے ساتھ ایسی کوئی حرکت کرے گا۔ آخر اس نے اسے کیوں بے ہوش کیا تھا؟ پھر اسے ماجد کا خیال آیا اور اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کیا ماجد نے ڈاکٹر کو اسے ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا؟ مگر اس نے اسے ٹھکانے کیوں نہیں لگایا۔ وہ تو اپنے لیے گڑھا بھی کھود چکا تھا۔ اس میں یقیناً اس کی لاش دفنائی جانی تھی۔

وہ اسی جنگل میں تھا اور ایک بڑے تنے والے درخت سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر کر کے درخت کی شاخ سے باندھے گئے تھے اور وہ عجیب پوزیشن میں تھا جس میں نہ وہ بیٹھا ہوا تھا اور نہ ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ گرہیں بہت سخت تھیں۔ اس کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ''ڈاکٹر تم کہاں ہو؟.... یہ کیا حرکت ہے؟ مجھے کھولو۔''

''یہ کام ڈاکٹر نے نہیں کیا ہے۔'' ڈاکٹر کے بجائے صوفیہ کی آواز آئی اور پھر وہ اس کے سامنے آ گئی۔ دور نمائش گاہ کی پارکنگ میں جلنے والے بلب کی روشنی یہاں تک آ رہی تھی۔ یاسر اسے دیکھ کر جلدی سے خود میں سمٹ گیا اس حالت میں ایک لڑکی کے سامنے اسے عجیب سا لگ رہا تھا مگر صوفیہ بالکل نارمل تھی۔ یاسر نے بوکھلا کر پوچھا۔

''پھر کس نے باندھا ہے مجھے؟''

''میں نے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''مگر کیوں؟'' یاسر چلا اٹھا۔ ''ڈاکٹر کہاں ہے.....؟ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

لڑکی آگے آئی اور اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی گرفت خاصی سخت تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''اونچی آواز مت نکالنا ورنہ پھر آواز نکالنے کے قابل نہیں رہو گے۔''

''اوکے میں غلطی سے بول گیا۔'' اس نے جلدی سے آواز نیچی کر لی۔ ''اب بتاؤ، تم نے یہ سب کیوں کیا ہے؟''

صوفیہ نے ماہ نور کی تصویر نکالی اور یوں اس کے سامنے کی کہ اسے صاف دکھائی دے۔ ''اسے دیکھا ہے؟''

جب صوفیہ نے ڈاکٹر کو تصویر کے بارے میں بتایا اور اس نے ویگن سے نکالی تو اس نے یاسر کو نہیں دکھائی تھی۔ یاسر نے پہلی بار دیکھی اور چونک گیا کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی ویڈیو اس نے ماجد کے کمپیوٹر میں دیکھی تھی اور ماجد اس پر تشدد کر رہا تھا۔ مگر وہ یہ بات اس خطرناک لڑکی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے نہیں دیکھا۔''

''تم چونکے تھے؟''

''ہاں کیونکہ اس کی صورت تم سے مل رہی ہے۔'' یاسر نے صفائی سے بات بنائی۔ ''کیا یہ تمہاری بہن ہے؟''

''ہاں۔'' وہ بولی۔

''تم نے مجھ سے لفٹ کیوں لی تھی، کیا تم میرا پیچھا کر رہی تھیں؟''

''وہ اتفاق تھا مگر یہاں تمہاری اور میری موجودگی اتفاق نہیں ہے۔'' صوفیہ نے اس کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ''تم ایک ایسے شخص کے ساتھ ہو جو میرے ساتھیوں کو قتل کر چکا ہے اور میرے ساتھی ان لوگوں کے پیچھے تھے جنہوں نے میری بہن کو اغوا کر کے غائب کیا ہے۔''

''تمہاری بہن کو کیوں اغوا کیا ہے، کیا تم لوگوں سے کوئی دشمنی ہے؟''

''نہیں، یہ لوگ پیشہ ور بردہ فروش اور انسانی اسمگلر ہیں۔ ماجد نامی شخص ان کا سرغنہ ہے۔''

اس بار یاسر نے بڑی مشکل سے خود کو چونکنے سے روکا۔ ماجد کے بارے میں اسے پہلے ہی شک تھا اور اب یقین ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہاری بہن کو کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟''

''ہمارے گاؤں سے۔'' صوفیہ نے کہا مگر یہ وضاحت نہیں کی کہ اس کا گاؤں اس ملک میں نہیں بلکہ پڑوسی ملک میں تھا۔ اس نے یاسر کا موبائل نکالا۔ ''یہ تمہارا موبائل ہے؟''

''ہاں میرا ہے۔''

''اس میں یہ کس عورت کی تصویر ہے؟''
''میری ماما کی۔''
صوفیہ تصویریں آگے کرنے لگی۔ ''مگر پورے موبائل میں نہ تو تمہارے باپ کی تصویر ہے اور نہ ہی کسی اور شخص کی؟''
''میرا باپ مر چکا ہے۔'' یاسر نے سچ کہا۔
''لیکن ایک تصویر میں یہ لمبے بالوں والا شخص ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہے، اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا، یہ کون ہے؟''
یاسر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''یہ ہمارا رشتے دار ہے۔''
وہ ذرا پیچھے ہٹی اور بولی۔ ''تم اچھے لڑکے ہو لیکن اس وقت تم سچ نہیں بول رہے ہو۔''
اس نے یقین دلایا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں، میرا یقین کرو۔''
صوفیہ نے پستول نکال لیا۔ یہ اس کا اپنا پستول تھا جو بیگ میں تھا اور بیگ اسے شیورلیٹ کار میں موجود ایک ہینڈ کیری سے ملا تھا۔ ''تم نے دو بار جھوٹ بولا ہے۔''
یاسر دہشت زدہ ہو گیا۔ ''خدا کے لیے میں نے غلط نہیں کہا ہے۔''
''اس شخص کو مارو گولی مجھے صرف میری بہن کے... بارے میں بتا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں تمہیں چھوڑ دوں گی۔''
یاسر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بلاوجہ ماجد کا جرم چھپاتے ہوئے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا، اسے کیا ضرورت تھی ایسا کرنے کی۔ اسے لڑکی کو بتا دینا چاہیے تھا کہ اس نے اس کی بہن کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا مگر اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں اپنی بہن کے بارے میں سن کر یہ لڑکی مشتعل نہ ہو جائے۔ دوسری طرف وہ نہ بتاتا تب بھی لڑکی اس کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم پوچھ سکتی ہو، میں ہر سوال کا درست جواب دوں گا۔''
''یہ شخص کون ہے؟''
یاسر چونکا۔ ''کون ڈاکٹر.... میں اسے نہیں جانتا.... میں کل سے اس کے ساتھ ہوں مگر میں نے کچھ نہیں کیا۔''
''کل سے اس نے کیا کیا ہے؟''
''کل یہ مجھے کے ایف سی کے باہر ملا۔ میری بائیک وہیں رہ گئی اور اس نے مجھے اپنے ساتھ ویگن میں بٹھا لیا اور پھر ہم ہائی وے سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹی آبادی تک پہنچے وہاں اس نے مجھے ویگن میں چھوڑا اور خود ایک چھوٹے بنگلے میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو....''
''تو کیا... ؟''
''اس کے ہاتھ پر خون لگا ہوا تھا۔ پھر یہ آگے اس جنگل تک گیا۔ اس وقت رات ہو گئی تھی، ہم جنگل میں رکے اور یقین کرو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس جگہ کوئی مکان بھی ہوگا۔ ہم تو پکنک منا رہے تھے۔ پاس سے گزرنے والی ندی میں نہائے بھی تھے پھر صبح ڈاکٹر....''
''اس کا نام کیا ہے؟''
''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، بس اس نے اتنا بتایا کہ وہ اپنے کام میں بہت ماہر ہے اس لیے ڈاکٹر کہلاتا ہے۔''
''او کے، آگے بڑھو۔''
''اس نے مجھ سے کہا کہ میں ویگن پر نظر رکھوں اور خود بلٹ پروف جیکٹ پہن کر مکان کی طرف چلا گیا۔ فائر ہوا تو میں اس کی طرف بھاگا مگر وہ بچ گیا تھا اور اس نے قبائلی کو بے ہوش کر دیا اور اسے ہتھکڑی سے درخت سے جکڑ دیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں کلہاڑی سے اس کا ہاتھ کاٹ دوں۔ میں نے انکار کیا تو اس نے یہ کام خود کیا اور پھر اس نے قبائلی کو بھی مار دیا۔ اسی وقت تم وہاں آگئیں لیکن تم وہاں کیا کرنے آئی تھیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے تم اس قبائلی کے پاس آئی تھیں۔''
''وہ میرے لیے ہی کام کرتا تھا۔'' صوفیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب مجھے اس کا حساب بھی لینا ہے۔ تم نے اصل بات نہیں بتائی کہ تم اس کے ساتھ کیوں ہو؟''
یاسر ہچکچایا۔ ''مجھے میرے سوتیلے باپ نے بھیجا تھا۔''
''سوتیلا باپ' اس کا کیا تعلق ہے اس معاملے سے؟''
اس بار یاسر نے زیادہ مشکل سے جواب دیا۔ ''ماجد میرا سوتیلا باپ ہے۔''
صوفیہ نے یک دم پیچھے ہو کر اس پر پستول تان لیا اور یاسر کا دل ایک لمحے کو رکا اسے لگا، وہ ابھی اسے شوٹ کر دے گی۔ اس کے تاثرات بھی خطرناک ہو رہے تھے۔ یاسر نے سر نیچے کر لیا مگر اس نے گولی نہیں چلائی اور پھر ہاتھ نیچے کر لیا۔ ''تو تم اس لیے جھوٹ بول رہے تھے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے تمہارے باپ کے آدمیوں سے بچنے کے لیے میں نے تم سے لفٹ لی تھی۔''

## سرداری

ایک سردار جی ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ وہ گارڈ کے پاس آئے (وہ بھی سکھ تھا) اور کہا۔ ''سردار جی میں سونے لگا ہوں جب امرتسر آئے تو مجھے جگا کر اتار دینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ جب میں نیند سے جاگوں تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ ہوسکتا ہے میں آپ کو گالیاں دوں کہ مجھے نہیں اترنا آپ زبردستی مجھ کو اتار دیں۔''

سردار نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں اتار دوں گا۔''

گارڈ کی بات سن کر سردار جی جا کر سو گئے۔ جب آنکھ کھلی تو وہ لاہور پہنچے ہوئے تھے۔ سردار جی نے غصے میں گارڈ کو گالیاں دینی شروع کر دیں کہ مجھے امرتسر اسٹیشن پر کیوں نہیں اتارا۔

لوگوں نے گارڈ سے کہا۔ ''سردار جی وہ آپ کو گالیاں دے رہا ہے۔

سردار جی ایک ادائے بے نیازی سے بولے۔ ''اس نے کیا گالیاں دینی ہیں۔ اصل گالیاں تو اس نے دینی ہیں جس کو میں نے امرتسر زبردستی اتارا تھا۔''

''اسے میرا باپ مت کہو، مجھے اس سے نفرت ہے۔'' یاسر نے اگلا سچ بولنے کے لیے اسے پہلے سے ہموار کرنا شروع کر دیا۔ ''میں اور میری ماں اس کے قیدی ہیں۔''

''مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔'' صوفیہ نے کہتے ہوئے دوبارہ پستول تان لیا۔ ''اگر تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ خدا کے لیے پستول نیچے کرلو کیونکہ اب میں تمہیں جو سچ بتانے جا رہا ہوں ایسا نہ ہو کہ تم بے اختیار مجھے گولی مار دو۔''

''نہیں ماروں گی، مجھے خود پر اختیار ہے۔''

''پلیز! بااختیار انسان بھی کبھی بے قابو ہو جاتا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

صوفیہ نے پستول نیچے کرلیا اور بولی۔ ''اب بتاؤ۔''

تب یاسر نے اسے ویڈیو کے بارے میں بتایا جو اس نے ماجد کے کمپیوٹر میں دیکھی تھی۔ اپنی بہن پر ہونے والے ظلم کا سن کر صوفیہ کی حالت عجیب ہوگئی۔ اس کا چہرہ انتہائی حد تک سرخ ہوگیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ابھی پھٹ پڑے گی۔ یاسر اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ ''پھر ویڈیو ختم ہوگئی اور ماجد اندر آ رہا تھا اس لیے میں کوئی اور ویڈیو نہیں دیکھ سکا۔ جلدی سے اس کے کمرے سے نکل آیا۔''

صوفیہ کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ گہرے سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ اپنے گردوپیش سے کچھ وقت کے لیے بے خبر ہوگئی تھی۔ رات ہونے پر جنگل سے بھاپ نما دھند اٹھنے لگی تھی، ماحول کسی قدر دھندلا ہو رہا تھا۔ اسی دھند سے یاسر نے ڈاکٹر کو آتے دیکھا اور وہ بے اختیار چلایا۔ ''بچو۔''

صوفیہ تیزی سی گھومی تھی مگر ڈاکٹر بیس بال کا بلا گھما چکا تھا۔ صوفیہ نے پھرتی دکھائی اس کے باوجود بلا اس کے بازو پر لگا اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر یاسر کے نزدیک آ گرا۔ صوفیہ پستول کی طرف آنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے اسے عقب سے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ نیچے گری اور فوراً ہی قلابازی کھا کر پیچھے چلی گئی ورنہ اس بار بلے کی ضرب اس کے سر پر لگتی۔ بازو کی چوٹ بھی شدید تھی مگر وہ حوصلہ کر کے برداشت کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بلا تولتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے تر نوالہ سمجھا تھا۔''

''مجھ سے غلطی ہوئی۔'' صوفیہ اس سے فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اسی وقت تمہارے سر میں گولی اتار دینی چاہیے تھی۔''

''ہم سب غلطی کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''اگر غلطی نہ کریں تو خدائی کا دعویٰ نہ کرنے لگ جائیں۔''

''وہ تو لوگ پھر بھی کرتے ہیں۔'' صوفیہ بولی اور اس نے لپک کر ڈاکٹر پر سوئپ کک آزمائی۔ وہ نیچے گرا تھا اور اس سے پہلے وہ اٹھتا، صوفیہ اس سے گتھم گتھا ہوگئی۔ اس کی کوشش تھی کہ اس سے بلا چھین لے اور ڈاکٹر اسے دور پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یاسر ان کی لڑائی دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر پستول پر گئی۔ اس نے آگے آنے کی کوشش کی مگر دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، وہ پاؤں سے بھی پستول اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا تھا۔ اس نے کوشش کر کے دیکھا تو اسے بائیں ہاتھ کی رسی کسی قدر ڈھیلی لگی اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے بہت زور لگانا پڑ رہا تھا اور وہ مسلسل ہاتھ گھما رہا تھا کہ رسی ڈھیلی ہو جائے۔ اس دوران میں صوفیہ اور ڈاکٹر وحشیوں کی طرح لڑ رہے تھے کیونکہ یہ زندگی و موت کی لڑائی تھی۔ جو ہارتا، وہ زندگی ہار جاتا۔ وہ دونوں یہ بھی بھول گئے تھے کہ وہ کس صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خالص دو انسانوں کی لڑائی تھی۔

یاسر دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔ رسی نے اس کی کھال رگڑ ڈالی تھی اور خون رسنے لگا تھا مگر اس کی کوشش میں ہر گزرتے لمحے تیزی آرہی تھی۔ بالآخر وہ ہاتھ رسی سے نکالنے میں کامیاب رہا۔ اب اگلا مرحلہ پستول تک رسائی کا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دوسرا ہاتھ آزاد کراتا۔ صوفیہ اور ڈاکٹر میں سے جو غالب آتا وہ سب سے پہلے پستول پر قبضہ کرتا اور وہ دونوں ہی اس کے لیے خطرناک ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے تو ثابت بھی کر دیا تھا، اسے لڑکی پر بھی بھروسا نہیں تھا۔ اس نے پاؤں آگے کیا۔ یاسر کا قد طویل تھا مگر اس کی یہ لمبائی بھی کام نہیں آرہی تھی۔ اس کا پاؤں پستول سے دو انچ دور رہ گیا۔ اگلی بار اس نے پورا جسم کھینچا اور پاؤں کو عین پستول کے اوپر لے گیا۔ کوشش کر کے اس نے انگوٹھا پستول کے دستے پر لگایا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پستول اس کی طرف سرکا اور اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ مزید دو بار پاؤں کا استعمال کرنے پر پستول اس کے ہاتھ کی حد میں آگیا۔ اس نے پستول اٹھایا اور چلا کر بولا۔ ''رک جاؤ۔''

ڈاکٹر چونک کر سیدھا ہوا۔ صوفیہ اس کے عقب میں تھی۔ اس نے اچانک ہی ڈاکٹر کو عقب سے ہاتھ مارا اور بھاگی۔ یاسر نے پستول اس کی طرف کیا مگر فائر نہیں کیا۔ یاسر نے پستول دانتوں سے پکڑ کر اپنا دوسرا ہاتھ آزاد کرایا۔ اس.... دوران میں ڈاکٹر ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ یاسر نے ہاتھ آزاد کرا کے پستول سنبھالا۔ اسی لمحے پارکنگ کی طرف سے شیورلیٹ کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ڈاکٹر نے یاسر کی طرف دیکھا۔ ''وہ جا رہی ہے لیکن میں اسے نہیں روک سکتا۔''

یاسر کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ ''کیوں؟''

ڈاکٹر کا کوٹ.... اپنے بائیں پہلو پر تھا۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا تو وہ خون سے تربتر تھا۔ یاسر اس کے پاس آیا۔ ''یہ کیا ہوا؟''

''میں تمہاری طرف متوجہ ہوا اور اس نے کوئی چیز ماری۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''میرا خیال ہے اس طرف کی شریان متاثر ہوئی ہے۔''

''میرے خدا۔'' یاسر اس کے پاس آیا۔ ڈاکٹر گر رہا تھا مگر اس نے اسے پکڑ لیا۔ ''میں تمہیں اسپتال لے چلوں؟''

''نہیں۔'' وہ گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہاں سے نکلو۔ وہ پھر واپس آسکتی ہے۔''

یاسر اسے سہارا دے کر ویگن تک لایا۔ اس کے دروازے کھلے تھے اور چابیاں غائب تھیں۔ یاسر نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور خود کپڑوں کے لیے گڑھے تک آیا۔ اس کے کپڑے وہیں پڑے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ واپس آیا تو ڈاکٹر کہیں سے ویگن کی دوسری چابی برآمد کر چکا تھا۔ اس نے چابی یاسر کی طرف بڑھائی اور بولا۔ ''ڈرائیو کرو۔''

یاسر نے اس کا زخم دیکھا جس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں آپ کو اسپتال لے جاتا ہوں۔''

''نہیں، میں اسپتال نہیں جا سکتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میں زندگی کی آخری سانسیں جیل کی چار دیواری میں لوں۔ دوسرے تم بھی پھنسو گے اگرچہ تم نے کچھ نہیں کیا مگر دو قتل تمہارے سر بھی جائیں گے۔''

یاسر نے ویگن اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے نکالی۔

''تب میں کیا کروں؟''

''کچھ نہیں، مجھے جھیل والے پارک تک چھوڑ دو۔''

یاسر نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''وہاں کیوں؟''

ڈاکٹر نے ہاتھ سے اپنا زخم دبایا ہوا تھا تاکہ خون بہنے کی رفتار سست رہے۔ اس نے سگار مانگا۔ ''میں خود سے نہیں سلگا سکتا۔''

یاسر نے ڈبے سے سگار نکال کر اس کے منہ میں لگایا اور لائٹر سے اسے آگ دکھائی۔ ڈاکٹر نے گہرا کش لیا۔ ''اب اچھا لگ رہا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اگر میرا آخری وقت آیا اور مجھے موقع ملا تو میں مرنے سے پہلے اس پارک تک آؤں گا اور یہاں بینچ پر بیٹھ کر جان دے دوں گا۔''

یاسر کو لگا جیسے اس کے اندر کچھ سرسرا رہا ہو۔ کس قدر عجیب شخص تھا۔ مرنا بھی اپنی مرضی سے چاہتا تھا۔ پارک والی جھیل یہاں سے خاصے فاصلے پر تھی مگر اس نے کہا۔ ''میں آپ کو لے جاؤں گا۔''

رات کے ایک بجے سڑکیں سنسان اور ٹریفک سے خالی تھیں۔ وہ بنا کہیں رکے جھیل والے پارک تک پہنچ گئے۔ یاسر نے ممکنہ حد تک ویگن کو اس جگہ کے قریب روکا جہاں جھیل کے سامنے بنچیں لگی تھیں۔ اس موسم میں دن کے وقت اس پارک میں خاصا رش ہوتا تھا۔ مگر رات کے اس پہر یہاں کوئی نہیں تھا۔ یاسر نے اسے سہارا دے کر ویگن سے اتارا اور لے جا کر ایک بینچ پر بٹھا دیا۔ ڈاکٹر نے اسے

بھی ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ ''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کہیے۔''

''تم اس ویگن کو پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دینا۔ اس میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو میں نہیں چاہتا کہ کسی کے ہاتھ لگیں۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔''

ڈاکٹر نے اپنا موبائل نکال کر دیا۔ ''اسے جھیل میں پھینک دینا۔ تم بھی مت دیکھنا اسے یہ تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

یاسر اب تک اس سے پوچھنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا کہ اس نے یاسر کو قتل کرنے کی کوشش کیوں کی۔ اس وقت بھی وہ نہیں پوچھ سکا تھا مگر ڈاکٹر نے خود جواب دیا۔ ''ماجد نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں اس طرح سے ہونے والے قتل میں ملوث کر دوں کہ پھر تم تمام عمر اس کے چنگل میں رہو اور وہ تم سے اپنی مرضی سے کام لیتا رہے۔ اگر میں اس میں ناکام رہوں تو تمہیں قتل کر دوں۔''

''آپ نے کوشش کی تھی۔''

ڈاکٹر نے سر ہلایا اور سگار منہ سے لگانے کی کوشش کی مگر اس کا بایاں ہاتھ اوپر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ زخم پر جما ہوا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ اب تک زندہ تھا۔ ورنہ خون زیادہ بہہ چکا ہوتا اور وہ مر جاتا۔ یاسر نے پھر سگار اس کے منہ سے لگا کر اسے لائٹر دکھایا۔ ڈاکٹر نے کش لے کر سر ہلایا۔ ''ہاں مگر میں ناکام رہا۔ شاید اس لیے بھی کہ میری خواہش تھی، میں تمہیں قتل نہ کروں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا جب کسی شکار کے لیے میرے دل میں ایسی خواہش بیدار ہوئی ہو۔ قسمت کو تمہاری زندگی منظور تھی۔''

یاسر نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''ماجد کیا کام کرتا ہے، آپ جانتے ہیں؟''

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''بردہ فروشی، وہ یہاں سے لڑکیاں مڈل ایسٹ بھیجتا ہے۔ اس کا باقاعدہ نیٹ ورک ہے جو ملازمت کے نام پر لڑکیوں کو یہاں سے باہر بھیجتے ہیں۔ اس نے جعلی کمپنیاں بنا رکھی ہیں۔ یہ لڑکیاں مڈل ایسٹ میں عیاش لوگوں کو فروخت کی جاتی ہیں اور وہ پھر مرتے دم تک ان لوگوں کی غلامی کرتی ہیں۔''

''مجھے خود سے گھن آ رہی ہے۔ میں اتنے عرصے اس شخص کے گھر میں رہا اور اس کی کمائی پر پلتا رہا۔'' یاسر نے دکھ سے کہا۔ ''کاش کہ ماما مجھے لے کر کہیں بھاگ جاتی۔ ہم غربت میں رہ لیتے مگر اس شخص اور اس کی کمائی سے بچ جاتے۔''

''تم اچھے آدمی ہو اور اب تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''مگر ماجد صرف ہتھیار کی زبان سمجھے گا۔''

یاسر نے دانت پیسے۔ ''میں اس سے اسی زبان میں بات کروں گا۔''

''تم لڑکی والا پستول لے جانا۔ میرا سارا اسلحہ بہت خطرناک ہے۔ اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' یاسر نے کہا۔ پستول اس کے پاس تھا۔ اس کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی طرف سے پھر کوئی ردِعمل نہیں آیا تو اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر کا سر جھکا ہوا تھا اور منہ میں دبا ہوا سگار رفتہ رفتہ بجھ رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے کب خاموشی سے مر گیا، یاسر کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور ڈاکٹر کے منہ سے سگار نکال کر اسے بینچ پر سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اب کوئی قریب آ کر غور سے دیکھتا تب ہی اسے پتا چلتا کہ وہ ایک لاش دیکھ رہا ہے۔ یاسر ویگن تک آیا۔ اس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس پر پیٹرول چھڑکا۔ اس نے اب تک عقبی خانہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے وہ سارا سامان جو بیگ میں تھا اسے بیگ سمیت ڈرائیونگ کمپارٹ میں ڈال دیا اور ذرا پیچھے ہٹ کر اس نے لائٹر جلا کر ویگن کی طرف اچھال دیا۔ پیٹرول کی وجہ سے اس نے بہت تیزی سے آگ پکڑی اور لمحوں میں پوری ویگن شعلوں میں گھر گئی تھی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ تیزی سے ویگن سے دور ہوا اور پھر جھیل کے کنارے آیا۔ اس نے ڈاکٹر کا موبائل نکالا اور اسے پانی میں اچھال دیا۔ پھر اس نے لڑکی کے سائلنسر لگے پستول کی طرف دیکھا اور پارک کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ جہاں وین تھی اب وہاں اس کا جلتا ہوا معمولی سا ڈھانچا ہی بچا تھا۔ باقی سب دھماکے نے تباہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی تھی کہ ویگن میں موجود اس کے سامان میں سے کچھ بھی کسی کے ہاتھ نہ لگے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا جسے دھماکا چونکاتا۔ وہ چلتا ہوا آدھے گھنٹے بعد ہائی وے تک آیا اور وہاں سے ایک لوڈنگ ٹرک نے لفٹ دے کر کے ایف سی سے کچھ ہی دور اتارا تھا۔ جب وہ بائیک اسٹارٹ کر رہا تھا تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔

☆☆☆

روبینہ نے رات بہت بے چین گزاری تھی۔ یاسر

اچانک گیا تو اسے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ماجد نے اسے کہاں بھیجا تھا؟ وہ جب پوچھتی، وہ یہی بتاتا کہ اس نے اسے کام سے بھیجا ہے۔ کھانے سے پہلے ماجد نے اسے مارا اور زبان بند رکھنے کا حکم دیا تھا۔ کھانے کی میز پر کال آئی اور ماجد کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی اہم آدمی سے بات کر رہا ہے۔ کھانے کے بعد روبینہ نے پھر ماجد سے پوچھا اور اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ تب روبینہ نے فیصلہ کن لہجے میں اس سے کہا۔ ''اگر صبح تک یاسر واپس نہ آیا تو میری اور تمہاری راہیں الگ ہوں گی۔''

اس پر ماجد نے اسے دھمکی دی۔ ''ایسا صرف ایک صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک قبر میں ہو۔''

''میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔'' روبینہ بولی۔ ''یاسر کو صبح تک گھر میں ہونا چاہیے۔''

ماجد رات بیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔ صبح سے پہلے روبینہ بستر سے نکل آئی اور اس نے ماجد کے خاص کمرے کا دروازہ بجایا۔ خاصی دیر تک اس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر روبینہ مستقل مزاجی سے بجاتی رہی۔ وہ باقی گھر میں نہیں تھا اور پورچ میں دونوں گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ اس کے بعد یہی کمرہ رہ جاتا تھا جہاں وہ موجود ہوسکتا تھا۔ خاصی دیر بعد ماجد نے کمرا کھولا تو اس کی آنکھیں نشے سے بوجھل ہو رہی تھیں، وہ پیتا رہا تھا اور شاید مدہوش پڑا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''کیا ہے؟''

''یاسر ابھی تک نہیں آیا۔''

''وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔'' ماجد نے مخمور لہجے میں کہا تو روبینہ اس پر جھپٹ پڑی اور اس نے ناخنوں سے ماجد کا منہ نوچ لیا۔

''ذلیل، کتے میں تجھے قتل کردوں گی۔''

ماجد نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا، اس کے گال سے خون نکل آیا تھا۔ اس نے نفرت سے کہا۔ ''کتیا.... تیری یہ جرأت۔''

کہتے ہوئے ماجد کا ہاتھ گھوما اور روبینہ پلٹ کر لاؤنج کے پاس جا گری۔ ماجد غراتا ہوا اس کی طرف آیا تھا کہ لاؤنج کے بیرونی حصے سے یاسر نمودار ہوا اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ ماجد کی طرف تھا۔ یاسر نے اسے خبردار کیا۔ ''بس اب ایک قدم مت بڑھانا۔''

ماجد رک گیا پھر اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے روبینہ کو دیکھا۔ ''تم اپنے بیٹے کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔ تم نے دیکھا یہ دو ہی دن میں کتنا سیکھ کر آیا۔ مجھ پر پستول اٹھا رہا ہے۔ میرا پالا ہوا پِلّا مجھ پر بھونک رہا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' یاسر بے قابو ہو کر اس کی طرف آیا اور پستول کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔ ''مجھے مجبور مت کرو کہ میں ابھی تمہارا بھیجا باہر نکال دوں۔''

ماجد نے کوئی اثر نہیں لیا اور نہ ہی وہ ڈرا تھا۔ وہ پھر ہنسا۔ ''دیکھا کل تک تمیز سے بات کرنے والا اب بات کرنا بھی سیکھ گیا ہے۔''

یاسر کے پُر وحشت تاثرات نے روبینہ کو بھی ڈرا دیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ماجد پر گولی نہ چلا دے۔ اسے ماجد کی پروا نہیں تھی مگر وہ اپنے بیٹے کو قاتل کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چلائی۔ ''یاسر گولی مت چلانا۔''

''ماما اس شخص نے مجھے میرے قاتل کے ساتھ بھیجا تھا تاکہ وہ مجھے ٹھکانے لگا دے۔ قاتل اب زندہ نہیں ہے لیکن میں زندہ ہوں اور اب میں اسے ٹھکانے لگاؤں گا۔''

ماجد بدستور ہنس رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا اور شاید یہ اس کا بھی اثر تھا۔ ''ہاں اب یہ بڑا ہو گیا ہے، اسے میری ضرورت نہیں ہے، یہ خود بھی کاروبار چلا سکتا ہے۔''

''میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہارے کاروبار پر۔'' یاسر نے اس پر تھوک دیا۔ ماجد پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس نے منہ کھول کر کہا۔

''یہاں گولی مارو۔''

''تم کیا سمجھتے ہو میں بلف کر رہا ہوں۔'' یاسر نے کہا اور پستول ہٹا کر ذرا پیچھے ہوا۔ روبینہ پھر چلائی۔

''یاسر ایسا مت کرنا۔''

یاسر کی توجہ ایک لمحے کے لیے روبینہ کی طرف ہوئی تھی کہ نشے میں جھولتا ہوا ماجد حیرت انگیز پھرتی سے جھپٹا اور جب تک یاسر سمجھتا، وہ پستول اس سے چھین کر اس کی نال یاسر کے ماتھے پر مار چکا تھا۔ اس کا ماتھا پھٹ گیا اور وہ کراہ کر نیچے گرا تھا۔ روبینہ نے اس بار دہشت سے چیخ ماری اور وہ یاسر کی طرف جھپٹی۔ مگر ماجد نے راستے میں اسے روک لیا۔ بازو سے پکڑ کر اس نے روبینہ کو اپنی طرف کھینچا اور اس کے سر پر اپنے سر سے ٹکر ماری۔ روبینہ کے لیے ایک ہی ضرب کافی ثابت ہوئی اور وہ پیچھے جا گری۔ ماجد چکراتے ہوئے یاسر کے پاس آیا اور اس کے پیٹ پر ٹھوکر ماری۔ وہ کراہ کر دہرا ہو گیا اور اسے مزید چند ٹھوکریں اپنے گول ہوئے جسم پر سہنا پڑیں۔ ماجد اسے مارتے ہوئے دلا-



www.paksociety.com

"میرا پلا..... مجھ پر ہی بھونک رہا ہے..... تم دونوں ماں بیٹے کو ایک ہی قبر میں دفن کروں گا..... سنا تم نے۔" اس نے یاسر کے بال پکڑ کر کھینچے اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ "اب بتا کون کسے قتل کرے گا..... کتے کے پلے۔ تو مجھے قتل کرنے کی بات کر رہا تھا.....؟" ماجد نے اسے چند گندی گالیاں دیں۔ "اب میں تجھے قتل کروں گا۔"

اس نے جھک کر یاسر کی گردن میں بازو ڈال کر اسے جکڑ لیا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ "کیا خیال ہے تیرا بھیجا نکالوں۔"

یاسر خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نوجوان اور ماجد کے مقابلے میں طاقتور تھا مگر وہ اس سے کہیں زیادہ تجربے کار اور سخت جان تھا۔ ماجد اسے سچ مچ قتل کرنے جا رہا تھا۔ اس نے پستول کا ٹریگر نصف دبا بھی دیا تھا کہ اچانک رک گیا۔ "نہیں یہاں تیرے گندے خون سے میرا قالین خراب ہو جائے گا۔"

وہ اٹھا اور یاسر کو گردن سے دبوچے ہوئے باہر لان کی طرف لے جانے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اچھی بات ہے پستول پر سائلنسر لگا ہوا ہے، تجھے مار کر اسے غائب کر دوں گا اور پھر تیری لاش بھی غائب کر دوں گا۔ تیری ماں سے وعدہ کیا ہے نا کہ دونوں ماں بیٹے کو ایک ہی قبر میں دفن کروں گا۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

وہ برآمدے سے ہوتا ہوا پورچ میں آیا اور لان کی طرف مڑ رہا تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی کہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر آنے کے بعد یاسر نے ریموٹ سے اسے بند نہیں کیا تھا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ماجد نے اسے لان میں دھکا دیا اور پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔ یاسر نے ہاتھ چہرے کے سامنے کر لیا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ وہ آنے والی موت کو نہیں روک سکے گا۔ مگر گولی چلنے کی آواز نہیں آئی۔ شاید ماجد اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یاسر نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تو ماجد اسے ڈگمگاتا ہوا نظر آیا۔ یاسر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ڈگمگا کیوں رہا ہے جیسے اپنا توازن درست کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا دایاں پہلو یاسر کے سامنے تھا اس لیے وہ ماجد کا بایاں پہلو نہیں دیکھ سکا۔ ماجد گیٹ کی طرف گھوم رہا تھا اور تب یاسر کی نظر آگے آتی لڑکی پر گئی۔

وہ ماجد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماجد نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا اور کانپتے ہاتھوں سے گولی چلائی۔ مگر نشانہ خطا گیا اور گولی صوفیہ کے پاس سے گزر گئی۔ صوفیہ کے سکون میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، وہ اسی اعتماد سے آگے بڑھتی رہی۔ ماجد نے پھر فائر کیا اور اس بار بھی گولی کہیں اور گئی۔ سائلنسر کی وجہ سے معمولی سی آواز آ رہی تھی۔ تیسرے فائر کے وقت صوفیہ ماجد سے مشکل سے چار گز کے فاصلے پر تھی اور یقیناً ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا جو ماجد اتنے قریب سے بھی اس کا نشانہ نہیں لے سکا تھا۔ ورنہ یہ صریحاً خودکشی تھی۔ صوفیہ نے اسے چوتھے فائر کا موقع نہیں دیا اور لپک کر اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر اوپر کر دیا۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے ماجد کے بائیں پہلو پر کچھ کیا اور وہ لرزنے لگا تھا۔ صوفیہ نے زور لگا کر اس کے پہلو میں دھنسا چاقو باہر نکالا تو ساتھ ہی ماجد کی کرب ناک چیخ بھی نکلی تھی۔ صوفیہ نے اسے چاقو پھینک کر مارا تھا جب وہ یاسر کو شوٹ کرنے والا تھا۔ صوفیہ نے پوچھا۔

"میری بہن کہاں ہے؟"

ماجد ایک بار پھر ہنسا اور رک رک کر بولا۔ "تم..... یقیناً..... ماہ نور کی..... بہن ہو۔"

"ہاں میں اس کی بہن ہوں۔"

"وہ..... اب اس ملک میں..... نہیں ہے۔" ماجد نے جواب دیا۔ "کسی..... وحشی گھوڑی..... کی طرح تھی۔ وہ مجھے..... پسند آئی..... مگر اس کی قیمت بہت اچھی ملتی..... اس لیے میں نے اسے آگے بھیج دیا۔"

"کہاں؟" صوفیہ نے پوچھا۔

ماجد پھر ہنسنے لگا۔ "مجھے خود نہیں معلوم کہ وہ اب کہاں ہے اور اگر معلوم ہوتا تب بھی میں نہیں بتاتا۔"

صوفیہ نے اسے غور سے دیکھا اور اچانک چاقو اس کے بائیں پہلو میں اتار دیا۔ ماجد لرزنے لگا۔ صوفیہ نے کہا۔ "یہ ماہ نور کے نام ہے۔"

ماجد نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ جھکتا ہوا نیچے گر گیا۔ صوفیہ نے اس کے پہلو سے چاقو نکال کر اس کے کپڑوں سے صاف کیا اور یاسر کی طرف دیکھا۔ "گیٹ بند کرو۔"

یاسر بائیک کی طرف لپکا۔ اس نے جلدی سے چابی میں لگے ریموٹ کا بٹن دبا کر گیٹ بند کیا اور اندر کی طرف بھاگا اسے روبینہ کی فکر تھی۔ وہ اندر آیا تو روبینہ ہوش میں تھی مگر اپنا سر تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔ یاسر نے اسے سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔ "ماما آپ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

''وہ سب؟'' روبی نے پوچھا۔

''ماما وہ اب نہیں رہے۔'' یاسر نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' روبینہ نے پوچھا۔

''اسے ایک لڑکی نے مار دیا۔۔۔۔ جب وہ مجھے شوٹ کرنے والا تھا۔ ماجد نے اس لڑکی کی بہن کو فروخت کیا ہے۔''

صوفیہ اندر آئی۔ اس نے روبینہ کی طرف دیکھا اور یاسر سے بولی۔ ''میں جا رہی ہوں۔''

یاسر اس کے پاس آیا۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن میں اس مشکل سے اکیلا نہیں نمٹ سکتا کہ اسے کیسے ٹھکانے لگاؤں۔''

صوفیہ نے سوچا اور بولی۔ ''پہلے مجھے اس کا خاص کمرا دکھاؤ۔''

خاص کمرا لاک تھا مگر اس کی چابی ماجد کے پاس سے مل گئی۔ جس وقت صوفیہ اس کا کمپیوٹر اور دوسری چیزیں کھنگال رہی تھی، اس نے یاسر کو کام دیا کہ وہ شیورلیٹ اندر لائے اور ماجد کی لاش اس کی ڈکی میں ڈال دے۔ یاسر نے ایسا ہی کیا۔ وہ باہر کھڑی کار کو اندر پورچ میں لایا اور ماجد کی لاش اس کی بہت بڑی ڈکی میں آسانی سے آگئی۔ وہ اندر آیا تو صوفیہ تمام چیزوں کا معائنہ کر چکی تھی۔ اس نے یاسر سے کہا۔ ''مجھے بہت اہم معلومات ملی ہیں مگر وہ معلومات قانون کے رکھوالوں کو دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، الٹا ہم ہی مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''پھر کیا کرنا ہے؟''

''تم لوگوں کے لیے خاموشی بہتر ہے اور میں ان معلومات کی مدد سے اپنی بہن کو تلاش کروں گی۔ تمہارے لیے کچھ اچھی خبریں بھی ہیں۔ یہاں ایک تجوری بھی ہے۔'' صوفیہ نے اسے دیوار گیر شیلف کو ہٹا کر دکھایا جس کے پیچھے خاصی بڑی تجوری تھی اور وہ لوگ آج تک اس کے وجود سے لاعلم تھے۔ اس کا لاک کمبی نیشن صوفیہ کو کمپیوٹر میں ملا تھا اور اس نے ملا کر تجوری کھولی۔ وہ دونوں ہی حیران رہ گئے تھے اندر بے انتہا دولت تھی۔ ملکی اور غیر ملکی کرنسی میں رقم جو بلاشبہ کروڑوں میں تھی۔ دوسری قیمتی اشیا اور کچھ دستاویزات بھی تھیں۔ صوفیہ نے چیک کیا تو یہ بنگلا روبینہ کے نام ہی نکلا تھا۔ باقی کچھ جائیداد تھی جو ماجد کے نام تھی اور وہ اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں انہیں قانونی کارروائی کرنا پڑتی جو اُن کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ صوفیہ نے اس سے کہا۔

''تمہارے لیے بہتر ہے کہ جلد از جلد اس بنگلے کو فروخت کر کے یہاں سے نکلو اور منتقل ہو جاؤ اور اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس دولت کے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

یاسر سچ مچ اس کا شکر گزار تھا۔ ''اب تم کیا کرو گی؟''

''میں اپنی بہن کی تلاش میں باہر ملک جاؤں گی جب تک وہ مل نہیں جاتی میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔''

''باہر جانے کے لیے تمہیں بہت ساری دولت کی ضرورت ہوگی۔'' یاسر نے کہا۔ ''تم اس میں سے جو چاہے، لے سکتی ہو۔''

صوفیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''جو چاہے؟''

''ہاں اگر تم ساری دولت بھی لے جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

صوفیہ کو سچ مچ رقم کی ضرورت تھی مگر اس نے رقم کے بجائے تجوری میں موجود سونا اور جواہرات لینا مناسب سمجھا۔ ''اگر تم اجازت دو تو، میں یہ لے لوں۔''

یاسر نے یہ سب ایک چمڑی پاؤچ میں بھر دیا۔ صوفیہ خوش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ دولت کتنی مشکلات چٹکی بجاتے ہی آسان کر دیتی ہے۔ ابھی اسے طویل سفر کرنا تھا۔ اس نے خوش ہو کر یاسر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اچک کر اسے پیار کیا۔ ''میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی۔''

یاسر کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم۔۔۔۔''

صوفیہ نے ایک بار پھر اس کے ہونٹ بند کر دیے اور پھر سرگوشی میں بولی۔ ''تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے، ہاں اگر میں نے اپنی بہن کو تلاش کر لیا تو شاید کبھی اپنی ماں اور بہن کو لے کر یہیں آ جاؤں۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' یاسر نے کہا تو صوفیہ کی آنکھوں میں خواب اتر آئے۔ پھر وہ چونکی اور گہری سانس لے کر اس سے الگ ہو گئی۔

''اب میں جاؤں گی۔''

یاسر اس کے ساتھ باہر آیا۔ ''اس کا کیا کرو گی؟''

''یہ اور گاڑی دونوں ہمیشہ کے لیے دنیا سے غائب ہو جائیں گے۔'' صوفیہ نے کہا۔ ''لیکن اگر کوئی مشکل ہوئی یا انہونی ہوئی تو میں تمہیں خبردار کر دوں گی۔''

صوفیہ گاڑی میں بیٹھی اور بنگلے سے نکل گئی۔ یاسر نے آسمان کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی۔ وہ اور روبینہ اب آزاد تھے۔